[illegible] ۰۳۱۲۱

ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵
رہائش ۴۸۰۹۸

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ ۱۰۴
جنوری ۱۹۶۶ء

مدیر:
محمد طفیل

ادارۂ فروغ اُردو لاہور

قیمت فی پرچہ
۵/-

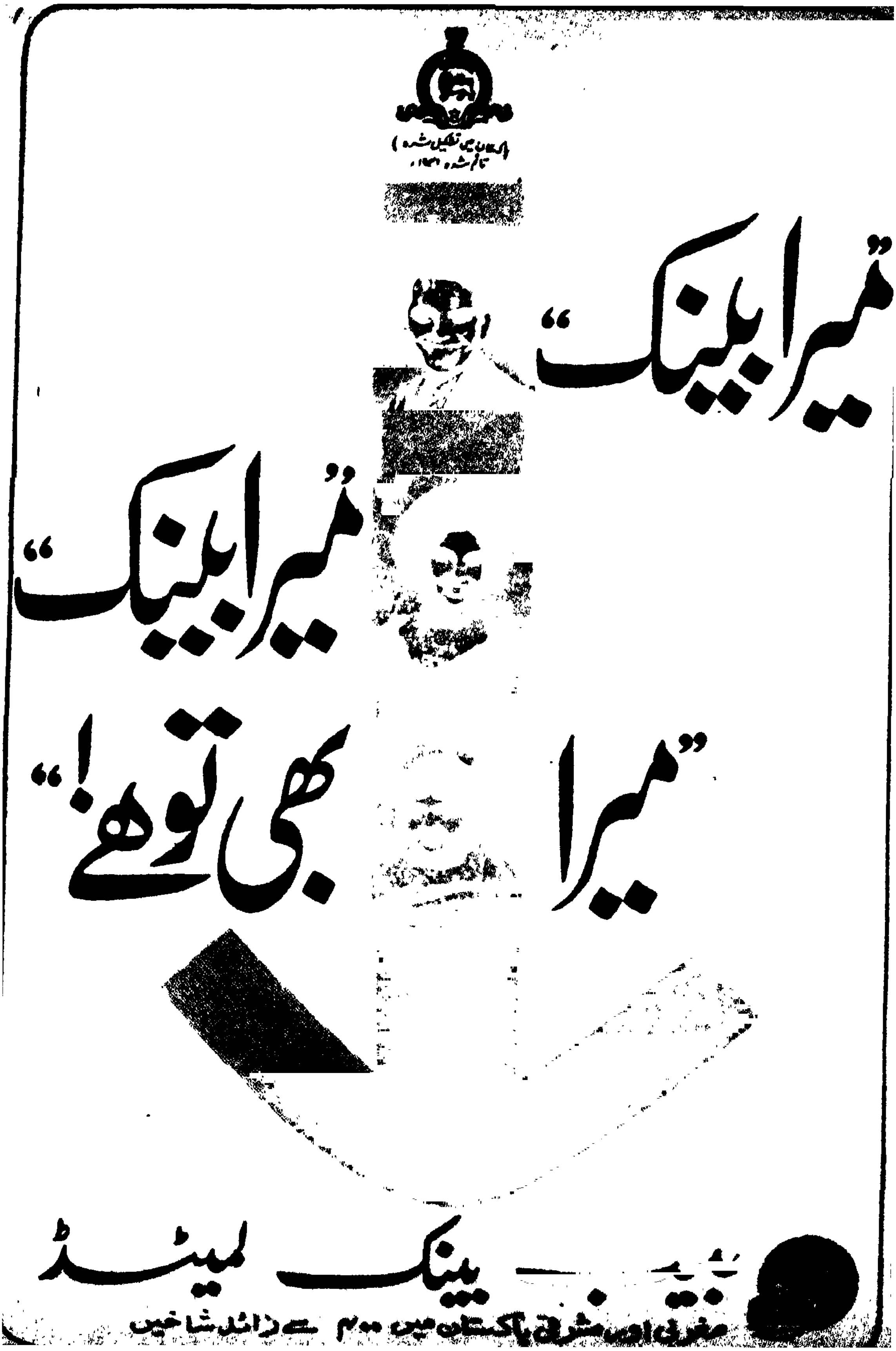
سالانہ چندہ ۲۰ روپے
غیر ممالک ۲۵ روپے

ترتیب

افسانے

حالات حاضرہ

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر فروغِ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا


"میرا بینک"
"میرا بینک"
"میرا بھی تو ہے!"
بینک لمیٹڈ
مغربی اور مشرقی پاکستان میں ۲۰۰ سے زائد شاخیں

طلوع

جو کوئی ہندوستان کے لیڈروں کو بُرا بھلا کہتا ہے تو مجھے اس پر بڑا غصہ آتا ہے۔ غصہ آنے والی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ بھلا کوئی اپنے محسنوں کو بھی بُرا بھلا کہتا ہے۔

اگر ہندوستانی لیڈر اس روپ میں ہمارے سامنے نہ آتے اور وہ یوں ہم پر یلغار نہ کرتے، اس طرح ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے نہ بناتے تو ہم مدافعت کے لیے سوچتے رہتے۔ انھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ نہ صرف جگایا بلکہ متحد کر دیا اور ہم میں خود شناسی اور سرفروشی کا وہ جذبہ پیدا کر دیا جو عام حالات میں ناممکن تھا۔ واقعی ناممکن تھا۔ یہ کام وہ تھا جو اللہ اپنے پیغمبروں سے لیا کرتا تھا۔ چونکہ خدا کی ذات ہر شے پر قادر ہے اور اس کی قدرت رحمت ہے۔ اس لیے اب کے اُس نے یہ کام ہمارے دشمنوں سے لیا ہے۔ یہ دور ایسا تھا کہ جیسے کئی کافر بھی کلمہ پڑھے بغیر مسلمان ہو گئے۔

میں تو یہی کہوں گا ـــ اے ہندوستان ہم تیرے ممنون ہیں!

اگر ہم مسلمان ہو گئے ہیں تو عاقبت سنور جانے کی بجائے تشنہ نہ ہو گئے ہیں تو دنیا سنور جانے کی مگر ایک مسئلہ ادبی ہے اور وہ مسئلہ ہے ادب کا۔ کئی ادیب اور شاعر ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ ہم سے کٹ گئے ہیں۔ کیا ان کے بغیر ہمارے ادب میں تازگی اور بانکپن باقی رہے گا؟ اس کا جواب پاکستان کے ادیبوں کو دینا ہوگا۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ خون جگر سے لکھے ہوئے ہمارے الفاظ اب اپنا رنگ جمائے رہیں گے ـــ اور ہماری تحریروں میں چھاپ بھی اپنی ہو گی۔

ہم پہلے یہی سمجھا کرتے تھے کہ ادیب آفاقی قدروں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ علاقائی حدود میں رہ کر نہیں سوچتا۔ وہ کائنات کے ہر فرد کے لیے لکھتا ہے۔ مگر اب کے اس جنگ میں ایسے مرحلے پر سے دوچار ہونا پڑا کہ ہوش ٹھکانے ہو گئے ہمیں اپنے وجود کی بقا کے لیے لڑنا پڑا اور وہ بھی ملا۔ پھر ساری آفاقی قدریں ہمارے دماغوں سے نکل گئیں جو بھی لیا کرتے۔ ہمارا پڑوسی ملک جس کے عوام ہمارے بھائی بند ہیں اور دشمن بن کر ہمارے سروں پر سوار تھا۔ اس کی توپوں کے گولے جیسے آس پاس آ کر پھٹ رہے تھے۔ اس کے ہوائی جہاز ہماری بستیوں پر بم برسا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ عین تہہ کرنے پر تلا بیٹھا ہو۔ ایسے نازک موقع پر پاکستان کے فنکاروں کو سوچنا پڑا کہ وہ ادب کی آفاقی قدروں کو اپنا کر غلام بن جائیں یا آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے قلموں کو ہتھیار کی صورت میں استعمال کریں۔

ایک فیصلہ ادب کی بقا کا تھا ـــ ایک فیصلہ ملک کی بقا کا تھا۔ یوں ہم تاریخ کے دوراہے پر کھڑے تھے مگر شرمسار نہ تھے۔ کیونکہ ہمارے فیصلے پر وقت کی مہر ثبت تھی۔ جسے کوئی بھی طاقت نہیں مٹا سکتا تھا۔

محمد طفیل

اس شمارے میں

حادثات بعض اوقات ادب کو بھی مالا مال کر جاتے ہیں۔ اگر ادبا ان سے بچی گریں۔ گریلی ان کے اثرات [illegible] ہیں۔ اس جنگ نے ہمیں سوچنے کے ایک نئے انداز سے روشناس کرایا ہے۔ لہٰذا تشبیہات اور استعاروں کا بھی انداز [illegible]۔ اس شمارہ میں ایک افسانہ ہے [illegible] اس کے تیور دیکھیں:۔

"یہ بات تو اس پر واضح تھی کہ [illegible] مدت سے ادھیڑ بیچ گزرتی ہوئی ہے۔
[illegible] سے پھر لڑائی کو جنگ میں تبدیل کرنے اور مورچے بنانے
[illegible] کہ ماضی اور حال کی کھڑکیوں پر ڈھک جائیں۔"

[illegible] سے پہلے یوں کون سوچتا تھا۔

○ [illegible]

○ [illegible] پیدا کر دی ہے۔ مگر ہمیں تبدیلی نہیں کہ اپنے مسلک سے ہی ہٹ جاؤں۔

○ اس پرچے میں ایسی تحریریں بھی شامل ہیں۔ جو [illegible] کی تخلیق نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ [illegible] ادب [illegible] کا چراغ نہیں [illegible]۔

○ موسیقی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ [illegible] احساسات کو بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں [illegible] کی اشاعت پر میرا بھی جرم ہو گیا۔

○ آپ کو شاید حیرت ہو کہ مجھے [illegible] دلچسپی ہے۔ [illegible] بات کر کے رہ گیا۔

[illegible] ایک بات اور بھی [illegible] پہلے بھی نقوش ہی کے ایک شمارے میں چھپ چکی تھی۔ مگر وہ [illegible] اب سے مکمل صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

محمد نقوش

لاهور
کا
چیلسی

حکیم احمد شجاع

تعارف

حکیم احمد شجاع جس ثقافتی ورثے کے علمبردار ہیں وہ حقیقت پسندی کی جدید تصویر سے تیار ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی ابتداء میں ہو گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ان کے بزرگ حکیم شہباز دین کے مکان پر سر عبدالقادر علامہ اقبال مولوی احمد دین میرزا ارشد گورگانی اور ناظر حسین ناظم جمع ہوتے تھے۔ لاہور کی یہ اجتماعی ادبی محفلیں حکیم احمد شجاع کی تربیت گاہ تھیں۔ اس فضا میں انکا شعور بیدار ہوا پھر علی گڑھ کی تعلیم اور میرٹھ کے قیام اور لاہور کی تربیت نے انکے لئے شاعری افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے پیرائے میں ادبی کارنامے انجام دینے کا سامان کیا۔ آجکل کے مقابلے میں اس زمانے میں مذہب اور انسان کا رشتہ قریب کا تھا۔ زندگی درویشی اور درویش دوستی کو اعلیٰ اوصاف تسلیم کرتی تھی۔ مذہبی نقطۂ نظر کو زندگی کے عملی پہلوؤں میں جاری رکھا جاتا تھا۔ انسانی سیرت معاشرتی علوم سے بہرہ مند تھی۔ دیانتداری اور دنیا داری میں ایک خاص رشتہ تھا۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآن پاک کے احکام نے حکیم احمد شجاع کے ذہن کی تشکیل کی۔ ان کی اصلاح پسندی اسی نظام حیات سے کسب فیض کرتی ہے۔ ان کے ہاں نیکی انسان دوستی مظلوموں کی حمایت جیسی بنیادی انسانی اقدار اسلام اور صرف اسلام کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جس ماحول میں حکیم احمد شجاع رہتے تھے یہ اسکا لازمی نتیجہ ہے۔ ادیب اپنے ماحول سے اثر لیتا ہے۔ حکیم احمد شجاع نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اس میں ان اقدار کو اسی سیاق و سباق ہی سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ کسی تقلید محض یا ذہنی بے دست و پائی کا نتیجہ نہیں۔ وہ اپنے ماحول کے نقاد بھی ہیں اور مصلح بھی۔ مذہب کو انہوں نے رسمی لباس کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اسکی روح تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس لئے انکے اظہار میں خلوص اور بیان میں وہ ناقدانہ بصیرت پائی جاتی ہے جو ہر اچھے صاحب فن کے لئے ضروری ہے۔

حکیم صاحب کے ادبی سرمائے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگاری، ڈراما نویسی اور شاعری۔ "حسن کی قیمت" حکیم صاحب کے پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے "اندھا دیوتا" ۱۹۱۳ء میں لکھا۔ "گناہ کی رات" ۱۹۱۵ء میں۔ "آرام شاہ کی بیٹی" ۱۹۱۵ء میں اور حسن کی قیمت ۱۹۱۷ء میں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آیا۔

حکیم احمد شجاع اردو نثر نگاری کے ایسے دور سے متعلق ہیں جب نثر کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اسکی نوک پلک سنوار کر اسے دلکش اور جاذب بنانا بھی ضروری تھا۔ نثر نگاری میں یہ ریاض انکی تحریر کو نکھار گیا۔ اپنے دور کے رومانی طرز کے زیر اثر حکیم صاحب نثر میں شاعری اور مصوری کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور بعض جگہ تو انہوں نے نثر کو بالکل شعر کی سرحدوں سے ملا دیا ہے۔ زبان و بیان کا یہ چٹخارہ انکے افسانوں کے علاوہ ڈراموں اور عام نثری تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔

حکیم احمد شجاع کی ڈراما نگاری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے معاشرتی مسائل پر سب سے پہلے قلم اٹھایا۔

حکیم احمد شجاع کے ادبی کارناموں کا تیسرا حصہ انکے شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔ "خون بہا" انکی آپ بیتی کے علاوہ کلام کا مجموعہ بھی ہے۔ دوسرا مجموعہ "گرد کاروان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس شاعری میں بھی اصلاح (خاص کر اخلاقی اصلاح) کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ اخلاقی اقدار کے علمبردار ہیں۔ انکی رائے میں انسانی معاشرے کی بنیادی فکر اخلاق ہے۔ یہی نقطۂ نظر انکے افسانوں اور ڈراموں میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس دور میں جبکہ ہمارے معاشرے میں اختلال کی کیفیت ہے اور اس تنزل کی سب سے زیادہ زد اخلاقی اقدار پر پڑی ہے حکیم صاحب کے کلام ان کے افسانوں اور ڈراموں سے ہمارے نوجوان بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حکیم احمد شجاع کا نام تاریخ ادب اردو میں ایک افسانہ نگار اور ڈراما نویس کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)



حکیم احمد شجاع

لاہور کا چیلسی

حکیم احمد شجاع

یکم جون ۱۹۶۳ء کو بی بی سی لندن سے ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ادیبوں، شاعروں اور مصوروں کے اس مشہور مسکن کے متعلق جو "چیلسی" کے نام سے موسوم ہے اور لندن کے مضافات میں واقع ہے ایک نہایت بصیرت افروز اور پُر از معلومات مقالہ نشر کیا جس کے یہ چند اقتباسات اس مضمون کو قلمبند کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

"چیلسی کی فضا لندن کے دوسرے محلوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ماضی دوبارہ زندہ ہو کر اپنی صورت میں سامنے آگیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور فنکاروں کے مکان اس کثرت سے یہاں ہیں کہ یہ شرف غالباً لندن کے کسی اور محلے کو حاصل نہ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ اب قدیم روایات کی پابندی اس شدت سے نہیں کی جاتی اور ادبا و شعرا کا شیرازہ ایسا بکھرا ہے کہ یہ لوگ لندن کی گنجان آبادی کو چھوڑ کر یہاں سے تیس تیس چالیس چالیس میل دور جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی چیلسی کی شان کسی حد تک قائم ہے۔ آج بھی برٹرنڈ رسل جیسے شہرۂ آفاق مصنف، سر ہربرٹ ریڈ جیسے نامور مفکر، آگسٹس جان جیسے جید پایہ مصور اور جان آئرلینڈ جیسے مشہور عالم مغنی چیلسی میں رہتے ہیں۔

چیلسی میں اگرچہ اب نئی وضع قطع کے مکان بھی بنتے جا رہے ہیں لیکن بیشتر گلی کوچوں اور مکانوں کی طرز تعمیر وہی پرانی ہے جو آج سے سو دو سو سال پہلے تھی۔ اس لیے تاریخی تسلسل ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے قائم ہے۔ قہوہ خانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں تو ماحول کچھ اٹھارویں صدی کا سا نظر آتا ہے۔ روشنی عمداً اس قدر مدھم کی گئی ہے کہ در و دیوار پر تاریکی کا سایہ پڑتا ہے۔ چھت کے شہتیر اور کڑیاں نمایاں کر کے دکھائی گئی ہیں۔ ساز و سامان سے بھی دورِ حاضر کا تعلق نہیں بلکہ ماضی کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

آج سے چار سو سال پہلے چیلسی ——— ایک چھوٹا سا گاؤں تمام لندن شہر کے مضافات میں آباد تھا۔ جب سولھویں صدی کے وسط میں سر ٹامس مور نے یہاں اپنا مکان بنوایا تو چیلسی کو پہلی مرتبہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر شہزادے جب چاہتے یہاں آکر مقیم ہوتے۔ اٹھارھویں

صدیوں کے لوگوں میں مقبول ٹروپ کا مصنف سیفٹ یہیں رہتا تھا۔

چیلسی کا عروج اٹھارہویں صدی کے وسط میں شروع ہوا جب ٹامس کارلائل یہاں اسکاٹ لینڈ سے آکر آباد ہوا۔ اور چیلسی کے لئے مرجع بن گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۴ء کا ہے۔ کارلائل چینی واک سے قریب ایک ہی مکان میں رہا اور ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی تمام کتابیں ایک ایک کر کے اسی مکان میں لکھیں۔ خوش قسمتی سے یہ مکان ایک قومی یادگار کی طرح محفوظ کر دیا گیا ہے جس میں کارلائل کا گھریلو سامان اور فرنیچر اسی ترتیب سے رکھا ہے جیسا اس کی زندگی میں تھا۔ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔

ہانس سلون ایک دوسرا عظیم و نامور شخص تھا جس نے چیلسی میں رہائش اختیار کی۔ سلون اسکوائر اور سلون سٹریٹ اسی کے نام سے منسوب ہیں۔ سلون پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا لیکن اس نے اپنی زندگی میں نوادرات کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے دنیا اور اپنے مختلف ممالک کے نادر سکے اکٹھے کیے تھے۔ مرتے وقت یہ تمام چیزیں وہ قوم کو دے گیا۔ چنانچہ اسی ذخیرے سے برٹش میوزیم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

انیسویں صدی کے بہت سے ادیب اور شاعر چیلسی میں آکر آباد ہوئے۔ ان میں جارج ایلیٹ، لی ہنٹ، ڈی جی روزیٹی، سوئن برن اور آسکر وائلڈ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے میدان میں یگانہ روزگار تھے۔ جیمز اور ٹرنر جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصوروں کے مکان بھی اسی محلے میں تھے۔ مشہور انگریزی ادیبہ [illegible] بھی چیلسی میں رہتی تھی۔ [illegible] چیلسی آباد ——— جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو کتنا رشک آتا ہوگا۔

چیلسی کا ایک حصہ تو شہری آبادی سے ملحق ہے اور دوسرا حصہ دریائے ٹیمز کے کنارے تک پھیل گیا ہے۔ یہ حصہ بہت خوبصورت ہے۔ دریا کے کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ چینی واک ہے۔ دریا پر ایک پختہ بند باندھ کر سیرگاہ بنا دی گئی ہے جو دور تک چلی گئی ہے۔ دریا کے اس طرف ایک بڑا باغ ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں میلہ لگتا ہے۔ جو دور سے دیکھنے میں بہت [illegible]

گزشتہ دو صدیوں میں جب انگریز مصنف چیلسی میں آباد ہونے لگے تو [illegible]۔ دو سو برس کے بعد انہیں دیکھ کر جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ [illegible] ان کی باتوں سے علم و ادب اور فنی مباحث کے علاوہ اس محلے کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے [illegible] کے چیلسی کے [illegible] سے نثر کیا تھا اور پھر قصہ سنایا کرتے۔

میرے ایک انگریز دوست نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں چند سال [illegible] میں بھی بسر کر

پچھلے ہی باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ لاہور کے کس حصے کو آپ لاہور کا چیلسی کہنا پسند کریں گے؟ ان کے اس عجیب و غریب اور دلچسپ سوال نے لاہور کا پورا نقشہ میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا کہ بھاٹی دروازہ ایک لحاظ سے لاہور کا چیلسی کہلانے کا مستحق ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ اس کی وجہ؟

میں نے عرض کیا کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھاٹی دروازہ لاہور کے ادبا و شعرا کا سب سے بڑا مسکن تھا۔ علامہ اقبال وہاں رہتے تھے۔ سر عبدالقادر نے وہیں سے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا تھا۔ آغا حشر کا قیام بھی وہیں تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی جب لاہور تشریف لائے تھے تو انہوں نے بھاٹی دروازے ہی میں قیام فرمایا تھا۔ چودھری سر شہاب الدین جو پنجاب اسمبلی کے سپیکر ہونے کے علاوہ پنجابی زبان کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید قمر الدین جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے، بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ مشہور مرثیہ گو شاعر سید ناظم حسین ناظم لکھنوی کا مکان بھی بھاٹی دروازے ہی میں تھا۔ غرضیکہ لاہور کی تاریخ میں ایک وقت ایسا گزرا ہے جب بھاٹی دروازہ مصنفوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مسکن تھا بلکہ اکثر علمی اور ادبی محفلیں بھی وہیں گرم ہوتی تھیں۔

میرے انگریز دوست یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے لیکن مجھے خیال آیا کہ اس ملک کے دانشوروں نے تو چیلسی اور چیلسی کی قدیم معاشرت پر بیسیوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور ہمارے ہاں کے دانشوروں کو آج تک یہ خیال نہیں آیا کہ کسی کو لاہور کے چیلسی یعنی بھاٹی دروازے پر ایک مضمون لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

اس تذکرے کے بعد ڈاکٹر عاشق حسین نے مجھ سے ذکر کیا۔ اچھا ہو کہ اگر آپ یہ کمی پوری کر دیں۔ آپ کا خاندان صدیوں سے بھاٹی دروازے کے اندر آباد ہے اور آپ اس کی پرانی روایات سے خوب واقف ہیں۔ اگر ان تمام ادیبوں شاعروں اور دوسرے مشہور لوگوں کے حالات کسی بھی صورت میں سامنے آ جائیں جو کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کے علاقے کے اندر رہتے تھے، تو یہ نہ صرف لاہور کے اس مشہور مقام کی تاریخی حیثیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہو گی بلکہ اس سے دنیائے علم و ادب کے ذہن میں ان لوگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی جو کبھی یہاں رہتے تھے اور جن کے دم قدم سے اس علاقے نے اپنے اپنے زمانے میں علم و فن کی شمع روشن کی۔

مگر عمر رواں کا کارواں زندگی کے سفر کی ستر منزلیں طے کر چکا ہے اور ڈاکٹر عاشق حسین کی اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے میں ان لوگوں ہی کا ذکر کر سکتا ہوں جو اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے اور جن کی یاد میرے ذہن میں زندہ ہے۔ میں نے اپنی بھولی ہوئی یادوں کو یکجا کر کے ان کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات مختصر طور

پہلے لاہور میں مسلمان بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کی حدود کے اندر رہتے تھے اور ہم کو انہی کے آثار کی تلاش ہے۔ لاہور کی کوئی نہیں۔ بلکہ پنجاب کی قدیم تہذیب اور ثقافت قدیم کے آثار ملتے ہیں۔ اور یہی کی زندگی کے لحاظ سے لاہور پرانی تہذیب کے امتیازی آثار ہیں۔

لاہور ایک بہت پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں ذکر ہے کہ رام چندر جی کے دو بیٹے تھے۔ لو اور کسو۔ لو نے لاہور آباد کیا اور کسو نے قصور۔ مختلف زمانے کے انقلابات میں یہ کئی بار اجڑا اور آباد ہوا۔ کبھی تو یہ شہر اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل اچھرہ آباد ہے اور کبھی اس مقام پر جو اب [illegible] سے موسوم ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے زمانے میں لاہور اسی جگہ آباد تھا جہاں آج کل آباد ہے۔ جب شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے لاہور کو اپنا عسکری مرکز بنایا تو اس وقت لاہور کا قلعہ تعمیر ہوا یہ لاہور کے شمال مغرب میں ایک وسیع و عریض میدان کے بیچ پر واقع تھی۔ پنجابی زبان میں کسی مقام کی سطح مرتفع کو تھیہ کہتے ہیں۔ پہلے لاہور کا وہ حصہ جو مستی دروازے سے لے کر بھاٹی اور ٹکسالی دروازوں کی حدود کے اندر واقع ہے "تھیہ" کہلاتا ہے۔ شاہ جہاں کے وقت میں لاہور تین حصوں میں منقسم تھا۔ "تھیہ" میانی اور چوک دارا شکوہ۔ تھیہ کی حدود کے اندر ایک قلعہ تھا اور اس کے مضافات میں شاہی محلات، بازار اور خانے اور امراء کی حویلیاں۔ میانی لاہور اور چوک دارا شکوہ اور تھیہ کے درمیان واقع تھا۔ آج کل یہ محض ایک قبرستان ہے بلکہ میانی کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے قبرستان کا تصور آ جاتا ہے۔ اس وقت شہر لاہور کا بیشتر حصہ اسی مقام پر واقع تھا شہر کا یہ حصہ [illegible] سے شروع ہو کر ایک طرف بھاٹی دروازے تک اور دوسری طرف مزنگ جس کا اصلی نام "مرزنگ" ہے اسی سے آگے پھیلا ہوا تھا۔ چوک دارا شکوہ شہر کے اس حصے کا نام تھا جو دہلی دروازے سے شروع ہو کر ایک طرف شاہدرہ کی گڑھی اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس تک اور دوسری طرف باغبانپورہ سے لے کر اچھرہ تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس مقام کی ہیئت کا اندازہ ہو جائے جو اس وقت تھیہ کہلاتا تھا اور جس کی حدود میں وہ علاقہ شامل ہے جو بھاٹی دروازے سے لے کر ایک طرف ٹکسالی دروازے تک اور دوسری طرف پیر [illegible] میں [illegible] سے گزر کر مستی دروازے تک پھیلا ہوا ہے کہ یہی علاقہ اس مضمون کا موضوع ہے۔ اس کے علاوہ یہ بتانا بھی لازم ہے کہ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں بھٹی دروازہ تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے [illegible] راجپوتوں نے فتح کے بعد آکر ڈیرہ ڈالا تھا۔ مرور زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ بھاٹی دروازہ ہو گیا۔ بھاٹی دروازے کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر چونکہ مجھے اس علاقے کی صرف ان مراکز کا ذکر کرنا ہے جن کو [illegible] عاشق حسین [illegible] نے "لاہور کے جھروکے" سے موسوم کیا ہے اس لیے میں اب اپنے مضمون کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

جب بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک گلی ہے جسے اونچی [illegible] کہتے ہیں۔ آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے اس گلی کے ایک مکان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے نامور اور ممتاز شخصیت کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے تھے۔ وہ بڑی کرامت کے اور سرچشمہ ہدایت و رشد۔ ان کے درس کلام [illegible] کا شہرہ دور دور تک تھا۔ [illegible] میں بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ [illegible] پاک باطن اور فرشتہ صفت انسان تھے اور لوگ [illegible] ان کی صورت دیکھ کر

اسلامی سیرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اپنی طالب علمی کے زمانے میں [illegible] اور اس زمانے میں جب کہ [illegible] اسکول لاہور [illegible] کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے مولانا [illegible] کی شاگردی کے فیض سے بہت سی عربی اور فارسی کے علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی اور جس کی بدولت انھوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے متعلق بڑی کاوش اور کوشش سے تحقیق کی۔ ان کی تصانیف میں سے "[illegible] العزیز [illegible]" جو اُن کی چند [illegible] سال کی محنت کا نتیجہ ہے اور چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے پنجاب یونیورسٹی نے دو جلدوں میں شائع کی۔ مولوی محمد شفیع کے علمی کارناموں اور تحقیقی دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے [illegible] تفصیل کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں ان کے ذکر سے [illegible] کہ ان کی ابتدائی زندگی [illegible] کے [illegible] اسلامی ماحول میں گذری جو اس مضمون کا موضوع ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کے پرانے استادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جو [illegible] وقت میں [illegible] سے دیتے تھے اور جن کو [illegible] اس محترم کے نقوش یاد ہوتے ہیں جو اس زمانے کے استادوں کی تعریف کا [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] کو خیال تھا کہ یہ سب لوگ بھاٹی دروازے ہی کے اندر بستے تھے۔ اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج سے بہت ہی قریب تھا

اورینٹل کالج اپنے ابتدائی زمانے میں [illegible] میاں [illegible] کی حویلی میں واقع تھا۔ اگر میں ان [illegible] کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ہر ایک سے ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہییں۔

یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر تاریخ بیان ہو جائے تو مناسب ہے۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی [illegible] میں علوم مشرقیہ کی ترویج کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کا نام "انجمن پنجاب" تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں ڈالی گئی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس انجمن کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں اسی سال [illegible] علوم مشرقیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اسی جگہ [illegible] ۱۸۶۵ء میں [illegible] کے قریب ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا اور جس میں [illegible] ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ قائم ہوا۔ اور انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تولیت میں لے لیا اور اس کے نصاب میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ [illegible] میں [illegible] کے سامنے [illegible] ہسپتال [illegible] محلے کے متصل میاں [illegible] کی حویلی [illegible] گورنمنٹ کالج پہلے پہل قائم ہوا۔

[illegible] ۱۸۷۰ء [illegible] مشرقیہ [illegible] اورینٹل اسکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے [illegible] کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی [illegible] دروازے کے اندر [illegible] کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج [illegible] کی ایک عمارت میں منتقل ہو گیا ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت [illegible] ہو گئی تو اس کے پیچھے [illegible] عمارت کا [illegible] مشرقی [illegible] ڈاکٹر لائٹنر اس کے [illegible]۔ اس وقت مولوی

[illegible] صاحب [illegible] تھے [illegible] دونوں [illegible] رہتے تھے
[illegible] رہتے تھے
[illegible] رہتے تھے۔

[illegible] شیخ گلاب دین
[illegible] شیخ گلاب دین سیالکوٹ کے رہنے والے تھے
[illegible] قانون [illegible] شہادت [illegible] دوسری [illegible] ایک [illegible]
[illegible] مستقل رہتے تھے [illegible]
[illegible] خطیب مولوی [illegible] رہتے تھے
جو اپنے [illegible] مرشد [illegible] بادشاہی [illegible]
[illegible] قرآن [illegible]
[illegible] سید محمد شاہ وکیل رہتے تھے جو اس زمانے میں
دیوانی قانون کے ماہر [illegible]
[illegible] ڈاکٹر محمد [illegible] رہتے تھے [illegible]
[illegible] ڈاکٹر رحیم خان [illegible]
[illegible] ڈاکٹر محمد حسین [illegible] اور ڈاکٹر رحیم خان اپنی
[illegible] ڈاکٹر محمد حسین [illegible] خان تھے جو
اپنے زمانے کے بہت مشہور [illegible] اور شاعر تھے اور [illegible] کتابوں کے مصنف۔

شیخ [illegible] سے آگے چل کر راجہ [illegible]
[illegible] بھاٹی دروازے [illegible]
[illegible]
[illegible] سرپرست تھے۔ [illegible]
[illegible] میاں محمد بخش [illegible]
اور [illegible] جب تک
[illegible] ہندو [illegible] سکھوں [illegible] بھاٹی دروازے کے
[illegible] سر محمد اقبال [illegible]
[illegible] میاں [illegible] نواب [illegible]

سر سکندر حیات خاں، میاں محمد نصیر، شیخ خان بہادر، سید مراتب علی، سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سردار جگندر سنگھ وغیرہ نے اکثر ان ہی کے ہاں [illegible] بیٹھے دیکھا ہے۔ اب یہ داستان ایک قصہ پارینہ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے سامنے [illegible] بہت سی [illegible] کھڑی رہتی ہیں۔ اسی کوچے میں مرزا عبدالقادر رہتے تھے جن کا نام محتاج تعارف نہیں۔ گلی کے سامنے ہی خلیفہ نظام الدین رہتے تھے جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے صدر دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور اپنی حساب دانی کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں مولانا عبدالحلیم کلانوری بھی رہتے تھے۔ اس محلے سے ذرا آگے چلیے تو بائیں طرف کو ایک گلی نکلتی ہے جسے پیر بھیسے کی گلی کہتے ہیں۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں ڈاکٹر امیر چند رہتے تھے۔ یہ ان طبیبوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں میو ہسپتال [illegible] میں بڑی شہرت حاصل کی۔ وہ [illegible] کی بیماریوں کا کامیاب علاج کرنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اپنی ہمدردی اور منکسر مزاجی کے باعث شہر کے غریب طبقے میں بہت مقبول تھے۔ کچھ دور آگے جا کر یہ بازار جو گلی کہلاتا ہے۔ مسٹر میاں فضل حسین بیرسٹر ایٹ لا جو بعد میں سر میاں فضل حسین کے نام سے معروف تھے، انگلستان جانے سے پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور انگریز بیرسٹر [illegible] اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینلڈز کے ساتھ کام کیا۔ یہ رینلڈز اس مشہور و معروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو ایم رینلڈز کے بیٹے تھے جنھوں نے "مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن" لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی محلے میں اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے۔ یہ ابتدائی زمانے میں میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں محمد شفیع وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دلی چلے گئے تو انھیں منشی طاہر الدین کے مشورے سے ڈاکٹر سر محمد اقبال [illegible] میں لے گئے جن کی سر محمد شفیع پریکٹس کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے اقارب و متعلقات کی پیروی کا کام سر محمد اقبال کو سونپ گئے تھے۔ اس سبب سے منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ایک دوا [illegible] کے نام سے ایجاد کی۔ اور اس کے موجد ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر مشہور ہوئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا اعتماد پیدا کر لیا کہ انھوں نے اپنی وصیت میں اپنے معاون دوستوں کے ساتھ ان کو بھی اپنی اولاد اور جائداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں [illegible] صاحب رہتے تھے۔ ان کو خوش نویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ [illegible] انھوں نے اس محلے سے "نقوش" کے نام سے اردو کا ایک مشہور ادبی رسالہ شائع کرنا شروع کیا جو آج کل ایک [illegible] سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، مضامین کے تنوع اور کتابت کی نفاست کے اعتبار سے اپنے ہم عصر رسالوں سے مختلف و منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعض نمبر تو بہت [illegible] تحقیق میں ایک تاریخی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنھیں موجودہ دور کی تاریخ مرتب کرنے میں [illegible] کی تلاش ہو۔

آگے چل کر شیخ [illegible] مزار [illegible] رہتے تھے۔ وہ بعد میں کوچہ [illegible] میں جو [illegible] بازار میں واقع ہے رہنے لگے۔ اسی [illegible] میاں [illegible] رہتے تھے جو [illegible] تھے [illegible] صاحب [illegible]۔ یہ شخص ان کی طاقت کا لوہا مانتا تھا [illegible]

بازار حکیماں سے جب آگے بڑھتے ہیں تو تمام علاقے پر تذکروں کی چادر کی وہ وقت بھی ہے جو کئی پرانے خاندانوں سے یہاں کے لوگوں کا اس وقت کی یاد تازہ کرتا ہو۔

محلہ کا نقشہ کے بالمقابل مولوی کا کوچہ ہے۔ یہیں مسجد کی عمارت کے نزدیک فقیر سید نورالدین اور فقیر سید شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمر الدین اور دوسرے حصے میں فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آج کل اس میں فقیر سید اعجاز الدین صاحب رہتے ہیں۔ اسی حویلی سے ملحق ایک مکان تھا جس میں وہ تبرکات محفوظ رکھے گئے ہیں جو فقیر سید عزیز الدین نے شاہ محمد غوث سے حاصل کیے تھے۔ یہاں دو وقت قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اسی مکان کے قریب ملا محمد رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرأت کے ماہر تھے اور جن کے درس قرآن کا فیض عام تھا۔

اس کوچے کے قریب چوہدریوں کا کوچہ ہے جہاں پنجاب کے ایک مشہور رئیس میاں محمد حسین جو مہاراجہ چنبہ کے وزیر رہے تھے، رہتے تھے۔ انہی کے بیٹے میاں محمد حیات ہیں جو بعد میں ریاست جموں کے ایک وزیر رہے اور اس کے بعد ریاست بہاولپور کے میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری ہو کر اپنی عمر میں گزار گئے۔ کوچہ دار صاحب اندر گلیوں میں داخل ہو کر اس محلے میں یہ مکان بھی آتا ہے۔ میرے والد کے بڑے بھائی حکیم امین الدین کا مکان ہے جو حکیم حسام الدین کے بیٹے تھے جو اس محلے میں پہلے ہی آباد ہو چکے تھے اور جنہوں نے قانون پڑھ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان ہے جس میں ۱۸۹۰ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین کی بستی میں ایک شعر ۱۸۹۳ء میں اقبال ہوئی۔ اور جس کے دوسرے شاعروں میں اقبال نے جو ان دنوں کے شاعروں کے سامنے پہلی دفعہ اپنی اردو نظم پڑھی۔ حکیم امین الدین کا بیٹا اور ہر قسم کے طالب علموں کی علمی ضرورتوں کے لیے اس زمانے میں بہت بڑا مرجع تھا۔ اور اکثر کالجوں کے طالب علم یہاں آیا کرتے تھے۔ یہ علاوہ ایک طبیب خاص ہونے کے والی ریاست کے معالج بھی تھے۔ انسانی نگاہوں کی ملاقات کا مرکز اور وقت گزارنے کا بہترین مقام تھا۔ ان کی بیٹھک اور محفل میں زیادہ تر لوگ دور سے زیادہ ان کی دعا کے طالب ہوتے تھے۔ اس کے بالمقابل میرے دوسرے چچا حکیم شہباز الدین کا مکان تھا۔ یہ مکان لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک جب تک حکیم شہباز الدین زندہ رہے، ہر روز شام کو لاہور کے مشہور شاعروں، عالموں اور سیاست دانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا علمی کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع ہوتے تھے ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، منشی محمد دین، مولانا محمد حسین، حافظ محمد حسین، مولوی منظور احمد، سید محمد شاہ، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ امیر بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، نظام الدین اور مرزا بخش کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس محفل میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا ارشد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور ارباب حل و عقد میں سے حاجی شمس الدین، خواجہ امیر بخش، مولانا غلام اللہ اور خلیفہ حمید الدین بھی اسی بزم احباب میں اکثر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ اس محلے کے ساتھ ہی ہمارا مکان ہے جس میں میرے والد

حکیم شجاع الدین بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور طبیب فلسفی اور شاعر تھے۔ یہاں زیادہ تر ان کے وہ شاگرد دن بھر موجود رہتے تھے جن کو طب، شعر اور فلسفہ میں ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید افتخار الدین کا مکان تھا۔ وہ چوہدری اپنے زمانے میں فقیر خانے کے ایک ممتاز رکن اور سرکاری ملازمت کے اعتبار سے ایک جلیل القدر عہدہ دار تھے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سرکاری اہل کاروں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس ہجوم کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ان کے ہندو، سکھ اور مسلمان دوست جو یا تو سرکاری ملازمت سے منسلک تھے یا ان کے خاندان سے دیرینہ تعلقات کے باعث وابستہ تھے مل بیٹھتے تھے۔ ان میں لالہ ہرکشن لال، سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ، چوہدری سلطان احمد (فیض احمد فیض کے والد) مرزا سلطان احمد، میاں نصیر الدین (نواب امام الدین صوبیدار کشمیر کے بھتیجے) سید اقبال علی شاہ اور سید مراتب علی شاہ (نواب امام الدین خان صوبیدار کشمیر کے نواسے) قابل ذکر ہیں۔ جب فقیر سید افتخار الدین لاہور میں آتے تو اپنے مکان پر ایک پر تکلف مجلس شعر و سخن جمائے رکھتے۔ ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار اور امرا جب کبھی لاہور آتے تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتے۔ اس محفل کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ چوہدری سلطان احمد اسی بازار میں اپنے بڑے بھائی چوہدری نبی بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بیرسٹر ہونے کے علاوہ علم ریاضی میں بھی بڑی دسترس رکھتے تھے۔ اور ریاضی ہی میں کیمبرج میں ٹرائی پاس حاصل کر کے آئے تھے۔ اسی بنا پر انھیں حکومت افغانستان نے اپنا وزیر مالیات مقرر کیا اور ان کی اس شہرت سے متاثر ہو کر مرزا ارشد گورگانی نے اس تقرر پر ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کا یہ ایک شعر ان کی اس مہارت پر شاہد ہے جو انھیں علم ریاضی میں تھی —

برادا ہندسہ بُرد فضیلت گر تو ریاضی می بینی

زاں رو بست کہ خواہش کردہ دولت افغانستان

مرزا سلطان احمد ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے علاوہ بڑے پائے کے ادیب شاعر اور سخن فہم تھے۔ جب ایبٹسن نے جو بعد میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے اپنی سنسس رپورٹ لکھی تو اس میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت زہر اگلا۔ مرزا سلطان احمد نے جو اگرچہ اس زمانے میں انھیں کے ماتحت ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اس رپورٹ کے خلاف ایک مدلل، مبسوط اور درشت رسالہ شائع کیا جس نے نہ صرف ایبٹسن کے دانت ہی کھٹے کر دیے بلکہ مرزا سلطان احمد کی غیرت و حمیت کا سکہ مسلمانوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔ یہ بھی اسی محلہ میں رہتے تھے۔ فقیر سید افتخار الدین کبھی کبھی اقبال کو بھی بڑے چاؤ سے کھینچ لاتے اور ان کی صحبت سے محفل کی رونق بڑھاتے۔ فقیر سید افتخار الدین کے بڑے داماد فقیر سید نجم الدین جو میرے حالات ہی ہوتے ہیں اور بھتیجے بھی اقبال سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ انھیں مراسم کی یادگار ہیں فقیر سید نجم الدین کے بیٹے فقیر سید وحید الدین نے "روزگار فقیر" کے نام سے دو جلدوں میں ایک نہایت ہی جامع، دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جس میں علامہ اقبال مرحوم کے ہیں۔ فقیر سید افتخار الدین کے چھوٹے بھائی فقیر سید اقتدار الدین جو انھیں کے ساتھ رہتے تھے اس زمانے کے مذاق کے مطابق شاعری کو اپنی شرافت نسبی اور وجاہت علمی کا جزو سمجھتے تھے۔ وہ اس مشاعرے کے علاوہ جس میں جو حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتا تھا ہمیشہ اپنی تازہ غزل پڑھتے تھے۔ فقیر قمر الدین جو فقیر خانے کے بزرگ تھے اور جو کاشانہ لال حویلی کہلاتا ہے اگرچہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے

تھے جیسے مرزا کو دعا بیں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ بھی بہت اچھا شعر کہتے تھے اور (نقش) کرتے تھے۔

اس سے آگے چل کر تکیہ شریف کا آخر آتا ہے جس میں فقیر سید جلال الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے۔ اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے بانی فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو "شاہ [illegible]" کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں فقیر سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین کے مزار بھی ہیں۔ اس تکیے میں مہر سید مراتب علی شاہ کی حویلی اور سید مبارک حکیم کا امام باڑہ ہے۔ اور ان کے بعد فقیر سید اعتماد الدین کی ہنسی حویلی ہے۔ اس حویلی سے ملحق فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانے میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حنیف الدین کی حویلی میں مرزا اسلم بیگ ایک پرانے خاندان کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اعظم بیگ کو شعر و شاعری کا شوق وراثتاً تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے شاگرد تھے۔ میکش تخلص کرتے تھے۔ اپنی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ کروڑ پتی مشہور ہو گئے۔ اس دولت پر ان کے ذوق سخن کو بھی کافی تقویت ملی۔ انھوں نے اپنی حویلی میں ایک مستقل مشاعرہ قائم کیا جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور اپنے استاد سے داد سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے پوتے فقیر سید [illegible] تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے۔ اور بہت صاف شعر کہتے تھے۔ اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔

شاید اس شاعری کے زمانے میں یہ بیان کرنا ضروری ہے جب کہ مرزا اعظم بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا دیا تھا۔ مرزا اعظم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال اور ان جیسے کئی کاملین کے نام اور پیغام اس طرح گزرے گئے ہیں بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہوتی تھی۔ اور اس محفل کا مذاق مرزا اعظم بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا چرچا تھا۔ اور اس محفل میں وہی قائل و قافیت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس کوچے کے انتہائی سرے پر حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے —

کرد اسحق این عبادت گاہ عبداللہ حکیم

انھوں نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اپنا گھر بنانے سے پہلے خدا کا یہ گھر بنایا تھا۔ اس کے سامنے ہی حکیم شاہ بخش کی حویلی تھی جس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے گنبد میں ان کا مزار باقی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے توکل اور فیاضی کے باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چل کر بازار کے بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر سید ظہور الدین رہتے تھے۔ اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسن الدین کا مکان اور امام باڑہ ہے۔ اس میں ان کے بیٹے والد سید شیخ علی شاہ رہتے تھے جن کو شعر گوئی کا شوق اس سرے پایہ تک تھا مگر انھوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی اختیار نہ کیا تھا نہیں۔ بڑے بڑے مستندوں کو مدت میں لگتے تھے اور ان سے رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔ مناظر قدرت کی جو تصویریں

کے لئے تعریف کی وہ کسی دوسرے مصنف کی چابکدستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو اشعار بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور ان کی تعداد ہزاروں تک ہے ہر حیثیت سے شعر کے تاریخ فکر کا آئینہ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ فطرت کے عجائبات کا ایک لامحدود خلا ہے جس کے پیش کش گئے ہیں اور وہ ادب و شعر و سخن کا ایک چمنستان ہے جس پر بہار آگئی ہے۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی اور قریب قریب ایک سو بیس سال کی عمر میں ابھی پچھلے ہی برس رحلت فرمائی۔

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی ہے جو ان کے بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی۔ اور آج کل اسی میں ان کا امام باڑہ واقع ہے۔ کچھ دور آگے چل کر تحصیل آ جاتی ہے جہاں اس زمانے میں لاہور کے تحصیلدار کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے متصل ایک مکان ہے جس میں دارالاشاعت پنجاب اور رسالہ "تہذیب نسواں" کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے۔ اور اس کوچے میں ایک مدرسے میں مولانا محمد حسین آزاد بھی رہتے۔ اس کوچے کے مقابل ایک بازار ہے جسے اس زمانے میں جوتیوں کا بازار کہتے تھے اور جو آج کل رنگ بازار کہلاتا ہے۔ اسی بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دوسری طرف تاریخ لاہور کے مشہور مصنف سید محمد عبداللطیف کی حویلی۔ وہ اس زمانے میں سشن جج تھے اور اسی نسبت سے یہ بازار اب جج بازار کہلانے لگا ہے۔ اس بازار میں ایک اور بزرگ رہتے تھے جن کا نام مولوی عبدالغنی تھا۔ وہ لکھنؤ میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے میاں شمس الدین کے مکان میں علامہ اقبال کا ایک مدت تک قیام رہا۔ اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔

اس مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبدالغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں شیکسپیئر کے اسلوب نگارش کے فہم میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے۔ بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

کچھ دور آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آج کل تیلی بازار کہلاتا ہے۔ زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں بھی اس بازار میں عمائد حکومت کی حویلیاں تھیں مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں اس بازار میں زیادہ تر موچیوں کے ڈیرے تھے۔ ہاں اس بازار میں ایک عالیشان مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی جس میں علوم اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین ناظم نے غالب کا یہ مصرع برجستہ دہرا دیا۔ اور سننے والوں نے لطف اٹھایا ——

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کی بائیں طرف شیخ پوریوں کا بازار ہے۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے۔ یہ پنجاب کے ایک مشہور اخبار "رفیق ہند" کے ایڈیٹر تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کا اثر اور رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے وہ میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب کرا دیتے۔ اسی لیے لوگ انہیں "کنگ میکر" کہتے تھے۔ بعد میں یہ اس مکان سے اٹھ کر بیرون شہر کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے۔ بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر۔ حضرت سید مستان شاہ کابلی کے مرید تھے۔ ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ شہر کے لوگ اپنے مہمانوں کے وفد شہر کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہیں کے ہاں قیام فرماتے۔ اپنے ابتدائی

زمانے میں انگریزی [illegible] بہت مقبول تھے۔ اور اسی لیے سرسید احمد خاں کی اس بات سے ہم پوری طرح [illegible] کی قسمت کا سبب [illegible]
جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے انھیں کو جوہر بہت ایک زمانے تک شیخ علم و فضل بنا رہا۔

اس محلے کے قریب چابک سواراں والی حویلی تھی جس میں مرزا عبدالرحیم رہتے تھے۔ ان کے بیٹے صاحبزادے مرزا محمد سعید آج
انگریزی ادب پر بہت ہی ملکہ رکھتے تھے کہ جن سے گورنمنٹ کالج کے ایک انگریز پروفیسر [illegible] کہا کرتے تھے کہ انھوں نے
مرزا محمد سعید کا سا پایہ انگریزی ادب اور کسی دوسرے ہندوستانی طالب علم یا استاد میں نہیں دیکھا۔ مجھے مرزا محمد سعید کی شاگردی کا فخر اس
زمانے میں حاصل ہوا جب وہ اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ بعد میں وہ انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر گورنمنٹ کالج کے عہدے میں انگریزی
کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے دو ناول "خواب ہستی" اور "یاسمین" اردو زبان میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہ ان مصنفوں میں سے چند
لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بلند پایہ انگریزی مضامین کو اردو زبان کا جامہ پہنایا۔ شیخ عبدالقادر کے رسالے "مخزن" کا مضمون میں سلسلہ شروع
ہوا۔ پروفیسر محمد سعید دہلی کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پھر اپنے وطن چلے گئے اور وہیں گزرے ہیں کہ انھوں نے تقریباً (۸۰)
برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ بھاٹی دروازے کے اندر ہی گزرا ہے اس لیے ان کی شہرت کا اس علاقے
کو کچھ حصہ ملتا ہے۔

موچی دروازے کے اندر بھی شیخ عزیز الدین کی کوٹھی تھی جو لاہوری کے ساتھ تھے۔ جن میں سے اکثر اپنے فن کے کمال کے باعث
بہت مشہور تھیں۔ شیخ عزیز الدین کی کوٹھی میں مسجد وزیر خاں کے قریب ایک مکان تھا جس میں مرزا ارشد گورگانی ایک مدت تک مقیم رہے۔
یہ مغلیہ خاندان میں سے تھے اور اسی نسبت کے باعث گورگانی کہلاتے تھے۔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ اور درس و تدریس
کے مشاغل کو اپنا سرمایۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں وہ ہر کسے کو نوجوانوں کو شعر و شاعری سے وابستگی تھی وہ اپنے کلام کی اصلاح
انھی سے لیتے تھے اور یا میر ناظر حسین ناظم سے۔ یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شعر و شاعری میں یہی دو بزرگ پنجاب میں
اردو زبان کی ترویج کا باعث ہوئے۔ مرزا ارشد میر ناظر حسین ناظم اور بعض کے معاصر تھے۔ اور انھوں نے ان شاعروں کو جن کے نام پہلے
بیان ہو چکے ہیں کی کوشش کی اور کی اس کوشش میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ [illegible] رہے۔ منشی احمد حسین خاں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔
بعض مرزا ارشد گورگانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اقبال اگرچہ بذریعہ خط و کتابت اپنی ابتدائی غزلوں کی اصلاح حضرت فصیح الملک
مرزا داغ سے لیتے تھے لیکن وہ بھی بعد میں اپنی غزلیں مرزا ارشد گورگانی کو دکھایا کرتے تھے۔

بھاٹی دروازے کے چوک سے جو راستہ ہیرا منڈی کو جاتا ہے اس کے دائیں ہاتھ محلہ [illegible] ہے۔ اس محلے کی
اس زمانے میں زیادہ تر [illegible] یہی [illegible]۔ آگے چل کر یہ بازار [illegible] میں پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ راستہ [illegible]
گزر کر چوک [illegible] سے ہو کر چونے منڈی کو جاتا [illegible] کے صاحبزادے میاں [illegible] رہتے تھے۔
[illegible] کے بازار میں میاں شمس الدین اور میاں نظام الدین دو معروف [illegible] بنگلے [illegible] رہتے تھے۔ [illegible]
کے باعث ان کا وقت [illegible] شاعروں کا جماؤ رہتا تھا [illegible] زندگی کے [illegible]
بسر کرتے تھے۔ میاں امیر الدین جنھوں نے پنجاب کی سیاست میں ہمیشہ بہت نمایاں حصہ لیا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی

میاں جلال الدین کے صاحبزادے اور پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین کے بڑے بھائی ہیں۔ اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمد الدین تاثیر جن کے علم و فضل کا چرچا اردو اور انگریزی میں ہے جن کا اسلوب نگارش آج بھی قارئین کے دل کو گرما دیتا ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بارود خانے ہی میں رہتے تھے۔

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگ خیال" جیسے مقبول عام اردو رسالے کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر بھی شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے۔ وہ طبیب بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور اردو ادب کو مقبول عام بنانے میں انہوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کر دی کہ اپنا سارا اثاثہ اسی پر لٹا بیٹھے۔ بارود خانے کا علاقہ جو لیگ کے لیڈروں کی سکونت کی بدولت دنیائے ادب میں شہرت رکھتا ہے ان میں حکیم یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

بارود خانے سے آگے جائیں تو قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو کمانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کسی زمانے میں مغل فوجوں کی چھاؤنی تھی جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک بازار آتا ہے جسے موتی بازار کہتے ہیں۔ یہ چوک سرین شاہ سے شروع ہو کر مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت مشہور طبیب اور نیک سیرت انسان حکیم سید بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز خاندان کے نامور رکن تھے۔ خدا نے انہیں جیسا دستِ شفا بخشا تھا ویسی ہی ان کی دعا ایسی مستجاب تھی کہ لوگ دور دور سے آتے تھے اور انہوں کے ساتھ ساتھ ان کے تعویذ بھی بہت چلتے۔ پرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی تھا۔ ایک تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر کوئی طبابت کے فن میں ماہر تھا۔ اور حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں۔ دوسرا موتی بازار میں انہی حکیم سید بزرگ شاہ کا خاندان۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود حکیم سید عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا خاندان جو ان کی ذات والا صفات کے باعث بہت مشہور ہوا۔ چوتھا موچی دروازے کے اندر تیلیوں والے محلے میں حکیم سید صاحب علی اور حکیم سید فرزند علی کا خاندان۔ حکیم سید فرزند علی نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ اور ابھی دو چار برس ہوئے ہیں کہ ان کا انتقال ہوا۔ اور پانچواں چونے منڈی میں حکیم سید بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ذاتی طبیب تھے۔ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں اور بھائی وستی رام جیسے مشہور ہندو اطبا فن طبابت میں یگانہ مانے جاتے تھے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقۂ علاج کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ وہ شہر میں دو تین مسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی دیکھیے ہندو ڈاکٹر ہی نظر آتے تھے۔

موتی بازار میں حکیم سید بزرگ شاہ کے مکان سے ذرا آگے چل کر ایک گلی آتی ہے جس میں لاہور کے دو مشہور پہلوان جنہوں نے کشمیر میں بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا ... پہلوان تھا اور دوسرے کا نام کریم بخش پیلے والا۔ آج کل میں بھاٹی دروازے اور مستی دروازے کے درمیانی علاقے کے نامور لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس بستی میں ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جن کی شہرت علمی اکتساب کی رہین منت نہیں ...

نے اپنے داستے ... نام پایا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ گرو اور استاد اور مرشد کے پیرواؤں کے معیاری کمالات کا درجہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے علمی اور ادبی اکتسابات کے درجے سے کم نہیں تو ان پیرواؤں کے ایک اشارے کی قوت کو تعلیمی مدرسوں سے کم اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ مرشد کے غلام پہلوان اور گرو پہلوانوں ... ان پہلوانوں اور امام بخش پہلوان کے کمال فن کی شہرت اپنے ملک ... محدود نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے ممالک کی شہ زوروں کا سر ... کا رواج چکے ہیں۔

... ان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ اسلام کی حقیقی سیرت سے آشنا تھے۔ وہ بزرگانِ دین کی طرح بندگی کرتے اور اس کی ... میں اوقات بسر کرتے۔ تکیہ مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے۔ اور صبح و شام درس قرآن دیتے۔ انہیں حاجت میں بھی بہبود ... حاصل تھا۔ اور لوگ ان کے تعویذوں پر بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط الرجال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ مسجدیں یا دینا دی خدمت کا اولین مقصد کسب زر ہو یا نمائش و شہرت ... تو وہ سببِ رحمت ہوتی ہے اور باعثِ برکت۔ اس بازار میں آگے چل کر ... دروازے کے قریب ایک مسجد ہے جسے بیگم شاہی مسجد کہتے ہیں۔ اس کے امام اور خطیب مولانا غلام قادر تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے پٹھان تھے اور ... کے صاحب فضیل پیر صاحب کے مرید۔ عربی اور فارسی کے علوم میں ان کو دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین سے اکتساب علم کر چکے تھے عربی زبان کے فاضل اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور فارسی تحریری تصنیفات مولانا غلام قادر ہی کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ درس دیتے وقت بیٹھے بیٹھے اور تسبیح چلاتے رہتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس پہلوان کی طرف کا ادارہ ... ہے۔ ان ... یہ بھی دیکھا کہ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ انہیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں ... کا ... پہنچ چکے تھے۔ بالکل کو درس قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو قاضی جی کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب مجھ میں ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ میں تو ان کی خدمت میں محض اکتساب سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ اور وہ اس لیے کہ میری بسم اللہ کی رسم اسی مرد حق آگاہ کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ نام و نمود سے ان کو نفرت تھی اور اپنے کام سے کام۔ میں نے جب کبھی انہیں دیکھا مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلے پر بیٹھے دیکھا۔ ان کی تنہائی ... ہے کہ باہر کے لوگ ... ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم و فضل کا تذکرہ اس مشغلہ کیا گیا ہے لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کمالات کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ یہ تفصیل مختصر کے ساتھ بیان کردی جائے تو مناسب ہے۔ اس سے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور اس مضمون کی تاریخی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے۔ اپنی تعلیم کے زمانے میں انہیں مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومن، میرزا اسد اللہ خان غالب اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی صحبت کا بھی

شرف حاصل رہا۔ ابتداً میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی کو دکھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے دوران دلی سے نکل کر پٹنہ، الور، سہارنپور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جاکر عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور آ گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں اسی سال اورینٹل کالج میں شعبۂ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔ لاہور میں ان کا قیام محلہ معماراں کے اندر بازار حکیماں میں رہا۔ ۱۸۸۱ء میں انھوں نے اسلام کی سیاسی اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں "سنین اسلام" کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف شائع کی۔ ان کی تصنیفات سے ان کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "حیاتِ شبلی" میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن کے علم و فضل کی عظمت پر شاہد ہے —

"مولانا فیض الحسن اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند
نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"

میرے والد حکیم شجاع الدین محمد شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن کا ہر شعر ان کے جوہرِ کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت اقبال کو بھی اکثر ان کے اشعار کو پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبا کو اپنی شاگردی کی سعادت سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بزرگوں کی زبانی سنا ہے اور وہ اس لیے لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں رہنے والے صاحبانِ علم و فضل میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ اور اگر یہ مضمون ان کے ذکر سے محروم رہ جاتا تو گویا ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا۔

شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۱۶ء تک صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت وجیہ انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کرتا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے بھائی شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔ جب وہ آتے تو حضرت اقبال زیادہ تر انھیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے۔ انھوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض، صنائع و بدائع اور املا کے خصائص پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبا کو اکتسابِ علم میں بڑی مدد ملی ہے۔ ان کے حلقۂ بیان کے شاگردوں کا شمار نہ تھا۔ اور جب بازار میں چلتے تھے تو اس وقت بھی ان کے شاگرد ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں سلجھانے میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ۔ اکثر ادبی مسائل و سخن کی فکر میں رہتے تھے۔ آخر کار اورینٹل کالج میں چوبیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اردو، فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد انھی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ بڑے متقی اور دیندار بزرگ تھے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گزرا ہے۔ مفتی انوار الحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے مستند عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا۔ وہ بعض مسائل پوچھنے کے لیے ہم کو کچھ

ہو گئی۔ اس سے [illegible] تھا [illegible] کو [illegible] کرتا تھا۔ یہ ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جا بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں میں اکثر لوگ ایسے ہوتے تھے جن کا پیشہ وراثت تھا۔ [illegible] ایسے بھی [illegible] کو قرآنی [illegible] کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی بنائی ہوئی [illegible] ۔

مفتی محمد عبداللہ بہت [illegible] تھے۔ ہاں ہر وقت چلتے رہتے تھے اور جب بات کرتے تو [illegible] کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال [illegible] ادب کرتے تھے [illegible] علم و فضل کا اتنا ذخیرہ [illegible] میں بہت کم [illegible] ہے۔ [illegible] سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور [illegible] کچھ عرصہ [illegible] کام کرتے رہے [illegible] شرح [illegible] چار جلدوں میں ان کی کتاب [illegible] اردو زبان کا ایک قابل قدر سرمایہ ہے [illegible] مسائل [illegible] رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے [illegible] ۔ [illegible] میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے [illegible] ایک [illegible] محروم ہو گئی۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ کی عمر اسی برس کے قریب تھی۔

[illegible] کی خوش قسمتی ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی اجڑی تو دلی کے سب سے [illegible] اردو زبان کے [illegible] مولانا محمد حسین آزاد نے انقلابات زمانہ کے [illegible] صاحب سے [illegible] پنجاب [illegible] کی [illegible] آزاد [illegible] لاہور میں گوشہ نشین ہو گئے [illegible] سررشتہ تعلیم پنجاب [illegible] لاہور میں [illegible] ملازمت میں [illegible] کے جوہر کمال کی [illegible] ایسے مواقع بھی بہم پہنچائے کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے گردش تقدیر نے [illegible] دیا تھا [illegible] گورنمنٹ کالج میں شعبہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ [illegible] شمس العلماء کا خطاب بھی پایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے محتاج تعارف نہیں۔ پنجاب میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے اسباب میں [illegible] کارنامے [illegible] ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آب حیات، نیرنگ خیال، قصص ہند، اور دربار اکبری جیسی [illegible] تصانیف [illegible] اردو ادب میں [illegible] کی [illegible] شاہد ہیں۔ [illegible] اردو زبان کے [illegible] کیا ہے [illegible] اس زمانے میں [illegible] سررشتہ تعلیم کے [illegible] اردو [illegible] کتابیں لکھیں۔ یہ بات [illegible] کے بعد اس [illegible] پیروی کی [illegible] ۔ [illegible] شاعری [illegible] غزل کے [illegible] انجمن پنجاب کے مشاعرے [illegible] حب وطن [illegible] خیال [illegible] [illegible] ہے۔

شاعر کی حیثیت سے مولانا محمد حسین آزاد کے کمالات کو ان چند سطروں میں بند کرنا ایک گستاخی ہے جس کا ارتکاب محض اس لیے قابلِ عفو ہے
کہ اس مضمون کی حدود میں ان کی غیر محدود صلاحیتوں کا بیان نہیں سما سکتا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف اکثر حاصل ہوا۔ اور اس زمانے میں جب انہیں
دانش فراموش یا ریاست جوش دماغ سے بیگانہ سمجھتے تھے۔ ہم نے انہیں پہلے داناؤں سے زیادہ دانا پایا۔ آخری زمانے میں وہ بھاٹی دروازہ
سے ہٹ کر یکی دروازے کے اندر نواب صاحب کی حویلی کے عقب میں اپنے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم کے مکان میں چلے آئے۔ اور یہیں
۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ سر عبدالقادر جو شروع شروع میں بھاٹی دروازے کے اندر محلہ ... میں رہتے تھے۔ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان
اعزازات کے باعث جو انہیں سرکار دربار میں حاصل ہوئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ چند سطور محض ان کی عظمت کے اعتراف اور ان کے
کمال کی عظیم تفصیل کے اجمال کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔ وہ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے
کی ڈگری حاصل کرکے ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں کے پہلے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان میں ان کی قابلیت
کی یہ پہلی سند تھی جو انہیں مل گئی۔ ۱۸۹۹ء میں جب سر سید احمد خاں نے لاہور میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو پنجاب میں متعارف کرنے
کے سلسلے میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور اس میں کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک نے انگریزی میں تقریر کی تو شیخ عبدالقادر نے ان
کی تقریر کے ختم ہوتے ہی اس کا ترجمہ نہایت شستہ اردو میں کیا۔ اور لوگ تو کیا خود سر سید احمد خاں بھی حیران ہو گئے۔ اس دن سے وہ انہیں مولوی
عبدالقادر کہنے لگے۔ اردو زبان کی ترویج کی دھن اب ان کے دل میں ایسی سمائی کہ وہ ہر وقت اسی کوشش میں مصروف رہتے کہ پنجاب کو
اردو زبان کا مرکز بنا دیں اور علم و ادب کی جو بساط دلی اور لکھنؤ میں الٹ چکی تھی اسے ایک بار پھر یہاں لا کر لاہور میں بچھا دیں۔

وہ اس وقت بازار حکیماں میں فقیر جلال الدین کی حویلی کے سامنے میاں نبی بخش کے مکان میں رہتے تھے۔ اور یہیں سے ۱۹۰۱ء
میں رسالہ "مخزن" جاری ہوا۔ اس رسالے کے سرورق پر ہندوستان کا ایک نقشہ ہوتا تھا جس پر مختلف نشانوں سے ان مقامات کی
نشاندہی مقصود تھی جہاں یا تو اردو بولی جاتی ہے یا اردو کہی جاتی ہے اور یا جن کے رہنے والوں کی ادبی زبان اردو ہے۔ یہ رسالہ
بہت مقبول ہوا اور اس نے اپنے بے جان اوراق میں نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ فکر و قلم سے زندگی کی ایک نئی
لہر دوڑا دی اور شائقینِ ادب کے دل میں اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جب سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک، سید احمد
خاں دہلوی، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے دوسرے ہم
عصر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے بعد سمیٹے اردو کی نشاط میں سرگرم رہے تھے۔ مخزن نے ایک ایسی محفل سجائی کہ اس میں اس
زمانے کے تمام ممتاز ادیب آن بیٹھے۔ سر محمد اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر، منشی ... نیرنگ، ... مولوی
ظفر علی خاں، شیخ محمد اکرام ... چند نوجوان اس محفل کے مستقل رکن تھے۔ یہ محفل ... اعتبار
سے علیگڑھ کی محفل تھی۔ اس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی ... اس محفل میں
مخزن کا سلسلہ ترتیب پا گیا ...
وجہ ہے اس محفل کا ...

...یہ دوسرا کامیاب مجلہ اس وقت منظر عام پر آیا جب انہوں نے ۱۹۱۹ء "ہزار داستان" کا سلسلہ شائع کیا۔ اس میں شاہد حمید، چودھری، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، منشی پریم چند، مرزا ادیب، میر حسن، حامد حسین علی بسمل، عبدالمجید سالک، پنڈت ہری چند اختر، شیرانی اس فن کے سب سے روشن ستارے تھے۔ عبدالرحمن چغتائی کے موقلم کی گلکاری سے ہزار داستان کا ہر شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ آراستہ ہوتا تھا۔ مخزن ہی کی طرح ہزار داستان بھی ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں ترتیب پاتا اور شعر و ادب کی وہ بساط بچھاتا جو کسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے بچھائی تھی۔ ہزار داستان کا ذکر اس جگہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی اشاعت کی ابتدا اور مخزن کی بہت سی باتیں ملتی جلتی تھیں۔ یہ ستارہ بھی اسی افق پر روشن ہوا جو سالہا سال سے مخزن کے زیر اثر تھا۔ ہزار داستان اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ جس کا ذکر آج بھی تخیل کی مستیوں کی معراج اور گزشتہ زمانے کی یادگار کا سرور و کیف ہے۔ ہزار داستان کا سرورق حکیم فقیر محمد جیسے نامور خطاط نے لکھا اور سر محمد اقبال نے زحمت اٹھا کر اس کا نام بھی تجویز کیا بلکہ اپنے قلم سے اس کے سرورق پہلے صفحے کے لیے یہ شعر تحریر فرمایا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے

جب یہ شاعر مشرق کی فطرت روشن پر آشکار ہوگا کہ انہوں نے جس عشق کے داغ کا نام ہی کیا سوز و ساز دیکھا اور وہ حاصل سوز و ساز کیا تھا جس سے وہ چاہتے تھے کہ اس زمانے کی بزم ادب میں اجالا ہو جائے۔

شیخ عبدالقادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۷ء میں واپس آئے۔ اقبال بھی ان دنوں انگلستان میں تھے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ قیام انگلستان میں انہیں ہمیشہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر کرنے میں مصروف رکھا۔ اقبال کے دل پر شیخ عبدالقادر کی شخصیت کے جو اثرات تھے اس نظم سے ظاہر ہیں جو انہوں نے ان کے نام ایک نظم کی صورت میں لکھا۔ ہم اس مقالہ میں انہیں درج کرتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آگے چل کر ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی تنظیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ان تصورات کے آئینہ دار ہیں جن کی جھلک اس نظم کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں شیخ عبدالقادر اپنی زندگی میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں مجلس قانون ساز پنجاب کے صدر بنے۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندے مقرر ہو کر جنیوا گئے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں انڈیا کونسل لندن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں وہ منسٹر کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے اور پھر سرکار برطانیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۲ء میں بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مقیم ہو گئے۔

زبان اردو کی ترویج میں جو انہماک سر عبدالقادر کو تھا وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔ اے (اردو) کی جماعتوں کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اورینٹل کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم۔ اے (اردو) کی جماعت کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح کشت زار اردو کو اپنے ابر کرم سے سیراب کیا۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود درس و تدریس کے باب میں وہ سرگرمی دکھائی کہ جواں سال اساتذہ کے لیے ایک مثال بن گئے۔ ۹۔ فروری ۱۹۵۰ء کو ایک مصروف اور کامیاب زندگی کے شب و روز گزار کر سر عبدالقادر نے رحلت فرمائی۔ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو جگہ انہوں نے خالی چھوڑی وہ پھر کبھی پُر نہ ہو سکی۔

سر شہاب الدین کی جوانی کا زمانہ بھی ایسے اندھیروں کے طبقے میں بیتا تھا۔ وہ پنجاب کے ان امرا اور رفیع الشان گھرانوں سے نہ تھے بلکہ ایک پسماندہ طبقے میں ہوش سنبھالنے کے باوجود کامیابی اور ترقی کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچے جہاں پہنچنا ہر انسان کے بس میں نہیں۔ ایک نہایت معمولی زندگی اور شب و روز کی محنت و مشقت کے جتنے انعامات ہو سکتے ہیں انہوں نے حاصل کیے۔ ۱۹۰۰ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے پھر اس ملازمت سے دستبردار ہو کر کچھ دنوں تک اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں "پنجاب کریمنل لا جرنل" ایک قانونی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کی کامیابی سے حوصلہ پا کر "انڈین سٹیچوٹس اینڈ کیسز" (Indian Statutes and Cases) جیسے کئی قانونی مجموعے مرتب کرنے لگے۔ لاہور کی شہری اور پنجاب کی سیاسی زندگی میں بھی وہ ہمیشہ نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ایک مدت تک میونسپل کمیٹی لاہور کے میئر رہے۔ اور بائیس برس تک پنجاب کی مجلس قانون ساز کی صدارت پر فائز رہے۔ سر شہاب الدین پنجابی کے بڑے مانے ہوئے خوش گو شاعر تھے۔ مسدس حالی کا پنجابی زبان میں جو ترجمہ کیا وہ ترجمہ ان کی اپنی ہی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مجلس قانون ساز پنجاب کی صدارت کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیے کہ پھر ان جیسا صدر اس مجلس کو کبھی میسر نہ آیا۔

بھی ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں بیٹھتے تھے۔ اقبال اور ان کے ساتھ کے ... معلوم ہوتا ہے شاہ ... میں ان کے ... کا
میں لکھنؤ منتقل ہونے سے پہلے ... سے بہت دولت کمائی اور اس دولت کا بیشتر حصہ یا تو قضا کی راہ میں صرف کیا اور یا اپنے ملک و
قوم کے ہاتھ ... کر دیا۔ انہوں نے بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے ان کی ذاتی لائبریری کو ایک بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ
کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسی وصیت کے مطابق وفات سے پہلے وہ اپنی
قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے سٹیشن کے سامنے واقع ہے انجمن حمایت اسلام کو دے گئے تھے۔ وہ ... کا ... سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ
بنا۔ جس میں ... نے ... ادا کی۔ سر شہاب الدین نے بھی اس ... کی ... سیاست کے
لیے ایسے ابھرے کہ ... کی زینت تھی ... اور صاحب ... تھے۔ اندر ... تھا کہ جب
... تو ... ہو جاتے۔ ... سے ان کی آواز ... ایک ... کی ... تھی۔ قوت حافظہ
کا یہ عالم تھا کہ ... کے ... رہتا تھا۔ ...
کی ... تھے۔ ... اپنے ... سے ... ان کا ... اور یہ ... تو یہ ہے کہ ... تک
... پایا۔ اس ... کی ... اور ... ان کے بیان کے لیے ... مختصر ... یہ گنجائش ہے نہ فرصت۔ بس یہی کہہ
دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین ... ایک مثل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ مثل بھی ختم ہو گئی۔

مولوی احمد دین وکیل بھی کا نام ان لوگوں میں آتا ہے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمع ہوتے تھے۔ اپنے زمانے کے ...
قانون کے ماہر تھے۔ اور ... کے ادیب۔ الفاظ کی تاریخ میں ان کی تصنیف "سرگزشت الفاظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اس موضوع
پر ایک مثالی تصنیف ہے اور اپنے مصنف کی عرق ریزی اور ... کی ... ہے۔ ان کا ایک ... کارنامہ جو اب ... کی یاد میں ...
ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کو ... دیکھا اور ان کی شاعری کو اس کے اصلی رنگ میں پرکھا۔ اور اقبال کے ... سے
ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو ... تک ... میں پڑھے گئے تھے اور
پھر ... کی اس طرز پر تشریح کی جس طرز پر "آئینۂ عرفان شیکسپیئر" (Mind and Art of Shakespeare)
لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب ... ایک ناشر شیخ ... نے چھاپی۔ لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے
شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہی وہ مجموعے ہیں جنہوں نے بعد میں "بانگ درا" کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی
کتاب کی اشاعت سے "بانگ درا" کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔ اور اس طرح دنیا ایک ... کا ...
تحقیق یا ... سے محروم ہو گئی۔ مولوی احمد دین کی تحریر کا ... اپنے ... سے ... نمونہ تھا اور ...
... کی شائستہ تحریر ... ان کی تحریر کا ... آتا تھا۔

مولوی احمد دین بھی ... "... گلی" میں رہتے تھے۔ ان کے ... سے ... مولوی ... کا مکان تھا جو ...
... جنہوں نے انگریزی زبان ... شائع ... پیدا کرنے میں ... نام پایا۔ یہ ... سر رشتۂ تعلیم پنجاب میں
ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے ... تعلیم ... مقرر ہوئے۔ ... صاحب ... گئے تھے۔ شیخ عبدالقادر،

مولوی احمد حسین اور سید ادی تمام دین پابندیٔ وضع کے اس قدر پابند تھے کہ میں نے انہیں ان کی جوان سالی کے زمانے میں بھی کبھی بے شملہ نہیں دیکھا۔

اس گلی سے آگے چل کر اسی نمکین بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھابڑوں کی گلی کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظر عام پر نہیں آئے۔ مگر وہ اس محفل کی روح رواں تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی تھی۔ ان کی جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا لیتے تھے اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے۔ "نالۂ یتیم"، "ہلال عید"، "تصویر درد" اور "شمع و شاعر" کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہیں لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر ان سے [illegible] انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہان اسلام سے حسن قبول و تحسین و عقیدت حاصل کیا۔ خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لا جو اقبال کے ہم زلف تھے اور جنہوں نے آگے چل کر ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا انہی خواجہ رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ اور خواجہ عبدالمجید "جامع اللغات" جیسی جامع اور ضخیم لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے۔ اس لغت کی گیرائی اور اس کے مؤلف کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموز ادب کا دلدادہ [illegible] سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کس انہماک سے اس عظیم الشان تالیف کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے آغوش عاطفت میں ان دونوں نوجوانوں نے پرورش پائی۔

اسی بازار میں اس کوچے کے سامنے ایک مشہور پنڈت رگھو دیال جوتشی (رمال) اور ڈاکٹر ہیرا لال رہتے تھے۔ جوتش کے علم کے متعلق لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ بعض ان سب نظریات سے قطع نظر میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رگھو دیال اس علم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سر شہاب الدین ان کے بہت قائل تھے۔ اور سر شہاب الدین ہی کیا بڑے بڑے لوگ دور دور سے اپنے معاملات میں اپنا زائچہ بنواتے۔ بڑے نیک دل اور خدا پرست انسان تھے۔ میں بچپن کی شرارت میں کئی مرتبہ مختلف طریقوں سے جوتش کے رموز سیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ [illegible] کے بغیر اس علم کا حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کے مکان کے سامنے ہر قسم کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہر شخص ستاروں کی گردش کے اس رازداں کی زبانی اپنے مستقبل کے [illegible] آتا جو پردۂ غیب میں مستور رہتے ہیں۔ بہرحال پنڈت رگھو دیال کا مکان کوئی نصف صدی تک مرجع خواص و عوام رہا۔

ڈاکٹر ہیرا لال اپنے زمانے کے بڑے مشہور سرجن تھے۔ بہت [illegible] اور اپنے فن میں ماہر۔ غریب ہو یا امیر ہر مریض کو بڑی احتیاط سے دیکھتے اور اپنے ہر مریض کا علاج بڑی توجہ سے کرتے۔ اس زمانے میں انگریزی طریقہ علاج کا بھی [illegible] تھا۔ تاہم ڈاکٹر بیلی رام، ہیرا لال، ڈاکٹر نہال چند، ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر رحیم خاں انگریزی طریقہ علاج میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہیرا لال کے مکان کے سامنے ڈاکٹر [illegible] کا مطب تھا۔ یہ ڈاکٹر ہیرا لال کے شاگرد تھے اور [illegible]

[illegible] کو دیکھ کر محسوس ہوئی کہ انھوں نے [illegible] وجہ سے وہ مختلف موقعوں پر اپنا مطلب ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ [illegible] صبح ۱۰ بجے وہ پھر [illegible] تحصیل بازار میں مطب کرتے اور [illegible] بجے [illegible] گئے [illegible] مریضوں کو دیکھتے۔ [illegible] ایک [illegible] دیکھی [illegible] نہیں خوش تھی [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی توسط [illegible] سے [illegible] تھے اور سب سے عجیب بات تھی کہ وہ یہ [illegible] بچے بچے خوشحال [illegible] مریضوں کا بھی [illegible] علاج کرتے تھے۔ [illegible] سے [illegible] نہیں لیتے۔ [illegible] کہ [illegible] اور [illegible] مریضوں سے [illegible] کوئی [illegible] ہے جن [illegible] ضرورت کے لیے کافی ہو۔ [illegible] ڈاکٹر [illegible] میں سب سے پہلے ڈاکٹر [illegible] سے [illegible] کے شیشے بنانے کا فن سیکھا۔ اور پھر ان شیشوں کو بنانے کا ایک [illegible] کارخانہ بنایا۔ [illegible] ایک دل [illegible] تھے اور [illegible] کی گیتا کے [illegible]۔ جب ڈاکٹر [illegible] نے گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو [illegible] اعتبار سے چھپوا کر شائع کیا گیتا کا یہ ترجمہ بعض نقادوں کی رائے میں [illegible] اینی بیسنٹ کے ترجموں سے [illegible] بہتر [illegible] ہے۔

تحصیل بازار کے آگے [illegible] کے قریب [illegible] صاحب [illegible] اور پنڈت [illegible] شاستری کے [illegible] تھے۔ [illegible] شاگردوں کا فخر حاصل ہے۔ پنڈت [illegible] کی دماغی وسعت [illegible] صلاحیت ایک [illegible] رکھتی تھی۔ انھوں نے کئی [illegible] کے امتحانات پاس کیے۔ سنسکرت اور [illegible] سے [illegible] خاص شغف تھا [illegible] سے [illegible] پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں [illegible] کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ [illegible] کشمیر [illegible] کر [illegible] گئے۔

منشی صاحب [illegible] پہلے تو ماڈل سکول لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بعد میں ریلوے ٹیکنیکل سکول [illegible] وجہ سے پنشن [illegible] ہونے اور ابھی ملازمت سے سبکدوش نہ ہونے تھے کہ [illegible] سے سبکدوش ہو گئے۔ [illegible] استاد اس [illegible] خاص خیال رکھا کہ وہ اپنے شاگردوں کی دیکھ بھال اپنے [illegible] کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مضمون میں کمزور دیکھتے تو اس سے بیزار ہونے کی بجائے اس کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو جاتے۔ ان [illegible] طالب علم [illegible] شاگرد ان کی مربیانہ شفقت سے [illegible] کرنے کی [illegible] نہ ہوتی تھی۔

جب پنجاب کے [illegible] میں شاعری کا [illegible] تھا ۱۹۰۸ء [illegible] حکیم [illegible] نے اردو زبان [illegible] سے متاثر ہو کر ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ "شور محشر" اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر [illegible] دیوان خانے میں منعقد ہوتا تھا اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا وہ "شور محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس سلسلے کے [illegible] ڈاکٹر [illegible] کے بیٹے [illegible] تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے [illegible] کی شہرت ایک ناول [illegible] ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ آگے چل کر انھوں نے "شباب اردو" کے نام سے ایک [illegible] رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا جس نے ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ سر [illegible] اقبال بھی جو اس زمانے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے [illegible]

جتے اس مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی ایک محفل میں انھوں نے وہ غزل بھی پڑھی جس کا یہ شعر اب تک ہر ا
لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس غزل کے مقطع سے اقبال کی حیثیت کا اندازہ بخوبی صاف ظاہر ہوتا ہے جس نے آخرکار انھیں ان لوگوں کی پیروی سے بے نیاز کر دیا جن کو محض زبان دانی کا دعویٰ تھا اور جن کے اشعار کا تار و پود لکھنؤ اور دلی کے محاوروں کے تانے بانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

مرزا ارشد گورگانی دلی سکول کے پیرو تھے اور میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ۔ دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے غزل سرا ہوتیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اودھ اور دہلی کے اکھاڑوں کا نقشہ کھنچ جاتا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں کچھ پنجاب کے شعرا میر اور مرزا ہی کے زیر قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے پنجہ آزما ہوتے رہتے تھے۔ اس بزم مشاعرہ کی مقبولیت اس روداد سے ظاہر ہے جو "شور محشر" کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے کے متعلق چھپی۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے اور اردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی۔

"۲۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا جناب حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا کے عالیشان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے قریباً تین سو شائقین کی بھیڑ بھاڑ تھی۔

۱۔ جناب حکیم شجاع الدین صاحب شجاع، میر مشاعرہ
۲۔ جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب
۳۔ جناب مرزا حبیب علی صاحب ارشد دہلوی
۴۔ جناب منشی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار
۵۔ جناب منشی عبدالعزیز صاحب، منیجر پیسہ اخبار
۶۔ جناب لالہ موہن لال صاحب مطلب، نائب میر مشاعرہ
۷۔ جناب میر نثار علی صاحب شہرت
۸۔ جناب مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے پلیڈر
۹۔ لالہ حشمت رائے صاحب، بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی

۱۰۔ جناب منشی پیران بخش صاحب، بیرسٹر ایٹ لا
۱۱۔ جناب میرزا احمد حسین صاحب ناظم
۱۲۔ جناب لالہ منوہر لال صاحب بی۔ اے
۱۳۔ جناب مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے
۱۴۔ جناب پنڈت سکھ دیو ناتھ صاحب در، ایم۔ اے
۱۵۔ جناب لالہ گوبند رام صاحب، رئیس لاہور
۱۶۔ جناب لالہ دولت رائے صاحب مالک امرت پریس لاہور
۱۷۔ جناب شیخ ... صاحب ایم۔ اے
۱۸۔ جناب منشی شاہ ولی صاحب ...
۱۹۔ جناب مرزا عبدالغنی صاحب عارف
۲۰۔ جناب حکیم شہباز دین صاحب
۲۱۔ جناب فقیر سید زین العابدین صاحب پلیڈر
۲۲۔ جناب منشی غلام حسین صاحب شیدا
۲۳۔ جناب شہزادہ محمد علی صاحب متخلص بہ شہزادہ
۲۴۔ جناب آغا سلطان علی صاحب کربلائی
۲۵۔ جناب سردار کشن سنگھ صاحب شفق
۲۶۔ جناب مولوی عبدالرؤف خان صاحب رافت بھوپالی، ایڈیٹر پیسہ اخبار
۲۷۔ جناب فقیر سید افتخار الدین صاحب
۲۸۔ جناب خلیفہ نظام الدین صاحب
۲۹۔ جناب حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، سیکرٹری
۳۰۔ جناب منشی احمد حسین خان احمد صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری

اس بزم مشاعرہ کی اہمیت صرف اسی امر سے ظاہر ہے کہ اس میں جناب امیر احمد صاحب امیر استاد، جناب نواب صاحب بہادر والی ریاست رامپور، جو اس زمانے میں لاہور تشریف لائے ہوئے تھے، صرف شرکت کی غرض سے ... بلکہ مصرعہ طرح پر ایک غزل لکھ کر خود پڑھی۔ اس بزم مشاعرہ کا ذکر ہے اقبال مدعو ہو کر اس کے ... اس مشاعرے میں اقبال نے جو ... سب سے پہلے اپنی غزل پڑھی۔ غور طلب کہ وہ ماہ ... دسمبر ۱۸۹۵ء میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے۔

• جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال

تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی •

اس غزل کے مقطع میں انھوں نے خود داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

جب تک میرے والد زندہ رہے شعر و شاعری کے یہ ہنگامے بھی جاری رہے اور "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔ میرے والد حکیم شجاع الدین اپنے زمانے کے بلند پایہ شعرا میں سے تھے۔ "داغِ جوانی" کے نام سے ان کی غزلیات کا دیوان اور "عزیز ہند" کے نام سے ان کے لکھے ہوئے مرثیوں کا مجموعہ ان کی ادبی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ انھوں نے طب کے علمی اور عملی پہلوؤں پر بہت سی کتابیں لکھیں جن سے اس زمانے کے طبیبوں نے بہت فیض پایا۔ ان کی وفات کے بعد میرے بھائی حکیم امین الدین اور میرے دوسرے بھائی حکیم شہباز دین نے اس بزمِ مشاعرہ کو جاری رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی۔ اور جذبِ صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزمِ مشاعرہ میں شرکت کرنے اور ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی سب ہر روز شام کے وقت حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ اربابِ علم و ادب کی دید کے مشتاق دور دور سے آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ فیض کرتے۔ اس مجلس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ حکیم شہباز دین ایک بہت ہی لائق اور شریف انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایک بیدار دل تھا۔ سخاوت اور فیاضی ان کی فطرت تھی۔ وہ جو کچھ کماتے اپنے احباب کی خاطر مدارات پر صرف کر دیتے۔ ان کی زبان کی شیرینی، ان کی منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کی نشست گاہ کو علم و ادب کے درخشاں ستاروں کا آسمان بنا دیا۔

حکیم امین الدین اپنے زمانے میں نہ صرف ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے بلکہ اپنے اس علم و فضل کی بنا پر جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا امتیازی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی ذکاوت اور ذہانت اس زمانے میں مشہور تھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں جب وہ تقریر کرنے کے لیے اٹھتے تو ان کی تقریر کو سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے۔ اور مسلمانوں کی عظمتِ گزشتہ کے تاریخی واقعات کے آئینے میں اپنی آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل کی جھلک دیکھ کر اپنے دل میں ایک نئی زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگتے۔ ان کی تقریر میں جوش اور جذبہ اثر تھا اور ان کی عبارت میں ان کی وسعتِ نظر کا عکس۔ ان کے تبحرِ علمی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے کتب خانے میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی سینکڑوں ایسی کتابیں موجود تھیں جن پر ان کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی ان کی معلومات کی وسعت اور ان کی تنقید کی گہرائی کی دلیلِ روشن تھے۔ انھوں نے قانون پر کئی کتابیں لکھیں۔ اور اسلامی تاریخ پر بہت سے مضامین تحریر کیے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ حضور سرورِ کائنات صلعم کی زندگی کے واقعات اور سیرت کی مکمل تدوین ہے جو زمانے کے ہاتھوں سے چرکے کھانے کے باعث افسوس ہے کہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اور وہ اس آرزو کو دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان مجلسوں کا ذکر ہو رہا ہے ان کی رونق حکیم امین الدین ہی کے دم قدم سے تھی۔ جب وہ نہ رہے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان

مضمون کے ساتھ بھی عکس تحریر سے پیدا کر گئی ہے

لاہور غیر مطبوعہ کے مشہور رسالے "مخزن" کا ذکر کیا جا چکا ہے اس کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب سر عبدالقادر (ہائی کورٹ) کی ملازمت کے مشاغل کے باعث اس رسالے کی ادارت اور اشاعت کے لیے وقت نہ نکال سکے تو انھوں نے یہ کام اپنے ایک عزیز دوست شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی اس رسالے کو اندر کھاتوں سے شائع کرتے رہے۔ یہ وہی شیخ محمد اکرام ہیں جنھوں نے بعد میں "بہار عصمت" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس نے نسوانی جرائد میں بڑا نام پایا۔ "مخزن" کے سامنے شیخ محمد اکرام کے دل پر چھا جانے کے باعث کئی دوسرے [illegible]۔ ایک زمانے میں [illegible] احمد اس کے [illegible] بنے۔ پھر جب انھوں نے اس سے قطع تعلق کیا تو یہ رسالہ ایک مدت تک [illegible] کی ادارت سے مستفیض رہا۔ جب تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا اس کا اہتمام اشاعت بھاٹی دروازے کے کسی مکان میں رہا۔ اور جب تک سر عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، مولانا احمد اور مولانا [illegible] اس کے ساتھ متعلق رہے وہ بھاٹی دروازے کے [illegible] رہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ [illegible] بازار کے اس کنارے پر جہاں یہ بازار ایک طرف اندرون شہر کو اور دوسری طرف چوک کی طرف جاتا ہے، حکیم فقیر محمد رہتے تھے۔ حکیم فقیر محمد ۱۹۰۹ء میں دلی کے حکیم اجمل خاں سے طبابت کی سند حاصل کر کے لاہور آئے تھے۔ وہ پنجاب کے ایک ایسے علاقے کے رہنے والے تھے [illegible] مگر وہ زبان پر کچھ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ میں نے انھیں کبھی اردو کے سوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سنا۔ فن طبابت میں انھیں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ دور دور سے [illegible] حکیم محمد اجمل خاں بھی ان کی ذکاوت تشخیص اور طریقۂ علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خطاطی میں انھیں وہ کمال حاصل تھا کہ [illegible] ان کے نسخوں کی نستعلیق تحریر پڑھ کر [illegible] وابستہ ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے ڈاکٹر عبدالمجید پروین رقم کو جو اس زمانے کے ایک صاحب کمال خطاط تھے اور [illegible] پروین رقم کے لقب سے مشہور ہوئے اور جن کو اقبال نے اپنی تصنیفات کی کتابت کے لیے منتخب کیا، خطاطی کے نکات اور مفرد حروف کے تناسب کی نشست کے بارے میں حکیم فقیر محمد سے مشورہ کرتے دیکھا۔ عبدالمجید پروین رقم کے بیٹے محمد عطا جو اپنے نامور باپ کی نسبت سے اپنے آپ کو [illegible] پروین رقم کے نام سے منسوب کرتے ہیں ایک صاحب کمال خطاط ہیں۔ جب اقبال نے [illegible] حضرت [illegible] کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے دیکھے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی زبان سے [illegible] فرمایا "خوش نویسی خوب است"۔ حکیم فقیر محمد کو مصوری میں بھی درجۂ اتم مہارت حاصل تھی۔ بڑے خوش [illegible] تھے [illegible]۔ مریض [illegible] کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے مرض سے شفا پا کر [illegible] کے گرویدہ اور احسان مند ہو جاتے تھے۔ [illegible] کا اس قدر پاس تھا کہ اپنی تحریر اور تقریر کو مناسب اور نامناسب کی تمیز سے کبھی آزاد نہ ہونے دیتے تھے۔ [illegible] فارسی نظموں میں اقبال کی پہلی کتاب "اسرار خودی" انھیں کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ [illegible] ایک ایسے [illegible] سے دوچار ہو گیا جس کا [illegible] اس زمانے میں [illegible]

تو مبتلا ہونا نہیں آتا ہے۔

شریف خانہ قائم کر کے انھوں نے طبابت یونانی کی وہ کمی پوری کر دی۔ جس کے باعث یونانی اطبا کے تجویز کیے ہوئے نسخے دواؤں کی تیاری تازہ اور کثیر سے محروم تھے۔ ہر دوا اس کے نام اور وزن کے مطابق اور ہر مرکب اس کے اجزائے ترکیبی کے تناسب کے ساتھ اگر کہیں مل سکتے تھے تو اسی دواخانے سے۔ یہ دواخانہ ان کے مکان کی نچلی منزل میں اس طرف کو واقع تھا جو رستہ ... کو جاتا ہے۔ مگر یہ دواخانہ بھی اپنے بانی کے ساتھ معدوم ہو گیا۔

اس دواخانے کے سامنے ایک کنواں تھا جس کی منڈیر پر رائے بہادر سانجھی مل بدھوے سے نکلے ایک دھوتی باندھے بیٹھے رہتے تھے اور ہر تشنہ لب کو اپنے ہاتھ سے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پلاتے تھے۔ یہ کنواں اپنے آب سرد کے باعث شہر بھر میں مشہور تھا۔ رائے بہادر سانجھی مل پنجاب یونیورسٹی کے ان گریجوایٹوں میں سے تھے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے بعد سب سے پہلے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد یہ پروونشل سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ اور پنشن پانے کے بعد اپنے آپ کو تمام دنیاوی تعلقات سے منقطع کر کے تیاگ دھرم دھار بیٹھے۔ اور اپنا آخری زمانہ پیاسوں کو ٹھنڈا پانی اور بھوکوں کو اپنی توفیق کے مطابق کھانا کھلانے میں صرف کر دیا۔ بچوں کو بہت پیار کرتے تھے اور ہر راہ چلتے مسافر کو ذرا سی دیر کے لیے روک کر اپنی میٹھی باتوں سے اس کا دل خوش کر دیا کرتے تھے۔ رئیسوں کے محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور بڑے بڑے امرا بھی انھیں جھک کر سلام کرتے تھے

ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آغا حشر بھی بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ جب وہ اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور آتے تھے تو بھاٹی دروازے کے باہر اس مکان میں رہتے تھے جو برکت علی اینڈ سنز کی عمارت سے ملحق تھا جس میں ان کی کمپنی کے کھیل دکھائے جاتے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کی بیماری کے سلسلے میں لاہور آئے تو پہلے بھاٹی دروازے کے اندر ہی کسی غریب خانے ہی میں رہے اور اس کے بعد نگ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہنے لگے۔ اور پھر جب دوبارہ فلم کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے لاہور آئے تو اس زمانے میں بھی کچھ عرصے تک اسی مکان میں رہے۔ اس کے بعد وہ میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں رہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حکیم صاحب کی زندگی کا زیادہ تر حصہ بھاٹی دروازے میں گزرا۔ جب بھی ان کا قیام لاہور میں ہوا ان کو ڈرامہ نویسی سے کبھی ایسی فرصت نہ ملی کہ وہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں کچھ زیادہ حصہ لے سکتے۔ ان ڈراموں میں جو انھوں نے لاہور میں رہ کر لکھے سفید خون، خواب ہستی اور آنکھ کا نشہ قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ نگ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان میں ایک شہ نشین تھی جس کے دروازے ایک گلی کی طرف کھلتے تھے۔ اس میں ایک بخاریہ تھا۔ جس میں ایک بجلی کی انگیٹھی رکھی رہتی تھی۔ حشر صاحب کا بیشتر وقت اسی بخاریے پر گزرتا تھا۔ ان کی نشست کا سامان بہت مختصر ہوتا تھا۔ ایک پنسل اور کچھ سادہ کاغذ۔ اس زمانے میں ان کے دوستوں میں سے حکیم فقیر محمد اور ... صحبت سے مسرت حاصل کرتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کی ... پریشانی کے باعث ان کی ڈرامہ نگاری کے کام میں ایسے زمانے بھی ... جب ... ان کی ... تھی جو ... کے دوران ... رہتے تھے۔ ... جب

ہم نے ان کی رفیقۂ حیات کو سپردِ خاک کیا تو آغا حشر بت بنے بیگم کی قبر کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر اپنی چھڑی سے قبر کے سامنے زمین پر ایک مستطیل کا خاکہ کھینچا اور کہا یہ حشر کی قبر ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں آگاہ ان پر جبری کمپنی کا حشر بہت زیادہ بیمار ہو، علاج کے لیے لاہور آنے پر حکیم نیّر لہر کے مطب و معالجہ پنجاب کی آب و ہوا اور ایک منظوم کی گرم جوشی کی بدولت ان کی صحت بہت جلد بحال ہو گئی۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی "حشر پکچرز" قائم کی تب سے جب وہ اس سرگرمی و تندہی سے کام کرنے لگے کہ میں نے جنہیں ان کی جوانی کے زمانے میں بھی اس طرح کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور طاقت کا تمام باقی اندوختہ سرمایہ ہو چکا۔ ایک مدت تک ان کی زندگی کا تیل ہوتا رہا، یک بیک بھڑکا اور ایک پل بھر میں ختم ہو کر رہ گیا۔ وفات سے دو روز پہلے یہ شعر کہا:

گر چکا ہوش طاقت پہ ہے زور سب
حشر اب صحت میری گرتی ہوئی دیوار ہے

حشر ایک رفتہ و آفتاب کی صورت اُفقِ ہند پر چمکا اور ایک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی آب و تابی کو اپنے ساتھ لے کر گم ہو گیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو یہ سرمایہ دار سحر آفرین اور ہنگامہ آرا لاہور کے عیش و نشاط اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حشر لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں اسی مستطیل میں دفن ہیں جس کا خاکہ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں اپنی بیوی کی قبر سے پیوستہ کھینچا تھا۔ یہ ان کی پیش گوئی تھی یا حشر کے خواب کی تعبیر۔ بہر حال یہ سعادت بھی بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی کہ حشر کی زندگی کا ایک اہم حصہ اس کے جوار میں گزرا۔ اور اسی جوار کی خاکِ پاک میں ان کو ابدی راحت ملی۔

آغا حشر نے اردو اور ہندی میں بے شمار ڈرامے لکھے جو ہمیشہ مقبول ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو انڈین شیکسپیئر کہا کرتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ لقب ان کی ندرتِ تخیل اور ان کے اسلوبِ نگارش کو بہت راس آیا۔

چونکہ ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں پچھلے ساٹھ ستر برس کے عرصے سے بہت دور جا کر فقیر سید عزیز الدین اور بھائی فقیر سید نور الدین کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اور بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ ان کا ذکر بھی کر دیا جائے اور اس معزز خاندان کی عظمت کا کچھ سرسری سا بیان ہو جائے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے۔

بھاٹی دروازے کے اندر اونچی سڑک کے قریب سے شروع ہو کر چوک تحصیل تک ایک بازار ہے جسے بازار حکیماں کہتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کی بنیاد میرے جدِ امجد حکیم عبد اللہ انصاری نے اس زمانے میں ڈالی تھی جب وہ قاضی القضاۃ بندہ اور سید پور کشمیر تھے۔ جن حالی قدر علاوہ ان کے علاوہ وہ بہت عجیب طبیب تھے۔ ان کے بھائی حکیم خدا بخش بھی جو نواب محمد زکریا خاں صوبیدار لاہور کے عہد میں وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ اور ملک الاطبا کے خطاب اور فرزند خانی سے سرفراز تھے۔ بہت بڑے طبیب اور اپنے فنون اور جود و سخا کے باعث مرجعِ خلائق تھے۔ قصبہ چونیاں کے ایک بزرگ سید شاہ غلام کے بیٹے سید غلام محی الدین کی شادی حکیم خدا بخش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ان کے تین بیٹے تھے۔ فقیر عزیز الدین، [illegible]

۱۸۴۵ء)، فقیر امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) اور فقیر نور الدین (متوفی ۱۸۵۲ء)۔ فقیر عزیز الدین کے دُوسرے بیٹوں کے علاوہ فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ فقیر سید شمس الدین کے بیٹے فقیر سید شہاب الدین تھے۔ اور اُن کے بیٹے فقیر سید وحید الدین کے علاوہ سید نجم الدین تھے۔ چونکہ سید غلام محی الدین کو فقر سے رغبت تھی اور خود بھی ایک رُوحانی پیشوا کی حیثیت سے صاحب رشد و ہدایت تھے۔ انھوں نے فقیر کا لقب اختیار کیا اور ان کی اولاد نے بھی اسی لقب کو اپنا سرمایۂ افتخار و امتیاز کہا۔

فقیر سید عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وزارت امور خارجہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پنجاب کی کسی تاریخ پر بھی نظر ڈالیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ خالصہ دربار میں جو عزت فقیر سید عزیز الدین کو حاصل تھی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ صاحب علم بھی تھے اور صاحب سیف بھی۔ ان کی دانشمندی اور حاضر جوابی کے تذکرے زبان زد خلائق ہیں۔ یہ جگہ ان کے سیاسی کارناموں کی تفصیل کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ فقط اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس بحران کے زمانے میں خالصہ حکومت اور برطانوی ارباب حل و عقد کے مابین جو خط و کتابت یا گفت و شنید ہوتی تھی فقیر سید عزیز الدین ہی کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اور ان دونوں حکومتوں کے مابین جو تحریری معاہدہ ہُوا وہ "عزیز الدین شکاف تحریر" ہی کہلاتا ہے۔ فقیر سید عزیز الدین نثر اور نظم دونوں میں مشّاق اور اپنے زمانے کے بڑے بلند پایہ ادیب اور طبیب تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کی نظم کا مجموعہ "دیوانِ آزاد" اب تک پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

فقیر سید نور الدین اپنے بھائی فقیر سید عزیز الدین کی طرح خالصہ دربار میں بڑے مراتب عالی پر فائز رہے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ جالندھر کے صُوبیدار مقرر ہوئے اور اس کے بعد سیالکوٹ اور وزیر آباد کے پرگنوں کے عامل کی حیثیت سے اُنھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح صاحب قلم اور صاحب سیف تھے۔ اور نہ صرف سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ممد و معاون رہے بلکہ اپنی سپہ گری کی صلاحیتوں کی بدولت بھی اُنھوں نے بڑا نام پایا۔ شاہ شجاع الملک والیِ افغانستان جب اپنے وطن اور تخت کو چھوڑ کر لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مہمان ہوئے تو فقیر سید نور الدین ہی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ "کوہِ نور" جیسے مشہور زمانہ اور بے مثال ہیرے سے دستبردار ہو جائیں اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہ شجاع الملک کی من مانی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر رضامند کر کے یہ ہیرا حاصل کیا۔ اور اسے ان کی کلغی کی زینت بنایا۔ اس نادر واقعہ کی روئیداد فقیر سید نور الدین کے قلم سے فارسی زبان میں لکھی ہوئی اب تک محفوظ ہے۔ یہ شاعر بھی تھے اور منور تخلص کرتے تھے۔ "دیوانِ منور" کا قلمی نسخہ اب بھی ان کے خاندان میں موجود ہے۔

فقیر سید غلام محی الدین کے تیسرے بیٹے میرے پڑدادا فقیر سید امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) عمر میں فقیر سید عزیز الدین سے چھوٹے اور فقیر سید نور الدین سے بڑے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امرتسر میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار تھے اور شاہی خزانے کے محافظ۔ خالصہ فوج کا تمام اسلحہ بھی انھیں کی تحویل میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دربار کا سارا کاروبار انھیں تینوں نامور بھائیوں کی ہمّت افزائی سے انجام پاتا تھا۔

فقیر سید نور الدین کے ایک بیٹے فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۰ء) تھے۔ یہ بھی بہت بڑے طبیب تھے۔ یہ بڑے سے بیمار

اور ماہر علم و فراست تھے۔ انھوں نے خاصا عرصہ گزرنے میں ہی اور اس کے بعد جب پنجاب میں انگریزی تسلط ہوا تو اس
سلسلے میں بھی اپنے علم و فضل اور بے مثال ذہانت کی بدولت نام پایا۔ ۱۸۷۲ء کے سلسلے میں ان کی کارگزاریاں ان کے لئے عجیب
لائق محبت کا کام کر گئیں اپنے ذاتی مذاق کے سبب دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے خاندان میں علم
کے ساتھ شعر و ادب میں کتب علم کا شوق پیدا کیا تھا۔ اور اس مقصد کے پیش نظر انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اور پھر پرانی روایات کو
اس نے حق [illegible] کہ کر رئیسوں کی تعلیم کے لیے جانے کے [illegible] سے سبکدوش کیا۔ انگریزی عہد میں یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے
اور میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی۔ اردو فارسی میں بہت اچھا شعر کہتے تھے اور شمس تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں فقیر سید
[illegible] الدین، فقیر سید [illegible] اور فقیر سید شہاب الدین کو زیادہ تر علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ۱۸۷۹ء میں
فقیر سید [illegible] الدین بہادر فقیر سید [illegible] صاحب نے وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور پھر یہ دونوں بھائی
مدت تک پنجاب کی [illegible] عہدوں پر فائز رہے۔ فقیر سید شمس الدین کے تیسرے بیٹے فقیر سید شہاب الدین
پہلے تحصیلدار بنے اور پھر اپنے علم و فضل کی بدولت ضلع [illegible] کے مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ یہ میرے والد کے بڑے
بھائی حکیم [illegible] تھے۔ اور اس رشتے میں میرے بھائی ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی زبانوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے
انھوں نے حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے
علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اپنے معزز خاندان کی روایات کے پابند تھے اور نہایت شرافت کی زندہ تصویر۔ سردی کے موسم میں
سبز رنگ کی [illegible] کا جامہ پہنتے تھے اور اسی رنگ کی [illegible] باندھتے تھے۔ اپنے دونوں والد بھائیوں کی وفات کے بعد جب اپنے
علاقے [illegible] تحصیل میں [illegible] کے قریب واقع تھی۔ اور نو سو ایکڑ زمین پر مشتمل [illegible] میں پانی [illegible] سے سبکدوش
ہوگئے۔ [illegible] ہر شام حکیم [illegible] کی بیٹھک میں آکر بیٹھتے [illegible]۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں انتقال
کیا۔ ان کے بیٹے فقیر سید [illegible] اس سے پہلے سرکاری ملازمت سے منسلک تھے [illegible] کی
[illegible] کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ فقیر سید [illegible] رشتے میں میرے بھتیجے بھی تھے اور بھانجے بھی۔ اپنے ماموں
حکیم [illegible] کی صحبت میں رہنے کے باعث انھیں [illegible] تاریخ سے عموماً اور [illegible] کی تاریخ سے خصوصاً دلچسپی ہوگئی تھی [illegible]
[illegible] انھوں نے ان مضامین پر بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آخر کار وہ سید امیر علی کی ان دو کتابوں "سپرٹ آف اسلام" اور
"ہسٹری آف [illegible] سیرسینس" کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ان کا اردو ترجمہ کیا۔ میں نے ان کا ترجمہ دیکھا ہے۔ اور ترجمے کے مسودات
بھی دیکھے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بڑی کامیاب تھی۔ مگر افسوس کہ ان کی دوسری مصروفیتوں کے باعث یہ دونوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ
نہ ہوئیں۔ ان کی ناگہانی وفات کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ ان کے اپنے [illegible] قیمتی کتب خانے کی نادر کتابوں کے ساتھ یہ مسودات
بھی ضائع ہوگئے۔ یہ ایک ایسا صدمہ ہے جس کا [illegible] ہے۔ فقیر سید [illegible] کو موسیقی اور شاعری سے بھی بڑا
شغف تھا۔ [illegible] کا اثر ایسا چھایا تھا کہ [illegible] کے اشعار گنگناتے رہتے۔ اقبال [illegible]
[illegible] سے گفتگو [illegible]۔ اس وقت [illegible] ایک عجیب کیفیت کا عالم طاری رہتا۔ ان کے بیٹوں میں سے فقیر سید وحید الدین

نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں ملازمت اختیار کی۔ اور ترقی کرتے کرتے کرنل کے بلند رتبہ عہدے تک پہنچ گئے تقسیم ہند کے بعد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کسی نے تجارت کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ مگر فقیر وحید الدین کی ذاتی صلاحیتیں ان کے بڑے کام آئیں، اور انھوں نے کئی تجارتی ادارے قائم کیے جو ان کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئے۔ لیکن وہ بہت جلد ہی اپنے تجارتی کاروبار کو اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اچھی کتابیں پڑھنے والوں کے دل پر اپنے انداز فکر کی ندرت اور اسلوب نگارش کی دل آویزی کا سکہ بٹھا دیا۔ اقبال کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "روزگار فقیر" کی دو جلدوں میں اس خوبی و خوش اسلوبی سے قلمبند کیے اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حضور سرور کائنات صلعم اور اصحاب کبار کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "محسن اعظم و محسنین" میں ایسی سلیس عبارت اور ایسے عام پسند زاویۂ نگاہ سے لکھے کہ اب اس کتاب کا انگریزی اور سندھی میں بھی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ آج کل ان کے وقت کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ انھوں نے اس مصروفیت سے اپنے بزرگوں کی روایات تصنیف و تالیف کو قائم رکھا ہے۔ اور یہ زمانے نے جب قحط الرجال کے باعث ان کے نامور خاندان کی عظمت کے نشان معدوم ہو چلے تھے انھیں اپنی محنت، شفقت اور فطری صلاحیتوں سے از سر نو پہلی آب و تاب سے روشن کیا ہے۔ اس خاندان کے سب بزرگ جن کا میں نے ذکر کیا ہے بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں میں بستے تھے اور اس بازار کی وجہ شہرت یہی ہے کہ یہاں ان کا مسکن رہی ہے انھی بزرگوں کی روحانیت، صفات اور ادبی دنیا زندگی کے باعث بنی رہی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ فقیر سید اعجاز الدین کے پوتے سید منیر الدین اب بھی اپنے بزرگوں کی حویلی کے اس حصے میں رہتے ہیں جس کا پھاٹک بازار حکیماں میں کھلتا ہے اور انھوں نے اس حویلی کی دو منزلوں کو اپنے بزرگوں کے تبرکات اور زمانہ قدیم کے عجائبات سے آراستہ کر کے حقیقی معنوں میں ایک خزینہ بنا رکھا ہے۔

میں نے اوپر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ سرسری سا ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس سلسلے میں کہ وہ بھاٹی دروازے کے اندر قدم حکیماں کے سامنے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اور پھر اس سلسلے میں کہ وہ ایک وقت تک اس مشغلہ علم و ادب کی رونق بنے رہے جو ہر شام بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ میں نے دانستہ ان کا ذکر اس قدر تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت کا سکہ اب دنیائے علم و ادب پر اس قدر بیٹھ چکا ہے اور ان کی زندگی کے حالات اور ان کے فکر و ذکر پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کا اعادہ محض تکرار بیان ہے۔ تاہم بھاٹی دروازے کی سب سے بڑی شخصیت جس کی ذات گرامی سے وابستہ ہے اس کا مختصر سا ذکر بھاٹی دروازے سے نسبت سے کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اقبال کو اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ ابہام سا تھا۔ جب وہ ایک طویل بیماری کے باعث صاحب فراش ہو گئے اور اس وقت ان کا یہ اندازہ تھا کہ ان کی عمر ۶۰ برس سے تجاوز کر چکی ہے تو ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب میں زیادہ دیر تک زندہ رہنا نہیں چاہتا مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری عمر ۶۳ برس سے زیادہ نہ ہو جائے کیونکہ حضور سرور کائنات صلعم کی عمر جہاں تک یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے ۶۳ برس کی تھی۔ یہ کہتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور انھوں نے اپنی دعا میں اور پھر جو دعا

در تماشای شرر ما — مغز مشتِ خاک ما است او
در جہاں ہم پردہ دار است او

پر اس کی اصل مجلد تھی۔ ڈاکٹر سید ... صاحب ... کتاب "ذکرِ اقبال" میں اس کی صحت ... مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر بوقت وفات ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا انضباط ... کے جسٹس شیخ عبدالقادر کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہو تو اقبال کی ... ۱۸۹۳ء میں ... ہو جانے کی ... ڈاکٹر ... سید ... نے اپنی کتاب ... میں ... تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے اور ... اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی ... ۱۸۹۳ء ... برس کی عمر سے پہلے پاس کر لیتے۔

محمد شفیع ... کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں ... سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ... اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ ۱۸۹۵ء میں وہ لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ ... کا مجموعہ ... ۱۸۹۵ء ... جو بازار حکیماں میں منعقد ہوا۔ ... اپنے بھائی حکیم ... اقبال کا آغاز ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں ... پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کوارڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس مکان میں جو ... کے سامنے ... کے اوپر واقع ہے رہنے لگے تھے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

یہ اسی طرح پایا ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "تصویر درد" لکھی تو سب سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ وہ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تھے تو جلسہ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" لاہور سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی نظم "ہمالہ" جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں اس زمانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اُٹھ کر سرکلر روڈ پر جو آج کل اُردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے ایک چوبی لال بنگلے کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہرالدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے اواخر اکتوبر میں انارکلی میں وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس انتقال مکان سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو جونہی اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں نے اوپر لکھا ہے ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور ان میں "اسرار خودی" کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دل کش اور پُرسوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی انجمن بکھری اور ادھر اقبال انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اُٹھ گئے۔ اور ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی، کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے زرافشاں میں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمد و رفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی۔ الفقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر ہر دو انھیں اپنے مکان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دریا پار [illegible] پسند رنگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانانِ عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر اپنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالم اسلام کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کی جھلک ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر نیا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

ہمارا پایۂ شعر پر ماست — روز محشر اعتبار ماست او
در جہاں ہم پردہ دار ماست او

پر اس کی آمد بند ہو گئی۔ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب "ذکر اقبال" میں ان کی ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۹ھ لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً سر شیخ عبدالقادر کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی [illegible] ۱۸۹۳ء میں [illegible] چاہیے تھی۔ لیکن فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب "روزگار فقیر" میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آمد و رفت [illegible] ۱۸۹۵ء [illegible] پہلے [illegible] ہو گئے۔

فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شورش کاشمیری نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء [illegible] سے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں منعقد ہوا۔ مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین سے زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مکان پر اقبال کا آنا جانا ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کر چکے تو اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس مکان میں جو [illegible] کے سامنے [illegible] دکان کے اوپر واقع ہے رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام مدت میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "نالۂ یتیم" لکھی تو پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تو جلسۂ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی نظم "ہمالہ" جو شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں وہ زمانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے نکل کر موہن لال روڈ پر جو آج کل اردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہر الدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی میں وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس نقل مکان سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو بلاناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں نے اوپر لکھا ہے ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور ان میں اسرار خودی کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم حکیم نظام الدین کو جن کی آواز بہت دلکش اور پرسوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اجڑی ادھر اقبال اسی برس انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اٹھ گئے۔ اور وہاں کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی۔ کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے [illegible] میں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمد و رفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل کے بیٹے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اور فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر انھیں مکان والی حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دنیا پر اپنے پسند رنگ شعر اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانان عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب اپنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالم اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کا اظہار ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

بیدار، درد و سوز تھا کہ سننے والے بھی بے کل ہو جاتے اور شدت جذبات کی تاب نہ لا سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر سب بے تاب ہو جاتے۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبول خاص و عام ہو چکی تھی۔ اور ان کا نام ایک دیا حسن بن گیا تھا جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہو جاتا یا شائع ہوتا لوگ اس کے مطالعے سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگتے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب اقبال کا انداز نظر اور طرز بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر چھا گیا اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا جادو ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے نادیدہ نظروں سے اسلام کے مستقبل کو اسی آئینے میں دیکھنے لگے تھے۔ اور ہر ایک کا یہ عالم تھا کہ ان کی تصنیفات کو حرز جاں بنا کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کی تعیین کر دی جائے کیونکہ اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئیں اور ان کی شاعری کے دور ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں، "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیام مشرق" ۱۹۲۳ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی دوسری کتابیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں "بال جبریل" ۱۹۳۵ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ۱۹۳۶ء میں "ضرب کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغان حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ جو شب تار اسلامی کے شدید دور میں وہ ہندوستان کے بسنے والوں کی آنکھوں پہ دبیز پردہ پڑا ہوا تھا جو مغربی تعلیم اور تہذیب نے ان پر ڈال رکھا تھا۔ لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جہان کے افق پر درخشاں ستاروں کی طرح ابھر کر ایک نئی حیات زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر حباب کی طرح بظاہر استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیش نظر اس جگہ شاعر مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عدیم المثال جوہر فکر و نظر پر افسوس کہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ——

دہر ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبال وہ مرد حق تھا جو قرنہا قرن کے بعد پیدا ہوا اور اب شاید دہر ہا دور گزر جائیں تو بھی گیتی ایسا مرد حق پیدا نہ کر سکے گی۔ اور گو شبلی و بہار اس نہاں خانۂ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی چلی جائے مگر وہ زمانے بعد پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کو ایک حیات نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

اقبال نے اپنی علالت کے زمانے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رباعی کہی تھی ——

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس شعر میں غالباً یہ اشارہ تھا کہ اقبال کے ذہن میں اس مسئلہ کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کبھی زمانے میں پردۂ غیب سے پھر سرآمد روزگار کوئی دانائے راز پیدا ہو جائے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور جو فطرت کے اس رازداں کی قدر و منزلت سے خوب واقف ہوں انہیں کے ایک شعر پر ان کی عظمت کی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں —

خفا اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مقصد بیان تعلّی نہیں مگر جب بھائی صاحب اور دوسروں کے بلند پایہ [illegible] کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان خود نمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک قطرہ اور انہیں دانائے رازِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوش قسمتی سے مجھے نصیب ہوئی۔

میں نے ابتدا میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی۔ یہ مدرسہ اس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا۔ محکمہ پنجاب کے سررشتۂ تعلیم نے اس بات کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید المثال اور طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں۔ مولوی سید محمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت بھگوت دت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی حبیب اللہ خان، اور مسٹر [illegible] جہاں تعلیم و تعلم میں سخت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلباء میں ہر دلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب الاحترام تھے۔ یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہستیوں کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم و فنون رہا جو کہ اپنے کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے۔ رائے بہادر [illegible] رائے بہادر [illegible] مسٹر [illegible] مسٹر [illegible] اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر [illegible] وہ شفیق استاد تھے جنہوں نے طلبا کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشو و نما کی تربیت انہیں اساتذہ کے دامنِ عاطفت میں ہوئی۔

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر جتنا بھی فخر کروں بجا ہے۔ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد جن دنوں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحرِ مواج ہے جو [illegible] اور حکمت و دانش کا ایک [illegible] ہے۔ ہم تشنہ کام طلبہ نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود [illegible] اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور اس علم و دانش کے بہتے ہوئے دریا سے جتنے بہرہ مند ہو سکتے تھے اس سے بہرہ ور ہو گیا۔

[illegible] سازی کو عام کرنے میں میں نے [illegible] میں اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ [illegible]
ہے۔ اور مکتبہ [illegible] کی اشاعت [illegible] ۱۹۲۱ء [illegible]
[illegible]
[illegible] حکیم [illegible]
پیدا ہو گیا۔ اور میں نے [illegible] اپنے مستقبل [illegible]
باقی نہیں۔ مگر [illegible] کی خدمت کے لیے [illegible]۔ اس وقت [illegible]
اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے [illegible] کا اندیشہ ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے
۱۹۲۰ء میں [illegible] اقبال کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقش قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ
ادبی رسالہ "خیال" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے [illegible] کا ایک ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں
رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گیا تو میں نے ان رسالوں
کی ادارت اپنے [illegible] سید عابد علی عابد [illegible]
اور ادبی حلقوں میں [illegible]
جب لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ دونوں رسالے بند ہو گئے۔

میں نے [illegible]
[illegible]
میں حضرت شاہ رفیع الدین [illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible] زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس
کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیر طبع ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اقبال کی تاریخ ولادت [illegible]
[illegible] سید وحید الدین کی بے مثال کتاب "روزگار فقیر" [illegible]

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ [illegible]

حدیث بود و حکایت دراز تر گفتم

کھلونے

(ناولٹ)

مسعود مفتی

کھلونے

مسعود مفتی

عبدالرحمٰن نے دونوں کہنیاں جوڑ کر رکھیں اور ان پر ٹھوڑی ٹکا کر کھڑکی کے شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

چھوٹا سا کمرہ ——— درمیان میں بڑی سی میز ——— میز کے دو طرف کناروں سے پرے ایک شکنجہ ——— قد آدم سے کنارے سے اوپر چھت سے بندھی ہوئی رسیاں لٹکتی ہوئی تھیں ——— میز پر ایک مرد بنیان اور دھوتی پہنے لیٹا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں شکنجے میں کسے تھے اور دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسیوں سے بندھے تھے ——— مگر کان تک کھنچی بنیان کا نچلا سرا اور جسم سارا میز پر بچھا تھا ——— دھوتی سمٹ سمٹ کر رانوں کے گرد اکٹھی ہوئی تھی اور ننگی ٹانگوں پر شکنجے کے دباؤ کی وجہ سے رگیں ابھر آئی تھیں۔

عبدالرحمٰن کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ شیشے پر ٹکا دیا اور ایک آنکھ میچ کر دیکھنے لگا۔

میز کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار ہاتھ میں چمڑے کا فیتہ پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے [illegible] اور جسم کا ہر رواں رواں پھٹ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے نظر آئے ——— میز پر لیٹے ہوئے آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے تھانیدار کو دیکھا، ادھر ادھر دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

تھانیدار نے سٹ سے فیتہ لہرا کر جھٹکا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہی کو اشارہ دیا۔ سپاہی نے ٹول پیٹی کو اٹھا کر جھٹکا دیا اور شیشے سا ایک باریک تار اٹھا کر میز پر لیٹے ہوئے مرد کے دو دو چپت لگا۔

وہ مرد تڑپ تڑپ کر اپنے پیروں کو لہرانے لگا۔ اس کی آواز بند کھڑکیوں میں سے بھی باہر آنے لگی۔

ابھی چند لمحے پیشتر عبدالرحمٰن نے یہ چیخیں سنی تھیں اور چلتے چلتے گلی میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے شک گزرا کہ کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر کھڑکی دیکھ کر اس کے شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا تھا۔ اب جو اس نے یہ نظارہ دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں زمین پر رکھ دیں۔ ناک کو ایک دفعہ سہلایا اور پھر سے چہرہ شیشے پر دبا دیا۔ تک پچھلے سے اس نے بڑی مشکل سے ایک چیخ روکی۔

بیٹھنے والا مرد بس زور سے اب نے کر رہا تھا اور سپاہی اس کو تڑاتڑ چپت مار رہا تھا۔ مرد کی ہر چیخ کے ساتھ عبدالرحمٰن کا دل سن ہونے لگتا۔ جب مرد کے جسم پر چپت کی چوٹ لگتی تو سارا جسم اچھلتا۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسیاں جب تن جاتیں اور کھنچنے لگتیں تو عبدالرحمٰن کانپ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تھوڑی دیر میں اس کی ٹانگیں بھی ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ عبدالرحمان کی کمر پر پڑا۔

——— وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

ایک سپاہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے فائیلوں کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ڈپٹ کر بولا۔

"چل ہٹ پرے۔ آیا ہے ماں کا خصم تماشہ دیکھنے۔"

عبدالرحمان فائیلیں سنبھال لیں سہارا کر تھانے کی حد سے کافی دُور جا کر اُس نے سانس لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور خوف کے مارے ہر آتے موٹر یا سائیکل سے بھی دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ اِسی کوشش میں وہ کئی دفعہ دُوسرے راہگیروں سے بھی جا ٹکرایا۔ چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ پیٹھ سے ساری قمیص پسینے سے تر ہے۔ تب اُس نے فائیلیں دُوسرے ہاتھ میں پکڑ لیں اور فارغ ہاتھ مشکل سے کمر پیٹھ تک پیچھے لے گیا۔ دو تین انگلیوں کی چٹکی بھر قمیص کا ذرا سا پکڑا، پھر ذرا کھینچا تو قمیص کے پیٹھ سے الگ ہونے ... ساری پیٹھ پر ٹھنڈی ہوا ... اور اُسے سکون سا مل گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "توبہ، میری توبہ" اور وہ زیرِ لب کلمے پڑھنے لگا تاکہ خوف کچھ کم ہو۔

گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ بڑے زور سے بند کیا۔ اندر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے باہر؟"

مگر وہ جواب دیے بغیر گھبرایا ہوا سا آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چارپائی پر اُس کا تین سالہ بچہ سویا پڑا تھا۔ وہ بے تابی سے لپکا اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ایک دو دفعہ دیوانہ وار چوما اور پھر زیرِ لب کہا "توبہ میری توبہ۔"

بچہ نیند میں اچانک چونکنے پر رونے لگا تو عبدالرحمان اُسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ مگر وہ روتا گیا۔ اُس کے گلے کی ... بار بار تن جاتی۔ جو بے کل ہو کر ایک طرف کو ڈھلک جاتی۔ ادھ کھلی آنکھوں کی باریک درزوں میں پانی بھرنے لگا۔ جو کناروں سے ڈھلک کر گالوں سے بہتا ہوا گردن تر کرنے لگا۔

"اسے کیا تماشہ کھڑا کر دیا آتے ہی؟"

بیوی کی آواز پر سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھری تھی اور دوسرے میں آدھا چھلا ہوا شلغم تھا۔

"اتنی مشکل سے سلا کر ذرا کام کرنے لگی تھی اور اس فتنے کو پھر جگا دیا آپ نے۔"

بچے کے رونے کی تان بلند ہونے لگی تو بیوی پاس آ کر بولی:

"مجھے دے دیں ——— میں سلا لوں۔ سمجھتے ہو ——— نیند پوری کیے بغیر جاگ اُٹھا تو ساری شام پریشان کرے گا۔"

عبدالرحمان نے خاموشی سے بچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

بیوی نے کندھے سے لگا کر دو تھپکیاں دیں اور ساتھ ساتھ بڑے ملائم انداز میں اپنے کندھوں کو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے لگی۔ بچے نے ایک دو دفعہ ننھی ننھی آنکھیں جھپکیں۔ بے تابی سے سر کو پٹخا۔ ایک دو دفعہ آں آں کر ...

کمرے پر رکی اور پھرتا ہوا ہٹ گیا۔

اس وقت میں عبدالرحمان غسل خانے میں جا چکا تھا اور اندر سے منہ دھونے کی آواز آ رہی تھی۔

بیوی باورچی خانے کی طرف چلی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج پھر دفتر میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ معلوم نہیں کیسی عادت ہے جب کسی کے کام آتے ہی نہیں۔ اپنے لوگوں کو یہ ناخوش کر دیتے ہیں اور گھر میں آ کر کبھی بچوں کو جھنجھوڑ، کبھی چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخ، کبھی ویسے ہی ستم مثلاً شوہر پر چڑھ جاتے ہوئے وہ مجھ سے بگڑ جاتے۔

"معلوم نہیں جنجال میں پھانس دیا اللہ نے مجھے:"

تھوڑی دیر بعد عبدالرحمان باورچی خانے میں داخل ہوا۔ دیوار سے لگی ہوئی پیڑھی کو پاؤں سے کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس پر بیٹھتے ہوئے دھوتی کے پلو سے گیلا منہ صاف کرنے لگا۔ چہرہ جب پلو کی اوٹ سے باہر نکلا تو وہ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔

"لاؤ میری ٹوپی:"

بیوی اس کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھنے لگی، جن میں تشفی بھی تھی اور سوال بھی تھا۔ ابھی تک نیچے کر جھکانے کا مقصد شمار کر سکتے کہ وجہ سے وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔

"او۔ چائے ڈال:"

دیگچی کا ڈھکنا کر اس نے وال دستر خوان سے اٹھایا اور پیالی میں انڈیلتے انڈیلتے پوچھ کر چائے کی تیز کرنے سے پہلے لگی۔ جب تک چائے سے پیالی بھرتی اس کا ارادہ تجسس میں بدل چکا تھا۔

"کیا ہو گیا آج؟"

"کچھ نہیں پھر گڑ بڑ ہو گئی۔ کیا بتاؤں کیا دیکھا آج۔ میں تو کہتا ہوں ——— شریر" اس نے چائے کی چسکی لیتے منہ سے لگا اور نیا بچنے پر پیالی ایک دم نیچے رکھ دی۔

"آج تھانے میں ایک ملزم کو پٹتے دیکھا ہے:"

"ہائے ——— میں مر گئی ———" اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر قمیص کے گریبان پر رکھ دیا۔ "آپ کیسے چلے گئے تھے وہاں؟"

عبدالرحمان نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھائی اور پھر رکھ دی۔

ابھی تک اس کے ہوش برقرار نہ ہوئے تھے۔ دھوتی کے پلو سے ایک دفعہ منہ پونچھتے ہوئے اس نے پیڑھی میں بیٹھے ہوئے، بیوی کو بات سنانے لگا۔ شکنجے میں پاؤں دیے جکڑے تھے جیسے سیمنٹ سے ڈھالے ہوں۔ ہاتھ بھر لمبے بیلنے کی خوفناک آواز ——— پاؤں کے ہونے کی وجہ سے اوپر والے جسم کو کربناک تڑپ۔ جیسے پلپلے کو دو سخت آدمی اوپر سے مرچلتے ہیں ——— مرد کی دردناک چیخیں ——— عبدالرحمان کا دہشت کھانا۔

وہ پیالی اٹھا کر ہونٹوں تک لے گیا۔ مگر پینے سے پہلے ہی نیچے رکھ دی اور کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگا کر لیا۔

"گڈو کی ماں! سچ پوچھو تو میرا جسم ایسے کانپ رہا ہے جیسے چکی کے آس پاس کی زمین دھڑکتی ہے۔"

"توبہ توبہ۔" بیوی چولہے میں لکڑی گھسیڑتے ہوئے بولی۔ "اللہ کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیگماں۔ مگر آدمی ایسے آڑے وقت ہی کیوں آئے۔ جو بعد میں ایسی حالت میں پھنسے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

بیوی کچھ قائل نظر آتی تھی اور دونوں میں بحث چل پڑی۔ عبدالرحمن کو اصرار تھا کہ ہماری ساری مصیبتیں ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ "بچپن میں پتھر پھینکو، پھینکنے والا پکڑیں۔ کسی فقیر سے بادشاہ نے پوچھا تم مجھ سے زیادہ ڈرتے ہو یا خدا سے۔ تو اس نے کہا میں نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خدا سے بلکہ اپنے اعمال سے ڈرتا ہوں۔ اگر میرے اعمال اچھے ہیں۔ تو نہ تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو نہ اللہ میاں اور اگر اعمال خراب ہیں تو میرا کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ اس لیے ساری بات اپنے پیٹ ساری مصیبتیں ہم خود لاتے ہیں۔ دوسرا کوئی ذمہ دار نہیں۔"

بیوی یہ سب کچھ مانتی تھی مگر پھر بھی وہ پوری طرح قائل نہ ہوتی تھی۔ "کبھی کبھی عقل پر پتھر بھی تو پڑ جاتے ہیں۔ آدمی سے اُلٹی سیدھی حرکت ہو ہی جاتی ہے۔ آخر انسان جو ہوا۔ کوئی فرشتہ تو ہے نہیں کہ غلطی ہی نہیں کرتا۔"

"نہ بیگماں نہ ـــــ یہ بات نہیں" عبدالرحمن اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب مجھے ہی دیکھو میں کبھی رشوت نہیں لیتا۔ حالانکہ میرے دفتر میں کون ہے جو رشوت نہیں کھاتا۔ اس زمانے میں چپراسی بھی اپنے افسر جیسی پوشاک پہننا چاہتا ہے اور لوگ اپنی جیب دیکھنے کی بجائے ہمسائے کی شان دیکھ کر خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں خوش ہوں۔ مزے سے رات کو سوتا ہوں۔ گھر میں ریڈیو نہیں۔ ایئرکنڈیشنر نہیں۔ فریج نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اطمینان تو ہے اور دیکھ لینا یہ اطمینان مجھے ساری عمر نصیب رہے گا۔"

بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور پیچھے پڑے شلغم کے چھلکے اکٹھے کر کے باہر لے جانے لگی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے جب اس نے ایئرکنڈیشنر، صوفے اور فریج کا ذکر سنا تو اس کے چہرے پر کرب کی ہلکی سی لہر آئی اور گزر گئی جیسے نیچی اڑان والے پتنگ کا سایہ آپ کے قدموں میں سے سرک کر غائب ہو جاتا ہے۔

اتنے میں عبدالرحمن کو باہر سے کسی نے آواز دی تو وہ دھوتی کے پلو سے منہ صاف کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیگماں صحن سے گزر کر ڈیوڑھی تک گئی۔ وہاں خالی ڈرم میں شلغم کے چھلکے پھینکے۔ پیچھے کو مڑا۔ ایک لمبا سا چوہا ڈرم کے پاس سے بل میں گھس گیا۔ وہ ایک چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باہر زمین پر لڑھک گئے۔ بیگماں نے پاؤں کی ٹھوکر سے ان کو ڈرم کے قریب کیا اور پھر دروازے کے پھٹے ہوئے پٹ سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے لگی کہ کون آیا ہے۔ پٹ کا یہ سوراخ اسی دن بنایا گیا تھا۔ جب نیا پردہ لٹکایا گیا تھا۔ اور اسی وقت سے اب تک نہایت مفید ثابت ہو رہا تھا۔

عبدالرحمن کے ساتھ عاقل کھڑا تھا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ یہ بھی اسی دفتر میں کام کرتا تھا اور اکثر ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔ بیگماں نے اسے اسی طرح یہیں سے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں ہیں۔ ایک ہی حالت کی ملازمت میں تنخواہیں بھی برابر ہیں۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے۔ عبدالرحمن پرانی دھوتی اور بوسیدہ سی قمیص پہنے کھڑا تھا اور عاقل نے ڈھیلا ڈھالا سکی کا چمکدار قمیص اور لٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی۔ وہ عمر میں عبدالرحمن سے کچھ بڑا ہی تھا۔ مگر سنہری فریم والے چشمے کے نیچے اس کا چہرہ زیادہ

[illegible] تھی۔ نیلماں کو عاقل سے کوئی لگاؤ نہ تھا مگر اسے [illegible] پر افسوس [illegible] تھا جو عاقل کی طرح رہ سکتا تھا مگر رہتا نہ تھا اور [illegible] چوکھٹے میں اپنے [illegible] سنایا کرتا اور نیلماں کے سامنے عاقل [illegible] ۔ نیلماں کچھ دیر تو [illegible] دیکھتی رہی۔ پھر اپنے [illegible] بستر [illegible] آئی۔ [illegible] بچوں کے [illegible] میں [illegible] ماں اپنے [illegible] کر لیتی ہے۔

کمرے سے گزرتے [illegible] نیلماں کا پاؤں [illegible] کے پنجے میں آگیا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ [illegible] سے چارپائی [illegible] گئی تو بچہ پہلے سے بیدار ہو کر رونے لگا۔ اس نے ایک دم اٹھا کر [illegible] سے لگا کر اپنا جسم [illegible] جب [illegible] خاموش ہوا تو اس نے جسم کی حرکت کو روک دیا۔ مگر وہ پھر [illegible] لگا۔ نیلماں [illegible] سر [illegible] دیا۔

[illegible] کی تو [illegible] مگر وہ [illegible] لگا تو نیلماں نے اسے چارپائی پر پٹخ دیا۔

بچہ ایک دم رونے لگا۔

نیلماں نے زور سے [illegible] اب [illegible] ــــــ [illegible] نہیں [illegible] بھلا [illegible] ہے۔

[illegible] اس نے [illegible] چارپائی پر [illegible] میں گھس گئی۔ [illegible] بہت [illegible] جاتی۔

اتنے میں [illegible] چارپائی کے پائے [illegible] ۔ مگر [illegible] نیچے [illegible] ۔

[illegible] ۔۔۔۔۔۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible] ۔

وہ دو ایک منٹ اسی طرح رہے پھر بڑی مشکلوں کے چنگل سے نکل آئی۔ کتے نے اچھل کر پوزیشن تبدیل کی۔ اس پر چونچ ماری اور
بے اڑا۔

گنڈو کی آنکھیں اور چہرہ اس کی اڑان کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھتی گئیں۔ وہ منڈیر پر جا بیٹھا۔ چڑیا کو سامنے لٹکایا مگر وہ لڑھک کر چھپ سے نیچے صحن میں آ گری۔

گنڈو کھل کھلا کر ہنس پڑا اور جب کتا دوبارہ نیچے آیا تو وہ چارپائی سے اتر کر اس کے پیچھے بھاگا۔

عبدالرحمان اپنے دوست سے مل کر فارغ ہوا اور اندر داخل ہونے لگا تو اس نے بچے کو انہماک سے کتے کا تعاقب کرتے دیکھا۔ کتا جب ہانپتے ہوئے بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ تو گنڈو اس کے پیچھے بھاگتا اور کتا اچک کر اس کی پہنچ سے باہر ہونے کے لیے کبھی ٹب کی ٹوٹی پر کبھی دیوار سے لگی چارپائی کے پائے پر اور کبھی کپڑے سکھانے والی رسی پر بیٹھ جاتا۔ گنڈو نیچے کھڑا شور کرتا رہتا۔ ادھر پہنچ کر کوے کی طرف دوڑتا ہاتھ بڑھاتا تو وہ جھٹ سے تھوڑی فاصلے پر پہنچتا اور گنڈو پھر شور کرتا۔ بازو ہلاتا ادھر کو بھاگتا

عبدالرحمان اندر آنے کی بجائے وہیں رک کر شفقت اور مسرت سے بچے کو دیکھتا رہا۔ یہ بچہ اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اس نے دنیا میں اور کسی چیز کی تمنا نہ کی تھی بلکہ بہت قناعت پسند انسان تھا۔ اس کے دل میں ایک ہی تمنا تھی کہ گنڈو کی مناسب تربیت کر کے اسے اچھا اور باوقار انسان بنائے۔ جس کا کردار مثالی ہو۔ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکے اور لوگ اس کی عزت کریں۔

کتا نلکے کے پاس لوٹے پر بیٹھ گیا۔ گنڈو چھوٹی سی چھڑی ہاتھ میں اٹھائے اسے مارنے بھاگا۔ گیلی زمین سے اس کا پاؤں پھسلا اور گرتے ہی اس نے زور سے چیخ ماری۔

کتا پھر سے اڑ گیا ۔۔۔

عبدالرحمان بھاگ کر آگے آیا۔ گنڈو کو اٹھایا تو وہ بے تحاشا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ باپ نے اس کی ٹانگیں ہلا کر دیکھیں۔ بازوؤں کو ٹٹولا۔ مگر وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا امکان نہ تھا۔ مگر گنڈو چیخ رہا تھا۔ اس نے چپ کرانے کی کوشش کی، پیار کیا۔ مگر بچہ کسی طرح بے حال تھا۔ وہ [illegible] مگر اس کے گھٹنے پر ہاتھ پہنچا تو وہ اور چیخا۔ عبدالرحمان نے پاجامہ اٹھا کر دیکھا ۔۔۔

۔ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔ یہ کیسے درد بڑھا۔

ہائے بیگم۔ [illegible]

عبدالرحمان کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ قلم چھوڑ کر ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے اس نے انگلیاں چٹخا کر پھیلا دیں۔ پھر دونوں بازو اٹھا کر سیدھے کیے سکتے ہوئے ایک انگڑائی لی اور چارپائی پہ بیٹھ گیا [illegible] اس نے ادھر ادھر دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر عاقل اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس کمرے میں چھ آدمی بیٹھے تھے۔ دو جونیئر کلرک، دو سینئر کلرک اور دو اسسٹنٹ۔ عاقل اور عبدالرحمان دونوں اسسٹنٹ تھے اور ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے تھے اور بیچ میں تھوڑا سا راستہ تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل سی تھی۔ ایک کلرک پرانی مشین پر ٹائپ کر رہا تھا جیسے ٹین کی چھت پر بارش گر رہی ہو۔ میزوں پر فائلیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ کمرے کی دیواروں کی حالت اچھی نہ تھی۔ پرانی تعمیر، جس کی تعمیرات کی ملمع ساز سفیدی کی تہہ سے جابجا جھانک رہی تھیں۔ اوپر پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ جس کا ڈھیلا ڈھالا بدن جب گھومتا تو ایسے جھٹکوں کی طرح جھولتا کہ لگتا چھت سے چھوٹ کر ابھی سے جا لٹکا تھا۔ بوڑھا کلرک سست انداز میں کاغذ ادھر سے ادھر اٹھا کر رکھتے اور بے دلی سے فائلوں کے اوراق الٹتے۔ ذرا سی آہٹ پر انہیں اٹھا کر دیکھنے لگتے اور پھر دیکھتے رہتے۔ دیر تک کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ کبھی کبھار ایک سال خوردہ چپڑاسی بیڑی پیتا ہوا کوئی فائل لے کر اندر آتا۔ مگر اس ڈھیلے انداز سے جیسے بیگار میں پکڑا گیا ہو۔ کسی کی میز کے گرد زیادہ چکر لگاتا۔ کسی کے کم اور کسی کے بھی نظر انداز کر دیتا۔ چپڑاسی کی توجہ کے تناسب سے فوراً اندازہ ہو جاتا کہ کون سا شخص جونیئر ہونے پر بھی زیادہ اہم ہے اور کون سا سینئر ہونے کے باوجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اہمیت کا پیمانہ افسروں تک رسائی، دفتر کے اہلکاروں سے رسوخ اور کام نکالنے کی اہمیت تھی۔ موجودہ دور کا چپڑاسی دفتری ضابطے سے زیادہ موجودہ دور کی اقدار کا زیادہ لحاظ کرتا تھا۔

عاقل اپنی میز سے اٹھ کر عبدالرحمان کے پاس آیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھنے لگا: "ہو جائے ایک پیالی چائے؟"

عبدالرحمان نے گھڑی پر نظر ڈالی اور سر جھکا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر گھنٹی بجائی۔

"یہاں نہیں یار۔" عاقل کہنے لگا "کینٹین میں چلتے ہیں۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔"

ان کے باہر نکلتے ہی کمرے کا ماحول ڈھیلا ہو گیا۔ ایک کلرک نے آہستہ سے ہونٹوں سے سیٹی بجائی۔ دوسرے نے قلم رکھ کر انگڑائی لی اور مسکرا کر مزہ لینے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ تیسرے نے زور سے فائل بند کی۔ اس کو دھڑاک سے میز پر رکھا اور کرسی کی پشت پر پھیل کر بولا:

"یار یہ عاقل جب تک بیٹھا ہوتا ہے۔ اپنا تو سانس خشک رہتا ہے۔" وہ عاقل کے ماتحت کام کرتا تھا۔

"تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔" دوسرا کلرک بولا جو عبدالرحمان کے تحت کام کرتا تھا۔ "ہمارا بھی تو عبدالرحمان ہے۔ قسم سے جو کبھی خواب میں بھی اس سے ڈر لگا ہو۔"

"سنا ہے روزانہ تبدیلی تو پڑھیں گے۔ وہ دو دن میں نوکری چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔"

"کیوں، کیا بات ہے اس میں؟"

"یار پھر چار سپرنٹنڈنٹ سے جو عاقل کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوتا ہے۔ عبدالرحمان کی ترقی ہو جائے تک نہیں کرتا اور سپرنٹنڈنٹ ہو گیا۔ سبھی اوپر والے ڈرتے ہیں اس سے ——— پتہ نہیں کہاں کہاں سے تعلق رکھ رکھے ہیں اس نے۔"

"اللہ قسم میں نہ ہوا اس کا افسر۔ دو دن میں نکال باہر کرتا۔ حضرت تماشا میں ہوا کرتے کے لیے۔"

"پتہ نہیں اسے باہر کرتے یا خود باہر ہو جاتے ——— عاقل خود بادشاہ کچھ نہیں کرتا۔ جب تک اس کو پیچھے والے

وسعت کریں اور حوصلہ کریں کرے۔ یہاں تو جو بھی افسر ہے وقت گزارنے کی فکر میں ہے۔

بات چلتی گئی۔ پھر اسے خیر و پہ پاکر دونوں تازہ ترین پاکستانی فلم پر بحث کرنے لگے۔ ایک سین پر اختلاف رائے ہو گیا۔ تو وہ دونوں اٹھ کر دوسری برانچ میں ایک اور کلرک سے فیصلہ کروانے چلے گئے۔ جو ہر پکچر پہلے ہی روز دیکھنے کے لیے جان کی بھی بازی لگا دیا کرتا تھا۔

دروازے کے باہر سٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے انگڑائی لی۔ پھر اطمینان سے اُٹھا اور برآمدے کا موڑ مڑ کر غائب ہو گیا۔

دفتر کی کینٹین میں پتھر کی سل والی میزیں تھیں۔ لوہے کی سیٹ والی کرسیاں تھیں۔ سوکھی ہوئی کریم والی پیسٹری تھی۔ ٹوٹے ہوئے کنڈوں والی پیالیاں تھیں اور چپک جانے والی مکھیاں تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئے تو کینٹین میں کافی لوگ بیٹھے تھے۔ مختلف اطراف سے بیٹھنے والوں نے حسب تعلقات آوازے کر ہاتھ ہلا کر یا سر کی حرکت سے سلام کیا۔

دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ پہلے دفتر کی باتیں ہوئیں۔ پھر دوستوں کی باتیں ہوئیں اور پھر عاقل عبدالرحمان کی بوسیدہ ٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یار کبھی ذوق کی تسکین کرتے ہو۔ ٹائی تو کوئی ڈھنگ کی خریدو۔"

"میاں جب تک نئی کے پیسے نہیں ہوں گے۔ پرانی ہی چلے گی۔"

"اگر یہی لچھن رہے تمہارے تو پیسے آ چکے۔"

عبدالرحمان سر جھکا کر پیالی کا کنارا بجانے لگا۔

"رحمان بھیا۔ یہ بتاؤ۔" عاقل آگے جھک آیا۔ "تم کیوں اپنی جان پر ظلم کرتے ہو۔ اللہ نے ایک ہی زندگی عطا کی ہے۔ اُس رسی سے باندھ کر جکڑ دیا ہے تم نے۔"

"تو کیا کروں۔ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ ایسے رہوں ورنہ وہ بڑی آسانی سے کسی رئیس کے گھر پیدا کر سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ اگر اس نے یہ نہیں کیا تو یہ تو کر دیا کہ تم رئیسوں کی جیبوں میں شرارت کر سکو —— اچھی بھلی ذہانت ہے۔ ذرا ہمت کرو تو سب دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"چھوڑو بھی یہ بکواس۔ تم تو ہمیشہ مجھے غلط راستے پر ہی ڈالتے رہو گے۔"

"دیکھو میاں بچے نہ بنو۔" عاقل بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "غلط اور صحیح کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز سب لوگ مان جائیں وہ صحیح ہو جاتی ہے اور جب سب نہ کریں تو البتہ وہ غلط ہے۔ جیسے۔ رشوت کی بات ہے کبھی کچھ عرصہ پہلے تک عدالتوں میں بہت برائی سمجھی جاتی تھی۔ مگر آج کل یہ پیدائشی کوئی برائی نہیں ہے۔ اس طرح رشوت اُس زمانے میں غلط تھی جب زیادہ تر لوگ پاکباز تھے۔ مگر آج کل سمجھتے ہیں جیسے چند سرپھروں کے باقی تو سبھی زیادہ دونوں ہاتھوں سے پیسے بنا رہے ہیں۔ زمانے کے ساتھ

کیا مصلحت یہی ہے کہ کوئی چیز غلط معلوم ہو جائے تو یہیں کہہ دی جائے باقی ہے اور یہ تو عملی زندگی کی بات ہے جو چیز سب الگ کر رہے ہیں وہ غلط نہیں ہوتی۔

رحمان خاموش رہا۔ وہ ایک پلیٹ چاٹ کی لیں اور پیالی کی پلیٹ عاقل کے آگے کر دی۔

عاقل نے بیگم نعیم سے پیشکش دیکھا۔ پیالی کی سوکھی سوکھی سطح پر دراڑیں پڑ گئی تھیں صرف ایک دانہ قسمت سے بہتر تھا۔ جو پلیٹ کے درمیان والے کنارے پر پڑا تھا عاقل نے اسے جھک کر وہ دانہ اٹھایا اور منہ چلانے لگا۔ رحمان نے بھی ایک سوکھی ہوئی پیالی اٹھا لی۔

"بھیا! خدا بخشے چند روز پہلے تک کتابیں لکھنے والے محتاج پڑے ہیں۔ ہم تو زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔" عاقل بولا۔ "جیسے انسان زندگی کی کوشش کرتی ہے ویسا ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری دنیا تو عیش کرے اور ہم اپنے بچوں کو اپنے سامنے آرام کرتے دیکھیں۔ ہمارے بچے دوسروں سے کم ہیں کیا؟"

"بعض دوسروں نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہم نے اپنی قبر میں۔ ہمیں دوسروں سے کیا؟" رحمان نے جیسے بات ختم کرنا چاہی ——۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ ہم تو تب قبر میں جائیں گے جب وقت آئے گا فی الحال تو جینا ہے —— مگر تم تو ابھی سے قبر میں گھس کے بیٹھ گئے ہو —— اپنے پر تو جو ظلم تم نے کیا وہ کیا ہے ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اپنی اعلیٰ صفت سے ان کو بھی اچھی زندگی سے محروم کر رہے ہو۔ اس تنخواہ میں تم نہ تو انہیں اچھی تعلیم دلا سکتے ہو۔ نہ اچھا پہنا سکتے ہو۔ تمہاری وہ بڑی بیٹیوں میں کب تک افسوس کرتے رہیں گے۔ جوان ہونے پر ملازمت کے وقت تعلیم کی کمی کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں گے۔ ان کی آئندہ زندگی تمہاری وجہ سے خراب ہوگی۔ —— کچھ تو سوچا کرو۔"

"یہ غلط ہے عاقل۔ اگر بچے اپنے جیسے لوگوں میں رہیں گے تو کبھی افسوس نہیں کریں گے اور اگر ان کی تربیت مناسب ہے ...."

مگر عاقل نے بات کاٹ دی اور بحث کرنے لگا "ارے میاں۔ نوکری کرو ہے اپنے جیسا پندرہ روپے تنخواہ والا بھی بازار یا اپنا ورق سے رئیسوں کے ٹھاٹ رکھتا ہے۔ تم پتہ نہیں اپنے جیسا کس سے ملتے ہو۔"

رحمان زچ ہو گیا "یہ تم پرانی چکر بازی کا ثبوت کیوں دیتے ہو۔ ادھر خاندیوں سے منہ کھلاتے رہتے ہیں اور ادھر تم نے جھک جھک شروع کر دی ہے۔"

"میاں تمہیں کیا، ایسے ہی کہہ رہا ہوں کہ شاید تمہاری اکڑی ہوئی کھوپڑی میں کوئی سیدھی بات سما جائے —— وہ تو گئے جھک گیا۔ دیکھو مال مفت ہے ایک ہاتھ میں۔ چاہو تو اس سے کئی گنا بہتر چیزیں اپنا سکو۔"

"میاں تم یہ مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ اپنے بس کا تو روگ نہیں یہ۔"

"روگ کی بات خوب کہی ہے۔ بس تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔ نہ جھکنے کی نہ چلنے کی اور نشے کی فنی سے وقت

چونکہ تم نے کام جاری رکھا۔ شادی کے کچھ سال بعد بھی تم اپنے سر سے عاشق ہو جاؤ گی۔"

عبدالرحمان خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

عاقل نے پیالی رکھی، پھر کچھ تھوڑا سا آگے سرکا۔ خود بھی جھک گیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"محترم صاحب۔ کام ہو جائے تو ایک سو روپے مل جائیں گے۔"

"چھوڑو میاں۔ میرے بس کا یہ کوئی کام ہی نہیں۔ دفتر میں آدمی دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی ساری چیزیں تمھاری میز پر رکھی ہوتی ہیں۔"

عاقل اس کی چوٹ کو نظر انداز کرتا ہوا بولا "وہ فائل ہے نا جیسے اکرام دار... اس میں سے قواعد والا پرچہ کہیں گم کرنا ہے ——— بس اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اس سے کیا ہو گا؟"

"ہوگا یہ کہ قواعد نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ سیٹھ کے حق میں ہو جائے گا ——— اور کیا؟"

"اور جو ریکارڈ روم میں رکھے ہیں؟"

عاقل کھل کھلا کر ہنس دیا۔ پیچھے ہٹ کر چائے کی پیالی اٹھائی۔ ذرا سی چسکی لی اور فتح مندانہ سرگوشی میں بولا۔

"پیارے وہ تو کب کے ہو بھی چکے۔"

عبدالرحمان تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا "تم نے مجھ سے یہ باتیں کیں ——— تم جانتے ہو میں اس قسم کی چیزوں سے بچتا ہوں۔ مگر واقعات ہی ایسے ہو گئے تھے تو وہ کسی اور پر ڈال سکتے تھے۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" عاقل نے بے تکلفی سے ہاتھ پھیلا کر کہا "مگر تمھاری کھوپڑی میں تو سارے قاعدے چھپے ہیں۔ تم دوبارہ ہی نوٹ کروا دو گے۔"

"بس اُوں اُوں۔" عبدالرحمان بولا "تو کیا مجھے نا سمجھ بنانا چاہتے ہو کہ میں نوٹ میں یہ سب بھی نہ لکھوں۔"

عاقل بولا "کوئی زبانی درخواست تو نہیں کر رہا۔ تمھارے سارے دفتر میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"مسلسل والی بات تو نہ کرو۔" عبدالرحمان کہتے ہوئے بولا "تمھیں سارے اپنے جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے تو اب بھی کئی اچھے آدمی ملتے ہیں ——— بہر حال جس کا کام اسی کو ساجھے۔ مجھے تو تم معاف ہی رکھو ——— اور نہ ہی آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات کرنا۔"

صحن میں داخل ہوتے ہی عبدالرحمان کو چار پائی پر میلی کچیلی آنکھوں والا کالا بدقد نظر پڑا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ پارو کی ماں آئی ہوئی ہے۔ وہ غالباً سلطانہ کے کمرے میں بچیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بچے کو سینے سے لپٹا کر عبدالرحمان نے بدقد ایک طرف ہٹایا اور دوسرے ہاتھ سے بستر ٹھیک کر کے بچے کو احتیاط سے لٹا دیا۔ بچے نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور پھر غنودگی سے سر ایک طرف ڈال دیا۔

عبدالرحمان نے منے پر ہاتھ رکھا تو تیز بخار کی تپش محسوس کر کے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس چارپائی پر بیٹھ کر اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے قدموں میں نظریں جمائے سوچنے لگا۔

اسے پارو کی ماں کے حسن و سلیقے کی تو لاج رہی تھی۔ وہ عبدالرحمان کی ہم درس تھی۔ وہ خود تو اپنی مشہور و معروف ہستی تھی کہ لوگوں میں پارو کے باپ کو شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ اور اگر جانتے بھی تھے تو پارو کی ماں کے خاوند کے طور پر۔ اس کی خاص صفت با قیمت مشورے دینا تھی۔ مگر جیسا اپنی زندگی میں کیسا ہی مسئلہ درپیش کیوں نہ ہو ———— وہ کھڑا کھڑایا مشورہ تیار رکھتی تھی اور تلقین کرتی تھی کہ اس پر عمل ہو گا اور اگر عمل نہیں ہوتا تھا تو سب ہمسایوں کے سامنے (دن ڈوبنے کے قصے کا) ذکر کرتی۔ پھر اس پر اپنے تمام مشورے کا۔ پھر ان تمام خدشات کا جو اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے عمل ہو سکتے تھے۔ مشورہ دینے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور عقل تجربہ چاہتی ہے مگر ہمسایوں کی بدقسمتی سے چالیس سالہ پارو کی ماں کو اتنا تجربہ تھا کہ خود کی عمر کے بڑے بوڑھوں کو بھی نہ ہو۔ وجہ یہ تھی کہ دنیا میں کوئی بھی واقعہ پیش ہو وہ اس سے پہلے اس کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد سے پیش آ چکا ہوتا۔ اور یہ سب واقعات ستاروں کی گردش کے سخت بندھے اصولوں کی طرح ان اصول کی سختی سے پابند تھے کہ اگر وہ واقعہ اچھا ہوتا تو وہ ہمیشہ پارو کی ماں کے میکے میں ظہور پذیر ہوتا اور اگر برا ہوتا تو اس کی سسرال میں۔
———— مگر یہ ناممکن تھا کہ پارو کی ماں کے لیے کوئی چیز نئی ہو۔

گڈو کے پھوڑے کی خبر سن کر اس نے کئی علاج بتائے۔ پھوڑے کے ارد گرد پان کھانے والا چونا لگانا۔ نیم کے گرم گرم پتے پانی میں حل کر کے لگانا۔ پٹی باندھنا اور باسی تھوک لگانا۔ ان سب علاجوں کی سند کے طور پر اس نے اپنے عزیزوں کے اتنے چشم دید واقعات پیش کیے کہ یہ تمام علاج بیک وقت شروع کرنے میں بھی اسے کوئی حرج نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی نند نے حسد کی وجہ سے اس کی بات ٹالی تھی تو بازو اُس کا بہت خراب ہو گیا تھا۔ اور اس کی چھوٹی بچی کی ٹانگ کٹوانا پڑی تھی۔

مگر عبدالرحمان اسے سرکاری ہسپتال لے گیا۔ گزشتہ چار روز وہاں کا علاج ہو رہا تھا اور آج عبدالرحمان سیدھا ہسپتال سے واپس آ کر گڈو کی پائنتی بیٹھا سوچ رہا تھا۔

آہٹ سن کر اندر سے اس کی بیوی نکل آئی۔

مشکل گھڑیوں کی ماؤں میں ایک نئی حس بیدار رہتی ہے جو چشم زدن میں امید و مایوسی کی جھلک دکھا دیتی ہے۔ بیگمان نے اس کے انداز دیکھے تو اسی حس کی لرزش سے اس کا دل کانپ گیا۔

"کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟" مختصر سا سوال ہوا۔

"ڈاکٹر نہ کہو بیگمان، قصائی کہو" عبدالرحمان جیسے پھٹ پڑا "ڈاکٹر کے دل میں تو خدا کا خوف ہوتا ہے۔ بیمار کے لیے ہمدردی ہوتی ہے۔ فرض کا خیال ہوتا ہے ———— مگر ان لوگوں میں تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

مگر وہ اپنے خیال میں بڑبڑانے لگا "ہمارے سرکاری ہسپتال [illegible] جیسے ذبح خانے کھلا

ں۔ جیسے مرنے کے لیے آسانی دی جاتی ہے۔

"ہائے ہائے۔ کیا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کوئی خیر کا کلمہ نکالیے منہ سے۔"

بیگمان نے آگے بڑھ کر گڈو کو ساتھ لپٹا لیا اور کپڑا اٹھا کر چہرہ دیکھنے لگی۔ خاوند کا موڈ دیکھ کر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر نے گڈو کے متعلق کیا کہا ہے۔ جب قابو نہ پا سکی تو اس نے طریقے سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"دوائی کہاں ہے؟ میں پلاؤں اپنے لال کو۔"

تھکا تھکا سا جواب تھا۔ "دوائی شام کو لاؤں گا ——— بازار والے ڈاکٹر سے ——— ابھی نہیں لایا۔"

بیگمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہسپتال سے خالی ہی لوٹ آئے کیا؟"

"خالی تو نہیں آیا ——— ڈاکٹر سے سخت جھگڑ کر آیا ہوں۔"

بیگمان تھیلی اپنے ماتھے پر مار کر چونک دار بیزاری سے ہاتھ اس کی طرف چلاتے ہوئے بولی "آپ کو تو ہر وقت لڑنے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ ساری رات بچے کا نزلہ نہیں دیکھا جاتا مجھ سے تھام تھام کے اور سوں بچ پڑ جاتے بھونک۔"

عبدالرحمان ٹکر ٹکر نظروں سے اپنے دونوں پاؤں کے بیچ کی زمین دیکھتا رہا۔ بیگمان نے گڈو کا گودڑی میں ڈوبا ہوا سر اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"ہائے ہائے میں واری جاؤں۔ کیسا بخار محسوس ہو رہا ہے بچے کے بدن سے ——— مجھ تو ایسا لگتا ہے بس رونا ——— اللہ تو ماں کو جو لگے ہے۔"

بچے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس نے اسے چوما اور پھر ماتھے سے بال ہٹا دیے ——— پھر جیسے سائیکل کی خالی ٹیوب جاتی ہے سے آہستہ آہستہ پھوٹتی ہے اسی طرح اس کی آنکھوں میں نمی پھوٹنے لگی اور وہ دبی دبی آواز میں بڑبڑانے لگی۔

"ماں کا دل اور کسے طرح سے جانیں بھلا ——— ان مردوں کو تو بس اپنی مردانگی کا شوق ہے ——— وہ پورا ہوتا ہے ——— گھر میں بیوی پر رعب۔ دفتر میں لوگوں سے ہاتھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں سے جھگڑا۔ بچے جائیں جہنم میں ——— وہ جان کے پیچھے ہیں۔ خود ہی ڈھلانوں سے لڑھک لڑھک کر نہیں ایسا ہوا کہ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے ——— ان کو کون رونے والا۔"

آنسو پلکوں کی جڑوں میں موتی پرونے لگے۔ جیسے مزار پر جلنے والے عقیدت مندوں کی طرح بے پانی آنکھوں سے ابھر کر ٹپک گئے۔ تھوڑے وقفے بعد اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا احتجاج جاری رکھا۔

"وہ کوئی اور ہی مرد ہوتے ہیں جن کو بیوی بچوں کی فکر ہوتی ہے ——— یہاں تو بیوی بھی دو پیسے کی بات جو شامت کا مارا پیدا ہو گیا وہ بھی اسی سڑک پر چل پڑے گا ——— نہ گھر میں برتن۔ نہ تن پر ڈھنگ کا کپڑا ——— دل شوق تو کرتا ہے کیسے گا۔ یہاں تو خالی خولی زندگی گزارنا ہی عذاب ہے۔۔۔۔۔"

عبدالرحمان دونوں ہاتھوں کے پیالے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرہ اٹھائے بغیر وہ دھاڑا۔ "بند کر دو یہ بکواس۔ اے تہمر

بیماں نے وہ پہلا اخبار نہ سمیٹا۔ اٹک سے دعا کی شروع کی اور میز پر جھک کر اس نے گلاس کے نیچے سے کاغذ کھینچ کر ٹھیک کیا۔ پھر کرسی پر سے اٹھا اور بیماں بیٹی اندر کو چلی۔

عبدالرحمٰن اس بچے میں ہوا۔ ساری بات تو پتا دیتا تھا اسی لیے تو ذکر کر رہا ہوں۔

عبدالرحمٰن کے کانوں میں بیماں اور پاروکی ماں کی آوازیں پڑتی رہیں۔ مگر اس نے سننے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ماما اور ابا کی سسکیوں کی آواز اور پاروکی ماں کے رونے کی بھی شامل تھے۔ وہ سر جھکائے سوچتا ہی رہا۔ . . .

ہسپتال میں جب وہ پہنچ گیا تھا تو گزشتہ دو گھڑیوں پہلے بینچ پر بیٹھا تھا۔ اور گرد بہت سے مریض لیٹے ہوئے تھے۔ بینچ پر بیٹھے ہوئے، کچھ زمین پر بیٹھے ہوئے، کراہتے ہوئے، سسکتے ہوئے، سٹریچروں پر لیٹے ہوئے ——— کوئی درد سے بے حال کوئی تھا۔ بہت سے نڈھال، کوئی تکلیف سے بے چین، کوئی اِس طرح پڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار ہسپتال سے گزرتے ہوئے وہ سب کو نظر انداز کرتے گزر جاتے تو تمام مریضوں کی نظریں ان کی طرف شک بھری امید سے اٹھ جاتیں۔ کہ وہ ایسے گزر جاتے جیسے پاکستان بننے سے پہلے گورے حاکم غلاموں کے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی باری کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی نظر گرم گرم بہنے والی نرمی اس کی گود میں جاگتی رہی۔ اس کی ماں تو وہ اکثر مستقل حال بتانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد ہسپتال سے نکل جائے۔ مگر ڈاکٹر تو ایسے مریضوں کو لگے ہوئے تھا جیسے جلدی جلدی میں کاش کے پتے پھینٹ رہا ہو۔ وہاں سے نکالتے وقت ایک دوسرے لہجے میں کہا کہ ذرا چلنے لگے ہیں۔ پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے پیر پر ایسا سخت ہاتھ مارا کہ درد سے عبدالرحمٰن کی چیخ نکل گئی۔ زخم چھلنے کے بعد اس نے کچھ پوچھا تو کہنے لگا کہ یہ وہ ہی خرچ ہو گئی ہے۔ باز آ کے نہ دیا۔ عبدالرحمٰن نے بچے کے جسم سے خون کے فوارے کی طرف اشارہ کیا تو اس نے دکھ سے سر ہلا کر چلا گیا۔

یہ سب تفصیلات اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ چار روز تک اسی قسم کے چکر چلتے رہے۔ بیوی کے شکوؤں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی نظروں میں بھی قصور وار بنا دیا تھا۔ مگر جب اسے یہ سب حالات یاد آنے لگے۔ جن میں اس نے بچے کی حالت مسلسل بگڑتے ہوئے دیکھی تھی اور اس کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹر سے جھگڑنے پر سینیئر ڈاکٹر جس میں مجبوراً اور دل نے اسے باہر نکال دیا تھا۔ تو اس کا غصہ پھر سے تازہ ہو گیا اور اب ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اس کی جھنجھلاہٹ بیوی پر بھی ہونے لگی۔ جو باہر کے حالات سے بے خبر اس کے دماغ کو چھوڑ کر چارپائی کی ادوائن کی طرح کس رہی تھی۔

عبدالرحمٰن کافی دیر سوچتا رہا پھر اٹھا۔ انگا ٹھنڈی کی بتی جلنے لگا۔ کہ اس میں سے پانی نکلے مگر بتی کا پیچ ڈھیلا تھا اس لیے اس نے کئی جھٹکے دیے اور دے کر دیکھا کہ فرش پر گرا۔ چیتے کے سائے کی طرح لرزتے ہوئے ایک چوہا بھی اس کے پاس سے بھاگ گیا۔ اندر کے ساتھ ایک بجلی کی چمک بھی فضا میں پھیل گئی اور عبدالرحمٰن باہر نکل گیا۔

کمرے کے اندر سے پاروکی ماں نے جھت سے ایک آنکھ نکال کر جھانکا۔ عبدالرحمٰن کی پیٹھ باہر نکلتی دکھائی دی تو وہ پورا سر باہر نکال کر دیکھنے لگی۔ پھر دروازے کے جب سامنے پوزیشن میں دوبارہ جم چکی تو ترس بھری نظروں سے بیماں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تو پھر شکر ہے ——— یہ مدد بھی کیا قسمت ہے ——— اب خود ہی کمانے بھی ہو رہے ہیں۔"

بیگماں کی نصف دلاسکی سے پادری کی ماں کو تسلی ہو گئی کہ یہ وہ موقع اس موضوع کے لیے مناسب ہے اور جب دونوں اکٹھے رہا تھا پادری کی ماں تمام خاندان کا ذکر کر رہی تھی جو بیوی بچوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مثال کے طور پر اپنی بدقسمت بہن کے خاوند کے قصے بتی تھی جو عبدالرحمان سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اسی ذکر میں بیگماں نے ایک دفعہ کہا کہ بھی مرد ایسے ہوتے ہیں تو پادری کی ماں نے فوراً اپنے بھائی کی مثال دی جو اپنی کم ظرف بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا حالانکہ وہ اس جیسی بدصورت قطعاً اس قابل نہ تھی کہ اتنے شاندار بھائی بن ہو سکے یا پادری کی ماں کی جا مع ہو سکے۔ اسی طرح اس کی ایک نند بالکل چڑیا تھی۔ مگر اس کا خاوند بہت خیال رکھتا تھا ——— پارہ کے دو قول جاری تھے اور بیگماں اپنی پھوٹی قسمت پر خود ہی ترس کھاتی مری جا رہی تھی۔

بائیں دونوں ڈاکٹر نے گزدی کی حالت دیکھی اور کچھ کہے بغیر ایک ٹیکہ لگا دیا نئی مرہم پٹی کی اور بخار کے لیے پینے کی دوا دی۔ دو تین کے علاج سے بخار تو ٹوٹ گیا۔ مگر گزدو کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ عبدالرحمان نے جب وجہ پر اصرار کیا تو اس نے مختصر سا جواب دیا کہ ٹھیک کرنا ہے تو فوراً ہسپتال میں داخل کر کے پھوڑے کا اپریشن کروا دو۔ مگر عبدالرحمان اس کے لیے تیار نہ تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونا اس کا تمام مریض پندرہ پندرہ دن انتظار کرتے ہیں۔ سو سفارشیں ڈھونڈتے ہیں۔ تب کہیں جنرل وارڈ کے ایک کونے میں جگہ ملتی ہے اور پھر بہت دنوں تک بھی نہیں کٹتی بلکہ علاج میں بھی کوئی پروا نہیں کرتا۔ ہسپتال کا عملہ ایسی بے رخی اور اوپرے دل سے بات کرتا ہے جیسے سات پشتوں سے کیا بیٹا ہو۔ اگر خون بھی نکل رہا ہے تو تڑپتے پڑا رہے کوئی نہیں منہ دکھاتا۔ پچھلے دنوں خود اس کا ایک عزیز ہسپتال میں ہی مر گیا تھا کیونکہ ہم نے چند گھنٹوں بعد ہی پھر سے خون نکلنے لگا تھا وہ چیختا رہا۔ مگر پہلے تو کوئی آیا ہی نہیں اور جب نرس آئی تو آتے ہی ڈاکٹر لینے چلی گئی لیکن اس کے واپس پہنچنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں اسے ہسپتال میں داخل نہیں کرواؤں گا۔ آپ خود اس کا اپریشن کر دیں۔"

مگر ڈاکٹر کے پاس کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ ہسپتال کا جو بڑا ڈاکٹر ہے اس کا پرائیویٹ مریض بن جائے تو وہ بھی داخل کروا دے گا۔ یہ آسان ترین طریقہ تھا ——— اور اس کی فیس مشورہ بتیس روپے تھی۔ سپیشلسٹ تھا۔

عبدالرحمان سپیشلسٹ کے پاس پہنچا تو کوٹھی میں کئی کاریں کھڑی تھیں۔ وقفے وقفے کے بعد اور بھی آتی گئیں اور ان میں سے نکل نکل کر کرسیوں پر بیٹھتے گئے۔ وہ خود بھی کافی دیر سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ پھر جب ایک آدمی نے آ کر اس سے پرچی طلب کی یہ معلوم ہونے پر کہ وہ نیا مریض ہے اس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان کا وقت مقرر ہے۔ اور آج ان میں سے کسی کا وقت ڈاکٹر صاحب کسی کو نہیں دے سکتا۔ عبدالرحمان نے جب وقت مانگا تو اس نے تین دن کا بعد کا وقت دے دی۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا لیکن اگر علاج کروانا تھا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً عبدالرحمان تین دن کے لیے ڈاکٹر سے علاج کرواتا رہا۔

سپیشلسٹ نے معائنہ کیا تو اس کا خیال تھا کہ ابھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا فوری طور پر اپریشن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ

اُس کا پیشاب وغیرہ ٹیسٹ کروانے کا کہا۔ تیسری مختلف طرف سے انہیں سے پینے کو کہا تاکہ پتہ چل سکے کہ پھیپھڑے کی جڑیں دل تک گئی ہیں یا نہیں اور پھیپھڑے پر سے گوشت کے ذرا سے ٹکڑے کا خورد بین کے نیچے معائنہ کروانے کو کہا۔

عبدالرحمان کا دل بیٹھ گیا اُس نے کہا کہ کوئی بہت ہی خطرناک بیماری ہے۔ ڈاکٹر سے نسخہ لیتے وقت اُس کی انگلیوں میں کپکپاہٹ تھی اور اس نے بھی دھیمی آواز میں پوچھا "مگر ڈاکٹر صاحب۔ اس کا سبب کیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو کہنے لگا: "اگلا مریض بھیجو۔ جلدی۔"

پھر وہ نسخہ لکھتے ہوئے بولے "ابھی کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب ٹیسٹ کروا لو تو کچھ پتہ چلے گا۔ اس دوران یہ مرہم لگاتے جاؤ۔"

سارے ٹیسٹ ہونے میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے کیونکہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی دقت تھی۔ بعد میں جب عبدالرحمان دوبارہ چیک کروانے گیا تو سپیشلسٹ نے چند اور ٹیسٹ لکھ دیے اور دوسری دوائیاں تجویز کر دیں ———— علاج جاری رہا۔ ٹیسٹ ہوتے رہے۔ پیسے لگتے رہے۔ بازار سے مہنگی دوائیں آتی رہیں۔ دفتر والے جب ملاقات ہوتی تب کہتے کہ علاج سرکاری ہسپتال سے نہیں ہو رہا اس لیے اس کو گورنمنٹ سے علاج کے پیسے نہیں مل سکتے اور وہ گھر کے خرچ کے روپے سے روپے آنے اور پیسے گھر چلنے کے بعد ادھر ادھر سے قرض لے کر علاج کراتا رہا۔

اس عرصہ میں پاروتی اماں بار بار چکر لگاتی رہی۔ وہ اپنے مشوروں سے نوازتی رہتی۔ نتیجے میں محلّہ کے دو سفید تل والے چیونٹوں کی گزرگاہ پر بیٹھ گئے۔ کالے بکرے کی سری آدھی رات کو ... پیر صاحب کی زیارت پر پانچ روپے کی گیری کی منت مانی گئی۔ عبدالرحمان پر جو قرضہ چڑھا اس میں پندرہ روپے پاروتی اماں کے بھی شامل تھے۔ اور وہ صبح و شام آ کر بیماری کی دلداری کرتی رہتی۔ جب کبھی ... پیسے دے نہ سکتی تو پاروتی اماں اُسے بہت لعنت دیتی اور پھر ادھر ادھر ... سناتی۔ کبھی ... بچیاں کو بھی بلا لیتی تاکہ وہ ... کی صحبت سے بچی رہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی ماں کا ذکر ضرور کرتی جو ہمسایوں کے گھر میں بیماری ہونے پر کئی کئی دن ان کے یہاں کھانا پکوا کر بھیجتی اور پھر اس کا مقابلہ اپنی ساس سے کرتی جو اتنی سنگدل تھی کہ چاہے بچہ جننے والی ہو۔ وہ اس کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عبدالرحمان جیب بچاتا ہوا سا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ راستہ دفتر کا ہی تھا۔ مگر کتنا غیر مانوس لگتا تھا۔ دھوپ کی چمک کے باوجود ہر چیز کی رنگت اڑی اڑی سی تھی۔ جیسے سینما میں فلم کی روشنی میں دکھائی جا رہی ہو۔ ہر راہگیر اس کے قریب سے بے فکر ہشاش بشاش سا نظر آتا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے سارے عالم میں صرف وہی پریشان ہے اور دوسرے کسی کو بھی کوئی پریشانی نہیں۔ اس کے ناہموار قدم ... اور روشوں کو روندتے جا رہے تھے اور ہاتھ مستقل طور پر جیب پر تھا۔

اُس کی جیب میں نسخہ تھا۔

آٹھ بجے جب ناشتہ آیا تو ناشتے کے دوران میں عبدالرحمان بالکل خاموش تھا۔ بیگم جیسے خاموشی کی ایک ایک ادا کا مطلب سمجھتی تھی

اور دونوں کے درمیان بے زبانی کا ایک پل تھا جس پر سے گزر کر ان کے خیالات ایک دوسرے تک پہنچ رہے تھے ——— جو بے حد واضح اور صاف گفتگو سے بھی بہتر. کپڑے بدلتے وقت اُس نے کنکھیوں سے بیگماں کی طرف دیکھا تھا جو سر جھکائے گُدڑے کے پاس بیٹھی تھی ... جیسے آپ ہی آپ عبدالرحمان کے مُنہ سے کوئی اجنبی سی آواز نکل گئی۔

"کچھ ہے ؟" ——— بیگماں نے نگاہ اٹھائی.

"بیچنے کے لیے :"

اور وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب باہر آئی تو وہ تیار ہو کر دروازے کے پاس کھڑا تھا. بیگماں نے ہاتھ بڑھایا اُس نے بھی خاموشی سے ہاتھ آگے کیا اور ایک دوسرے سے نظریں چُراتے ہوئے کاغذ کی پُڑیا اُس کے پاس منتقل ہو گئی۔ دونوں ایسے مُنہ پھیر کر بھاگے جیسے اُنھوں نے کوئی شرمناک جُرم کیا ہو اور اب احساسِ شرمندگی سے شکل نہ دکھا سکتے ہوں۔ مکان سے باہر نکل کر وہ کافی دُور تک ایسے ہی چلتا گیا ——— پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر پُڑیا کو چھوا اور اُس کا انگوٹھا ایک گول چکر پر پھرنے لگا۔

"ارے یہ تو گھنگھرو ہے" ایک زلزلہ سا اُس کے سارے جسم میں کوند گیا۔

گھنگھرو یادیں آوازے کی طرح دماغ میں بجنے لگیں . . .

...... چند سال پہلے وہ جھجکتا ہوا گھنگھرو والی کے ہاں داخل ہوا تھا۔ آنکھوں میں چُندھیاں رنگ رنگ رہی تھیں اور سارا جسم اندر ہی اندر ایک سُہانے ارتعاش سے پھڑک رہا تھا۔ کام پاس کے پیسے وہ کبھی ایک جٹ کو آتا، کبھی دوسرے کو اور اپنی دانست میں بہت ہی راز داری کی کوشش کر رہا تھا ——— وہ اس کے پاس بیٹھا تو گھنگھرو نے پیچھے سے نوٹوں کا بھولی طرح یار نا معلوم دیا۔ اور کسی ایک ادھ زیور کا دو ہوا پکارا، گھنگھرو کے تاروں میں سے اندھی دھوپ کی طرح جھلک کرنے لگا۔

اُس کا مُنہ خشک ہو گیا۔ دماغ میں غلیظ سا دُھواں ملا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پہلو بدل کر اس نے جائزہ لیا۔ ۔۔ لوگوں سے نیچے چھپتا ہوا جھلکتا گھنگھرو اور چاندی سی سڑک کی طرح بل کھاتا اُس کا سنہری کنارہ ——— بیچے ملے ہوئے گھنگھرو تک کودیں اور دونوں دوسرے ہاتھوں کا ڈھیر سا تھا۔ ہر چیز گندی تھی سوائے ایک گھنگھرو کے جو اُس وقت کی بہت ہی صاف اور نمایاں یاد تھی۔

اُس نے پھر بیچ بدلا ——— ہاتھ تھوڑے اُٹھائے ——— جیب ڈال دیے ——— جھجک سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھنگھرو اُلٹ دیا۔

وہ لا نیچے پڑی رہیں ——— اُن پر ہلکی سی مسکراہٹ ——— وہ دیکھتا رہا اور متوقع رہا کہ اب چھمیں چھمیں گی۔

...... چھمیں گی ...... چھمیں گی ...... مگر وہ ویسی ہی پڑی رہیں ——— اتنے میں چند سُنے ہوئے نام شوروں سے ٹوٹ جُھٹے اُٹھتے رہے تھے گئے ——— اور سنسنی والا ہاتھ جیب سے سینے پر پھیلنے لگا ——— انگلیوں کے دباؤ سے بے قراری سے اسے ملنے لگا۔

اُس ہاتھ کی کلائی میں ایک گھنگھرو کنگن سا بندھا ہوا تھا نیچے کو جھکنے لگا۔ جیسے چوڑیوں کی جھنکار پر کانپ رہا ہے ——— اور پھر جب

نسے نکلا اور نالی میں پہنچ گیا۔ جیسے بچہ لیٹنے سے ماں کی آغوش میں سمٹ جائے۔

عبدالرحمٰن کے جسم میں آگ سی دوڑ گئی ہوتی تھی۔ اُسے زندگی میں کسی لڑکی کے اتنا قریب بیٹھنے کا پہلا موقع تھا۔ اس لیے وہ گھبرا بھی رہا تھا۔ وہ باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا ـــــ پہلے رُک رُک کر ـــــ پھر ذرا اعتماد سے اور بے تکان بولنے لگا۔ مگر وہ باتوں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ پر اُسے کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا۔ وہ کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھتا کہ شاید ان میں سے کوئی کھل جائے۔ اس کے کپڑوں پر نظر ڈالتا کہ شاید وہیں سے کوئی بات ہاتھ آ جائے۔ کمرے میں خاموشی بڑھ رہی تھی کہ اس کی نظر پڑی

بلنے دینا اس نے سوچا۔ سُرخ کپڑوں کے اندر کیسی ہاتھ آتا اور چپکے سے تکمہ بھی پڑا ہوا۔

مدہم سا کہ بیٹھنے میں ریشمی سی کیا ہے پوچھا تو۔ اس کا پتہ کہہ ا یہ ہے:

ملگجے سے رنگ کا کلاوہ کی ڈوری پہ پکے ڈھونڈا تھا ـــــ پھر کلائی کی سرسراہٹ اور خوشبو کے جھونکے بھی اس کے پاس آ بیٹھے ـــــ وہ تلاش میں شامل ہو گئے ـــــ چارپائی کے نیچے ـــــ کرسی کے پاس ـــــ میز کے پائے کی اوٹ میں ـــــ جیسے عبدالرحمٰن کی انگلیوں اور کنگن نے زندگی میں پہلی بار کوئی دفینہ پالیا ہو ـــــ بٹن ہی مل گیا۔ عبدالرحمٰن نے بٹن اٹھا کر اس ہتھیلی پر رکھا اور اس کی طرف دیکھا

ـــــ مسکراہٹ

ـــــ دعا

ـــــ فرمائش

ہاتھ بڑھا کر اس نے دعا لی تھی ـــــ زور سے بٹن پکڑ لیا اور پھر ـــــ اُس نے کلائی چھوڑ دی۔ . . .

دو چار روز بعد جب حجاب کی دیواریں گر گئیں اور ان کے تعلقات مذاق کی سرحد میں داخل ہو گئے تو عبدالرحمٰن نے اس بٹن کو "مطلق بٹ" کا نام دیا۔ اور بیگماں بہت ہنسی۔ پھر وہ دونوں ہی اسے شگون کے لیے استعمال کرنے لگے۔ دقت ہونے پر وہ ملاقات بھی ایسا ہی جیسے دونوں تعلقات کے خاص پیارے رکھ ہیں جب زندگی کی شکل نے حقیقتیں بھی چیک اس نے لیں۔ جتنوں کبھی کبھی خانگی جھگڑے بھی ہو جاتے۔ شروع شروع میں معمول کی رنجشوں کے بعد دو تین روز تک بول چال بند رہنے لگی۔ ایسی حالت میں عبدالرحمٰن جب بھی صلح کرنا چاہتا۔ کرتے میں چپکے سے بٹن نکال لیتا اور کسی وقت بیگماں کے بازو میں چپکا دیتا ـــــ بٹن کرتا یہ شعبدہ کیسے نہ ہوا ہوتا۔ بیگماں بٹن چھتے ہی ہنس دیتی اور دونوں اگلے جھگڑے تک شیر و شکر رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بیگماں خود صلح کے لیے عبدالرحمٰن سے پہلے ہی وہ بٹن نکال کر ایسی جگہ رکھ دیتیں جہاں عبدالرحمٰن کی نگاہ سیدھی پڑنے کا امکان ہوتا تھا۔ وہ ایک دفعہ نظر پڑنے پر وہ مسکرا دیتا اور پھر سے چہک کا شکار ہو جاتا تھا۔

ایک دن اس طرح دوستی کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے مذاقاً سا ہو کر کہا تھا "بیگم جب سے تیری شادی ہوئی ہے مجھے کوئی زیور بھی نہیں خرید کر دے سکا۔"

تو بیگماں نے ہنسے ہنسے کہا تھا "آپ نے جب یہ بٹن پہنایا ہے میں سمجھتی ہوں سارا زیور پہن رکھا ہے جی۔"

عبدالرحمٰن کتنی ہی دیر تک مسکراتا رہا تھا۔

آج بیگمات نے خود ہی گلشن اُسے بیچنے کو دیا تھا۔ وہ بس سے دفتر جا رہا تھا تاکہ وہاں کچھ دیر کام کرنے کے بعد گھنٹہ بھر کی چھٹی لے کر بیچ آئے اور دوائیوں وغیرہ کا قرضہ اور ان کے گھٹنوں کا علاج جاری رکھ سکے۔

چیں۔۔۔ چیں۔۔۔۔ چوں گ گ۔۔۔۔ ایک دم کار کے اور پھر سخت بریک کی آواز نے اسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بیزار ہو گیا۔ سوچوں میں غرق وہ کار کے نیچے آنے لگا تھا مگر بروقت بریک نے اُسے بچا لیا۔ معذرت کے انداز میں اس نے کار پر نظر ڈالی تو اندر پرویز بیٹھا تھا۔ عبدالرحمٰن نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اُسے سلام کیا۔ مگر وہ ایک دم گھوم کے آگے نکل گیا اور عبدالرحمٰن دیر تک پیچھے سے لمبی چوڑی نیلی امپالا کار کے پچھلے شیشے پر گول گول سُرخ شیشے دیکھتا رہا۔

پرویز سکول کے زمانے میں عبدالرحمٰن کا ہم جماعت تھا۔ سب سے زیادہ نالائق۔ دسویں جماعت کر کے انقلاب کے پاس ہونے والے امتحان کے قریب عبدالرحمٰن کے پیچھے پیچھے گھومتا تھا۔ بعد ازاں کسی سرکاری ملازمت میں گیا تھا۔ سنا تھا بہت سارا پیسہ خورد برد کر کے استعفیٰ دے دیا اور اب اپنا کاروبار کرتا تھا۔ یہ نہیں پتہ کیا کاروبار کرتا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن کو یقین تھا کہ اس جیسا بے اصول اور کوئی الٹا سیدھا دھندا کرتا ہو گا۔

سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر چڑھتے ہوئے اس کا ذہن گھوم گیا پیسے کی کمائی پر۔ پھر جلد اُس کے دل میں خیال آیا کہ پرویز جیسے لوگوں کا کوئی کردار نہیں۔ مسکراتے ہیں اور وہ اپنے اصولوں کی خاطر اتنی تکلیف اٹھا رہا تھا۔ کہ زندگی کا سب سے پیارا اثاثہ فروخت کرنے جا رہا تھا۔ اس گلشن کی قیمت سنا تھا لاکھوں کے حساب سے ملتا۔ مگر اس کا تو اندازہ ان پیار بھرے لمحوں کو نہ تول سکے گا۔ جو پچھلے کئی برسوں پر انتہائی عبدالرحمٰن نے دیے تھے۔ سنا گھر والی کی قیمت تو مل جائے گا مگر اس کی تصویر کے بعد اس پر بیتے ہوئے گزشتہ ستائیس برس کی زندگی کی حرارت پہنچتے رہے ہیں۔ ان لمحوں میں کتنے ہی پہلے اور بھری یادیں بیتیں جو کبھی نہ بدلی جائیں گی۔ اس نے نہ چاہتے گلشن کو ہاتھ سے جانے دیا اور دفتر میں داخل ہو گیا۔ ۱۱

کرسی میں بیٹھتے ہی اس نے فائلوں کے ڈھیر پر نظر دوڑائی۔ ایک فائل کے ساتھ گلابی رنگ کا "اُردی" کا لیبل چسپاں تھا۔ اسے اٹھا لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ اتنے میں چپراسی نے اور فائلیں لا کر رکھ دیں۔ ان میں سے ایک پر بھی اسی قسم کا گلابی رنگ کا لیبل چسپاں تھا۔ عبدالرحمٰن نے پہلی فائل رکھ دی اور دوسری اٹھا کر دیکھنے لگا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ باقی اپنی میز پر بیٹھا افسر کی ڈانٹ کی چٹھی پڑھ رہا تھا جس میں اس کے پاس بہت سی پرانی فائلوں کے رکے ہونے کا ذکر تھا۔ ایک کلرک کام میں منہمک تھا۔ دوسرا کلرک سستی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور تیسرا قلم ہاتھ میں لیے کچھ نہیں لکھ رہا تھا۔

چپراسی ایک مہر ہاتھ میں پکڑے سرسراتا اندر آیا اور عبدالرحمٰن کو دیتے ہوئے بولا "صاحب نے یہ بھیجی ہے۔"

اس نے میز کی فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک فائل نکال کر دے دی۔

عبدالرحمٰن کمرے کے ماحول سے بیگانہ سا بیٹھا تھا۔ وہ ایک "ارجنٹ" فائل کو پڑھنے لگا۔ پہلا پیرا کئی بار پڑھتا

[illegible]
[illegible] تھا۔

[illegible]
[illegible] چنانچہ اس نے ایک [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— اس نے [illegible]
[illegible] ......
[illegible] ...... [illegible]
[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible]

جمال الدین نے دیکھا ——— [illegible]

——— [illegible]

——— [illegible]

——— باقر کا احساس

——— [illegible]

——— [illegible]

[illegible] ......
[illegible] ——— باقر نے [illegible]
[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] جمال الدین نے [illegible]

"مزید - مزید" وہ چیخا "چائے سے کون کافر انکار کر سکتا ہے ——؟ اسے کدھر گیا یہ لاٹ صاحب" اس نے ادھر ادھر چپراسی کو دیکھ کر کہا اور گھنٹی پر ہاتھ مارنے لگا مگر عبدالرحمان نے ہاتھ روک لیا۔ اس کا جسم اندر سے ایسے کانپ رہا تھا جیسے گزرنے والی گاڑی کی حرکت سے ٹین لرزتی ہے۔ وہ بولا۔

"میاں نہیں —— کینٹین میں چلتے ہیں —— ذرا گپ رہے گی۔"

کینٹین کے راستے میں عبدالرحمان کی گرفت اپنی مٹھی پر مضبوط ہونے لگی۔ اس کی انگلیوں کے پوروں نے آہستہ آہستہ کاغذ کو سمیٹنا شروع کیا۔ جیسے بکری گھاس کے پتے نگلتے ہوئے منہ میں کھینچتی ہے۔ کاغذ کا سپاٹ پھیلاؤ مڑ تڑ ہو کر اس کی کانپتی ہوئی مٹھی میں غائب ہونے لگا۔ بالآخر وہ سمٹ کر ایک چھوٹی سی گولی بن گیا۔ جسے عبدالرحمان نے انتہائی زور سے دبایا اور کینٹین میں داخل ہونے سے پہلے دروازے کے پاس پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں دے ماری۔

چارپائی پر گڈو سو رہا تھا۔ اس کا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ کبھی کبھار کوئی مکھی چہرے پر بیٹھتی تو وہ منہ سکوڑ دیتا یا نیند میں سر جھٹک دیتا۔ پاس بیگماں اور پارو کی ماں بیٹھی تھیں۔ پارو کی ماں بولے جا رہی تھی۔

"چوہدری کی بیوی میری مانتی تو آج کیوں خوار ہوتی۔ میں نے سو مرتبہ کہا کہ جوان لڑکی کی طلاق ہو گئی سو ہو گئی۔ اب اٹھنا ہے کہ کہیں اور شادی کر دو۔ کہتے ہیں رنڈیاں تو دو نکاح بھی بیٹھی ہیں مگر گشتے نہیں نکلنے دیتے۔ ٹھیک ہے دنیا میں نیک عورتیں بھی ہیں اور بد بھی۔ مگر جو نیکی بدی بھی تبھی ہے جب حالات سازگار ہوں۔ ورنہ تو اچھی بھلی نیک بیٹیوں کی نیکی کو ضدوں میں پیس کر کنا بگاڑ بنا دیتی ہے —— اور وہ تھی بھی خوبصورت۔ چندا کی شادی میں مرد کا پیسا بھی پڑ چکا ہے۔ اب وہ بیٹے اکیلی رہے گی۔ مگر چوہدری کی بیوی نہیں مانی۔ اب دیکھ لو گھر میں منہ چھپانے پڑی ہے۔ آخر کوئی تو ٹھکانے میں نظر رکھتی وہ تنہا بیٹی کو —— آبادی میں رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں ڈھیروں مرد چپٹے ہیں۔ کوئی لگا گیا ہو گا داؤ۔"

بیگماں ہنسنے لگی "تم تو بھی خوب حساب لگاتی ہو۔"

"ہاں - ہاں۔ تو کیا جھوٹ کہتی ہوں۔ مجھے تو ہیر پھیر کی بات کرنے کی عادت ہی نہیں۔ میں تو صاف کہا کہتی ہوں سچی چیز تو یہ ہے کہ اگر اب مجھے بھی مرد کے بغیر بنا پڑے تو جان عذاب ہو جائے۔ نہ جانے کیا کر گزروں۔"

پھر وہ ٹھٹھہ ڈال کر بولی "اور تو بتاؤ۔ بھلا تم رہ سکو گی۔"

بیگماں پھر ہنسنے لگی۔

"نہ - نہ۔ بات کرنا سیدھی —— آخر انسان ہو —— فطرت بھی تو کوئی چیز ہے یا نہیں۔ تم بے شک ذہن جھٹک سو دکر رہ لو گی۔ مگر میں تو صاف کہتی ہوں کہ جانا گزارہ نہیں ہو گا۔"

بیگماں بولی "ٹھیک ہے بہن۔ کام ذرا مشکل ہی ہے۔"

ملنے میں لگے دکھاوا، وہ دونوں ایسے مسکرائیں جیسے سیتی ہوئی ادھر تھیں۔

[illegible] ہو گیا [illegible]

[illegible] کر جاؤں [illegible] ———

[illegible]

[illegible] عبد [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ہو گئی

[illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]

[illegible] ہو گیا۔

[illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] خوشبو کے ساتھ [illegible]

روشنی کا اول پیاں طریقے سے غیر مانوس سی تھی۔ کمرے کا سارا ماحول بیگانہ لگتا تھا۔ اور برسوں کے گھسے پٹے سالوں کی ہر شے ایک نامونس تماشائی کی طرح چپ چاپ اس کے دل و دماغ کے اندر ہونے والی ہر حرکت کا مطالعہ دلچسپی سے اندازہ کر رہی ہو۔ جیسے کوئی سخت گیر کا سزا دینے سے پہلے خاموش اور گہری آنکھوں سے مجرم کا بیان سنتا ہے۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا مگر اس کے دماغ میں ایک بھاری انجن کے چلنے کا شور تھا۔ جس کی دھمک کرتی میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا

"یہ میں نے کیا کر دیا؟"

شروع میں جس پا کھلونا ٹوٹنے والے بچے کی طرح اب وہ تاسف میں کھویا اس لمحے کو واپس لانا چاہتا تھا۔ جب اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا اور اپنی زندگی از سر نو اس لمحے سے نئے سرے سے جاری کرنا چاہتا تھا۔ مگر کھلونا الٹ چکا تھا اور اس کے بکھرے ہوئے ملبے کے پیچھے تمام دکھ کے سارے سابقے لے غائب ہو چکے تھے ——— جیسے مرلی منہ زور ہوائی جہاز ایک دم غوطہ لگا کر فضا کی نامعلوم گہرائیوں میں کہیں فوراً ہی غائب ہو جائے اور شور سے بے قرار ہو کر اڑنے والی چڑیاں واپس نہ پہنچ سکیں

اتنے میں گڈو نیند بھری ہچکی دار آواز میں باہر آیا تو عبدالرحمن کے اپنے وجود کے اندر کی شادی اینٹیں دھارے میں سے دل میں اتر تی چلی گئی اور وہ شیشے کے دروازے پر سے جیسے سے وہ میں اس نے گڈو کے شانوں کو ایسے پکڑا جیسے ڈوبنے والا تنکے کو پکڑتا ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلتے ہوئے وہ خود ہی بڑبڑایا۔

"اب پانی سر سے گزر چکا ہے"

آج ڈاکٹر بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا۔ گڈو کی حالت دیکھنے میں اس نے بہت دیر لگائی۔ اور دوائی تبدیل کر دی۔ جب وہ بچے کے متعلق ہدایات دے رہا تھا تو اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔ اور جب عبدالرحمن گڈو کو گود میں لیے اٹھنے لگا تو ڈاکٹر نے دبیے ہی بچے کے سر پر ہلکا سا پیار بھی دیا۔

عبدالرحمن کا دل خوشی سے بھر آیا۔ پہلے میں کتنی حماقت تھی۔ اس نے سوچا آج کتنی ہمدردی کا رویہ ہے۔ اگر ایسا ہی سب ہوتا رہا تو انشاء اللہ گڈو جلدی ٹھیک ہو جائے گا

بچے کو گھر چھوڑ کر وہ بنیے بیٹے ہی بازار چلا گیا۔ دوائی وغیرہ خریدنے کے بعد اس نے بازار کا چکر لگایا اور ان تمام دکانوں کے بل ادا کیے جن کا وہ مقروض ہو چکا تھا۔ سب کو چکانے اور ادا کرنے کے بعد وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اور گھر کی واپسی کے راستے میں وہ ایک ریسٹوران میں گھس گیا۔

کولا کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا کہ عاقل بچ بول سکتا تھا۔ ایک معمولی سی چیز سے یہ ذہنی کشمکش ختم ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے دنیا میری نظروں میں تاریک جہنم تھی۔ یار دوست وہ ستم ایسے ذہن میں الجھ گئی ہوئی تھی۔ جینا شروع کر دیا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹنے سے وہ گھبرا گیا تھا کہ ہر دکاندار کے سامنے منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ذہنی الجھنوں سے کمزور ہو چکا تھا کہ زندگی بے معنی سی لگنے لگی تھی اور اب . . . .

نشانِ منزل کا سر منہ پر ہو دیتے ہوئے ڈالا گیا ——— سب کچھ [illegible]

دیا ہے۔ مگر وہ دشمنی ہو لیتا ہے بنا ——— پر ——— سب ٹھیک ہے

بیٹھا رہا ان میں ایک مرد اور ایک عورت داخل ہوئے۔ اس نے غور سے ان کو دیکھا۔ پہلی دفعہ [illegible] میں ملاقات کے لیے ہی دفتر کے ہمراہ گیا تھا تو یہ شخص بھی وہاں اپنے عزیز و اقارب کا ضمانت وغیرہ چیک کرا رہا تھا۔ غالباً کوئی کلرک یا اسسٹنٹ تھا۔ ایسا محسوس کر کے عبدالرحمٰن نے سوچا یہ عورت اس کی بیوی ہو گی تو اسے ایک دم مقتول کا قصہ یاد آ گیا۔ جو چاندنی کی طرح شوہر کے سب کو جتا کر بتا رہی تھی۔

بہار و رقت سے کچھ بیٹھ رہے تو۔ سڑک پر گاڑی اور لڑکی جاتے ہوئے قرآن کی تلاوت دیکھنے کے لیے لڑکے کو دیکھو مگر وہ انتظار میں رہا ہو تو عاشق ہے اگر عیب نہ رہا۔ اب تو جانتی ہے اور اگر یہ نظر تم نے تو کیا ہے؟

اس نے غور سے اپنا ہاتھ دیکھا اور پھر کہا وہ لڑکی کا عاشق ہے۔ کوئی لڑکی غالی تر آج صاحب سے کہتے ہوئے اس نے سوچا میں نے وہ [illegible] کیا بات ہے سو رہی ہے۔ خود اپنے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ دوست تو تمہارے عزیز بھی ہیں۔ تم چاہتے جو رہے ہو یا نہ ہو گیا تو آپ نقصان اٹھا رہا ہے۔

وہ منہ موڑ کر بیٹھ گیا اور اس پر سے آنکھ میں رکھ لیے۔ منہ کی آنکھ بند آہستہ کھول کر اس کے نیچے کرتی میں تبدیلی کر لیا پیر کے نیچے سے پاؤں [illegible] دوست جوڑتے وقت انگلی پکڑ لیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ کافی واضح نشانیاں تھیں۔

اس نے جواب کر تو اس کی بولی تھی سے وہ تیرہ منٹ ہوئے اور سوچنے لگا ہر قسم کے منہ پیٹ کے بغیر کچھ نہیں۔ حساب تو پیش نہ ہو گا۔ مگر یہ لڑکا کسی دن جیل بھی جا سکتا ہے۔ تو زندگی ہے اور یہی چند روز عیش نہ کیا تو کیا بات ہوئی۔ اور پھر تاج صاحب کو بھی نے سوروں کی قید میں شامل کیا۔ صاف بڑی بڑی خوشیوں سے خود محروم رہا۔ بس اپنی بیوی کی جانی کی ضامن ڈال ——— کی تھا ہے ——— پروں جاتے ہوں اس خیال میں سے تو سکر کے کیس لوپ کی مدد کا شکر اللہ خیر ہے۔ اتنی بیوی میں ہی کیا بات کہہ فائدہ ہی ہے۔۔۔ گورنمنٹ کو یہی نقصان نہ پہنچاؤں گا اور نہ دوں لگ کر لے۔ اس سے میں یہاں محنت کی مزدوری میں کما کھاؤں۔

بہرحال وہاں تو عبدالرحمٰن نے دس روپے کا نوٹ نئی شان سے نسے میں پھینکا۔ باقی پیسے واپس دیتے وقت پیشانی پر ایک رومال پھیر دیکھ کر جیب نے بھیک سے سلام پھر دیا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے عبدالرحمٰن دیر تک یہ سوچ رہا۔ باہر نکل کر وہ ڈرائی تو گزرگاہ پر کاروں، سائیکلوں اور پیدل لوگوں کی بھیڑ میں وہ بیا بست ہی سے ساتھ نکل گیا۔ جیسے ہی ایک ہاتھ ڈال کر وہ شخص تیز تیز چل دیا۔ فٹ پاتھ کے ایک کونے پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا اس کے کٹورے میں نے دو نئی نئی شان سے پھینکا۔

"میاں۔ ایک بیٹا اور دو..."

اس نے کمرے میں بھائی تو جیسے اطمینان سے کہ جو اس پاس بیٹھا ہوا ہو۔

"ذرا ٹھہرو ابھی آتا۔"

پاس میز کے سامنے چوڑا سا تختہ تھا۔ جس کے دونوں طرف ڈھکنے سے کھلے تھے۔ ان میں سگریٹ کی ڈبیاں جڑی تھیں۔ عبدالرحمان نے سامنے سے ڈبیا اٹھا کر پھاڑا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ مگر اس نے سوچا آج یہ مزا چکھنے میں بھی کیا حرج ہے۔ چنانچہ دس روپے کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔

"ایک ڈبیا قینچی کا سگریٹ اور ایک ماچس۔" باقر کو یہی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔

گھر کو جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ ذرا باقر سے ملتا چلے۔ وہ اُسے اپنا ہمدرد اور محسن نظر آ رہا تھا۔ جس کے بروقت مشورے اور تعاون سے اُس کی پریشانیاں دُور ہوئی تھیں۔

"ابے مولانا۔ کہاں گم رہتے ہیں؟" باقر مسکراتے ہوئے بولا۔

"پیر و مرشد کے مزار پر زیارت کے لیے آیا ہوں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"ٹھیک ہے بچہ۔ جس نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ سدا سکھی رہا۔" اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا اور پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

باقر اُسے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ فرش پر قیمتی قالین۔ بہت عمدہ صوفے اور کرسیاں۔ بھاری قیمت کا ریڈیو گرام۔ عبدالرحمان صوفے پر بیٹھا تو گدیوں میں دھنستا چلا گیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی آیا تھا اُس نے سوچا تھا یہ سب ساز و سامان حرام کی کمائی سے اکٹھا کیا تھا۔ مگر آج اُس نے حسرت بھری نظروں سے ان چیزوں کو دیکھا اور اُس کے دل میں چھوٹی سی اُمنگ نے سر اٹھایا کہ میں بھی اپنا کمرہ ایسے سجاؤں۔ اپنا گھر تو بالکل کباڑ خانہ ہے۔ اپنی تنخواہ میں تو یہی ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر اب باقر اسی طرح آسامیاں پھنساتا رہا۔ تو مشکل نہ ہوگا۔

اُس نے بڑی گرمجوشی سے باقر کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "اچھا تو اور کیا خبریں ہیں۔"

"بس مزے ہیں۔" باقر نخوت سے بولا۔

کمرے کے ایک طرف بہت بڑا ریک پڑا تھا۔ جس کے اندر سے نیا ریڈیو جھلک رہا تھا۔

"یہ اب خریدا ہے؟"

"نہیں میاں میرا نہیں ہے۔ تمہارے ایک پیر بھائی کا ہے۔"

"پیر بھائی" کی اصطلاح پر دونوں ہنس پڑے۔

"تو یہ پیر صاحب کے پاس کیسے آگیا؟"

"ابھی تو تنخواہیں ڈبل ہی ہوئی ہیں اور وہ تم نے۔ تم کے چلے گئے تو پتہ چلا کہ یہ ایک منصوبہ ہے۔ سو ملک کرتے رہتے ہیں۔ دس ہزار میں۔"

پھر کیا اعتراض ہے ؟

"کچھ نہیں ـــــ عجیب سی چیز ہے۔ اس نے کسی کا نام لیا تو کسی نے بجائے دو کی کار تک پہنچا دئیں۔ [illegible]

دیں نہیں۔"

"نہیں۔" عبدالرحمٰن مسکرایا۔ "یہ اتفاق ہے۔"

"یہاں یہ دیہاتی لوگ آباد ہیں۔ اور یہاں نئی بات بہت ہے۔ کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ اس لیے یہ [illegible]

[illegible]"

اس کے بعد ماحول سے نفرت سی تھی [illegible] اسے ایسی باتیں کچھ پوشیدہ حال بتانے لگیں جو اس کی زندگی اور دیہاتی لوگوں کے متعلق تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا وہ کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ جائے۔ اتنے میں باہر سے ماتی کی بیوی کے جھگڑنے کی آواز آئی۔ ماتی [illegible] جو بیوی کو ڈانٹ رہا تھا۔ پھر پیٹ کی دونوں سے [illegible] جاتے ہی تھوڑی دیر بعد ماتی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تیر تھے۔ وہ کھولا اور بچھا کر بیٹھ گیا۔

عبدالرحمٰن نے اس سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" [illegible]

"یہ وہ ہے جو آپ کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ جو لوگ ادھر آتے ہیں ان کے لیے سامان بنایا جاتا ہے۔" [illegible]

اس کے بعد بچے بھی آ گئے [illegible]

"تو کیا ہوا ؟"

"یہ تو کچھ بھی نہیں [illegible] میں نے آپ کو خاص طور پر منع کیا تھا کہ [illegible]

وہ گھر پر رہتا ہے [illegible]"

"مگر کیوں ؟"

"یار۔ عورتیں وغیرہ کی چیزیں ہوتی ہیں نا۔" ماتی زور سے ہنسا۔

"مگر یہ تو بڑا اچھا ہے ماتی۔"

"سب پتا ہے میرا بس۔" ماتی نے پھر قہقہہ لگایا۔ "تم کہتے کس لیے ہیں۔ تھوڑی دیر تو آرام کرو۔"

پھر ماتی اسے اپنے ساتھیوں کا حال بتانے لگا۔ کئی تو گھر جا چکے تھے اور کئی ابھی سب تھے۔ اتنے میں کوئی آواز سن کر وہ

اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے بچوں اور بیوی کے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ماتی نے چلا کر بیوی کو مارنا شروع کیا۔ وہ زور زور

سے چیخنے لگی۔

عبدالرحمٰن اٹھ کر چلا گیا۔

[illegible] ان کے پیچھے اس کے سر پر ایک گٹھڑی تھی۔ [illegible] تو چند بچے کھیل رہے تھے۔ ان میں سے وہ ایک

[illegible] عبدالرحمٰن نے [illegible]

…نے سوچنے لگا کہ وہ چار روز تک گڈو بھی ٹھیک ہو جائے گا اور اس کے ساتھ کھیلے گا۔ چنانچہ اس نے بڑی اپنائیت سے
…ہوئے گیند واپس کر دی ——— جب سے اُس کی ساس گھر میں موجود ہوئی تھیں وہ ہر چیز کے متعلق بہت پُرامید ہو
گیا تھا۔

مگر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں عورتوں کا ہجوم تھا ——— چارپائی پر گڈو سفید چادر میں ڈھکا تھا اور بیگماں
… رو رہی تھی۔

…نے سمجھ لیا۔ اب کیا ہونے والا ہے۔ پارو کی ماں پلٹی تو سب عورتیں مڑ کر دیکھنے لگیں۔ عبدالرحمان سہما متوحش سا
…اپنی بینائی پر یقین نہ آیا۔ بالکل خالی الذہن سا ہو کر آنکھیں پھاڑے سامنے چارپائی کو گھور رہا تھا۔ بیگماں ایک دم اٹھی
…اور دوڑ کر اُس سے چمٹ گئی۔ اُس کی چھاتی پر جھکا ہوا چہرہ رکھ کر چیخی "کہاں تھے تم۔ وہ تمہیں پکارتا گیا ———
…اوں اوں .... وہ تمہیں پکارتا ——— وہ 'ابا جی' 'ابا جی' کہتا رہا ——— تم کہاں گئے تھے ... ———
…نے تو وہ کبھی نہ جاتا ...... ہوں اوں اوں اوں ....."

عبدالرحمان نے اُسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"…ہاں چلا گیا میرا گڈو … میں اس کے لئے پیش بندی کر رہا ——— اور وہ چپکے سے چلا گیا ——— اپنے اللہ میں
… ——— یہ ٹھیک کیا تھا وہ بھی چھین لیا ......"

پارو کی ماں آگے آئی۔ اُس نے بیگماں کو کھینچ کر پرے کیا۔ "وہ صبر کرو بہن …"

…سے بچوں کی جیسی بولی بولی "آؤ بیٹے ملو جی آپ؟"

عبدالرحمان سر جھکا کر … کے پاس آکے بیٹھا۔ عورتیں کھسک گئیں۔ دونوں کے کندھوں … گھٹنوں سے … چارپائی کے ساتھ
——— بستر پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیچ میں چھوٹا سا جسم تھا۔ عبدالرحمان کو توقع تھی کہ جیسے وہ قریب پہنچے گا۔ گڈو اٹھ بیٹھے
…پر گڈو بیٹھ گیا ہو گا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ چادر کی سلوٹوں سے … اور گڈو ایک آنکھ کھولے
گا۔

"… ابا جی!"

مگر اس طرح کی حرکت نہ ہوئی اور وہ غلط ثابت ہو گیا۔

جب اس نے ہمت کر کے لرزتے ہاتھ سے چادر کا سرا اٹھایا۔

عورتوں کی چیخیں ایک دم آسمان تک جا پہنچیں۔ بیگماں پچھاڑ کھا کر گری۔ پارو کی ماں اور دوسری عورتیں فوراً
… بڑھیں۔

گڈو کا چہرہ بالکل پرسکون اور خاموش تھا۔ اُس پر جیسے … کا خول چڑھا تھا ——— مکمل سکوت۔ آنکھیں بند تھیں …
… سکون۔ پیلی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔ … ہونٹوں کے گرد … تھے جیسے … ہونٹ بھینچے

ہوئے دفتر کے ایک کمرے سے [illegible] تھے پہلے سے بیگ [illegible] ہوئے [illegible] کمرے پر
پہنچے تھے

عبدالرحمن نے اخبار پر آنکھیں ٹکائیں تو پہلے [illegible] گیا۔ [illegible] نرم اور [illegible] گول [illegible] کی صورت
کر کے [illegible] عبدالرحمن [illegible] ذرا سا [illegible] دیکھتا رہا۔ پھر سب ایک [illegible] میں غائب ہونے لگا...

منہ کا ذائقہ [illegible] ہو گیا...

[illegible] وہ [illegible] ہونے لگے۔

پھر ایک دم سب کچھ [illegible] ——— آنکھیں [illegible] کے گرد [illegible] میں [illegible] ڈال کر [illegible]
عبدالرحمن نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر ڈال کر [illegible] چارپائی کے پائے پر جھک گیا

(دس برس بعد وہ دفتر میں داخل ہوا)

وہاں کا ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ دروازے پر سپاہی چاق و چوبند کھڑا تھا۔ [illegible] سے
پاس [illegible] جانے والے [illegible] تھے سائیکلوں کے پہیے اور [illegible] کاروں کی [illegible]
[illegible] گزر رہی تھی۔ کچھ [illegible] ایک کمرے سے [illegible] دوسرے کمرے میں جا رہے تھے
[illegible] افسروں کے کمروں میں [illegible] صاحبوں کے کمروں کے دروازوں
پر گھنٹی کی آواز سن کر چپراسی اندر کو [illegible] تھے۔ کوئی وقت [illegible] سلام کر دیتا۔ [illegible]
والے [illegible] کا [illegible] کرتے تھے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ مگر [illegible] سب بہت عجیب [illegible] تھا۔ [illegible] اور [illegible] وہ پہلے اندر
داخل ہونے [illegible] تھا اس کی [illegible] ایک خلا تھا ہر قسم کی [illegible] سے خالی تھا۔ فضا میں ایک [illegible]
تھی جس کے [illegible] اور [illegible] دنیا کا کاروبار [illegible] تھا۔ [illegible] وہ اس ماحول سے [illegible] کر رہا تھا۔

دفتر کے [illegible] ساتھیوں نے [illegible] دیکھا آخر لوگ اس کے [illegible] کے پیچھے [illegible]
[illegible] ایک ایک کر کے آنے لگے۔ وہ [illegible]
[illegible] چلے جاتے [illegible] سے [illegible] وہ [illegible]
تھا۔ [illegible]

چپراسی کی آواز دروازے میں سے سنائی دی

"وہ بیٹھے ہیں؟"

اس نے مڑ کر دیکھا تو چپراسی ایک [illegible] دیکھ رہا تھا [illegible] شکل سے شناسا تھی

[illegible] دفن کیا ہے۔ اُس نے [illegible] کیسے پہنچ آیا ہے۔ مگر وہ قریب آکر سٹول پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا

"میرا نام عبدالخالق ہے۔"

عبدالرحمان نے سر ہلایا۔

"مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کا بچہ فوت ہو گیا ہے"

عبدالرحمان نے پھر سر ہلایا۔

عبدالخالق نے ہاتھ میز پر رکھا۔ شہادت کی انگلی کے ناخن سے میز کی سطح کو کھرچنے لگا۔ وہ خود ہی انگلی کی حرکت دیکھتا رہا — پھر بولا

"میرا بھی بچہ فوت ہو گیا تھا ——"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ —— عبدالرحمان متوقع رہا کہ وہ کچھ کہے گا۔ مگر وہ چپ رہا۔ عبدالرحمان کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ سوجھتا نہ تھا۔ وہ متفکر بیٹھا [illegible] رہا۔

عبدالخالق پھر بولا

"اُس کی عمر پانچ سال کی تھی . . . پچھلے ہفتے چالیسواں کیا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ عبدالرحمان بھی چپ تھا۔

پھر وہ بڑی دیر اُس کے پاس خاموش بیٹھا رہا۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ مگر عبدالرحمان کو یہ احساس ہو رہا تھا جیسے اُن [illegible] ایک دوسرے سے بندھے بیٹھے ہیں اور اُن کی بے زبانی ایک دوسرے کے دُکھے ہوئے دلوں کو پُرخلوص ہمدردی سے چھوئے جا رہی ہے۔ اپنے اپنے غم میں وہ ایک دوسرے کا دُکھ بانٹ رہے تھے۔ جیسے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہوں۔ اُس کے دل و دماغ میں [illegible] کی کیفیت تھی۔ [illegible] کی تسکین تھی جو انہیں سکون دے رہی تھی۔ اس طرح محسوس [illegible] انگلی کی طرح جو ستار بجاتے ہوئے تاروں کی [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] ہوتی ہوئی بالکل ساکت ہو [illegible] ہے۔

کافی دیر کی خاموش نشست کے بعد عبدالخالق اُٹھ کھڑا ہوا۔ عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ہمدردی سے دبایا اور بولا

"اب چلتا ہوں۔"

وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ راستے میں عبدالرحمان نے اُس کی دو شاخی چھڑی دیکھی۔ اُس کے سر کی پشت پر [illegible] کے سامنے تھے۔ ناہموار چال [illegible] کی زنجیر [illegible] اور [illegible] سے مڑتے وقت نظر آنے والا ایک [illegible] پر خاموش قرب کا سایہ تھا۔ [illegible] عبدالرحمان [illegible] کے سینے کی گرمی [illegible] وہ اپنا [illegible] عبدالخالق کے متعلق سوچنے لگا۔ [illegible] اُس کے پاس تعزیت کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے [illegible] بھی کہے تھے۔ مگر کسی کی بات سے عبدالرحمان کو اتنی تسکین نہ ہوئی تھی۔ جتنی اس ناواقف شخص کی خاموش [illegible] سے [illegible] ہوئی ہے۔

ہاتھ جھٹک کر وہ فائلیں اٹھانے لگا۔

مسٹر داس یہ فائلیں سب پہچانتے تھے۔ جنہیں ہمیشہ کام کرنا پڑا۔ کسی فائل پر وہ بہت پریشان تھا، کسی کو دیکھ کر اس میں مگن تھا، کسی پر نوٹ لکھنا تھا۔ کسی کے متعلق کلرک سے پوچھنا تھا۔ ان فائلوں سے وہ بے حد واقف تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے سب کو پڑھتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل کام میں لگنے لگا اور وہ اس میں منہمک ہو گیا —— مگر ایک نئی فائل اٹھائی تو ایک تحریر سامنے آ گئی۔ وہ رک گیا ——

—— یہ وہی فائل تھی ——

اور اسی فائل نے اس کے بچے کی جان لی تھی

پچھلے دس روز میں یہ خیال اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ بچے کی موت خدا کی طرف سے سزا تھی۔ اگر وہ رشوت نہ لیتا تو اس کا بچہ یقیناً ٹھیک ہو جاتا۔ وہ پہلے کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر دل ہی دل میں دعا کرتا رہا جو بیگم اس کو تسلی دینے کو آیا کرتی۔ وہ کئی دفعہ بیٹا کہتی کہ جب کبھی بچی کی زندگی کے دن بیتیں گے ہم دونوں چھپا نہیں سکتے تو مہاراج کے دل میں گھر وسوسوں نے انتشار پیدا نہیں کیا۔ گو وہ شریف رہا تھا جس نے رشوت لی اور بہر حال اپنے آپ سے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا سمجھا کہ وہ سزا خدا کی طرف سے تھی۔ اگر میں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا تو یقیناً اس عذاب سے بچ جاتا

وہ خیال مضبوط ہوتا چلا گیا جب اس نے خواب دیکھا ...

یہ تیسری رات تھی۔ سب لوگ بچے کے مرنے کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ وہ گھر میں رات کے بارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ اس کے بعد سے تنہا گھر بیگم نے وہ دروازہ کھول دیا جس میں کوئی چیز پڑی تھی۔ پارک کے عقب بڑے بڑے پیڑ تھے اور ان کی خالی ڈالیاں ایک دوسرے پر گری ہوئی تھیں۔ اس کے گھر سے جو دروازہ کا چیز کر سڑک کی طرف جاتا تھا وہ بچے کی لاش کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ سفید چادر میں لپٹا ہوا وہ چھوٹا سا جسم پانی کا قطرہ جس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر رکھا تھا۔ کھڑکی کا پردہ کھلا ہوا تھا اور ہوا میں کئی خشک پتیاں بکھری پڑی تھیں اور وہ خالی ہاتھ لوٹ آتی

عبدالرحمن نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ اندر دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ زمین سے دھکیل کر چارپائی تک لے گیا۔ وہاں اسے بٹھایا۔ بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو سہلانے لگا۔ خود اس کا دل رو رہا تھا مگر وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ کبھی خدا کی مرضی کا ذکر کرتا۔ کبھی وعدہ کرتا کہ کبھی زیادہ غم نہ کرے گا۔ اس کی صحت کی خرابی کے خطرے کا اندیشہ ظاہر کرتا۔ کبھی اور بچوں کی امید دلاتا۔ کافی دیر بعد آہستہ آہستہ بیگم کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگیں اور وہ پھیکی پڑ گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ وقفے کے بعد کسی سسکی سے ٹھہر جاتی۔ عبدالرحمن اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا یا ماتھے پر بکھرے بالوں کو سنوار دیتا۔ یا پیار سے تھپکتا۔ اس نے سہارا دے کر اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھنا شروع کیا ——

شام گہری ہو رہی تھی۔ چھپّر کی سیاہی میں وہ ڈھیر سا بن کر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ عبدالرحمان نے اُس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ کھسکا دیا۔ پھر زور سے اپنے سے علیحدہ کیا اور ایک ہاتھ سے ٹھوڑی اُٹھا کر کہنے لگا۔

"اُٹھو۔ بگی۔ کھانا کھاؤ۔"

بگیاں کا سارا جسم ایک دبی ہوئی سسکی کے اُبھرنے سے کانپ اُٹھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے اُس نے گود میں سر چھپا دیا۔

"میں نہیں کھاؤں گی آپ کھائیں۔"

"تھوڑا سا تو چکھ لو" عبدالرحمان نے منت کی۔

"اچھا جی" وہ پرے ہٹ کر ناک صاف کرنے لگی۔

خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ اندر سے بستر اُٹھا کر لائی۔ کھیس کو تہہ کر کے چارپائی پر بچھایا۔ تکیے پر دھپ مار کر مٹی اُڑائی۔ اور پائینتی پر رکھ دیا۔ اور پھر چادر کو دونوں کونوں سے پکڑ کر جھاڑا —— شام کے اندھیرے میں کوئی چیز اُچھل کر چارپائی پر گری —— چادر کے دوسرے کنارے کو ایک ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بگیاں نے دوسرے ہاتھ سے وہ چیز اُٹھائی اور عبدالرحمان بھی حیرت سے دیکھنے لگا۔

...... وہ گڈے کا سر تھا۔ پیچھے پر پیلی پٹیاں تھیں اور ماتھے پر سرخ رنگ کے گول گول دائرے تھے۔ ایک ذرا سا سر۔ رنگ تھا اور اس میں سے دو ایک پھوسڑے باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ سر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ بگیاں کی کھلی ہتھیلی پر سما گیا تھا۔ گڈے کا چپٹا سا سر۔ جس میں اب سرخ بھی نہیں تھی ان میں سے بھوری بھوری سی دل پشم باہر آتی تھی۔

بگیاں نے دست کشی کرتے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور رونے لگی۔ روتی ہوئی اسی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اب اُس سے منہ سے کچھ ضبط نہ ہو سکا اور وہ بھی اُسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے دیر تک چارپائی پر پڑی رہی اور تاریک سی میں بھیگی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں پتہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے —— ایسے ہی روتے روتے دونوں سو گئے۔

اُسی نیند میں عبدالرحمان نے وہ خواب دیکھا......

...... تاریک سا ماحول —— بادلوں کی گرج —— بجلی کی چمک اور جیسا گھپ اندھیرا —— کسی وقت بجلی کی روشنی میں ایک سیدھی سڑک پر سفید کپڑے پہنے ہوئے کوئی آتا ہے۔ عبدالرحمان اُس کے پیچھے لپکتا ہے۔ تعاقب کرتا ہے۔ مگر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ سڑک پر کبھی دکھتا ہے۔ کبھی جنگل میں اور گہرے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے —— پھر عبدالرحمان ایک پہاڑی ہے جس کے نیچے ندی دوڑتی ہے۔ اس کے ایک طرف بہت اونچی چوٹی ہے جس پر بادلوں کے دھوئیں میں آگ جل رہی ہے۔ اس آگ کے شعلوں کے اوپر ہوا میں گڈے کا سر اوپر نیچے جھومتا ہے۔ عبدالرحمان اسے دیکھتا ہے تو ایک ہولناک شور ہوتا ہے جو چیزوں سے آگے بڑھ کر زیادہ روشن ہوتا ہے۔ عبدالرحمان اُس میں کھو جاتا ہے تو وہ مڑ کر دیکھتا ہے ——

... جب وہ پوچھتا ہے کہ وہ ملازم کا معائنہ کر لیں۔ ڈاکٹر جونس کر عبدالرحمن کی طرف دیکھتا ہے پھر اپنے بیگ میں سے [illegible] نکال کر اس میں بھر لیتا ہے۔ شیشے بند ہو جاتے ہیں۔ کمرے کی دیپ زیادہ ہو جاتی ہے۔ عبدالرحمن کی چیخ حلق میں پھنس جاتی ہے ......

آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھا۔ حلق خشک تھا اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ساتھ ہی بیگم گہری نیند سو رہی تھی۔ اور کمرے میں گرمی کی وجہ سے چہرہ اوپر کر رکھا تھا۔ اور چاند کی مدھم روشنی میں رخساروں پر آنسوؤں کا راستہ چمک رہا تھا۔ وہ جیسے سسکتے سسکتے سو گئی تھی۔ عبدالرحمن دبے دبے اٹھا اور برآمدے میں نکل آیا۔ [illegible]

رات کا سناٹا گہرا ہو رہا تھا۔ دور دور چھپے ہوئے تارے اور افق کے دھندلے نقوش میں کائنات کی لامحدود وسعت میں خود کو کھویا ہوا پاتا تھا۔ آدھی رات کی پھیکی روشنی نے جیسے سامنے پڑی ہر چیز کو دن کی نسبت زیادہ بڑا بنا دیا تھا۔ اس وسیع نیم تاریک سماں میں عبدالرحمن ایک ایسا معمولی سا آدمی تھا جیسے سمندر کی بڑی اور وسیع سطح پر [illegible] کا ایک ذرہ ہو ——— مگر اس کی وحشت زدہ دماغ کی بھیانک حالت سے بھی وسیع تر تھی۔ ایک پریشان ذہن کی پریشانی سے سامنے افق کی جانب ہوتے ہوئے [illegible] اس تاریک دنیا میں عبدالرحمن اکیلا تھا۔ [illegible] نیم تاریک فضا میں [illegible] کا احساس شدت سے [illegible] ہونے لگا۔ اور اس ذہنی کیفیت کے زیر اثر اس کے اعصاب پر چھا گئے اور وہ [illegible] کر دیا۔ یہ سب اس کا قصور ہے۔ گھر میں اپنا اپنا خواب [illegible] مگر اب وہ ہے جو [illegible] سے [illegible] بھاگنا [illegible] جاتا ہے۔ میں تو [illegible] سے [illegible] ہی اپنے اس گھر میں بیٹھا [illegible] سے [illegible] زیادہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ میں سنبھل جاؤں ——— یہ بھی شکر ہے کہ میں نے وہ نہیں لیا کہ کسی کو پتا نہیں تھا۔ اب میں تو [illegible] خراب نہ کروں گا۔ ایمانداری سے [illegible] کروں گا۔ جو لوگوں سے میں نے رشوت کا پیسہ لیا ہے۔ ان کو واپس دے دوں گا۔ زندگی میں ایک [illegible] کی ہے۔ اب [illegible] اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر نیت کا حال جاننے والا جانتا ہے۔ خدا تو جانتا ہے۔ اب اگر میں [illegible] راستے پر چلنا چاہوں گا تو یقیناً خدا میری مدد کرے گا۔ پیسے واپس کرنے کے لیے اگر مجھے گھر کی چیزیں بھی بیچنا پڑیں تو بیچ دوں گا۔ بیگم یقیناً میرے موافق ہو گی۔

یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ایک گلاس پانی پینے سے اعصاب کو تقویت ہوئی اور وہ اندر آ کر لیٹ گیا۔ چھٹی کے [illegible] دنوں میں یہ خیال زیادہ تقویت پکڑتا گیا اور وہ نماز پڑھتے وقت اور [illegible] کے لیے توبہ کرتا۔

آج [illegible] فائل اس کے سامنے تھی جو اسی کا آئینہ تھی [illegible] کر رہی تھی۔ اس فائل کے ذریعے اب وہ اپنے [illegible] کو [illegible] جانا [illegible] اس نے کام شروع کیا۔ [illegible] کے [illegible] اس کے ہونے کی [illegible] اس [illegible] میں بیٹھے [illegible] کے تعاون کرتے [illegible] چلا جا رہا ہے۔ اپنے آپ کو پہلے جیسا ایماندار بنانے [illegible] کی [illegible] ہو رہی ہے۔ [illegible] پانچ سو روپے قسطوں میں ادا کرے گا۔ آدمی تو [illegible] ہو گی۔

گھر دوسرے دن اُسے پتہ چلا کہ عاقل نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اس نے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"اچھا ہی کیا نا۔ روز روز کی چخ چخ سے تو یہی بہتر تھا۔"

"مگر بھائی تم چخ چخ ختم کرنے کی کوشش کرتے ——— یہ بھلا کیا حل سوچا تم نے۔"

"چھوڑو بھائی تم کیا نصیحت لے بیٹھے۔ بس اب جھگڑا ہی ختم کر دیا ہے۔"

"تو اب کیا کرو گے؟"

عاقل نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر مسکراتے ہوئے دھواں چھوڑا اور وقفے کے بعد بولا تو کیا عورتوں کی کمی ہے دنیا میں؟ — بھری پڑی ہیں۔ وہ تو یہیں بیوی کی موجودگی میں بھی مل جاتی تھیں۔ اب تو پوری آزادی ہوگی ——— مزے میں سب کچھ کریں گے۔ نہ روک نہ ٹوک۔"

"اور اس بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"بتایا ہے" عاقل لاپرواہی سے بولا "شادی کر لے گی یا کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی ——— یا پھر دن کو نمازیں پڑھا کرے گی اور رات کو چھپ چھپا کر کسی کے بستر میں گھس جایا کرے گی ——— آخر ہمسائے کس مرض کی دوا ہیں"

اور وہ خود ہی اپنے مذاق پر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

عبدالرحمان مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر واپس چلا آیا۔ اس نے سوچا دوستوں کی بات کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔ چند دن بعد کیا جائے گا۔

مگر ان چند دنوں میں ہی ملک واپس آ گئی اور اس میں عاقل کی پارٹی کے خلاف فیصلہ ہو چکا تھا۔

دوپہر کے وقت کے بعد عبدالرحمن تیزی سے فٹ پاتھ پر ہو لیا۔ لوگ سائیکلوں پر ٹیکسیوں پر اور پیدل جا رہے تھے۔ بلاکوں کی ایک لمبی لائن سے آ رہی تھی۔ وہ ایک پیچھے تھے مگر وہ اس سے پہلے اپنے خیالوں میں کھو جاتا جو ابھی تک ... اور سڑک کے دوسرے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عاقل کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔

عبدالرحمن نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ... اس کو زور سے ہاتھ میں تھام کر عاقل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جلدی جلدی اپنے ساتھ چلنے لگا۔

"رحمن، یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" خشک حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

"مجھ سے پوچھتے ہو کیا ہو رہا ہے ——— تم نے کیا تماشہ لگا رکھا ہے۔ کیسے ذلیل ... کر رکھ دیا اور سارا بزنس بھی خراب کر دیا۔ تمہیں تو کچھ شرم ہی نہیں ... مشکل وقت میں شادی کی تھی تب دنیا میں ... تماشہ بنایا تھا۔ اب تم کر رہے ... میں اپنے گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"سنو عاقل، تم مجھے ... میں ... کروں گا۔"

"میں روپیہ واپس کر دوں گا۔" عاقل غصے میں دانت پیستا رہا۔ "بھئی تمہارے روپوں کا کیا کروں گا۔ میرا روپے کی بحث ہی کیا ہے۔ میرا تو سب کچھ تباہ کر دیا ۔۔۔۔ میں تو ان روپوں پر تھوکتا بھی نہیں۔"

"تو پھر چاہتے کیا ہو؟"

"تم نے میرا تماشا بنوا دیا ۔۔۔۔ میری ساکھ ضائع کر دی۔ ایک شعبدہ باز میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میں تمہارے بدلے کیا دوں گا۔ آخر اس بھی تو کوئی شے ہے۔ اصول بھی کوئی چیز ہے۔ میں اب ان لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"عاقل بھائی۔ تمہارا رویہ بہت نرم تھا۔" "اصول سے قریب تر رہو۔ یہ اور تم مجھے شکست پر مجبور کر کے مجھے کس اصول پر قائم رکھ سکتے ہو؟"

"میں تمہارے اصولوں کی بات نہیں کر رہا۔ اور نہ تم وہ سمجھو گے۔ میں نے زندگی کو اصول کا نام نہیں دیا۔ میری زندگی کو کسی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ مردہ ہے جو اصولوں کا سہارا لیتا ہے۔ میں تو ان اصولوں کی بات کر رہا ہوں جو زندہ رکھ کر زندگی کے کاروبار کی حفاظت کے اصول ہیں۔ تم کیسے یہ اصول سمجھاؤ گے۔"

بحث ہوتی گئی۔ عبدالرحمن نے اپنی مجبوری کا ذکر کیا۔ پٹھان کی بات قدرت کی طرف سے ملا بیان کی۔ اپنی توبہ کا ذکر کیا۔ مگر عاقل اس تمہید کو فضول سمجھا۔ وہ بات کہتا تھا۔ اس کی ساکھ بگڑ گئی تھی۔ کاروبار خراب ہو گیا تھا اور اس کے پیسے ڈوب گئے تھے۔ اور آخر عبدالرحمن کو غصہ آ گیا۔

"جب میں تمہارے روپے واپس کر رہا ہوں۔ تو تمہیں اور کیا چاہیے ۔۔۔۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

عاقل نے سارا غصہ پیڈل پر پال رکھا۔ اور بولا "یا تو جیسے تیسے کر کے دوبارہ ٹھیک کر دو۔ یا پھر تمہیں اپنا ماسٹر بننا منظور کرنا پڑے گا کہ میری ساکھ قائم رہ جائے۔"

اور وہ پیڈل پر پاؤں رکھ کر چلا جا۔

"نہیں نہیں ایسا" عبدالرحمن نے اسے کھینچ کر کہا اور سڑک پر زور سے دھکیل دیا۔

اگلے چار پانچ روز ان دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ عبدالرحمن کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ معاملہ رفع کرے مگر عاقل کوئی موقع ہی نہ دیتا تھا۔ وہ مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر جب عبدالرحمن سر جھکائے کام کر رہا تھا تو تین سپاہی اور ایک مجسٹریٹ اندر داخل ہوئے۔ وہ سیدھے عاقل کی میز کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ تھا جس میں پانچ سو روپے عبدالرحمن کو دیے تھے۔ عاقل نے مجسٹریٹ کے استفسار پر اس کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ رہا شخص" مجسٹریٹ نے کہا

عبدالرحمن کا ہوش ساکت ہو گیا۔ ایک سپاہی نے کرسی کی تلاشی لی تو نیچے دو ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ مجسٹریٹ نے نوٹ اٹھائے

اور اوپر اپنے دستخط شناخت کیے۔ عبدالرحمان نے پھٹی پھٹی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر چلا کر بولا۔

"یہ سب دھوکا ہے۔ یہ نوٹ کسی نے یہاں رکھ دیے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے سپاہیوں کو اشارا کیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر عبدالرحمان کو پکڑ لیا۔ اس نے زخمی پرندے کی طرح آخری دفعہ نگاہ اٹھائی۔

عاشق اپنی کرسی پر نہ تھا۔

وارڈن نے تالے میں کنجی گھمائی تو اندر والے قیدی اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گئے اور نئے قیدی کو دیکھنے لگے۔

دروازے کی چولوں سے چیخ نکلی اور وہ بھاری گھسیٹ سے تھوڑا کھل گیا۔

"اندر!" وارڈر نے عبدالرحمان کو اشارا کیا۔ وہ جھجکا —— ایک قدم اٹھایا —— پھر رکا —— مگر وارڈر نے اسے پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔

"ارے چل اندر —— جو تو لگتا ہے یہاں آتے ہی کرتا ہے۔"

پھر پیچھے سے بند ہونے والے آہنی دروازے کے زور دار دھکے نے اسے آگے کمرے میں دھکیل دیا۔

کنجی گھماتے ہوئے وارڈر چلایا "اب آرام سے رہنا سمجھے۔ خبردار جو اس کو کسی بری حرکت پہ اکسایا۔"

کمرے میں دو اور قیدی تھے۔ انھوں نے دیکھا نیا قیدی ڈرا ڈرا سا ہوا سامنے کی دیوار تک پہنچا اور دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی نظروں سے فرش کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے ماحول یا اس میں رہنے والوں کا جائزہ لینے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بلکہ ماحول کی گرفت سے گھبرا کر اپنے میں دبک جانے والی بھیگی بلی کی طرح چپکا بیٹھا ہوا زمین کو دیکھتا رہا۔

ان دونوں قیدیوں میں سے ایک لمبا چوڑا تنومند جاٹ تھا۔ جس کے سات فٹ اونچے جسم کی اٹھان میانوالی کے میدانوں میں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی، لال لال، ابھری ہوئی تھیں۔ سر پہ لمبے لمبے بال تھے اور چوڑی ہڈیوں والے کرخت چہرے پر گھنی گھنی مونچھیں جو اس کے بڑے ناک کے اوپر پھیلی تھیں۔ اس کے ماتھے پر ایک ساز خم کا نشان تھا۔ اور قیدیوں کا لباس اس کے جسم پہ جب بیٹھے سے تنگ کھڑا تھا۔ اونچے پاجامے میں سے اس کی کسی ہوئی پنڈلیاں ایک ساتھ ابھر کر آتی تھیں اور آستینوں میں سے بالوں بھرے موٹے بازو نکل کر بڑی دور بھاری ہاتھوں کو سنبھالے تھے۔ جن کی موٹی کالی کھردری انگلیوں میں چاندی کے چھلے تھے۔ اس کی عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی مگر کاٹھی بے حد مضبوط تھی۔ اور وہ اپنے تنومند مضبوط جسم کو ایک دم سیدھا کیے لال آنکھوں سے نئے قیدی کو دلچسپی سے گھور رہا تھا۔

دوسرا چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ بھی قیدیوں والا موٹا دھاری دار لباس پہنے تھا۔ اور اس کے انداز اور وضع قطع سے بڑی تیکھے کا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر غرور والی کرختگی نہ تھی۔ بلکہ ایسے کمال کی نرم خاص معصومیت تھی جو ذہنی کام سے لگتی پہ سلام کر کے آ رہا ہو۔ سیدھی ستواں ناک چوڑا ماتھا اور تیز چمکدار آنکھیں جن میں سنجیدگی کا اجالا سا جھلک رہا تھا۔

اس کمرے کے دوسرے کونے میں قیدی کو غور سے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا جو اپنے بستر پر جوگی کی طرح کلادن بیٹھا
تھا۔ پھر اس نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بوڑھا آدمی بے تکلفی سے آگے بڑھا اور اس نے بے تکلفی سے رنگے کے
کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ مسکرا کر ان نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم بڑے بابو" وہ پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا۔ "جیل تو مردوں کا سسرال ہے۔ میاں بیٹھے آؤ۔ اور
بیٹھے جاؤ۔"

دوسرے قیدی بھی ہنسنے لگے۔ لطف کی بات یہ تھی جیسے وہ اس وقت سنا رہا تھا اور پہلے قیدی کی بات میں اپنے آپ کو بھی
شامل کرنا چاہتا ہو۔

بہار میاں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" وہ اس کے پاس جا بیٹھا اور اپنی ٹانگوں کے
درمیان سے سر اٹھا کر بولا۔ "بتاؤ، وہ کیا بیچتے تھے؟ دو چار دن کی بات ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" "دوسرا قیدی بولا" "تو بھی ہوتا تھا چلے دو۔"

رنگے نے اپنی ادھوری نظروں سے ہاتھ ملایا۔ "تو پڑھا لکھا لگتا ہے۔"

"پڑھا تو کچھ یاد نہیں۔ مگر بہت زیادہ شوقین تھا۔ جس دن پولیس نے پکڑا تھا میں نے ریشمی کپڑے پہن کر
گیا تھا۔ اس وقت دل دھڑکتا۔ ابرق والی پگڑی۔ کندھے پر نئی چادر۔ دنیا والوں میں نیا موسم۔ وکیل ان کے پاس نے جھوٹ بولا تھا
کہ زندگی بھر جاؤ گے۔ وہاں کی یادیں بھول گیا۔ اس نے اگلے سات سال کے لئے۔"

رنگے نے کہا۔ "یہ بہت مزے دار تماشا نکلا۔" اور پھر اس نے سننا شروع کیا۔ بات کرتے وقت وہ ساتھ ساتھ گلیوں سے بچوں
کا بھی جائزہ لیتا رہا۔

"وہ دن اب بھی یاد ہے جب اونچا کرنے والی اور شوقین سے کوئی قیدی نکالا۔ وہ بھی دوہا آگیا۔ جس نے بھی شرافت
سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا ——— مگر اب یہ شاید وہیں ختم ہو گئے۔ اس نے تمباکو کر ہتھیلی پر ذرا سے مسل سوکھے پتوں
سے وہ کپڑے اتروا کر یہ کفن پہنا دیا۔"

اس نے نفرت سے اپنے پیر ان کو دیکھا۔ فرش میں سے ایک ڈھیلی اینٹ اٹھا کر نیچے سے چلم نکال لی۔ پھر اینٹ برابر
جوڑی اور چلم کو زمین پر پھینک کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

"اور رنگے۔ دوسرا بار کیسے آیا؟" دوسرے قیدی نے پوچھا۔

"پہلی بار تو واقعی دو ماہ تھا۔ پھٹے پہلے چوری کیا تھا اور بس۔ ابھی باقی سب ہی تھے۔ راجو اس نے تو اپنی کو شرم کی
سے ہی سب کے سامنے شروع کر دیئے۔ باقی بھی اس وقت قیدیوں نے خوب شور کیا۔"

رشتے نے کہا پھر نہ مڑ کر بہار میاں سے کہنے لگا۔ "بھئی نے جو بابو ——— جب اگلی دفعہ آؤ گے تو خوب نکلے

میں رہے گے۔"

عبدالرحمٰن نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

"اللہ سے خیر مانگتے رہیے" دُوسرا قیدی عبدالرحمٰن کے تاثرات کو تاڑ کر بولا۔ "وہ کیوں آئے گا دوبارہ؟"

رنگا پھر اس پر ہاتھ مار کر چلایا۔ "آئے گا ——— ضرور آئے گا ——— جو ایک دفعہ یہاں آ جاتا ہے وہ آتا ہی رہے گا ——— خدا سے بھی خالی دھرے ہوا ہیں ——— دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں آتے وارث میاں؟"

عبدالرحمٰن کے دل میں غصے اور نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ وہ بڑی ناگواری سے اُٹھ کر دروازے کے پاس آ گیا اور سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر بہت بڑا صحن تھا جس کے چاروں طرف کوٹھڑیاں تھیں۔ بعض کے دروازوں پر سلاخیں تھیں، بعض پر کواڑ لگے تھے اور اُن میں سر کی اُونچائی کے برابر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، جس میں سے باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ ایک طرف اُونچی اُونچی سلاخوں کا جنگلہ تھا جو لمبا اور دور تک جاتا تھا۔ اُس کے پاس سپاہی رائفل کندھے پر رکھے کھڑا تھا۔ یہی جنگلہ آگے جا کر جیل کے دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ صحن میں پیپل کے بڑے بڑے آموں اور نیموں کے بیچوں بیچ پر جالے لگے ہوئے تھے۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر زمین کی چادروں میں دو برائی ٹیلیاں تھیں۔ سپاہی خاکی کپڑے پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

اندر دونوں قیدی باتیں کر رہے تھے۔ مگر عبدالرحمٰن کا دھیان اُدھر نہ تھا۔ وہ اس ہنستے ماحول میں بے حد شرمندہ محسوس کر رہا تھا اپنی گراوٹ اور زوال پر حیران ہو رہا تھا۔ دُوسری کوٹھڑیوں کے دروازوں میں سے قیدی اپنے دھاری دار لباس میں نظر آتے تو اسے یقین نہ آتا کہ اتنی پاک اور صاف زندگی گزارنے کے بعد بھی وہ ایسی جگہ پر آ سکتا ہے۔ ہم عام دُنیا کے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔

"جیل کے باہر سپاہیوں کے گارڈ روم کے گھڑیال کی گھنٹی پر ٹن ٹن پانچ بجے۔

"پانچ بج گئے۔ آج ملاقات نہیں ہو گی وارث بابو۔"

"کیا بات ہے؟" رنگے نے کہا۔ "بہت یاد آتے ہیں گھر والے جو مشکل کر رہی محبت کی آس کر رہے تھے۔"

پھر رنگا بھی آ کر عبدالرحمٰن کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی کبھی بیچ میں دیکھنے لگتا اور کبھی اپنی لال لال آنکھوں سے اُس کے نیچے سے عبدالرحمٰن کا جائزہ لیتا۔ اس کا منہ مسکراہٹ سے کھلا تھا اور سامنے کے دانت اور لال زبان کا کچھ حصہ سامنے نظر آتا تھا۔ اس کی ہنسی کے ساتھ عبدالرحمٰن کو ڈر سے جھٹکے آنے لگے۔

"بابو! تم نے کیا کیا ہے؟"

عبدالرحمٰن نے غضب ہو کر دیکھا اور چپ ہو گیا۔

"شرماتے کا ہے میں ——— یہاں تو ہم سب ایک جیسے ہیں۔"

"ایک جیسے" یہ سُن کر عبدالرحمٰن کے دل پر جیسے کسی نے چرکا لگا دیا ہو۔ "بدنام اور عادی مجرم نے اپنے ساتھ ملا لیا!"

ہے ... تم تو اندر سے کھوکھلے ہو چکے۔

"بے بے" وہ چیخا "مت جاؤ۔ یہیں پڑے رہو۔ اٹھا کر لے گئے تو سب پتہ چل جائے گا۔"

عبدالرحمان نے غور سے دیکھا پھر بولا

"تجھے اعتراض تھا:"

"بے بے بے" وہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر تماشا بننے لگا۔ پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "استاد ہمیں کیوں ڈانٹتے ہو۔ افسروں کے سامنے تو یہی بات ٹھیک ہے۔ سامنے ہوتا ہے تو ہم بھی جھک جاتے ہیں۔ مگر یہاں تو سچ بتادو۔"

عبدالرحمان نے سر ہلا کر اب جیل آکر ضرورت ہی کیا تھی۔ جب سزا ہو چکی تو منتظر رہنا بھی کیسا نہ ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا قید سے ذکر کر لو۔

"رشوت لی تھی۔"

"بے بے بے" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"رشوت؟" وہ منہ سے چیخا۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر اس نے ہاتھ رانوں پر مارے پیٹ کو جھکا کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہنسی سے اسے کھانسی شروع ہو گئی۔ [illegible] عبدالرحمان کے پاس پہنچ گیا۔ [illegible]

"رشوت؟" وہ پھر ہنسا "یہ بھی کوئی جرم ہے ——— اسے جرم کون کہتا ہے تو کوئی [illegible] ——— [illegible] ——— کسی کا خون کرتے۔ کسی کی لڑکی نکالتے۔ کہیں ڈاکہ ڈالتے ——— یہ کیا تو روز مرہ کا جرم ہے۔"

اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا [illegible] بستر پر بیٹھ گیا۔ جیسے غصے سے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ جیسے عبدالرحمان بہت [illegible] کرتے ہو۔ پھر اچانک اس نے [illegible] سے پوچھا "اور سزا کتنی ہوئی؟"

"ڈیڑھ سال" بغیر منہ [illegible] عبدالرحمان نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ یہ تو کافی ہے۔" وہ ایسے بولا جیسے اس کے دل میں عبدالرحمان کا [illegible] تھوڑا بڑھ گیا ہو۔

جیب ٹٹولتا ہوا وہ بولا "بیڑی پیو گے؟"

عبدالرحمان نے ناگواری سے منہ موڑ لیا۔ [illegible] نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور پھر ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ بھلا ہم جیسے شخص سے [illegible] پیو گے۔

اس روز [illegible] دن بھی وہ چپ رہا تھا۔ اب وہ بھی آکر [illegible] کے پاس کھڑا ہو گیا اور اسے جیل کے قواعد اور کوٹھڑیوں کے متعلق بتانے لگا۔ عبدالرحمان کبھی کوئی سوال کر دیتا ورنہ وہ زیادہ تر خود ہی بتاتا رہا۔ اسے یہاں چار مہینے ہو گئے تھے [illegible] وہ جانتا تھا کہ کون سا وارڈ اچھا ہے۔ کون سا بدماغ ہے۔ قیدی افسر کیسے ہیں۔ جیلر کا رویہ کیسا ہے۔ ان سب کے بارے میں [illegible]

جب تپ عبدالرحمن کو کپکپا آیا۔

صحن میں جھنکار سی ہوئی۔ پھاٹک کے اندر والا دروازہ کھلا۔ دو سپاہی ایک قیدی کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا مگر اس کے بیڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ٹخنوں پر لوہے کے چھلے پنڈلی کے گرد اوپر نیچے چڑھے ہوئے تھے۔ ان سے لگی ہوئی دو سیدھی سلاخیں ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اوپر کو چڑھتی چلی سلاخوں کو جو کمر تک پہنچ جاتی تھیں اور کمر سے ذرا نیچے سلاخوں کے گرد لوہے کے بڑے بڑے چھلے ان کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ ٹانگیں چوڑی کر کے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ہاتھوں میں لٹکی ہوئی ہتھکڑیاں جب کسی چھلے سے ٹکراتیں تو دھات بجنے کی آواز سارے صحن میں پھیل جاتی۔ ایک کوٹھری سے ایک قیدی نے کوئی جملہ کسا تو اس نے مسکرا کر سر ہلا کر جواب دیا۔

"اسے بیڑیاں کیوں پہنائی ہیں؟"

"یہ بڑا خطرناک قیدی ہے۔ قواعد کی خلاف ورزی کی ہوگی تو جیلر نے دو چار روز کے لیے بیڑیاں پہنا دی ہوں گی۔"

"اب کہاں گیا تھا؟"

"دوپہر مشقت کے لیے کہیں لے گئے ہوں گے۔ شاید چکی والے کمرے میں یا جیل کا کنواں چلانے کے لیے۔ اب شام واپس لا رہے ہیں۔"

ایک وارڈر نے سوراخ والے دروازے کا کواڑ کھولا تو وارث کہنے لگا "اچھا! اسے تو قید تنہائی بھی ہے۔ ان کو تو الگ ہی رکھے جاتے ہیں۔"

عبدالرحمن خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا تھا۔ اور وہ سب کچھ توڑ تاڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ دروازہ چھوڑ کر کمرے کے اندر جا سکتا۔ خاموش کھڑا وہ [illegible] رہا۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔

"یا علی مدد" مٹکے نے نعرہ لگایا۔

"چلو برتن سنبھالو!" وارث بولا "کھانا بٹنے والا ہے۔"

"تم جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں۔" عبدالرحمن نے کہا۔

"یہاں یوں نہیں چلے گا۔ روٹی لے لو۔ ورنہ وارڈر آ کر بڑی غلیظ گالیاں دے گا۔"

"ہونہہ" عبدالرحمن کو ایک دم غصہ آگیا "تو مجھے گالی دینا نہیں آتی کیا؟"

وارث ہنسا اور ہمدردی سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ایسے خیال نکال دو دل سے۔ ورنہ بیڑیاں لگ جائیں گی۔"

وارڈر نے باہر دروازے ہی کی گھنٹی اور شور مچاتا آیا۔

"[illegible]" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

مٹکے نے جلدی جلدی سب کی ٹال دی اور برتن نکال کر باہر نکل گیا۔

وارث نے عبدالرحمان کی طرف دیکھا۔

"اللہ قسم میرا دل بالکل نہیں کرتا۔"

"تو نہ کھا۔ یہ تو ——— لے کر دے دینا۔"

بیلے کے پاس تین ڈبیاں پڑی تھیں۔ ایک کے پاس [illegible]۔ دوسرے کے پاس دال کی دیگ اور تیسرے [illegible] میں [illegible] ہوئے چاول رکھے تھے۔ عبدالرحمان پانی کا پیالہ اور [illegible] کی پیٹھ کے [illegible] کھڑا ہو گیا۔ [illegible] کے [illegible] رہتے۔ [illegible] اور [illegible] کے [illegible] سے [illegible]، [illegible] کی طرف [illegible] تھے اور عبدالرحمان [illegible] تھا۔

کسی نے [illegible] نے اپنا کھانا [illegible] دیا۔ [illegible] نے وارث کو [illegible]۔

"[illegible] کھانا [illegible] ——— زیادہ نہیں تو ایک [illegible]۔"

عبدالرحمان نے [illegible] نکالا۔ [illegible] کے [illegible] پر اس نے ایک [illegible] میں [illegible]۔ [illegible] اس کی زبان پر [illegible]۔ [illegible] منہ [illegible] کی [illegible] دانتوں [illegible]۔ وہ [illegible] کی طرف [illegible]۔

[illegible]

عبدالرحمان نے [illegible] سے [illegible] کمبل کا [illegible] وقت [illegible] ایک کمبل [illegible] تھا۔ [illegible] نے [illegible] کے [illegible] زمین پر بچھایا۔ سرہانے کی طرف [illegible] رکھیں۔ دوسرا کمبل اوڑھنے کو رکھ دیا اور وہ پھر بیٹھ گیا۔

[illegible] کی [illegible] سا شور بے ترتیب سے [illegible]۔ [illegible] سیدھا [illegible] کی [illegible] ایک [illegible] فضا میں [illegible] ہوئے [illegible] گیا۔

[illegible] بہشت میں [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] کی [illegible]: [illegible] تھی۔ [illegible] پانی میں جانے لگے ہیں:

عبدالرحمان [illegible] سامنے [illegible] نظر آ رہی تھیں اور [illegible] کی چھت کے اوپر سے نیلا آسمان [illegible] ایک [illegible] مستطیل نظر آ رہا تھا۔ اس کی [illegible] کسی وقت [illegible] جانے والے [illegible] کر لوٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس [illegible]۔ نیلے [illegible] سیاہی [illegible] لگی۔ وہ مستطیل [illegible] ہوئی سیاہی میں [illegible] لگی جیسے [illegible] سیاہ [illegible] میں سفید [illegible] کا [illegible] سا [illegible] نظر آئے۔ کچھ دیر بعد اس کے کونے میں [illegible] ستارہ [illegible]۔ [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] ستاروں کے [illegible] میں گم ہو گیا۔

دیا جلنے سے کمرے میں [illegible] ہونے لگی اور [illegible] تیل کی [illegible] فضا میں رچ گئی۔ اس سے عبدالرحمان کی آنکھوں میں [illegible]۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔ اس [illegible] زندگی ——— میں [illegible] شام کا [illegible] نہیں کیا تھا [illegible]۔

یا نہ اور نہ ہی کا دمی تھا جو سزا اور جزا کے فارمولوں سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ چند ماہ پیشتر جب اُس نے تھانے میں ایک ملزم کو پٹتے دیکھا تھا تو بیوی سے کافی دیر بحث کرتا رہا کہ اس حالت پر پہنچنے کی تمام تر ذمہ داری اُس آدمی کے اعمال پر تھی۔ تاریک جُرم کے کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اسے پرسنوں کا ڈسے اپنی بیوی کے ساتھ وہ بحث یاد آنے لگی ——— پھر وہ سوچنے لگا اگر میں رشوت نہ لیتا تو یہاں کیوں آتا؟ ——— اس خیال میں بھی وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہا مگر پھر خیالات نے پلٹا کھایا۔

لیکن ہمارے ملک میں اور بھی ہزاروں لوگ جو رشوت لیتے ہیں۔ بلکہ آج کل اکثریت ایسے لوگوں کی ہے اور اُن کی ساری زندگیاں اسی چکر میں کٹتی ہیں۔ مگر انہیں کبھی سزا نہیں ہوتی۔ اور میں نے ایک دفعہ ضرورت سے مجبور ہو کر رشوت لی تو مجھے سزا ملی ——— کہتے ہیں اللہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ مگر میری کیا مدد کی؟ گڈو کو چھوڑ نہ سکتا تو واقعات کا یہ سلسلہ ہی شروع نہ ہوتا۔ اگر وہ نہ مرتا اور مجھے وہ بھیانک خواب نظر نہ آتا تو میں عاقل کو ناحق ... کرتا اور اگر بالفرض گڈو کو مرنا ہی تھا تو خدا ایک دو دن پہلے مار دیتا کہ میں رشوت لینے سے بچ جاتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یا اس دن دفتر میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اتفاقیہ ... ہو جاتا اور میں یہاں اُس کی مثال دیکھ کر نہ ڈرتا۔ خدا نے واقعی میری کوئی مدد نہ کی۔ بلکہ پہلے بچہ چھین لیا اور پھر یکے بعد دیگرے سب حالات اس طرح چلائے کہ میں یہاں آ پہنچا ——— مگر مجھے رشوت لینے کی سزا تو نہیں ملی۔ اگر میں بیٹا جاتا اور عاقل کے کام کار بتاتا تو میرے بھی مزے تھے۔ ... نہ ڈر کی ... یہ سب کچھ تو مجھے توبہ کرنے کی دعوت ہے — تہ میاں بھی عجیب ہے۔ ایک طرف سے توبہ کرنے کو کہتا ہے اور دوسری طرف سے توبہ کرنے پر خوار دیتا ہے۔ مجھے رشوت لینے پر سزا نہیں ملی۔ اس سے تو میری مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ قرض اتر گیا تھا۔ دواؤں کے لیے کافی پیسے پاس تھے۔ پریشانی کم ہو گئی تھی۔ مصیبت تو پڑی ہی توبہ کرنے پر۔ جب اپنی ملازمت، عزت اور آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔۔۔۔۔

موچپ ———

"ماں کا خصم ——— یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔" رشتا بڑبڑایا۔

"کیا مار گئے؟" وارث سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"پھر تھا؟"

"مار ڈالا؟"

"ماں ایک تو پیٹ میں چھپا ہو گیا۔"

"کتنوں سے مار ڈالا؟" عبدالرحمن حیران تھا۔

"تمہارا کیا؟ وہ کمبل اوڑھے ہوئے ہو۔ ہر کمبل کا طریقہ ہوتا ہے یار ——— پکڑ کر اوپر سے کر کے چپت مار دو ساتھ ہی پیچھے سے سر پر لاٹھی مار دو اور مڑ کر سامنے سے سالن کے درمیان بچھا دو تو دم ... سانس نہیں نکلتا ——— ہے ہے ہے۔"

وہ اس فقرے پر خود ہی ہنستا جانے لگا۔

"وہ عورت کو کیسے مارو گے؟" وارث نے آواز میں پوچھا۔

وہ سنگھ نے ندامت کا اظہار کر کے معذرت چاہی۔
دہشت سے کانپتا ہوا اٹھا اور عبدالرحمن کی طرف منہ اٹھا کر بولا
"یار ۔ سنگھ نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"
مگر عبدالرحمن کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش بیٹھ گیا۔

——— تو

——— تو

——— تو

عبدالرحمن سوچ رہا تھا توبہ کرنے سے پہلے گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور ماضی کی لغزشیں پاک ہو جاتی ہیں ——— شاید کہ ان ہو گئے ہوں گے۔ مگر دنیا میں تو ہم تو بھول کر بھی کو کریں بھلا ماضی بھلا کیا نہیں چھوڑتا ——— بہت تو ماضی کے گزرے ہوئے لمحات قدم قدم پر ساتھ چلتے ہیں وقت کے تیز دھارے کا ہے۔ جس میں ہمارے ماضی کی لغزشیں بہت سی گتھیوں کی طرح گم ہو رہی ہیں۔ بات تو ماضی کو پوشیدہ رکھنے میں چھپ چھپ کر کاٹے ہوئے وقت کے گھیرے ہوں اور ان کا پیچھا سے چھین کر پکار سکتے جاتے ہیں۔ زندگی کے لمحات ایسی ہی جیل کی تاریک سلاخوں کے پیچھے پھیل جاتے ہیں۔ جیسے پتہ بھی نہیں چلتا اور وقت کے لمحے گزر جاتے ہیں حقیقت کو ماننے کے سوا قبول کر دیا دیتے ہیں جس سے ہم دن اور رات چلتے رہتے ہیں۔ اپنے ماضی کے خلاف جو سانس بھی لیا جائے ایک پیچیدہ کہانی ہوتا ہے۔ ہم ہر قدم پر یقین سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ماضی کے نقوش وقت کی گرد بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور ان لمحات کے چہروں کو اپنا جسمانی حصہ بنا کر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب یہ ایک ایک لمحہ ہمیں پیار کر کے ماضی کا عمر گزر جانے کے بعد ماضی دور رہ کے اور پھر قدم قدم پر مستقبل کی گود میں سے نکل کر ہماری راہوں میں حائل ہوتا ہے

"ذرا سا ——— ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟ ..."

ہم کیا ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ ....

ہماری زندگیوں میں ہماری اپنی خواہش کیوں نا کام ہے۔ حالانکہ ہر شے پر ہماری نیت کی چھاپ لگی ہوتی ہے؟

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ مگر ہم کالی کے لمبے کالے پیش حالات کی پٹڑیوں پر چلتے ہیں اور کسی ان دیکھے ہاتھ نے لگائے ہوئے ہیں؟؟؟ .....

سوچتے سوچتے عبدالرحمن سو گیا۔

· · ·

جیل کی زندگی بالکل سپاٹ۔ کھوکھلی اور بے کیف تھی۔ سلاخوں کے پیچھے جیسے تصادم کا دن ذرا کھا تا دوپہر شام دوپہر وہی کالیاں ہوتی تھیں۔ یوں احساس ہوتا تھا جیسے زندگی ختم ہو گئی ہو۔ اور اس میں کوئی ترمیم یا تبدیلی نہ ہوئی ہو۔ جیل میں صبح کے قریب

ہیں سے کبھی کوئی رہا ہو کر جانے والا ہوتا تو چند گرم جوشی سے مصافحے ہو جاتے اور چند آنکھوں میں آنسو چمک جاتے۔
ملا تو وہ ایک دو تک دوسرے قیدیوں کا آپس میں چہ میگوئیاں کرتے کہ اُس کے سارے حالات پتہ چل جانے پر یہ جوش
شروع شروع میں عبدالرحمٰن کو جب کبھی خود پیشی پر پیش کروانے کے وقت یا مشقت کے موقع پر دوسرے
سے کا موقع ملتا تو اُس کا دل کچھ بہل جاتا۔ مگر پھر یہ بھی باسی معلوم ہونے لگا۔ سبھی دن پورے کر رہے تھے۔ جس سے بات
پچھلی یادوں سے تڑپ رہا ہوتا یا آئندہ کے لیے رہائی کے دن گن رہا ہوتا۔ بے کاری نے اُن کے تعلقات کو تیز تر کر دیا
ملاکر پہلے پر ہونے والے ظلم کی طرح دیکھتے۔ اس میں اُن کو اپنے دشمن آدمی کی نظر کنے اور دوست بننے لگے۔ جیل
والوں کو دوسرے لوگوں کی سرد مہری نہ بے مروتی اور زیادتیوں کا جتنا احساس ہوتا ہے۔ باہر گھومنے والوں میں کبھی نہیں ہو
ایک سے ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار سُن سُن کر عبدالرحمٰن اُکتا گیا تھا۔
ملازمین کے لوگ قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اپنی شان میں گم رہتے۔ قیدیوں کو وہ بالکل بے جان مشینوں کی طرح سمجھتے جو
سختی اور بعض اوقات گھڑکنوں سے چلتی ہیں۔ اُن کے خیال میں قیدی اس قابل ہی نہ تھا کہ اُس سے اچھا سلوک کیا
ایک عجیب طرح کی بے جان اور حیوانی فرعونیت جیل کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔
ان پندرہ کے قریب وارڈر تھے۔ سپاہیوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ پانچ قیدی افسر تھے جو لمبی سزائیں پا چکے
ان کو پابندی کرنے کی وجہ سے دوسروں پر نگرانی کے لیے ملے تھے۔ ایک جیلر تھا اور ایک سپرنٹنڈنٹ
معائنے پر آیا کرتا۔
عبدالرحمٰن کا سبھی وارڈروں سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔ دو ایک کی ڈیوٹی اُس کا کمرہ کھولنے، بند کرنے اور باہر
دو ایک چکی والے کمرے میں تعینات ہوتے تھے۔ ایک آدھ جیل کے باغ میں کام کرواتا تھا۔ ایک گیٹ پر تعینات
دفتر کے اور باہر جانے والے درخت پر بھی ایک دو نگرانی کرتے تھے۔ چند ایک ملاقات کے وقت

ہ سب مگر وارڈر عجیب نیچر عمر پر ایک سا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُن میں غصیلے بھی تھے اور نرم دل بھی۔ خاموش طبیعت
باتونی بھی۔ مگر قیدیوں سے تعلقات کے معاملے میں سب ایسے تھے جیسے ایک ہی کارخانے سے بنے ہوئے تھے
پشے چپڑے کی پیٹیاں کرکے گرد۔ اُن میں پیتل کی پیٹ پر وارڈر لکھا ہوا۔ اور چہروں پر ایک سی سختی۔ اُن کے کردار
عبدالرحمٰن کو اُس وقت جب شروع شروع میں محبوب کے بعد چیکوں پر بھی دلچسپی ختم کرائی۔
اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وارث پچھلے گھنٹہ بھر سے اپنا منہ دھو کر تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا ماموں اور ماموں زاد بھائی
محبوب کو ملنے آتے اور وارث صبح ہی سے بے کل رہنے لگا تھا۔ رحیم حسب معمول اپنے پہلے ہوئے بستر پر بیٹھا تھا۔
خوشی دیکھنے کا وقت تھا۔ عبدالرحمٰن نے وارث سے پوچھا۔
کسی کی ملاقات نہیں آئے گی؟

آدمی قسمت کے سہارے جیتا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ـــــــ یہ تو بس سے کا تانگہ لگے گا:

ہو رہا تھا عبدالرحمن نے پہلی بار وہ عام دنوں کی نسبت بہت زیادہ پی لیا تھا۔ جب میں اسے چھ بجے کے وقت کے
روز وہ گھر میں پی لیتا تھا کہ نشے میں اسے پتہ نہ چلتا تھا کہ ملاقات سے واپس آتے ہوئے تو اس کے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔
اور گھر کے کسی کونے پر بیٹھا ہوتا یا رستے میں وہ منہ چھپائے ہوتا یا ویسے ہی بس رہا ہوتا۔ وارث نے عبدالرحمن کو خاص طور پر منع
کیا تھا کہ اسے بہت سے دن تک نہ پکارو۔ یا نشے میں اس کے قریب نہ جایا کرو۔ کیونکہ وہ بہت دکھی ہوتا ہے۔

اس دن وارث ملاقات کو جا چکا تھا۔ عبدالرحمن بیٹھا تھا کہ اتنے میں نذیری اندر آ گیا اور عبدالرحمن سے کہنے لگا۔

"مشتاق کی ملاقات آئی ہے۔"

عبدالرحمن بڑی بیتابی سے اٹھا۔ اسے توقع تھی کہ کوئی اسے اتنی جلدی ملنے آئے گا۔ وہ ٹوپی ٹھیک کرتا ہوا جانے لگا۔

نذیر نے ہنس کر اسے روک لیا۔

"وارث نے کہا۔ تیری ملاقات کسی نے کرنی نہیں ہے"

نشے کی حالت میں نشے بھری آنکھیں اوپر کر کے دیکھا جیسے وہ کوئی غیبی ہو۔ پھر وہ پیچھے کو نہایت غصے میں بولا۔

"تم یہی بتا کر بیٹھے ہو۔ سب کے سامنے جیسے ملاقات کروانے آئے ہو۔ سالے کو فرشتہ مارا ہوا۔"

نذیر ایک دم بھاگ گیا۔ پھر وہ وارث جیسے کہتا رہا "حرامزادے، شرم کرو"۔ اور آگے بڑھ کر زور دار تھپڑ اس کے
منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور پھر اس پر نیم بے ہوشی طاری کیسے پانی کے لوٹے کا ٹکڑا اٹھایا اور نذیر کی طرف مارا۔ اس نے
پکڑ کر بچنا چاہا مگر وہ اس کی گردن پر لگا سے جا۔

عبدالرحمن وارث سے لپٹ گیا۔

جب وہ دونوں اس کے پاس آئے تو بیٹھے پر ہجوم سا تھا۔ قیدی بیٹھے کے اندر سلاخوں سے جھانک کر تکتے تھے۔ بچے
کی دوسری طرف سے جب وارث کے پیچھے ہی مڑ گئی تھی۔ عبدالرحمن نے بیٹھے کے دروازے پکڑ لیا۔ مگر کوئی زور نہ چلا۔ تیسری طرف
کیا تو بجلیاں نکلتے ہی خاموش کھڑی تھی۔ بیٹھے کی دو سلاخوں کو کھینچتے ہوئے عبدالرحمن نے اپنا منہ ان پر لگا دیا اور زور سے ملتے
ہوئے پکارا۔

"بیگی!"

بجلیاں نے دیکھا اور لپک کر آگے آئی۔ عبدالرحمن نے بے اختیار ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالا۔ بجلیاں نے جھپٹ کر
اسے اپنی تیز آنکھوں سے لگا لیا۔

"ہاں بولو۔ ایک دم اتنی سی بات۔ تو نے وہاں کیوں رکھا ہے۔ یہ پہچان کی جگہ نہیں۔"

بجلیاں نے مڑ کر دیکھا اور پھر جیسے سہا ہوا پیچھے ہٹ کے کھڑے ہو کے بولی اسے بات سے بات ہے
دیا ہے۔ اسی طرح اس نے عبدالرحمن کا ہاتھ چھوڑا اور ہاتھ پیچھے کر کے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ عبدالرحمن کے ہونٹ

...پانی کی تکلیف سے کئی دن تک تنے رہ گئے

بیگماں اور عبدالرحمان خاموش کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بولا۔ وارڈر کی فہمائش نے دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔ بیگماں نے عبدالرحمان کو رستے ہوئے چپ سے کو دیکھا۔ دھاری دار لباس کے بے ڈھنگے پن کو دیکھا۔ بنیر کار کے میں سے اس کی گردن نکلتی ہوئی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اور پاجامہ ٹخنوں سے کتنا ہی اونچا تھا۔ کہنی سے ذرا نیچے آستینیں پھٹی ہوئی تھیں۔ قمیص کے دو بٹن غائب تھے۔

بیگماں کے نتھنے کانپے۔ آنکھیں بھرنے لگیں اور پھر آنسوؤں کے تار اس کے بھرے بھرے خوبصورت گالوں پر بہنے لگے۔ ان کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ برقع کے پلو سے پونچھ ڈالتی۔ اس کی بھیگی آنکھیں مستقل طور پر عبدالرحمان پر گڑی تھیں۔ اور وہ کبھی زمین کو دیکھتا۔ کبھی بیوی کو اور کبھی دوسرے ملاقاتیوں کو۔

گھنٹی بجنے لگی۔ ملاقاتیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

"چلو جلدی کرو سب لوگ۔" وارڈر چلایا۔

بیگماں نے جلدی سے برقع میں چھپا ہوا تھیلا نکالا اور عبدالرحمان کی طرف بڑھایا۔

وارڈر لپکا آیا۔ "ٹھہرو۔ پہلے دکھاؤ کیا ہے؟"

تھیلا کھول کر وہ چیزیں دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا خالی ڈبہ گھی سے بھرا ہوا۔ پڑیا میں کھانڈ۔ اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا سوجی کا خشک حلوہ۔ بسکٹ کا ڈبہ۔

"یہ نہیں چلے گا۔ واپس لے جاؤ۔" اس نے حلوہ بیگماں کو دے دیا۔ بڑی مایوسی سے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بے دلی سے واپس لے لیا۔

بسکٹ کا ڈبہ اپنی جیب میں گھسیڑتے ہوئے وارڈر نے تھیلے کے خالی کونوں میں جھانکا۔

"سگریٹ نہیں ہیں؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" عبدالرحمان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو پیتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اگلی دفعہ نہ بھولنا بی بی۔" اور پرے ہٹ گیا۔

"یہ بسکٹ کیوں لے گیا؟" بیگماں نے پوچھا۔

"یہ لوگ ہیں ہی سور۔" خاوند نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم حلوہ واپس لے جاؤ۔ اگر اس نے ذرا بھی بات کی تو میں سالوں کی پٹائی کروں گا۔"

بیگماں نے پھر پیار سے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ کہتی جاتے جاتے اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

عبدالرحمان کوٹھڑی میں پہنچا تو وہاں ایک ہجوم تھا۔ جیل کے چند وارڈر بیچ میں کھڑے تھے۔ دو تین وارڈر قیدی اور دو ایک اور قیدی مشقتی تھے۔ پولیس کے دو مسلح سپاہی بالکل بیچ کے پاس کھڑے تھے۔ جیل کا داروغہ بھی آیا ہوا تھا

کنپٹیوں پر سفید بال اور چہرے کا کالا کلوٹا تین نشست تھا۔ سنجیدہ پیشانی میں چمکدار آنکھیں تھیں۔ عبدالرحمٰن صاحب کے اندر داخل ہوتے ہی نمبر ۳ چلایا۔

"یہ آگیا ہے جناب ——— اس کے ساتھ سنگھ نے کام کیا تھا۔"

جیلر نے پر غور سے عبدالرحمٰن کو دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بجلیاں سی تڑپنے کے بعد کے آثار نظر آرہے تھے۔ اور جذبات کی اندرونی یلغار کی وجہ سے کسی بیرونی چیز میں دلچسپی لینے کے قابل نہ تھا۔ جیلر نے اپنی آنکھوں سے اس کے چہرے کو ٹٹولا۔ مگر مطلب کچھ نہیں ملا۔ چنانچہ اس نے ڈانٹ کر عبدالرحمٰن سے پوچھا

"کیوں بے نمبر ۵ نے مارا تھا اس کو؟"

عبدالرحمٰن کچھ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا اور اپنے بستر کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا

"ارے جواب کیوں نہیں" نمبر ۳ چلایا

عبدالرحمٰن پھر بھی خاموش رہا۔ مگر نمبر ۳ چلایا "یہ کیوں شک کرتے ہو آپ، ہم نے مارا تھا ——— مارا تھا ——— مارا تھا ——— اور اب بھی مار ڈالیں گا۔"

"دیکھیے جناب" نمبر ۳ دونوں ہاتھ پھیلا کر جیلر کو اپیل کرتا ہوا بولا۔

جیلر خاموشی سے سنتے کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور بولا "اس نے پہری کیوں نہیں لی؟"

سب وارڈر اور قیدی منہ چپ ہو کر دبک گئے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" وہ گرج کر بولا۔

"حضور ہمیں کیا پتہ۔ یہ تو آپس میں جھگڑا کرتے ہیں۔"

"اور تم کیا سوتے رہتے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے۔ کہ کیا ہو رہا ہے؟"

جیلر چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا "نمبر ۵ کو چھ دن کے لیے بیڑی پہنا دو اور دو ہفتہ روزانہ ڈیوٹی لگاؤ ——— اور قیدی کو بھی چھٹی نہیں۔"

باہر نکلتے وقت نمبر ۳ نے مڑ کر فتحمندانہ انداز میں سنگھ کو دیکھا تو اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے گھمانے سے پہلے ہی حرکت کر کے اسے چپ کرا دیا۔

سنگھ کی لال لال آنکھیں اور چڑھا ہوا سانس دیکھ کر عبدالرحمٰن مدد کے پاس پہنچ گیا۔

"اسے چوٹ کیسے لگ جاتی ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہم اندر کر لو تم کو تو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے" اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

اس کے بعد سنگھ کو روزانہ تک لے جاتے اور جب وہ شام کو واپس آتا تو خستہ اور نڈھال ہوتا۔ اس کا جسم ...
... جیسے چمڑے کی طرح اکڑا ہوا ہوتا۔ اور قدم چلنے سے بیڑیاں لگی تھیں۔ ...

…بستر میں گرا دیتا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو منہ کے سامنے رکھ کر اس طرح پیچ و تاب کھاتا رہتا۔ نہ وارث سے بات کرتا نہ عبدالرحمان سے۔ بلکہ …رتی سے بیزار رہتا۔ اس کا کھانا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ رات کو اسے کروٹ بدلنے میں تکلیف ہوتی تو بیڑی کی جھنکار کے ساتھ …اس کی کراہوں کو بھی ساتھ ہی سنائی دیتی۔

رنگے کی مشقت ختم ہو گئی۔ بیڑیاں اتر گئیں۔ مگر وہ نڈھال نڈھال اور مُردہ ہو گیا تھا۔ سارا دن بیٹھا ہوں ہوں کرتا رہتا۔ اس کے …ہونٹوں سے بھنچے رہتے۔ آنکھوں سے پانی بہتا رہتا۔ وہ نہ منہ دھوتا، نہ کھانے میں دلچسپی لیتا۔ کئی دفعہ صبح کے وقت اجابت …سے ہی ہو گیا۔

ایک دن عبدالرحمان نے وارث سے کہا "رنگے کی طبیعت خراب ہے۔ اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔" وارث بولا۔ "نمبر ۱۳ نے دوسرے وارڈروں سے کہہ کر اس کی چرس اندر آنا بند کروا دی ہے …تب تک، جب تک یہ اس سے معافی نہ مانگے۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس کے بعد جب کبھی نمبر ۱۳ نظر آتا۔ تو عبدالرحمان نفرت سے اس کے چیچک زدہ چہرے کو دیکھتا رہتا۔ وہ آنکھوں سے بھینگا …ہوتے چہرے پر … ٹھوڑی پر بہت گھنی داڑھی تھی۔

دو تین روز بعد وہ کوٹھڑی کے آگے سے گزرا۔ انتظار رنگے نے دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر جوڑ دیئے اور بڑی …سے اسے دیکھنے لگا۔ مگر وہ بڑی اکڑ سے "ہونہہ" کر کے گزر گیا۔

مگر شام کو وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو رنگے نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ "دیکھ اب جانے دے۔ رب کی قسم میرا سارا …ٹوٹ گیا ہے۔"

"ابھی تو تیرا جسم سیاہ ہے۔" وہ بڑی نفرت اور رعونت سے بولا۔ "مگر تیرا دماغ تب ٹھیک ہو گا۔ جب تو اپنی ماں کے …رہے گا۔"

رنگے نے اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ اس کی پھیلی ہوئی مونچھیں لٹکنے لگیں۔ "سوہنیا ——
سوہنیا —— تو جو چاہے گا کروں گا —— مگر اب خدا کے لیے جانے دے۔"

نمبر ۱۳ نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے سیدھا کیا اور بولا "چل بیٹھ اوہ صاحب اور خبردار جو ایسی حرکت پھر کبھی کی۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر بند مٹھی دی۔ رنگے نے یوں جھپٹ کر پکڑا جیسے چیل ہوا میں اچھالے …گوشت پر لپکتی ہے۔ جلدی سے اپنے بستر پر جا بیٹھا۔

رات کو جب رنگے کو چرس کا نشہ چڑھا تو وہ اندھیرے میں جھوم جھوم کر کہہ رہا تھا

"بابا، چند دنوں کی چھٹی اور ہے۔ پھر دیکھنا کیا بلائیں گے۔ میں تو کئی سال کاٹ چکا ہوں۔ جیل تو یہاں سب کی ماں کا بھی …گھر ہے۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبدالرحمن جیل کی زندگی کا عادی ہوگیا تھا۔ جب سے بیل مشقت پر چلانے لگا تو اس کے دن جلدی جلدی کٹنے لگے۔ جیلر نے ایک دفعہ اس کا انٹرویو لیا تھا اور اس کے بعد تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اسے سخت مشقت سے چھٹی دے دی تھی۔ چنانچہ وہ چکی وغیرہ کے ساتھ کبھی نہیں گیا۔ مگر شائی [؟] بنا اور بان بٹنے کا کام کرتا رہا۔ ایک آدھ دفعہ ترکھان کے ساتھ اس نے چارپائی بننے کی کوشش بھی کی۔ مگر جیلر صاحب نے منع کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ وقت باغ میں پانی لگانے، گوڈی کرنے اور سبزی بچانے پر صرف کیا کرتا۔

جیل میں جب کبھی قیدی نئے جیل آتے وہ لنگر خانے میں ایک دوسرے سے یہ پوچھتے کہ جرم کیا ہے اور کتنی سزا ہوئی تھی۔ اکثر لوگ ایسے بھی تھے جو دوسری تیسری مرتبہ جیل آئے تھے۔ عبدالرحمن ان قیدیوں سے بات چیت کرتا رہتا تھا جو بعض اوقات انتہائی حد پر خود پسند ہو گئے تھے۔ اور ان کی بات کا موضوع ہمیشہ اپنی ذات، اپنا جرم اور اپنے ساتھ دنیا کی زیادتی ہوتا تھا۔

عبدالرحمن کے دل میں ایک بات کی خلش رہتی تھی۔ وہ کسی وقت تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا تھا کہ اس نے شرط لگائی تھی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ قانون نے دوسرے شخص کی گرفتاری پر رقم رکھوا کر اسے قید کیا ہے اور وہ بے گناہ ہے۔ اگر اس نے ایک دفعہ شرط لگائی تھی تو یہ اس جرم کے تناسب سے بہت زیادہ سزا دی ہے۔ اور قسمت نے اس پر ظلم کیا ہے اس لیے دوسرے قیدیوں سے بات کرتے وقت وہ ہمیشہ جاننے کی کوشش کرتا کہ کیا وہ بھی جیل میں آئے ہوئے تھے یا اس کی طرح ان پر بھی ظلم ہوا ہے۔

قیدیوں کی سرگزشت سے جو واقعات اس نے سنے تھے ان سے بنیادی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر حالات کا شکار تھے۔ ایسے حالات جو ان کے اختیار سے باہر تھے۔ کبھی یہ مجبوراً، کبھی عورت کی رقابت یا اس کے پیچھے غیرت کے ہاتھوں غضب اور کبھی حالات کے مسلسل باعث پیدا شدہ پریشانی کے زیر اثر وہ کوئی غلط قدم جیل کی طرف لے جاتا۔ عبدالرحمن اکثر قیدیوں سے سوال کرتا کہ انھوں نے جرم کیوں کیا ہے۔ تو اکثر یہ عجیب جواب دیتے تھے۔ ایسے تو انسانی فطرت کے عین مطابق کوئی بھی تسلیم کرتا تھا کہ قصور اس کا ہے۔ لیکن وہ یہ بتاتے تھے کہ وہ یا تو اکسائے گئے تھے یا مجبور تھے۔ اور بسا اوقات ان کی باتیں ٹھیک بھی لگتی تھیں۔

عبدالرحمن کے دل میں اکثر یہ سوال گردش کرتا کہ ہم اپنے اعمال کے کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ ہم کتنے خود مختار ہیں؟ یہ درست ہے کہ خدا بار بار کہتا ہے کہ انسان کو ہم نے اچھے اور برے میں تمیز کرنے کے لیے عقل دی ہے۔ اس کے بعد خدا اور قادر مطلق ہے —— قانون بھی سزا دیتے وقت یہ پیش نظر رکھتا ہے۔ کہ آدمی اگر چاہتا تو جرم سے بچ سکتا تھا اس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

کیا یہ درست ہے؟

نہیں —— ہر شخص کی حیثیت مختلف ہے۔ اس کا عمل مختلف ہے اور انسان کا جزو عمل حیثیت اور عمل سے

معاشرے کی پیداوار ہے ——— طبیعت بنانے میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ماحول کا تعین وہ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ بلکہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے کم و بیش ساری زندگی اُسی میں گزارتا ہے ——— تو پھر انسان کو اس جرم کا ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جائے؟ .... سزا اور جزا کا کیا جواز ہے؟؟ یہاں دُنیا میں جیل کیوں بنائی گئی اور آخرت میں دوزخ کس لیے؟؟؟

جب عبدالرحمان کو ایسے خیالات بہت تنگ کرتے تو وہ چاہتا کہ کسی سے اس موضوع پر بات کرے مگر ایسا کوئی آدمی نہ ملتا تو وہ کچھ اُلجھ سا جاتا۔ وارث گو ذہین تھا مگر وہ جاہل تھا اور ان مسائل کے بارے میں اتنی گہرائی تک نہ جا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ غنیمت تھا اور عبدالرحمان کا زیادہ تر اُس کے ساتھ دل لگتا تھا۔ وہ متین، سنجیدہ اور خاموش طبیعت تھا۔ اور اُس نے اپنے آپ کو کبھی بھی مجرموں میں سے نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ جیل سے باہر جا کر باعزت زندگی گزارنے کی باتیں کیا کرتا۔ اُس کے پچھلے حالات سن کر عبدالرحمان کو اُس سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اکٹھے بان بٹ رہے تھے۔ جب وارث نے اُسے اپنی کہانی سنائی۔

وہ درخت کے نیچے بان بٹ رہے تھے۔ عبدالرحمان کو یہ کام کرتے دوسرا دن تھا۔ مگر اُسے ابھی تک طریقہ نہ آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ بار بار کٹ جاتے اور بازوؤں پر کھجلی ہونے لگی۔

"تم تھوڑی دیر مجھے دیکھو۔" وارث نے ہمدردی سے کہا۔

پھر اُس نے اُسے بتایا کہ مونج بٹنے سے کچھ پہلے بان کی نئی مونجیں ستونوں میں لٹکا دو اور ہاتھ کو تھوڑا پانی لگا کر گھماؤ۔

جب ہاتھ سے مطلوبہ نتیجہ اٹھا ابھی تو رسّی کے آخری سرے کو ہاتھوں میں جکڑو۔

"تم شاید یہ کام کافی عرصے سے کر رہے ہو؟"

"ہاں! بہت مدت سے۔"

"مگر جیل میں تو ابھی تمہیں چار مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"نہیں۔ میں اپنے گاؤں میں بھی یہ کام کیا کرتا تھا۔"

"وہاں تمہارا کاروبار یہی تھا کیا؟"

"نہیں، کھیتی باڑی کرتا تھا اور کسان کو ایسے اکثر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کی زمین بارانی تھی۔ اور میں نے سارا دن فارغ ہی رہنا ہوتا تھا۔"

"کیوں تمہارے والدین نہ تھے؟"

وارث چپ ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ جواب دے یا نہ دے پھر کافی دیر بعد بولا۔

"جب والدین کو آپس میں نفرت ہو تو بچوں کو دوسروں کے ٹکڑوں پر ہی پلنا پڑتا ہے۔"

عبدالرحمان چپ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے کچھ اور پوچھنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ مگر تھوڑے وقفے بعد وارث نے کہانی سنانا خود ہی شروع کر دیا۔

میری بڑی بہن دو سال کی تھی اور میں ابھی ماں کے پیٹ میں تھا جب میری ماں میرے ماموں کے ہاں آ گئی تھی
میں وہیں پیدا ہوا اور ہم دونوں بہن بھائی ماموں کے ہاں رہے۔

"آپ کے پاس کبھی نہیں گئے؟"

"نہیں ——— اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

"تو تمہاری والدہ کو اس نے طلاق دے دی ہو گی؟"

وہ شخص ہنس پڑا!

جیسے کہ ناراض ہو کر، پھر وہ شخص بولا "بابو تم ہمارے رواج نہیں جانتے۔ ہم پہاڑوں کے قبائلی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لڑکا لڑکی کے والدین کو کافی رقم دیتا ہے جسے ولور کہتے ہیں۔ میری ماں کی شادی پر میرے باپ نے پندرہ ہزار روپیہ دیا تھا۔ اب طلاق لینے کے لیے پندرہ ہزار روپیہ چاہیے تھا۔"

"وہ تمہارے ماموں دیتے نا؟"

"وہ بیچارے بیمار سے رہتے تھے اور دوسرے بوڑھے تھے۔"

"تو تمہاری والدہ کو نہ طلاق ہوئی نہ وہ کبھی واپس گئی۔"

"نہ ——— ہم اپنے ماموں کے پاس جوان ہو گئے۔ ہمارے باپ نے ہمیں کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ہم اپنے ماموں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے اور بڑے ہوتے گئے ——— ہماری ماں ہمیں دیکھ دیکھ کر رویا کرتی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر ... وہ یوں ہی روتے روتے مر گئی۔"

پھر وہ شخص خاموش ہو گیا۔ وہ شاید رستے بھر ... اس نے ان دونوں کو باتیں کرنے پر سرزنش کی گالیاں دیں اور خوب ڈانٹا مگر شام ہم نے ... پانچ گز ... تیار کیا تو ...

کمان کی تنبیہ کے باوجود اس شخص نے کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے دل کی کلی کھل گئی تھی اور اب یادیں اس کے دل سے امڈتی تھیں۔ وہ باتیں کر کے دل ہلکا کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بات جاری رکھی

"تب میرے باپ نے دعویٰ کر دیا کہ دونوں بچے مجھے ملنے چاہئیں۔"

"مگر کیوں؟ جب اس نے تمہاری ماں کو چھوڑ دیا تو اب تمہاری ماں کے مرنے کے بعد کیوں آ ٹپکا؟"

"میری بہن جوان ہو گئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور اس کی شادی پر میرے باپ کو کئی ہزار روپیہ ملتا ——— میرے ماموں کا ... تھا اور پیسے کا ہم اس کے پاس رہے تھے۔ چنانچہ وہ مقدمہ ... دائر ہو گیا۔ معاملہ جرگے کے پاس پہنچا۔ مگر جرگہ میں سے وہ ... میرے باپ سے پیسے کھا بیٹھے اور باتوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ... بہت سے ...

سکتا تھا۔

"مگر تم لوگوں نے کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے اور میری بہن نے صاف طور پر جرگے کے سامنے کہا کہ ہم اپنے ماموں کے پاس رہنا چاہتے ہیں مگر انھوں نے والد کو ہمارا گھمنڈ توڑ دیا اور کہا کہ یہ تو کرے جائے ——— پھر جرگہ والوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے میرا باپ میری بہن کو گھسیٹنے لگا۔ اس نے دونوں کا ساتھ سر پر اٹھا لیا۔ باپ نے تو سر کر ہاتھ لگایا۔ جرگہ ممبروں کے سامنے اپنی اوڑھنی بچھائی ——— اور مجھے پکار کر اس وقت میرا بھائی بھی چپ بیٹھا ہے . . . . ."

وارث ایک دم چپ ہوگیا۔

"پھر؟"

"پھر . . . . پھر . . . . . وہ میری بہن تھی . . . . اس وقت بے بس تھی . . . . میں غصہ میں پاگل ہوگیا . . . . . .
اور میں ایک بڑا پتھر اٹھا کر باپ کو دے مارا۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ مگر قسمت اچھی تھی جان بچ گئی ——— اور مجھے قتل کرنے کی کوشش میں پانچ سال کی سزا ہوگئی۔"

"اور بہن؟"

"اُسے باپ لے گیا۔"

"تمہارا باپ کبھی جیل میں ملنے آیا ہے تمہیں؟"

وارث نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ "کبھی نہیں ——— اس کا اب کیا واسطہ ——— ماموں اور ممانی ہر دو تین ماہ آتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر کر کے آتے ہیں۔ وہ بالکل میرے والدین کی طرح ہیں ——— ماں باپ کے والدین۔"

عبدالرحمان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم نے غلطی کی۔ تمہیں غصہ میں بے قابو نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"تم نے میری بہن کو بلکتے ہوئے نہیں دیکھا۔" وارث کا منہ اتنا کہہ کر جوش سے بولا۔ "بھائی کی کرسی چاہیے ——— تم نے میرے باپ کی نظروں میں خباثت کی چمک نہیں دیکھی تھی ——— تم نے جرگے والوں کا بے حیائی چھپانے کے لیے تاؤ اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نہیں دیکھا تھا ——— ہم بے بس تھے اور بے بسی میں غصہ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔"

"پھر بھی وہ تمہارا باپ تھا۔"

"اوں ہوں" اس نے سر ہلایا۔ "باپ تو وہ تھا جس نے ہماری پرورش کی۔ دوسرا آدمی تو ہمارے لیے دشمن تھا۔ جو اپنے منافع کی خاطر ہم کو بیچنا چاہتا تھا ——— تم میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے جو میں نے کیا تھا۔"

جہاں داد کو روحانیت کی بات کچھ بے معنی معلوم ہونے لگی۔ مگر وہ خاموش رہا۔

دونوں دائیں بائیں بیٹھے رہے۔ وارث خاموش تھا۔ کسی کسی وقت اس کے ہاتھ کانپ جاتے اور وہ غصے کی کیفیت اپنے اپنے خیال میں گم وہ شام تک کام کرتے رہے۔

وہیں پر جہاں داد نے پوچھا: "اور وہ کیا لے گیا ہے؟"

وارث ہنسا: "کوئی ایسی بات ہو تو بتاؤں۔ اس کا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ کسی بدقسمت کا چلہ ہے۔"

"پتہ کیا؟"

"وہ میانوالی کا مشہور بدمعاش ہے۔ سادات کا پیر ہے۔ وہ دلی سے پیسے کے لئے وارداتیں کرتا ہے۔ کوئی دشمنی کا بہت زور سے کو قتل کرانا چاہتا ہے یا کسی کو چرانا چاہتا ہے یا فصل کو آگ لگانا چاہتا ہے تو اس کو پیسے دے کر سارے کام کر سکتا ہے۔"

"مگر وہ کیسے ایسا کرتا ہے؟"

"اس سے کام ہیں ——— کیا معلوم؟"

"تم جس وقت وہاں تھے اس نے کہا ہو گا کہ قتل کرنا تھا۔ وہ کیا کہتا ہے؟"

"ساری بات کا تو مجھے بھی علم نہیں ——— میں نے بھی سنا تھا۔ جب اس سے پوچھا تو وہ کیا کہتا رہا۔"

جہاں داد کو قید ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں بیگماں چار دفعہ ملاقات کو آئی تھی۔ وہ بہت دھڑکتی خبریں سناتی تھی۔ پہلے کی طرح اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ تنہا اپنے مکان میں بے خوف رہ سکتی تھی۔ اکثر اوقات وہ سرتی ہی سو کے گھر تھی۔ بعض اوقات اسی لئے وہ [illegible] ہو جاتی۔ ملاقات کا وقت بہت مختصر ہوتا تھا۔ اس لئے وہ کوئی خبریں پوچھتے پوچھتے سنا سکتی تھی۔

جس دن بیگماں ملاقات کر کے چلی جاتی جہاں داد کے لئے رات کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ ایک چھوٹی سی مشعل جلاتا۔ اس کی شام کے دھندلکے میں ایک روشنی ابھرتی۔ جیسے آہستہ آہستہ جگہ بدلتا وہ دور سے مشعل کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتا اور جب اس کی آخری کرن بھی دور کی طرف چھپ جاتی تو جہاں داد صبح کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا مشعل کا نیلا نارنجی شعلہ جلنے لگتا۔ پھر روشنی مدھم پڑ جاتی اور اس سے نیلے دھاگے بند مشعل کے سامنے کانپنے لگتے۔ پھیکے سے آہستہ آہستہ گھل جاتے اور ایک شعلہ چار کونوں سے ابھرتا اور پھر اس میں سے آسمانی نیلا رنگ ابھرنے لگتا۔ اور ایک روشن شعلہ باہر کی طرف سے بدن پر ٹھہر جاتا۔ اور وہ چاہتا کہ چہرہ کو دشمن سے کر لگا لگا رہتا۔

اس دفعہ بیگماں آئی تو جہاں داد نے کہا: "بیگی تم اب اپنے گاؤں چلی جاؤ۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ کب تک یہاں خراب ہو گی۔"

"مگر گاؤں میں بھی میرا کون بیٹھا ہے۔" بیگماں نے دیر سے کہا۔

پھر بھی سدا سے جانے والے لوگ ہیں۔

مگر تم تو دوست ہو تمہیں دیکھنے بھی تو نہیں آ سکوں گی۔

تو کیا ہوا —— اب تمہارے پاس کھانے کو بھی تو پیسے نہیں ہوں گے۔

ہیں ابھی تو —— میرے ٹکٹ بچ رہا تھا۔

کون سا ٹکٹ۔ وہ چونکا۔

وہی والا۔ بیگماں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی

جو کہ عبدالرحمن والا ڈوب گیا۔ مگر وہ چپ رہا

جس کے ہاتھ بیچا [illegible]

میں نے تو پارہ کی ماں کو دیا تھا —— اس نے اپنے میاں کو دیا —— وہ [illegible] کرنا ہے [illegible] تو وہاں فاضل [illegible] کے پوچھنے پر کسی نے بتایا تو وہ پارہ کے خاوند کو لے کر سیدھا صاحب کے پاس آگیا —— اور کہنے لگا —— بھائی آپ سمجھدار ہیں —— [illegible] کے بچے ہیں عبدالرحمن [illegible] ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں نے اسے غلط فہمی [illegible] ہیں [illegible] تھا [illegible] جب پتا چلا تو میں وہاں موجود ہی تھا —— اور پتہ نہیں کیا انتظار کرتا رہا۔ بہرحال میں نے [illegible] کے پیسے نکال کر دیا [illegible] [illegible] اپنے پیسے [illegible] جب تم ہو [illegible] پارہ کے باپ نے بھی [illegible] اب اگر [illegible] دونوں [illegible] تو اس کے پاس جاتی [illegible] اس پیسے میں نے کہا کہ مجھے فورا پیسے دو۔ چاہے [illegible] رکھ لیا ہو۔ [illegible] نے مجھے [illegible] روپے دے دیے۔

تو یہ تو گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ عبدالرحمن نے [illegible]

مگر وہ کیا۔ جانی سمجھو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے [illegible] ہوں گے کہ لے چھڑوا سکیں۔

عبدالرحمن خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا [illegible] بہت [illegible] اس کو [illegible] آگیا۔ پھر [illegible]

[illegible] دیا۔

وقت ختم ہو گیا اور وہ پھر واپس آ گئے۔ [illegible] وقت عبدالرحمن نے [illegible] کر [illegible] دیا [illegible]

[illegible]

عبدالرحمن [illegible] تو [illegible] وقت پہنچ [illegible] عبدالرحمن خود بھی [illegible] خیالات میں [illegible] [illegible] سے باتیں کرنے لگا [illegible] وقت [illegible] کے [illegible] [illegible] سے [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] نے [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] سے [illegible] تھے

"اور تم کیوں ڈرتے تھے؟" عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"تم ڈرتی کیوں نہیں تھیں؟" اس نے اسی بے نیازی سے پوچھا۔ اور پھر اپنا قصہ شروع کر دیا۔

بات کو دلچسپی سے بے مزہ ہو کر سنا۔ مگر بیگم کے جانے کے بعد عبدالرحمٰن نہ سو سکا۔ اور وہ حسب معمول اپنے کمرے میں تکیوں پر نیم دراز سوچتا رہا۔ آدھی رات گزر گئی۔ اتنے میں وارث پانی پینے اٹھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں تم؟" عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"نہیں۔"

عبدالرحمٰن نے وارث کو پاس بٹھا لیا [illegible] وارث کے چہرے پر [illegible] پاؤں میں [illegible] عبدالرحمٰن کی طرف [illegible] اپنے [illegible] اقرار کر لیا۔

"ابا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا

"میری بہن کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔" وارث کا انداز [illegible] "میرا باپ کہتا ہے۔" وہ چند لمحے [illegible] اور منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگا۔

[illegible] وارث بیٹھا تھا [illegible] چپکے سے [illegible] عبدالرحمٰن نے خاموشی سے [illegible] وارث کو [illegible] خواہش کے [illegible] لیے [illegible] نکالا۔ وارث چپ رہا۔

"وہ تو میری بہن ہے [illegible] سب سے بڑا دشمن ہے اور [illegible] میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

[illegible] اس نے [illegible] اپنی طرف کھینچا [illegible] عبدالرحمٰن کا پیالہ [illegible]

[illegible] وہ [illegible] باتیں کرتے رہے۔ [illegible] چاند غائب ہو گیا اور [illegible] روشنی [illegible]

[illegible] عبدالرحمٰن [illegible] چھوٹے چھوٹے [illegible] کرتے [illegible] وہ باتیں [illegible] اور [illegible] کام [illegible] پھر وہ [illegible] ہر کام خود دیکھتا ہے۔"

عبدالرحمان کام چھوڑ کر کھڑکی سے اسے دیکھنے لگا۔

"ارے پاگل۔ چاروں طرف کالی گھٹا گھر آئی ہے۔ پانی برسنے لگا —— بھاگو اس طرف سے راستہ۔"

رنگا بڑبڑاتے ہوئے ٹھٹک گیا اور وہ دوڑتے ہوئے جا کر پیڑ کے سائے میں پاس سے باتیں کرنے لگا جو بندوق زمین پر ٹکائے

رنگا پوچھنے لگا: "اس رات اور کتنا کچھ ہوا تھا؟"

وہ ہنسا: "ارے تم جاگ رہے تھے؟"

"میں ایک آدھ دفعہ کی نیند میں سنا تھا۔"

عبدالرحمان نے ساری بات سنائی۔

"بڈھا،" اس نے زمین پر تھوک دیا، "بہو کو روتا ہے۔"

"بیچارہ روتے رہے۔ اسے اپنی بہو سے پیار ہے۔"

"پیار ہے تو گھر سے نکالے —— جیل کی روٹی توڑے، بھاگ جانے —— بہو نے کیا پایا تھا صاحب۔"

عبدالرحمان نے سوچا، "وہ تم سے بھی اچھا نہیں رہے گے۔"

"ہوں نہیں تو بتا بھی، وہ تو ہے۔"

"ارے تم کیا جانو عورت کیا کر سکتا ہے؟"

"نہیں یہ جانتا تو مت رونے۔"

"تمہیں اپنی بہن سے پیار نہیں؟"

"میں تو ہوں ہی نہیں"

عبدالرحمان کے دل میں پھر سے کچھ کریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "اچھا یہ تو بتاؤ رنگے، تم نے کبھی کسی عورت سے پیار کیا ہے؟"

"پھر وہی باتیں؟" رنگا کھسک کر بیٹھنے لگا

"نہیں رنگے، سچ سچ بتاؤ۔"

"مگر کیسے بتاؤں، کوئی ہو تو ہے۔"

عبدالرحمان نے چھیڑا ہو، "رنگے میں نے ثابت کر دیا کہ تم کس قدر بھی تھے۔" بہت سی باتیں اور ڈالیں بے ساختہ لہجے میں۔

"ہاں ہاں تو کیا بات —— مرد کی دنیا کا کرتے ہیں۔"

"مگر تم یہ کیسے کہہ رہے تھے؟"

"اس کا کالا ہے؟"

"مگر تم بھی تو کالی ہے ——— کالے نے کہا میں تو کوئی ملکہ ہیں۔"

"مگر میرے باپ نے تو بچپن ہی میں کالے سے کیا اور میرا کیا قصور؟"

"تمہارا باپ کالا کیوں تھا؟"

"وہ" رنگا نے کہا "میرے باپ کے نانا تو دور دور سے مال لاتے تھے۔ بہاگ اور معاش تمام بھگتا تھا۔
رنگ تو پہاڑ نشیبوں سے ہے۔ تب ہی تو اتنے برس بات کے کالے ہیں یہ آتے ہیں۔"

رنگا گھر پہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب تو ڈر ہی رہا تھا۔

"مگر تم جیسا بھی ہے پھر اللہ تو تھا ہی ہے۔ اپنے لڑکے کالے دور تک تھی اور میں نے بھی تو زندوں کی طرح دو راستے میں کہ
رہا تھا۔ مرنے وہ ساتھ بہت ساتھ تھے۔ وہ پنجاب کے ٹکڑے رہتے اور میں نے مدد میں دونوں سے کہاں زیبات اور نقشہ
وعدہ ——— کی طاقت نے زہر دینے میں دنیا میں پیار کی تو بات نے کر دیں تے بچہ پہچان کر وہ لڑکی پہ پھینک دیا۔ حالانکہ ایک
بچہ پیدا کر کے شاہ ہو گیا۔"

عبدالرحمن اور بھی اندر داخل ہو گیا کہ دیر تک خاموش رہے۔ رنگے کے پیچھے پوشی کی طرح منہ زور چپ دیکھ کر اپنے پوچھا:

"رنگے۔ تم کبھی بھی خدا کو کیا جواب دو گے؟"

رنگے نے گھر پہ ہاں میں پوچھا اور تیزی سے عبدالرحمن کی طرف گھوم کر بولا "میں جواب دوں کا یا وہ مجھے جواب دے گا؟ ———
میں؟ ——— اگر آپ مجھے کالا کر کے کہہ دیتا ——— کیسے دیکھا تھا؟ ——— اس کا بیٹا تو مجھے کسی اور رنگ کا پیدا کر دیتا۔ میں خود کالا
ہوں مگر بھی خدا کو ان ہی کا کہنا مانتا ——— اگر کالا بیٹا تو کالا ہی ہوگا ——— کبھی کبھی کسی کی خوشی پہ اپنا ہی لگتے دیکھتا ہوں۔
میں نے ایک دو دفعہ مرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر لوگوں نے بچا لیا۔ جب کے سب تعلق ہو گیا۔"

عبدالرحمن وہ سب سا ہو کر چپکا بیٹھ گیا اور کلام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا: "تم سے مطمئن ہو گئے۔ تم تو رنگتے ہی کہ
پیار کسی کو نہیں کیا۔"

رنگا ایک دم جوش میں آ گیا "تو کیا میں اس کا بھی پابند ہوں ——— کیا کیوں نہیں ——— میں بھی تو انسان ہوں ——— مرد
ہوں ——— مرد ہی پیار کیا کرتے ہیں۔"

"بشرٰی:" عبدالرحمن نے اسے پوچھا

رنگے نے گھر پہ ایک دم زمین میں پاؤں گھسیٹا اور دور سے تڑپتے ہوئے بولا "بشرٰی بھی مجھ سے کہیں ———"

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں؟" وہ بات کاٹ کر بولا

رنگا گھر پہ نکال کر کیاریاں بنانے لگا۔ پھر سر جھکائے بیڑا کا پیچ ادا زمین بولا "کیاریاں بنا دوں۔"

رنگے کے ہاتھ چل رہے تھے۔ کبھی بہت سست اور کبھی بہت تیز۔ چہرے کے رنگ بدلتے جا رہے تھے۔ اور سر کا...

بکتا جاتا تھا۔ معاملہ میں گم اور گہری سوچ میں غرق تھا۔

کام ختم ہوا تو دونوں درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔ جبار والے کے پوچھے بغیر جھٹے نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ اس کے چہرے پر جو تھی وہ اداسی کا گہرا شکوہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

"چوہدری صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا اور کہا تھا کہ ملک معراج دین کی گھوڑی نکالنی ہے اور قتل میں جا کر چھوڑ دینی ہے ——— پھر کیا ہوا؟ ——— میں نے کہا چوہدری جی یہ اس سے ٹھیک ہے جو ... بڑا جا بلا دی ہے ——— مگر چوہدری نے کہا تو اپنے پیسوں سے مطلب رکھ ——— میں نے کہا چوہدری کام بڑا ہے ... تم خود ہی دیکھو۔ جان کا بھی خطرہ ہے۔ جیل بھی سامنے ہے ——— بات چلتی رہی۔ آخر دو ہزار پر فیصلہ ہوا۔ چوہدری نے ہزار اسی وقت دیا اور کہا باقی ہزار کام پورا ہونے کے بعد دوں گا ——— میں تیار ہو گیا۔ ان دنوں بڑسی کی گھوڑی کا نکل جانا بہت بڑی عزت کی بات تھی اور چوہدری ملک کو کسی رنجش کی وجہ سے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ہمیں کیا ——— ہمیں تو اپنے مال سے غرض تھی۔

"میرا باپ ان دنوں جیل میں تھا۔ مت پھانسی ہونے والی تھی۔ میں نے کہا شکے چل ذرا۔ یا تو نام ہی ہو جائے گا اور باپ پیسے کے کام آ جائیں گے ——— ماں میری بوڑھی تھی میں نے اسے کہا۔ ذرا جیل جا رہا ہوں ملاقات کرنے۔ دو تین دن لگ جائیں گے ——— اور خود اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا ملک معراج دین کا علاقہ چل دیا۔

میں وہاں پہنچا تو گھوڑی نظر سے گزر رہی۔ کسی نے بتایا گھوڑی کو چرانے گئے ہیں۔ میں بھی اسی راستے پر چل دیا۔ دور سے گھوڑی نظر آئی ——— مگر قریب گیا تو گھوڑی کو دیکھتا سنبھل گیا ——— کیا بتاؤں بابو جی کیا ہوا ——— ایسا ہی وہ بلا کی چھوکری تھی جو گھوڑی کے ساتھ پل بھر کو آ گئی کہ میں سب کچھ بھول گیا ——— خیر ... ایک نظر گھوڑی پر ڈالی اور ہزار نظریں چھوکری پر ڈالیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔ پتہ چلا کہ وہ ملک معراج کی لڑکی ہے اور روز گھوڑی کو گھمانے لے جاتی ہے۔

رات کو گھوڑی کھولنے پہنچا تو دیکھا ساتھ ہی چارپائی پر لڑکی بھی سوئی ہے۔ دو سب گھر والے غافل سوئے تھے جیسے تو ذہن بدلا گیا۔ میں نے کہا چھوڑ دو اسے جس کی بنا پر لے آیا ہے۔ چنانچہ گھوڑی کو رستے لا کر وہیں چھوڑ دیا۔ اگلے دن چوہدری سے بتایا پیسے لوٹا دیے۔ اور پھر اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا اس کی ڈھوک پر۔

ان دنوں میری عمر ہوگی کوئی پچیس برس کی۔ بڑا گبرو جوان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چھوکری راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ رات پھر وہیں جا کر دیکھا گی۔ قسمت اچھی تھی اور وہ اکیلی وہاں تھی۔ ملک شاید گھوڑی ڈھونڈنے باہر گیا تھا اور ایک دوسری چارپائی پر خالی بستر تھا ...... میں چلتا تھا جیسے کوئی بھی بھی اشارہ کرتا ہے۔ میں نے کہا چھوکری بھی کیا چاہتی ہو۔ تو نے جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹ کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھا اور چہرہ چھپا لیا ——— بے چاری نے چیخ ماری مگر آواز نہ نکل سکی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھوڑی لینے آیا تھا تو وہ بہت گھبرائی اور اپنے آپ سے پیچھے ہٹنے لگی ——— مگر وہ کوشش کرنے لگی۔ تب میں نے اسے بازو وغیرہ سے تھام لیا مگر اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ نہیں معلوم اس کے ہاتھ اور منہ میں کیا دہل تھا اور کتنا بے ہوش کر دیا۔

وہی چند میل دور جا کر ایک پہاڑی غار میں اسے چھپایا۔ کھانے کو دیا۔ جیب سے چوہدری کے دیے ہوئے ہزار روپے نکال کر

اس کی صورت میں ڈال دیے۔ مجھ کو ایسے مذاق سے بڑی [illegible] تھی ——— کبھی چٹکیاں، کبھی گالیاں، کبھی میرے بال نوچتا، میں نے

کہا یہ ٹھیک نہیں۔ [illegible] اس نے [illegible] ——— میں نے کہا [illegible] کام لیا۔

اس [illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— سال ایک دم چت ہو گئی

[illegible] ——— [illegible] پانی سے زخم صاف کیا [illegible]

[illegible] ——— [illegible] جب [illegible] ——— [illegible]

[illegible] پہنچ گیا۔

[illegible] ———

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] چاقو [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] جب [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible] دیا۔

کٹے ہوئے رشتے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عبدالرحمٰن اُسے بالکل پسند نہ کرتا تھا اس لیے جب وہ قریب آ کر کھڑا ہو گیا تو بھی اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔

"آج کتنی پر ڈیوٹی ہے؟" اُس کی آواز میں وحشت کی بجائے نرمی کا احساس کر کے عبدالرحمٰن قدرے حیران ہوا۔ مگر اُس نے [illegible] سر ہلا دیا۔

"بابو — تم جیسے نیک آدمی ان سوروں میں کہاں سے آن پھنسے۔ تمہیں میں اس طرح دیکھتا ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے۔"

نفرت کے باوجود عبدالرحمٰن کو اُس کی ہمدردی اچھی لگی اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بیٹے والد صاحب نے کہا ہے کہ بابو کا خاص خیال رکھا کرو۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو امداد وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالو۔ بلکہ دے دیا کرو۔"

عبدالرحمٰن نے اُسے شکر آمیز نگاہوں سے دیکھا — اُس کا چہرہ چیچک زدہ تھا، آنکھیں جنگلی تھیں اور ہونٹوں سے [illegible] ٹھوڑی تھی — مگر اس وقت وہ عبدالرحمٰن کو برا نہیں لگا۔

"بیٹے والد صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر بابو کو بیوی سے ملاقات کرنے میں دقت ہوتی ہے تو بابو سے پوچھنا۔ اگر وہ چاہتے تو اُسے [illegible] ملنے میں مدد کیا کرے۔"

"ہاں — ہاں ضرور۔" عبدالرحمٰن بولا۔ "اگر تم لوگ ملاقات کا انتظام ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔" اُس نے سوچا جیل کی دنیا میں [illegible] انسانیت باقی ہے۔

"میں اُسے جیل والوں کا برابر راضی [illegible] ویسے وہ آدمی بڑا اچھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بیوی کو بھی راضی [illegible] اگر کسی [illegible] دونوں رات بھی [illegible] لوگوں کی نگاہ [illegible] کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔"

عبدالرحمٰن کا دل اچھل پڑا۔ شرماتے ہوئے وہ مسکرا دیا اور کہنے لگا "پوچھ دیا اس سے اگر وہ راضی ہو جائے تو" نمبردار نے عبدالرحمٰن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "تم فکر نہ کرو بابو۔ میں سب انتظام کر دوں گا — بیٹے والد صاحب کا حکم ہے۔"

پھر قریب ہو کر بولا "بس تم ذرا اپنی بیوی کو کہلا دینا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ وہ [illegible] — یہی کہ وہ [illegible] نہ مانے"

"نہیں نہیں تمہیں کچھ منانے کی — [illegible] بہت شکر [illegible]"

"نہیں — میرا مطلب ہے کہ وہ جھگڑا نہ کرے۔ اگر کسی بھی بیٹے والد [illegible] — اور — میں — [illegible] پیار کریں۔"

عبدالرحمٰن ایک دم چپ ہو گیا [illegible] اس کا منہ [illegible] مگر وہ چپ [illegible] دیکھا۔

عبدالرحمٰن [illegible] سے [illegible] ایک دم [illegible] ہو گئی۔

اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں [illegible] ——— کبھی چمکتیں کبھی کلیاں کبھی [illegible] نہیں سنے کا ایسے ٹھیک نہیں۔ چنانچہ [illegible] اس کے کپڑے اتار دیے [illegible] ——— میں نے کہا [illegible] کام ہو گیا۔ اس کے منہ سے [illegible] نکلا۔ مگر اس نے ایک [illegible] میں دانت گاڑ دیے اور [illegible] ——— تیرے [illegible] ہو کر [illegible] ——— سالی ایک دم چت ہو گئی

[illegible] ——— مر گئی۔ [illegible] تھی۔ [illegible] تو میں نے [illegible] صاف کیا اور [illegible] گھونٹ دیا ——— پھر [illegible]۔ جب دل بھر گیا تو [illegible] دیکھتا رہا ——— [illegible] دیکھتا رہا۔ [illegible] ——— [illegible] رات کے وقت اسے چادر میں لپیٹا اور صبح [illegible] پہنچ گیا۔

میں اس کو [illegible] ——— [illegible] ——— اور وہ جانتی۔۔۔۔۔ اسے [illegible] ——— [illegible] کی۔ میں نے [illegible]۔ مگر چند دن بعد [illegible] میرا باپ پھانسی پر چڑھ گیا۔

[illegible] ——— [illegible] میں [illegible] اور [illegible] ڈال دی۔ پھر میں نے [illegible]۔ وہاں سے [illegible] اٹھا [illegible]۔ اس [illegible] ایک جوڑا بنا لیا۔

[illegible] جب میں [illegible] اور زندگی کا [illegible] ——— [illegible] میں ہو اور ایک [illegible] ——— [illegible]؟

[illegible] کی آنکھوں میں ایک [illegible] کیفیت تھی، اور وہ [illegible] بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر [illegible] تھی اور آنکھوں کو [illegible] ——— [illegible] کی طرف چلا گیا۔ [illegible] ——— وہ انسان نہیں، درندہ ہے۔ [illegible] ——— وہ کتنی دیر [illegible]۔ مگر کبھی کبھار اس کے کانوں میں [illegible] کی آواز گونج جاتی۔

[illegible] کے گھر پر ——— کیوں گیا تھا، وہ اس کا [illegible] کسی [illegible] کے گھر پیدا ہو گیا۔

کئی [illegible]۔

[illegible] کی [illegible] ہو رہی تھی۔ وہ گھر کے [illegible] بیٹھا [illegible] رہا تھا۔ [illegible] جو نہ وہ [illegible] کے پچھلے [illegible] کے نیچے [illegible]۔ [illegible] وہ [illegible] کی [illegible] سے [illegible] تھا۔ [illegible] بیٹھا [illegible] کرنے کے بعد [illegible] اور [illegible] پر بیٹھ گیا۔ [illegible]

عبدالرحمان اُسے بالکل پسند نہ کرتا تھا اس لیے جب وہ قریب آکر کھڑا ہو گیا تو بھی اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔

"آج کھانے پر ڈیوٹی ہے۔" اُس کی آواز میں درشتی کی بجائے نرمی کا احساس کر کے عبدالرحمان قدرے حیران ہوا۔ مگر اُس نے صرف سر ہلا دیا۔

"بابو ——— تم پڑھے لکھے آدمی ہو سوروں میں کہاں سے آن پھنسے۔ تمہیں میں اس طرح دیکھتا ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے۔"

نفرت کے باوجود عبدالرحمان کو اُس کی ہمدردی اچھی لگی اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہیڈ وارڈر نے کہا ہے کہ بابو کا خاص خیال رکھا کرو۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے دوسروں کے چکر میں نہ ڈالو، بلکہ دے دیا کرو۔"

عبدالرحمان نے اُسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا ——— اُس کا چہرہ چیچک زدہ تھا۔ آنکھیں بھینگی تھیں اور لبوں تلے چپٹی ہوئی [illegible] ٹھوڑی تھی ——— مگر اس وقت وہ عبدالرحمان کو بُرا نہیں لگا۔

"ہیڈ وارڈر نے کہا ہے کہ اگر بابو کو بیوی سے ملاقات کرنے میں دقت ہوتی ہے تو اس سے پوچھنا۔ اگر وہ چاہے تو اُسے [illegible] کوٹھڑی میں بلا لیا کرے۔"

"ہاں۔ ہاں ضرور" عبدالرحمان بولا۔ "اگر کوٹھڑی میں انتظام ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔" اُس نے سوچا جیل کی دنیا میں [illegible] تو انسانیت ابھی باقی ہے۔

"میں اُسے جلدی دن کا کہہ آیا ہوں ——— ویسے وہ آدمی بڑا اچھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تم پر بھی راضی ہو جائے گا۔ کبھی کبھار تم دونوں رات بھی اس کوٹھڑی میں گزار لو۔ وہاں کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

عبدالرحمان کا دل اچھل پڑا۔ شرماتے ہوئے وہ مسکرایا اور کہنے لگا "پوچھ لینا اس سے اگر وہ راضی ہو جائے تو"

نمبردار نے عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "تم فکر نہ کرو بابو۔ میں سارا انتظام کر دوں گا ——— ہیڈ وارڈر کو منانا میرا کام ہے۔"

پھر قریب ہو کر بولا "بس تم ذرا اپنی بیوی کو کہہ دینا۔"

"کیا؟"

"یہی" وہ ہنسا "یہی کہ وہ بُرا نہ منائے۔"

"نہیں نہیں بُرا کیوں منائے گی ——— ہم تو تمہارے بہت مشکور ہوں گے۔"

"نہیں ——— میرا مطلب ہے کہ وہ جھگڑا نہ کرے۔ اگر کبھی ہیڈ وارڈر ——— اور ——— میں ——— ذرا پیار کر لیں۔"

عبدالرحمان ایک دم جھپٹ کر اُٹھا کہ اس کا منہ نوچ لے۔ مگر وہ چھٹکارا پا کر بھاگ گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

عبدالرحمان غصے سے بے دم ہو کر وہیں فرش پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر سانس لیتا رہا [illegible] ——— آنسو نکل آئے۔

—— عکس والد اور میں کیا ہو سکتا ہے ——— بلکہ کہیں آتش مزاج ہی تو ہے؟ ——— کہتی ہے

بیوہ خاموش:

پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

۔ کے وہ مخلص تھی ——— بیگماں پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا۔ بیگماں شوہر کے لیے کافی بنا رہی تھی ——— آنسو

آیا رہے۔

مگر میں کیسے جاؤں؟

اگر تم کچھ نہیں، تو میں آیا کر یہاں ——— میں جو کر دیا ہوں ——— میں کافی پلا رہا ——— اور جب بھی یہاں آئے

کسی کو ساتھ لے آنا۔

بیگماں جھٹ سے بولی تو وہ اسے نصیحت ہو ... ——— اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو میں کبھی بھی بات

نہیں کروں گا:

بیگماں بہت دیر تک راستہ دیکھتی رہی

اس کے بعد نہیں ... جو کسی دوسری ... بیٹا دانا ... اس نے اپنی ذہنی تبدیلی کر ڈالی تھی ———

بیٹے اس وقت سے بیگماں کی ... اور ... ہو گئی کہ وہ بیٹے کی موت۔

وہ شخص نہایت چپ تھا۔ چونکہ وہ ... سے اس ... شخص نہیں پاتا ... اپنی بیوی کے حق کی خبر نہ تھی۔ وہ ہر روز

کسی ... کا انتظار کرتا کہ ... ہو۔

... جیل کا ... تھا۔ سپرنٹنڈنٹ ... جیل ... کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ...

... تھا۔ ... بیٹھے تھے اور ... ہاتھ میں ... چشمے ... اور ... دیکھ رہے تھے

... اپنی ... دوسروں سے بات کرنے کر ... رہے تھے۔ وہ شخص

... بیٹھے تھے ... وہ ... کے درمیان ... پاس ... ہو۔

... اس سے بتایا ... اس نے ... کے ساتھ بات پر ... تھا۔ اور جھگڑے میں

... ہو گیا ...

... کو ... تسلیم نہیں ہوئی۔ ... سنبھالا

... کہ ... شخص ... خاص طور پر ہدایت کی کہ ... معاف کرنے کیونکہ

وہ ... تھا ——— ... شخص کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا

اس ... ہوا ... شخص ... نہیں ہوا۔ ... تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید

... کے ... گے ... غلط ...

شام جب کھانا لینے گئے تو عدالت بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ واپس کمرے میں آکر جب تینوں نے اپنے اپنے برتن سامنے رکھے اور کھانے لگے تو عدالت بولا۔

"سنتے تو پہلے یہی کہتا تھا کہ میں رہائی کے بعد دوبارہ واپس آؤں گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" نمبر ۱۳ نے منہ میں نوالہ ایک طرف سے دوسری طرف کرتے ہوئے بولا۔

عدالت روٹی کو ہاتھ میں مسلتا ہوا مضبوط آواز میں بولا "میں نے جا کر اپنے باپ اور بہن کے خاوند کو قتل کرنا ہے۔"

"مجھے پتا!" نمبر ۱۳ نے چاول اور دال سے دار شکل روٹی پر اتارا "یہ بات ہوئی مردوں والی ——— مرد ہے تو بھی۔"

اس نے مکا بنا کر عدالت کو ساتھ لپٹایا اور کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "فکر نہ کر۔ قتل کے طریقے میں بتاؤں گا۔"

عدالت نے پُرخلوص مسکراہٹ سے سر ہلاتے ہوئے اس نئی دوستی کا آغاز کیا۔

دوسرے روز جب کھانا لینے کے لیے باہر قطار میں کھڑے تھے، قیدی افسر ہوا آکر عبدالرحمن سے اگلے قیدی سے سرگوشی میں بات کرنے لگا۔ اس نے شاید عبدالرحمن کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے عبدالرحمن اسے دیکھتا گیا اس کے دل میں غیض و غضب اٹھنے لگا۔ نمبر ۱۳ نے سرگوشی کرکے آگے ... اور دونوں مسکرا دیے۔ اس پر معصوم عبدالرحمن کو کنویں والا شدت سے یاد آگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو گردن سے پکڑا اور دو چار گھونسے لگا دیے ——— قیدیوں میں ہلچل سی پڑ گئی۔ افسروں نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو چھڑایا تو وہ سیدھا جیلر کے کمرے کی طرف بھاگا۔

مقدمہ سب کے سامنے ہوا تھا۔ انکاری کی گنجائش نہ تھی۔ جیلر نے فقط اتنا کہا "ہنستے کھیلتے لوگ بھی کیسے ذلیل حرکتیں کرتے ہیں —" اور پانچ دن کے لیے بیڑی لگانے کا حکم دے دیا۔ عبدالرحمن نے کوئی صفائی پیش نہ کی ——— مگر خود اس کے دل کو بہت اطمینان ہو گیا تھا۔

آسمان کی ستیلی میں چاند چپ رہا تھا۔ اس کی روشنی سیدھی عبدالرحمن پر پڑتی۔ اور بیڑیوں سے بعض حصے چھپ جاتے تھے۔ لیے کے کٹے ہوئے ... اس کو جگہ جگہ چبھ رہی تھیں۔ پاؤں کے ٹخنے ابھی سے چھل چکے تھے۔ وہ جس کروٹ بھی بیٹھتا۔ دونوں ٹخنوں کے پیچھے چبھنے لگتے۔ وہ کبھی لیٹ جاتا کبھی بیٹھ جاتا۔ بالآخر اس نے کمبل تہ کرکے دیوار کے ساتھ رکھا اور اس سے ٹیک لگا کر چاند دیکھنے لگا۔

...... نہ معلوم اسے کالج کے زمانے میں پڑھا ہوا شیکسپیئر کا فقرہ کیوں یاد آنے لگا کہ جس طرح شریر بچے کیڑوں کو مار کر کھیلتے ہیں۔ اسی طرح دیوتا انسانوں سے کھیلنے میں مزہ لیتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا کہ ہم واقعی شطرنج کے مہرے ہیں۔ دنیا بالکل مہروں کی دکان ہے۔ جس میں بعض مہروں کو خوبصورت رنگ کے کپڑے پہنا کر اونچی جگہ پر سجا دیا گیا ہے اور دوسروں کے منہ کو کالک [illegible] چھپے پر چپک ہے۔ بعض کا کام صرف [illegible] بنانا ہے۔ جن کو [illegible] کہ ہاتھ ہلا سکیں یا آنکھیں [illegible] سکیں، یا آنکھیں چلا سکیں ——— [illegible] جب چاہتا ہے ایک مہرے کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا رکھ دیتا ہے ——— اور کوئی اپنی قوت عمل کوئی نہیں۔ وہ فقط اس انتظار میں ہیں

کر کوئی اوس سے آ رکیے۔ [illegible] ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔ کبھی ماتھے کو اندر کھینچتی ہیں۔ کبھی ذہن بیکار ہے اور کبھی خود بخود طبیعت [illegible] ——— [illegible] مگر [illegible] رات [illegible] ۔۔۔ [illegible] پانی ختم کر دیتے ہیں کبھی [illegible] ——— مدت بھی کافی تھا [illegible] ——— نکالنے پیدائش کے [illegible] ——— خود [illegible] قسمت [illegible] [illegible] ——— [illegible] [illegible] ——— یہ سب [illegible] بعض حالات کے لکھے ہیں . . .

. . . [illegible] ——— [illegible] ——— ہم بعض [illegible] لکھتے ہیں جو اسباب اور [illegible] احساس بیماری نہیں ہے . . . . . .

چار مہینے [illegible] اور عبدالرحمان بیٹھا سوچتا رہا۔

ڈیڑھ سال گزر گیا۔

سڑک پر [illegible] دھوپ بہت چمکیلی تھی۔ [illegible] چیزیں جا رہی تھیں۔ [illegible] اور سواری کو جا رہے تھے۔ سڑک پر سائیکلوں کا ریلا تھا [illegible] اور دنیا بغیر کسی تبدیلی کے رواں تھی۔

مگر عبدالرحمان ہر ایک چیز کو دیکھ کر عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ ہر شے ویسے ہی تھی جیسی ہونا چاہیے تھی۔ مگر پھر بھی وہ [illegible] تھوڑا حیران ہو کر [illegible] وہ جیل کے باہر کی دنیا کو اپنے پرانے [illegible] دیکھنے کا متوقع تھا۔ مگر توقع کے [illegible] ایک نامعلوم سی خوشی محسوس [illegible] ——— جب وہ [illegible] بازار میں پہنچا تو سبزہ [illegible] بالکل [illegible] پہنے تھے۔ [illegible] اور جب وہ [illegible] بیٹھ گئے۔

"نہ سے اس عرصہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوا" اس نے اپنے ہی بے شمار جذبات کے ہجوم میں سوچا۔

گلی میں مکانوں کی بھی دو رویہ قطاروں میں سامنے ایک مسجد کے میناروں پر صبح کی سنہری دھوپ پڑ رہی تھی اور ان کی آدھی گولائی سنہری ہو رہی تھی۔ فضا پر ایک مقدس پرسکون سا سایہ تھا۔ جیسے جیسے وہ مسجد کی جانب چل رہا تھا۔ اس کے دل میں ہچکچاہٹ بڑھتی سے سر اٹھانے لگے۔ گھوم گھما کر اس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا ——— وہ صاف نہ تھے اور شاید پاک بھی نہ ہوں۔ مگر کیا حرج ہے۔ میں تو فقط دنیا میں دوسری دفعہ داخل ہونے سے پہلے خدا سے دعا مانگنا چاہتا ہوں کہ وہ صاف ستھری اور نیک زندگی بسر کرنے میں میری مدد کرے۔ کپڑے اگر خراب ہیں تو کیا ہوا۔ میری نیت تو صاف ہے۔ ایک دفعہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بعد دعا مانگنے میں وہ بات نہیں۔

مسجد کے دروازے پر جوتا اتار کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بڑے صدق دل سے وضو کیا۔ صبح کی نماز کے دو سنت اور دو فرض پڑھنے کے بعد کچھ دیر درود شریف پڑھا۔ پھر دو نفل پڑھے اور سجدے میں گر کر بڑے ہی عجز و انکسار سے دعا مانگی کہ خدا اس کی مدد کرے۔ دنیا کی نکتہ چینی کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے۔ مشکل آزمائش سے بچائے۔ نیکی کی ہدایت اور توفیق عطا کرے اور ایمان مضبوط کرے۔

مسجد سے نکلا تو اس کا دل بڑا ہلکا تھا۔ خراماں خراماں چلتا جب وہ اپنی گلی میں مڑا تو اس کا دل تیز دھڑکنے لگا۔ ممکن ہے بیگم گاؤں سے آگئی ہو۔ میں نے پہلے ہی اس کو جیل سے خط لکھا تھا کہ میں آ رہا ہوں اور وہ گاؤں سے واپس آ جائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گلے لگ جائے گی۔ آنسوؤں سے میرا کندھا بھگو دے گی۔ پھر گلے شکوے کرے گی کہ میں نے اس کو مشکلات میں ڈال دیا۔ اور میں ہنس کر کہوں گا دیکھا بیگم میں سیدھے راستے سے بھٹکا تو مجھے کتنی سخت سزا ملی۔ مجھے پہلے کی طرح ہرگز مجبور نہ کرنا کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح رشوت لوں۔ ہر وقت میری حیثیت کے لوگوں کی مثالیں دیا کرتی ہو کہ ان کے پاس مجھ سے زیادہ روپیہ ہے اور وہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں اور وہ میری کمائی میں ... کرتی ہو کہ میں سب کچھ کر گزروں۔ یہ جانے بغیر ... بس یہی تو ہو کچھ ہو۔ تم ہی ہو۔ تم آ گئے تو ——— مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ تمہارے ساتھ مجھے ہر قسم کی روکھی سوکھی پسند ہے اور میں اسے پیار دوں گا . . . . .

اس نے دیکھا وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا ——— گھر والی سیڑھیوں پر ایک لڑکی بیٹھی تھی ... پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ لڑکی اور ... چند لمحے توقف کرکے اس نے سوچا کہ پارو کی ماں کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

پارو کی ماں نے جیسے ہی اسے دیکھا وہ چونک پڑی اور ... سے جھانکنے لگی۔

"ارے بھائی جی۔ آپ کب آئے؟"

"بس ابھی سیدھا واپس آ رہا ہوں۔"

"ارے بڑی خوشی ہوئی دیکھ کر آپ کو۔ پارو کے ابا تو گھر میں ہی نہیں ——— اری پارو جا ذرا بھائی کے واسطے شربت لے آ۔"

مگر عبدالرحمن نے منع کر دیا کہ مجھے پیاس نہیں۔ دراصل وہ بیگم سے ملنے کے لیے بے کل ہو رہا تھا مگر پارو کی ماں حسب معمول اتنی ... میں مصروف تھی۔ ... پاس پڑوس کی خبریں تھیں۔ ... کے جو واقعات ...

دیتی رہی تھی۔ ایک دفعہ جب وقفہ ذرا طویل ہوا تو عبدالرحمن نے بالآخر یہ سوال کر ڈالا۔

"ہیلن نہیں آئی کافی دن سے؟"

"بھابی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اچھی ــــ لیکن کچھ شبہ سا ہے مجھے۔ وہ پہلے تو شک کی نظر سے دیکھتی تھی آپ"
عبدالرحمن نے مختصراً بیان کر دیا۔ اسے طاہرہ پر گمان سا ہوا کہ اس نے بات کا جواب کیوں نہیں دیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے پیر کا لکھا
پکڑ لیا۔ مگر وہ بات ٹال گئی۔ عبدالرحمن نے کہا شاید یہ بھی محض کچھ تعصبات جڑ گئے تھے۔ مگر جب اس کی باتیں ہو رہی تھیں تو وہ
کہا "ہیلن بیمار تھی، ہیلن جیسا کوئی میرے پاس آئی۔ آپ کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ آپ نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ورنہ ذرا سی غلطی سے بہت
مشکل ہو جاتا ہے:"

پادری صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر بولے: "ہماری بیوی میں [illegible] تھی تم ہو کہ [illegible]"

"اس شروع میں تو باقاعدہ آتی تھی۔ مگر بعد میں میں نے منع کر دیا تھا [illegible] تب سے ترک کر دیا۔"

پادری صاحب پھر خاموش رہے۔

عبدالرحمن نے ذرا وقفہ کے بعد پوچھا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیوں، کیا ہوا ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے، ہیلن یہاں نہیں آئی۔ اب اسٹیشن پہنچا ہوں تو ان سے ملاقات ہو گئی"۔ اس نے کریمہ کو آہستہ سے رخصت کی۔

"بھابی ــــ کا اس پر کیا کرتے؟"

"کیوں؟"

پادری صاحب پر ایک عجیب وحشت کی خاموشی طاری ہو گئی جیسے بات کرنے سے گھبرا رہے ہوں۔

"کیا بات ہے؟" "وہ وہ۔"

"وہ مجرم ہی کا ذرا کہیں ہو تو آپ جائیں گا۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" عبدالرحمن حیران رہ گیا۔

وہ بہت بچے کے پیار میں بولی "اس نے مذاق سے شادی کر لی ہے۔"

عبدالرحمن ایک دم بڑبڑا گیا "کیا کہا؟"

مگر وہ خاموش رہے۔

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــ میں نہیں مانتا۔" اس نے دونوں ہاتھوں [illegible]

"اب تو آپ کو یقین کرنا ہی ہوگا۔" اس نے [illegible] کیا۔

عبدالرحمن [illegible] کے عالم میں کھڑا رہا۔ پادری صاحب نے اس عرصے میں [illegible] کر دست کیا۔ اپنے [illegible]

نہ نیک کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر بے سہارا نگاہوں سے عبدالرحمان کو دیکھتی رہی۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے ششدر کھڑا رہا۔

"مگر یہ ہوا کیسے؟"

پارو کی ماں کا چہرہ بند لٹک گیا۔ "ہونا تو تھا ہی۔ اس نے میری بات جو نہ مانی۔ میں نے بہت کہا تھا کہ بیرکا سکھ یہی تو کیوں بیگم ... عاقل تو ایک جاہل ہے۔ پہلے دو تین روز تو گھر سے بھاگا بھاگا آتا رہا۔ پھر ایک دن آکر اسے ڈھائی سو روپے دیے کر رکی رکھ ... اس کے بعد ہفتہ دس دن وہ چکر لگانے لگا ——— بڑی خیر خواہی جتاتا تھا کہ عبدالرحمان تو خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہے۔ مگر ... دوستی کا حق نہیں سمجھا۔ اس لیے تم پر کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتا دیا کرو۔ جب آتا فروٹ اور مٹھائی لے کر آتا۔ میں نے کئی بار ... سے منع نہ کیا۔ اس نے بھی کبھی کوئی دفعہ ہنسی دکھائی۔ مگر وہ تو بس چمگادڑ کی طرح چپا ہی رہا۔ حتیٰ کہ مجھے اصل بات کا تب ... جب اس کے گھر سے مولوی کی آواز سنی جو نکاح کا خطبہ پڑھ رہا تھا۔"

عبدالرحمان بُت بنا کھڑا تھا۔ پارو کی ماں ابھی تک کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو میری بیوی ہے اور بغیر طلاق کے دوسرا نکاح کیسے کر سکتی ہے۔"

"میں تو بھائی یہی بات اس سے پوچھا تھا۔ وہ تو چپ ہو گئی تھی۔ مگر مجھے عاقل نے بتایا کہ مولوی صاحب کے سامنے انھوں نے طلاق کا بیان دیا تھا جس پر سب کے دستخط تھے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ یہ غلط ہے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ عاقل نے پیسے دے کر جعلی طلاق نامہ بنا کر ان سب کو شامل کیا ہے۔"

عبدالرحمان غصے سے کانپنے لگا "میں اس کا مار ڈالوں گا، اس دھوکے بازی کے لیے جیل بھر دوں گا۔ یہ سراسر دھوکہ ہے ——— میں ابھی ... میں جا کر استغاثہ پیش کرتا ہوں ...."

"ذرا حوصلہ کرو۔ بھائی۔ جو بات ہونی تھی ہو گئی۔ اب کیوں اپنا جی جلاتے ہو۔ خواہ تم عدالت میں جا کر کتنے پیسے برباد کرو گے جب ... وہ راضی نہیں ہے۔"

اس نے تھوڑا سوچا۔ پھر بے بسی سے نماز میں پوچھنے لگا "کیوں وہاں وہ زیادہ خوش ہے کیا؟"

"اور کیا۔ وہ تو خوشی سے دیوانی ہو رہی ہے ——— اور خوش کیسے نہ ہو۔ دونوں بازوؤں میں سونے کی بڑی بڑی چوڑیاں ... وہ تو سر سے پیر تک سونے سے پیلی ہو رہی ہے۔ ٹیکسی یا اس کے بنا ایک دم نہیں چلتی ——— جس چیز پر انگلی رکھتی ہے۔ عاقل وہ منٹوں میں خرید دیتا ہے ——— مجھے تو رونا ہی تھی پارو کی ماں۔ زندگی کا مزہ ہی اب ... پہلے تو صرف غریبی تھی۔ وہ تو خالی پیٹ سے اصولوں کے لیے ... دیتا تھا اور جیل میں جا بیٹھا اور میری جوانی برباد ... بڑ گیا۔

عبدالرحمان کا چہرہ اتر گیا۔ اسے ایسے لگا جیسے بازار میں نیلام ہو گیا ہو۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"پارو کی ماں۔ تم نے یہ جھگڑا کے لیے مجھ سے لاتی ہو۔"

"مجبور ہو۔ وہ تقریباً چلائی ـــ [illegible] سے بات نہیں کرنی ہے [illegible] چاہتی ہوں:"

مگر عبدالرحمن نے [illegible] پھر [illegible] کے سامنے پہنچ کر [illegible] اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے [illegible] جسم پر ٹھنڈے پسینے پھوٹ رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ [illegible] وہ بہت سوچنے کی کوشش کر رہا تھا [illegible] کوئی فیصلہ کر سکا۔

اتنے میں پادری کی بیوی آ گئی [illegible] جب عبدالرحمن نے زیادہ [illegible] تو [illegible] بالکل ہے۔ کبھی کبھی [illegible] نہیں۔ کبھی [illegible] کر پتہ چل جائے گا ـــــ [illegible] قابل فکر نہیں:

عبدالرحمن نے دیکھا، سوچا۔ پھر خاموشی سے چل دیا۔

"سب بیمار ہے مجبور ہو:" پادری کی بیوی کا تجسس ہو گیا۔

اس نے ہاتھ ہلایا۔ "کیا پتہ ـــــ خدا کرے خیریت ہے ـــــ یہ بیماری [illegible] کیا ہے:"

پادری کی بیوی عبدالرحمن کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی ـــــ اس کی پشت سے نیچے [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] سے [illegible] ہوئی ـــــ [illegible] ـــــ [illegible] نہیں ـــــ [illegible] ہمیشہ [illegible] کبھی [illegible] ـــــ [illegible] کر کے باہر نکلا۔

پادری کی بیوی: "تمہیں معلوم ہیں وہ، خدا کرے [illegible] ہوئی:" خدا کرے [illegible]

خدا [illegible] کر کے [illegible] اور اس کی [illegible]

[illegible] عبدالرحمن [illegible] سے [illegible] عبدالرحمن [illegible] کے [illegible]

[illegible] کی [illegible]

مگر ..... تم بھی تو انسان ـــــ پھر وہ کرسی سے چپک گیا تھا۔

[illegible] عبدالرحمن [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]

ـــــ [illegible] کیا ہے؟ [illegible]

[illegible] ـــــ [illegible]

[illegible]

بیوی کے ساتھ گلابو کی پیدائش کے بعد ہسپتال سے واپس آیا تھا ——— چلتے چلتے گھر تک اس نے کتنی ہی امیدوں اور
ذہن میں دُہرایا۔ جو چند کمروں میں اس کے بچوں کے درمیان گھنٹوں بیٹھنے اور جینے کا کوئی گمان نہ تھا ——— مسلسل چھ سال وہ اس
ہو رہی تھی۔

باجوں کی آواز سے باہر نکلنے لگا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کالی پتلونیں اور لال کرتیاں والے اپنی کاپیوں پر جھالر جھلاتے
ہوتے ہیں، دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے دولہا گھوڑا۔ ساتھ دوست یار ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور اچھلتے
سے بازو اوپر اٹھائے چلتے ہوئے ——— کوٹھوں سے عورتیں دیکھ رہی تھیں۔ گلیوں کے بچے کھیل چھوڑ کر بارات دیکھنے جا رہے
دلہا اور تمام دوست گولیں اُٹھا کر نچھاور کرنے لگے۔ اور لالہ جی اپنی خستہ حال ریزگاری گنتا ہوا چلا گیا۔

مجھے بھی سات سال پہلے کا وہ سماں یاد آ گیا۔ ذہن میں یادوں کے دھوئیں بھرتے گئے۔ بات چلی گئی اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا
رہ گیا ——— حتیٰ کہ کسی نے پکارا " ہٹئے بابو!!" ٹیلے پر لکڑیاں لادے ہوئے ایک مزدور راستہ مانگ رہا تھا ——— وہ سر جھکا
کر چل دیا۔

وہ گھر جانے کے بجائے وہ سیدھا پاس کے باغ میں جھیل کے کنارے کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا ——— "اوہ خدا کیوں نیکی کی قیمت
ہے۔ اس دنیا میں ہر طرف سے لوگ چلتے پھرتے ہیں ——— جو کچھ میں نے کیا اس سے کہیں بڑا گناہ جرم اور گناہ عاشقوں نے کیے ہیں
اور اس وقت میں اپنی بیوی کے ساتھ ہنس کر رہا ہے اور میں اور سب خاندان والے ٹھکرا رہا ہوں ——— کیا تیرا قہر صرف ہم لوگوں کے لیے
ہی رہ گیا ہے؟؟ ——— یہ تیرا انصاف کیسا ہے؟؟؟"

اس کے گرد جھنڈ جھنڈ چکر کاٹ رہا تھا۔ کسی وقت وہ بیٹھے کو بیٹھتا تو ایک مچھلی کچھ پرے پانی پر آ جاتی۔ بھنور
آتا اور وہ پھر ڈوب جاتی۔ ایک دو چکر کاٹنے میں بھنور بالکل اس کے پاس سے گزرا۔ مچھلی نے جھٹ سے سر اُٹھایا اور گیت
دے دیا۔ مگر ساتھ ہی اس کے اپنے قدم اکھڑ گئے اور وہ فضا میں الٹ کر گری۔ نیچے بار کی تار دار تاریں لگی تھیں۔ وہ سیدھی ایک کانٹے
پر لگی اور بھنور اس کے منہ میں تڑپتا ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔

اس دنیا میں کوئی انصاف ہے؟؟ ایک قیمتی چلنے پر جوت تڑپ بازی ہے۔ اس نے سوچا اور بنچ پر بیٹھ گیا ——— ساری بات
سمجھتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ کل سے وقت بتایا کرے گا۔ گھر جا کر شاید وہ رضی ہو جائے۔

اور وہ سیدھا گھر کو چل دیا۔ مکان کے سامنے پہنچ کر ایک منڈیر میں بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد
وہ اندر چلا گیا۔

شاید وہ کسی کی فکر میں ہے ——— وہ انتظار کرتا رہا۔ پڑوس میں سے ایک ڈاکٹر میاں خان تھا اور دس پندرہ منٹ کے بعد
وہ بیٹھ گیا ——— علاقہ کی ایک لڑکی اور مسئلہ دوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں زیادہ ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ اب وقت ہے اور
ٹھہرے۔ گلی میں ایک بجلی پڑ گئی۔ وہ ایک طرف سے نکل کر دوسری گلی میں بھاگا اور وہ ایک دم ٹک گیا۔ "اس دنیا میں
کوئی نہیں" اور وہ چلا گیا۔ بجلی والی کچھ دیر سے اس کے گھر میں گئی اور صبح ہونے کو گھنٹہ بھر وہ انتظار کرتا رہا۔

آہستہ سے دروازہ کھولا وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ پھر احتیاط سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی ——— مگر کچھ سوچ کر پھر
کھول دی کہ شاید جانا پڑے۔ کمرے میں اندھیرا گھپ تھا۔

وہ ڈیوڑھی سے آگے بڑھا۔ سامنے کمرے میں ایک عورت کی پرچھائیں دکھائی دی۔ جو شاید کھڑکی میں سے کچھ نکال رہی تھی۔ وہ
ٹھٹھک گیا اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے دروازہ بند کیا۔ شیشے سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلی۔ ... شربت بنایا تھا اور گلاس ہاتھ میں پکڑے
واپس مڑا۔

بیگماں کا منہ ایک دم کھل گیا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور شربت سارے فرش پر پھیل گیا۔

دونوں چند لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

بیگماں کا رنگ سفید سا تھا۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا اور وحشت نظر آتی تھی ——— عبدالرحمن سوچ رہا تھا کہ اس کا چہرہ اتنا کیسے ہوا؟
جو پہلی دفعہ میں سے اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

پھر بات سے پہلے اس کے گلے میں کچھ اٹکا۔ وہ چپ۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے منہ سے ذرا سی سرگوشی نکل کر
رہ گیا۔ بیگماں چپ چاپ کھڑی وہ بیچاری تیز نظروں سے بیگماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی شکل پانے سے تھی۔ ... اس کے بعد پہلے چہرے
نے ٹوٹے گلاس کے ٹکڑے ... اور پھر بیٹھ گیا۔

بالآخر عبدالرحمن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس کی زبان کے الفاظ ساتھ نہ دیا۔

"بیگماں تم نے یہ کیا کر دیا ———"

وہ اٹھ کر بیگماں کی طرف ایک قدم آگے بڑھا۔ مگر عورت نے پیچھے ہٹ کر فرش کا سہارا لیا اور عبدالرحمن ... پھر اٹھ کھڑا ہو
گیا ——— وہ بھی اس عورت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جس سے اس نے کتنی ہی باتیں سوچ رکھی تھیں۔ ... کے
منصوبے بنائے تھے۔ مگر اس وقت بیگماں کی ... نظر ... چہرے اور ... کے ہاتھ ... سب کچھ غائب ہو گیا تھا؟
... اس وقت ... بیگماں کے چہرے کی ... غائب ہونے لگی۔ ...
مگر عبدالرحمن ... تھا۔ وہ خوشامد سے بولا

"بیگماں میری بات سن ... ——— میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔"

بیگماں کے چہرے سے ... ——— ... کوئی ... کے قابل نہیں ——— ...
... بیگماں ... مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

"بیگماں! عبدالرحمن چلایا ——— دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ ... اس کے
... برداشت سے باہر تھا۔

بیگماں آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس نے عبدالرحمن کے سر پر ہاتھ رکھا اور ... "تم ابھی سے ..."

اب تو جو ہو چکا سو ہو چکا۔"

عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ کچھ آنکھوں سے لگایا اور حلق میں سر جھکا کر کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔
بیگماں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ عبدالرحمن نے لیٹی ہوئی کے پاس سے آنسو صاف کیے اور اس کی راہ تکتے ہوئے بولا
"بیگماں!!"

—— عورت کے آنسو مرد کو بے بس کر دیتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز جبل کے سے راضی کر لیا چاہتا ہے۔ مگر مرد کے آنسو کا عورت پر اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو فاتح سمجھ کر اس کی اداؤں پر بند مست سانپ کی طرح سر کھانے لگتے ہیں۔ جنس کی دنیا میں وہ مطلب ہے ... کے آنسو عورت کو بے پناہ اہمیت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انمول سمجھنے لگتی ہے۔ اس وقت جب وہ بجلی جیسی ... ہوئی مرد کی آنکھیں بیگماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں تو اس پر غرور اور تفاخر ابھرنے لگے۔ بیگماں کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی ... سے مرد کو تکتے ہی جو اس کے قدموں کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیکے کھڑا تھا۔

"بیگماں تم سوچ لو کیا کر رہی ہو؟؟"

وہ کلائی سے چابیں رکھتے ہوئے بولی۔ "چھ سال پہلے سوچتی۔ یہی بولی۔ ڈیڑھ سال اب سوچا ہے۔ اب کیا سوچوں؟" اس کی ... میں بالکل لرزش نہ تھی بلکہ صاف اور واضح تھی۔ جس میں درشتی کا رنگ غالب تھا۔

"مگر میں نے تمہیں کیا دکھ دیا تھا؟" وہ خوشامد سے بولا۔

"دکھ کون سا دیا تھا؟" وہ نفرت سے بولی۔

"اس کے لیے میں شرمندہ تھا تو مگر اس نے جھڑکا۔"

"بالکل میں تلافی بھی کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔"

"بیکار ہے۔" وہ طنز سے بولی۔ "مگر اب میرے لیے زندگی دوبارہ شروع کرنا مشکل ہے۔"

"کیوں؟؟"

جواب دینے کی بجائے بیگماں نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا اس کے گھر کو دیکھنے کی جرأت عبدالرحمن کا منہ تک ... اس میں مسئلہ واضح تھا۔ مگر عبدالرحمن کرتے کیا نہ تھا۔ وہ بھی کچھ نہ بولا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر وہ بولے۔ وہ رہے

"بیگماں تم میرے ساتھ سونے سے ہمیشہ نفرت کرتی رہی ہو۔ تمہیں اپنا گھر میں اٹھایا ہے —— مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے ... یہ سمجھنے میں بہت وقت لگا۔ تمہیں کس طرح اس کرسی پر بیٹھا رہا۔"

فقرہ ختم کرتے کرتے اس کی آواز رقت سے لرزنے لگی۔

بیگماں نے اسے غور سے دیکھا۔ "میں نے تمہیں کب کہا تھا کہ تم نے کہا ہے۔"

اب وہ اٹھ کر باہر جانے لگی۔

عبدالرحمن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تیر رہی تھیں۔ یہ موقع اس شریف صاحب نے اس کا بند ہونے کا ... پھر اس نے جھک کر اندر جھانکا۔

نیلماں اندر کھڑی تھی جیسے کہ پتھر کی مورت ہو۔ چھوٹی سی۔

اس کی گرفت مضبوط ہو گئی —— وہ اس بار کر بچے کی گردن دبا رہا تھا۔ مگر اب وہ بچہ کانپ رہا تھا ... [illegible]

[illegible]

نیلماں کی چیخ سنائی دی اور چھوڑو۔

"یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

اس کے جسم کا ہر قطرہ نفرت سے جھنجھنا اٹھا۔ —— ایک لمحہ کو تو چاہا کہ اس نے اپنے ... جیسا محسوس ہوا۔ زندگی تباہ کر دی ... اس کا کچھ نہیں۔

اس نے زمین پر ... سنبھالا ...

..... نیلماں حیرت سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرت اور افسوس تھا۔ جیسے کسی ... [illegible] .....

غصے سے ... دونوں ہاتھوں سے نیلماں کو اٹھا لیا۔

"وہ زندہ ہی ... مگر وہ ... اس کی ... "

نیلماں ... ہاتھ پاؤں ... تو کالا ... وہ ... بھاگ گئی تھی۔ تو عبدالرحمن غصے سے پھر پلٹا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ... اور ... نیلماں نے ... اس نے گرفت مضبوط کر لی ہے۔ دونوں کی اس کشمکش میں ... کی آواز آئی۔ اور .... نیلماں بے جان ہو کر گر پڑی۔

عبدالرحمن وحشت کا کر پیچھے ہٹا۔ کچھ دیر فاصلے سے دیکھتا رہا، پھر ذرا قریب آیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے نشان ... گردن ... —— اور سانس کا نشان بھی نہ تھا۔

"نیلی۔"

چلا کر وہ اس کے اوپر گرا۔

عین اسی وقت مالک ... کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

عبدالرحمن کو چالان کیا گیا تو ... صاحب اس کے کیس ... [illegible]

ترچھی بالکل ستی تھیں۔ تھکا تھکا سا لئے رہے اور پھر موٹی موٹی آنکھیں اٹھا کر عبدالرحمان کو دیکھا

ہوئے "وہ اونچی آواز میں بولے "تم نے قتل کیوں کیا؟"

مگر عبدالرحمان سر جھکائے ہوئے بولا "قتل میں نے نہیں کیا جی ——— بالکل نہیں کیا:"

سب کا فیصلہ ہی سب کچھ ہے ——— جی؟" وہ آگے کو جھک کر اٹھے۔

"تھانیدار جی۔ میں نے نہیں کیا ——— میں تو صرف ایک گھوڑا ہوں۔"

"تو کس نے کیا ہے؟" وہ اسی طرح گھورتے ہوئے بولے۔

عبدالرحمان نے ہتھکڑیوں والے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

تھانیدار جی کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"نیچے لاؤ ——— وہ چیخے؟"

عبدالرحمان نے دھیرے دھیرے سے کہا "اس نے ایسے پیچھے کو پھینکا تھا۔"

تھانیدار نے موٹی سی گالی دی "ادھر آ اوئے ——— مردود۔" وہ دہاڑا۔

"جی صاحب۔" اردلی اندر آیا۔

"ادھر دیکھو اس کو۔ اس کا دماغ ست ہو رہا ہے ——— یہ ضرب ہے پیر ہو گیا ہے ——— اسے میرا تنہا دیکھتا

ہے۔ جاؤ اس طرح سے چکی دے کر۔"

اردلی کانپ کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لحیم شحیم سا سپاہی اندر آیا۔

"شیر بخش! لے جاؤ اس حرامی کو اور نکلواؤ اس کا بیان۔"

شیر بخش کا منہ اتر گیا۔ وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے کرائم برانچ کی جان تھا۔ حالانکہ بڑی اچھی نظر لگی تھی اور منیجر سے

اسے خاص طور پر تنبیہ کیا تھا۔

"جناب آپ نے کچھ پوچھ گچھ کر لی؟"

"وہ نے جا جناب کے پیچھے ——— زور کرنے کو گیا ہے؟"

شیر بخش نے قہر بھری نظروں سے عبدالرحمان کو دیکھا اور ہتھکڑی والے ہاتھ کو ساتھ لے کر باہر لے گیا۔ کمرے تک پہنچتے پہنچتے

اس نے اسے چار چھ عبدالرحمان کو گالیاں اور سب پڑھا دیا۔

"ان کے جسم نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے"

اس کا دروازہ کھول کر اس نے عبدالرحمان کو زور سے اندر دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اندر آیا۔ جب سنبھل کر کمرہ دیکھا

......

بھاگا ساگر ——— وہ میاں بیں [illegible] کا بیر ——— بیڑے کے قدموں کنارے پہلا ایک شکوہ ——— [illegible]
کنارے پر چھت سے بندھی ہوئی رسیاں لٹک رہی تھیں.........
پھر سے اس نے اس کمرہ میں [illegible] اور جب میں بیوی سے [illegible] - یہ سب ایک [illegible] کی طرح اس کے
میں کرتا ——— اور وہ وہیں بیٹھ کر [illegible]۔
شیر [illegible] - یہ قید کا سلا [illegible] ——— ایک [illegible] ———
آتا کو ختم کر کے چلا گئی۔

جوش صاحب

محمد طفیل

جوش صاحب

محمد طفیل

ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے نیاز فتحپوری پر "شخصیت" کا اظہار کیا تھا۔ آج جوش صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بشکل "تعصبات" آپ کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کو پڑھنے والے ان کی کتابیں ایک ہی جگہ جا کر ختم ہوتی نظر آتی ہیں۔ یہ میرے مطالعہ کا قصور ہے یا ان کرم فرماؤں کا، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاعر ہیں، دونوں ہی مذہباً کافر، دونوں ہی عقلیت پسند، دونوں ہی عیب ... کا یہ کہ تقاضائے انسانیت سے آشنا، نہ صرف آشنا بلکہ بیشتر حد تک پرچارک!

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں۔ وہ بھی "تھرڈ" خوبیاں اور خرابیاں، اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور برے کام بھی، اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مجھے مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں رُخ مکمل!

نواب محمد علی خاں ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہوگی۔ مگر اتنی ہی آمدنی ان کے دادا بزرگوار (نواب بشیر احمد خاں) کی تھی۔ جو ان صاحب حوصلہ بزرگوں نے شاہانہ اخراجات، شراب بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کر دی۔ تمپٹ میں جو کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمندہ نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کیے۔ خوب خوب جیے۔

ملیح آباد کے پٹھان، شبیر حسن خاں نام، تخلص جوش، نواب ابن نواب کے بعد صرف جوش، شبیر حسن خاں بھی نہیں۔ اجداد میں شعر و شاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، ذہنی علت ہوتے ہوتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ شعر کم ... تھے جیسے کہ رہے ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہو بھی تو اس لحاظ سے کہ گویا اور بشیر، جوش کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی ساحلات بھی، یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خودغرض کہ آپ بتا بتا رہ جائیں، کبھی اتنے فیاض کہ عقل دنگ۔ ان کے مزاج کی دھوپ چھاؤں، دراصل فطرت ہی کی غماز ہے۔ ایک رُخ کے اعلان سے پہلے اور دوسرے رُخ کے اظہار سے، عام طور پر ... تو سے اپنے اندر ہی گے۔ اس لیے مجھے انھیں اس تصویر کر!

جوش صاحب نے اپنی شخصیت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر برس کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے کہ ... چھپا رکھتے ہوں گے کہ کہیں دنیا والے آنکھیں دکھائیں، مگر جوش صاحب کہ ہم باز رہنے والے نہیں۔ یہ سلطنت اپنی قسم کی قیود سے قطعی طور پر آزاد شاہی ہے۔

میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں جنھوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جانتا

شکل ہے۔ پہ جاتیکہ چھپنا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے
جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف اُتارے جائیں تو بعض کے تین اُتریں تو ——— اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں
جتنے غلاف اُتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ دوست ہو تو، دشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی،
کا مطلب یہ نہیں کہ جوش صاحب بڑے مودب ہیں۔ جناب! یہ بڑے پھکڑ بھی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ زیادہ محترم نہیں۔ وہ تو آپ اور
سے کہاتے ہیں، جو دوست ہے یار ہے۔ وہ ہے دُوسرے کہاتے ہیں، بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں۔ ایسے تیسے، تُوں تڑاں ان
ان نہیں چلتا۔

جس ماحول میں یہ پروان چڑھے۔ وہ ان کے الفاظ میں یوں تھا:

ایک بہت کڑیل پٹھان، بڑے ہی رُعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہمارے والد
ہیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دن پوچھ ہی بیٹھے "میاں کیا آپ ان سے
تے ہیں؟"

"ہاں بیٹا، ہم ان سے ڈرتے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں محلے کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مالدار تھے۔ مگر اب کچھ عرصے سے
کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں
ر۔ تمھیں چار ہوں اور نہ انھیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پر بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُونچا نہ بولیں۔ ننگے سر نہ پھریں۔ کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں۔ ہاتھ میں
ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامت اعمال، ہم دونوں بھائی اپنے ایک ہمجولی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ کسی طرح
کا علم والد صاحب کو ہو گیا۔ اُنھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا۔ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
رہے تھے؟ ہم نے اقرار کیا۔ کیا کرتے۔

جس وقت والد صاحب یہ پوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ حقہ پی رہے تھے۔ اُنھوں نے حقے پر سے چلم اُتاری۔ دہکتے ہوئے
انگارے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دیے ——— خبردار جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے۔

اس کے بعد جوش صاحب نے یوں تبصرہ کیا۔ والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن میں سنوارنے کی کیا کیا ترکیبیں نہ کیں۔ مگر ہم ہوں کہ
بدمعاش بھلا وہ کیسے سدھرتے!

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "شارہ بازی" ان کے والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی میں نے انھی کی زبانی

چھوٹا سا کمرہ —— درمیان میں ٹوٹی سی میز —— میز کے اوپر کنارے پر ایک شکنجہ —— دوسرے کنارے پر چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں ....

کچھ عرصہ پہلے اس منظر اس کمرہ میں جا پہنچا تھا اور بعد میں بیوی سے جھگڑا کی تھی سب ایک شیشے کی طرح اس کے دماغ میں کوندا —— اور وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا.

شیر بخش مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا ۔ یہ قیدی سالا تو بالکل ہی بے جان نکلا۔ ابھی کب سے —— آج کا کام ختم ہو گیا ۔

جوش صاحب

محمد طفیل

جوش صاحب

محمد طفیل

ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے نیاز فتح پوری پر اپنے "تاثرات" کا اظہار کیا تھا۔ آج جوش صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بیشتر "تعصبات" کی زد میں آئیں گے۔

ان دونوں بزرگوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ان کی کوئی کل کہیں ایک جگہ پر مستقیم ہوئی نظر نہیں آئی۔ یہ پہلے مسلک تصوف سے یا اکرام [illegible] کا کوئی بات مجھ میں نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاعر! دونوں ہی مذہب کا باغی! دونوں ہی عقلیت پسند [illegible] دونوں کا یہ کرتا [illegible] انسانیت سے آشنا نہ صرف آشنا بلکہ بے حد تک پرچارک!

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں۔ وہ بڑی نثری خوبیاں اور خرابیاں۔ اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور برے کام بھی۔ اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس مقصد سے یہ مجھے مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں مکمل!

نواب محمد علی خاں ان کے پردادا تھے۔ آمدنی کوئی دو کروڑ روپے سالانہ کی ہوگی۔ مگر [illegible] ان کے دادا بزرگوار (نواب بشیر احمد خاں) کی تھی۔ جو اس صاحب [illegible] بزرگوں نے جو انتخاب [illegible] نذر کر دی۔ [illegible] انھوں نے بھی خاندانی روایات کو سرسبز نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کیے۔ خوب خوب جیے۔

[illegible] شبیر حسن خاں نام، تخلص جوش، نواب [illegible] کے بعد صرف جوش۔ شبیر حسن خاں بھی نہیں۔ اجداد میں شعر و شاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، [illegible] ہوتے ہوتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ [illegible] قصے کرتے ہیں۔ مگر ان کا ذکر [illegible] اور بشیر جوش کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی معاملات میں یہ دو بڑی شخصیتوں کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ بتا بتا کر [illegible] کبھی اتنے [illegible] کے رنگ کی دھوپ چھاؤں، انسانی فطرت ہی کی غماز ہے۔ ایک رنگ کے اظہار سے [illegible] عام انسانوں سے [illegible] نظر آئیں گے۔ [illegible] قصے کر!

جوش صاحب نے اپنی شخصیت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہتے۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس طرح قابو میں رکھ سکتے ہوں گے کہ ہمیں دنیا دکھائیں [illegible] مگر جوش صاحب کو یہ [illegible] نہیں۔ یہ ہر قسم کی قیود سے قطعی طور پر آزاد شاعر ہیں۔

میں ان ہی شخصیتوں سے واقف ہوں جنھوں نے اپنے اور شرافت کے خلاف چار کیے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو [illegible]

…ٹ مشکل ہے۔ چہ جائیکہ پڑھ لیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض سے دو غلاف اُلٹے جائیں تو، بعض کے تین اُتریں تو ——— اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں جا ہے جتنے غلاف اُتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ دوست ہو تو، دشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوش صاحب بڑے مؤدب ہیں۔ جناب! یہ بڑے پکّڑ بھی ہیں۔ ان کے نزدیک جو زیادہ محترم نہیں۔ وہ تو آپ اور جناب کے کھاتے میں، جو دوست ہے یار ہے۔ وہ ہے دُوسرے کھاتے میں، بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں۔ ابے تبے، تُوں تڑاں ان کے ہاں نہیں چلتا۔

جس ماحول میں یہ پروان چڑھے۔ وہ ان کے الفاظ میں یوں تھا:

ایک بڑے کڑیل پٹھان، بڑے ہی رُعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہمارے والد آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دن پوچھ ہی بیٹھے " میاں کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا، ہم ان سے ڈرتے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں محلّے کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مال دار تھے۔ مگر اب کچھ عرصے سے ان کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں تا کہ آنکھیں چار ہوں اور نہ انھیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پر بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُونچا نہ بولیں۔ ننگے سر نہ پھریں۔ کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامتِ اعمال، ہم دونوں بھائی اپنے ایک بھائی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ کسی طرح اطلاع والد صاحب کو ہو گئی۔ انھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا۔ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے ہم نے اقرار کیا۔ کیا کرتے۔

جس وقت والد صاحب یہ پوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ حقّہ پی رہے تھے۔ انھوں نے حقّے پر سے چلم اُتاری۔ دہکتے ہوئے انگارے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دیے ——— پھر جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے۔

اس کے بعد جوش صاحب نے یوں تبصرہ کیا۔ والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن میں سزا دینے کو کیا کیا ترکیبیں نہ کیں۔ مگر جو بات کا …زلی بدمعاش تھا وہ کیسے سدھرتے!

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "شکار و بازی" بھی والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی یہاں نے انھی کی زبانی

ث تھا۔ دا قعیہ کے بعد [illegible]

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت جوش ملیح آبادی کو کتابوں کی فہرستیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ میرے پاس بیٹھے ہوتے تو ابھی کہتے۔ اس سے ناواقف، فعل کی بھی اغلاط ہے۔ فہرستیں نہیں، (پڑھے تحریر کو بھی آگ لگا کے سلگا دیں گے۔ یہ جا کے مسلے کا جوش نمبر نکل رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے اسی شوق کے سستے ہیں تو آگیا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے دیر سے مطالعہ کے جتنا جب کہ کتابوں میں بہت فہرستیں نکالیں یک بہ یک ہوں جوش صاحب کی فہرستیں نکالنے کے لیے پہلا ایک نمبر چھاپا جا رہا ہے۔

یہ خوبی جوش صاحب کی اکتسابی نہیں، بلکہ انہیں وراثتاً ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کہا —— "پان لگاؤں؟" تو آبا جان نے اسی وقت شکوہ نکال کر بیت ا تھ پر رکھ دیا تھا اور کہا کہ غلط زبان بولنے والے کو اس طرح سزا دیتے ہیں۔ پان بنایا جاتا ہے۔ لگایا نہیں جاتا۔

جوش صاحب سے خط و کتابت تھی۔ تکلف کی سی فضا میں دو ہی سے تعلقات تھے۔ جب میں جدہ سے دلی پہنچا۔

"جی ہاں!"

"زندہ ہوں؟"

"بہت اچھا، بہت اچھا —— ایسے ——"

"آہا ہا ہا ہا، بھئی خوب آئے۔ بیٹھو بیٹھو!"

"میرے ایک دوست پاکستان سے آئے ہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا۔"

"کہہ دوں گا۔"

"تم تو اچھے ہو۔"

"کہہ تو دیا ہو جائے گا!"

"جی ہاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ جب وہ کچھ سمجھ لیتے ہیں تو بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔"

"آہا!"

"تو اب جوش!"

جوش صاحب سے ملنے جب میں ان کے دفتر میں پہنچا تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے جو اللہ جس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں وہ آپ نے بھی سن لیں۔

چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا —— بہت پیتے ہیں۔ شکر کے بغیر ہی نہ پی لیجیے!

"چائے پی او میاں! شکر اور دوا کوئی نہیں ہے۔ خدا کا شکر تو بڑوں کے ساتھ سے پیدا ہوتا ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے [illegible]

رہتے تھے۔ دریاؤں کو سانپ سمجھ جاتے تھے۔ وہ کوشیر کہا جاتے تھے۔ بجلی چمکتی تھی تو لرز جاتے تھے۔ لوگوں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دل کو سہارا یوں دیا کہ کوئی طاقت چاہیے جو ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ اُمید، بزدلی، احتیاط اور نااتفاقی کا نام خدا ہے۔ جب آبادی بڑھی اور مذہب میں آنے لگے تو سوچا کہ مرنے کے بعد بھی روح باقی رہتی ہے۔ اس سے مکار لوگوں نے بیوقوفوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر خدا کو حقیقت منوا لیا۔"

اس تقریر دل پذیر کے بعد ان صاحب کو چائے پینی پڑی۔ بلکہ انھوں نے پہلے ہی دو ایک فقروں میں چپت ہو کر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ یہ تقریر کر رہے تھے وہ چائے پی رہے تھے۔ جب یہ چائے پی چکے تو انھوں نے ایک سوال اور جھاڑ دیا۔

"جوش صاحب آپ کچھ بھی کہیں۔ مگر آپ لوگوں کے دلوں سے خدا اور مذہب کے تصور کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"جناب ایک بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ رسولؐ نے خدا کو پیدا کیا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کہاں تھا کوئی بھی رسولؐ سے پہلے" ان صاحب" سے واقف نہ تھا۔ رسولؐ نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لالچ بھی دیا۔ ڈرایا بھی، دھمکایا بھی ——— لالچ یہ دیا اگر تم اللہ کے بتائے ہوئے دین پر چلو گے، تو مرنے کے بعد جنت میں جاؤ گے۔ جنت میں شراب ملے گی۔ حوریں ملیں گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ چونکہ اہل عرب شراب کے رسیا تھے اور عورتیں ان کی کمزوری تھیں۔ اس لیے وہ رسولؐ کے کہنے سننے میں آ گئے۔ (نقل کفر کفر نباشد) اس لیے کہ رسولؐ نے عورت ایسی خوفناک حقیقت کو بھی لذیذ ترین شے بنا دیا تھا۔ محمدؐ واقعی دنیا کا سب سے بڑا انسان گزرا ہے۔ جس نے عرب ایسی جاہل قوم کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے ؎

ہم ایسے منکرِ حق کو ثبوتِ حق کے لیے   اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ورنہ مذہب تو فطرتِ انسانی کے ساتھ ایک گستاخی ہے۔"

میں نے بھی ذرا چھیڑ دیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے ہاں مذہب کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب ہی سب کچھ ہے۔" (یہ باتیں ان دنوں کی ہیں۔ جب جوش صاحب بھارت کے شہری تھے۔)

"جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی کیا ہے۔ آپ کے ہاں کا جو سب سے بڑا مولوی ہے۔ وہ اور میں بھوپال میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت تو وہ بالکل آدمی تھے۔ اب مولوی ہو گئے ہیں۔ لیڈر ہو گئے ہیں۔ پیشہ بُری بلا ہے۔ اگر ان کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو وہ ہرگز مولوی نہ بنتے۔ بدستور آدمی بنے رہتے۔ مجھے ان سے اور کوئی شکایت نہیں بجز اس کے کہ وہ پڑھے لکھے ہو کر مولوی ہو گئے۔ خوب چپا ہے انھوں نے بھی مسلمان قوم کو، مذہب کے نام پر کوئی جتنا چاہے اسے بے وقوف بنالے۔"

باتوں کا سلسلہ بہت طول کھینچ گیا تھا۔ اس لیے حاضرین میں سے کسی نے کہا "جوش صاحب ان باتوں کو چھوڑیئے۔ کوئی رباعی سنائیے۔"

"بہت اچھا" اور "لگے" کہہ کر سامنے رکھی ہوئی ڈبیا سے پان لے کر شعر و شاعری کا آغاز فرما دیا۔ بہت سی رباعیاں پڑھیں۔ ان میں سے دو چار آپ بھی سن لیں۔

تحقیق کو میں وقتِ بصیرت سمجھا   پردہ میں ذہانت کے غباوت سمجھا

جب عمر کی نسبت کر ذرا سا کھٹکا ایک جو کی مسافت پہ جہالت نکلی

اللہ میں حکمت جو نہیں پاؤں گا میں حشر میں ہنگامے مچاؤں گا
ہوگی جو بجائے عدل رحمت مجھ پر تو پا کا کاٹ کے مر جاؤں گا

چونکہ اس وقت ان کا اثر مذہب اور علم کے دھارے کی طرف ہو رہا تھا۔ اس لیے انھوں نے رباعیاں ... پڑھیں۔ یہ بحث ... کہیں گے کہ مذہب کے ... اصلی خیالات کیا ہیں اور ... ہندوستان کے لیے کتنا ... ہے اور کیوں!

یہاں صرف ذہن کا نقشہ بنانا چاہیے۔ اور جوش صاحب کے خاص رنگ کی بھی ایک دو رباعیاں سن لینی چاہییں۔ جو انھوں نے اسی وقت آنکھیں بند کر کے اور لہرا لہرا کر پڑھی تھیں۔

زلفیں بادل میں مگر بکھرتی ہی رہیں کلیاں دو کہیں مگر گزرتی ہی رہیں
امید کا آفتاب میں بھرتی رہیں رنگ اور یاس کی جھریاں ابھرتی ہی رہیں

ساقی تھی گھبرا رہی ہے گویا ندی سے ندی گذر رہی ہے گویا
آنکھیں تری کاجل ... دیوار سے دھوپ اتر رہی ہے گویا

یہ تھی میری پہلی تفصیلی ملاقات جس ... !

میں ان کے پاس دو ایک دو گھنٹے بیٹھا ہوں گا۔ ان کی باتیں ... اس نظم کی سرگوشیوں میں گم ہو جاتا تھا۔ یہ حیرت کہ اس انداز میں ہیں سوچتے۔ جس طرح سوچا جاتا ہے بلکہ ان کے سوچنے کا انداز بھی اپنا ہے۔ جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود غور و فکر پر آمادہ کر دیتا ہے۔

شام کو پھر جوش صاحب نے اکٹھے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی فرمایا کہ شعر و شاعری بھی ہوگی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! میں پہنچا۔ مختصر سی نشست تھی۔ چھوٹی بوتل سامنے رکھی تھی۔ اس شعر ... سے سبھی کو شوق فرمانے کی دعوت دی گئی۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھائے۔ جو میری طرح کے ازلی بزدل تھے۔ وہ تشنہ لب رہے۔

یہ پیتے جاتے تھے اور شراب پر ... جاتے تھے اور ہم بزدلوں کو سمجھا رہے تھے کہ اسلام کی رو سے بھی شراب پینا ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو۔ مگر نشے کی حالت میں شعر کہنے، پڑھنے اور سننے سے تو نہیں روکا گیا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ نماز روزہ تو انسان اپنے لیے پڑھتا اور رکھتا ہے۔ مگر شاعر اپنا خونِ جگر اللہ کے بندوں کے لیے صرف کرتا ہے۔

یہ ماحول تھا۔ جس میں جوش صاحب نے اپنی نظم "مجھ کو تو برسات" شروع کی اور ایسے جذب کے ساتھ پڑھی کہ لطف آ گیا۔ ہیں:

یہ کہنے کی بات ہے کہ جب تک انھوں نے یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔ ترنم تو غیر پٹھانی قسم کا تھا۔ لیکن اس ترنم میں بھی ذرا سی ایک بات ضرور تھی۔ میں اس نظم کے کئی مصرعوں پر کھو سا گیا۔ میں شعر بہت برے ڈھنگ یا طریقے سے سنتا ہوں۔ وہ یوں کہ شاعر بیچارہ جد ہا ہے اور میں چپ بیٹھا ہوں۔ کبھی کسی شعر پر واہ کہہ دیا تو کہہ دیا۔ ورنہ چپ۔ وہ بھی اتنی مدھم آواز میں کہ شاعر سن نہ سکے۔ لیکن اس دن نظم سننے سے میں نے اپنی روایات کو توڑ دیا تھا۔ میں بے خود ہو گیا۔ سرشار ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے دل کھول کر داد دی۔ میرے جاننے والے حیرت سے تھے کہ میں اس طرح میں ہوں۔ حالانکہ میں اس طرح میں نہ تھا۔ بلکہ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی کتنا ہی بدذوق کیوں نہ ہو وہ اچھے شعروں پر وجد میں آ سکتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی۔ نواب جعفر علی خاں اثر لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے دوسرے شعراء کے اچھے شعر سنائیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان دنوں فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں ٹھنی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف لکھنا نقوش ہی سے شروع کیا تھا ——— اور اثر صاحب مجھے فراق پارٹی کا آدمی سمجھتے تھے۔

اثر صاحب نے بڑے بڑے پیارے شعر سنائے۔ میں بے حد لطف اندوز ہوا۔ مگر انھوں نے ایک شعر ایسا سنایا کہ میں تڑپ اٹھا بے اختیار ہو گیا۔

اثر صاحب نے میرا رنگ دیکھا تو فرمایا: "اب تو بے تاب ہونا ہی تھا۔"

میں نے سنبھل کر کہا: "کیوں؟"

"میں نے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر سنائے۔ مگر آپ چلے تو فراق کے شعر پر۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ مجھ سے مذاق کی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے اس سے پہلے علم نہ تھا کہ یہ شعر فراق کا ہے:
معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہو تو وہ پتھر ایسے آدمی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔"

ہاں تو بات جوش کی نظم "مجبوتی بہشت" کی ہو رہی تھی ——— اس کے بعد میں نے دوبارہ یہی نظم ایک ایسی رنگین محفل میں سنی کہ جس کا ماحول ہی شاعرانہ تھا۔ متعدد مبہم شعر اور متعدد مبتسم مصرعے بنفس نفیس موجود تھے اور ماحول ایسا تھا کہ جوش صاحب لہرا لہرا کے پڑھ رہے تھے۔

ہاں، دیکھ، ذرا میرے سرو سیم بَر
گنگناتی گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو
سنسناتی ہواؤں کے یہ اڑتے ہوئے تیر
یہ گنج میں سنبلِ بہ مستی کی یاد

اے دولت پہلو
ہاں، آ، ان گھٹاؤں تلے، قربِ دلِ گل رو

اے دولت پہلو

ساحل پہ وہ اُلفت کے جنّت کے نغمے
فلک پہ یہ شرمیلے ستاروں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُٹھتے بجھتے دیئے بہتے ہوئے ہلکے
دھاروں میں گہری ناؤ کے کھلتے ہوئے چپو

اے دولت پہلو

اِن، آہا آہا، قریب وہ گل رُو

اے دولت پہلو

ذرا سوچو، دونوں چلیں کس ٹھاٹ سے ملاقات
جب ناز سے اُلجھے کسی کُرتے پہ دستک؟
مل کر کے فروشندہ و قصندہ جہاں بات
کیا بات ہے، ہر سمت ہے برسات ہے بہتات
مرادوں سا ملت پہ چل جانے جوت بو

اے دولت پہلو

اِن، آہا آہا، قریب وہ گل رُو

اے دولت پہلو

اُس ماحول نے اس نظم کو نیا رنگ پہنا دیا تھا۔ ہر مصرع پر جوش صاحب کے اشارے اور قدرے ایکٹنگ غضب ڈھا رہی تھی۔ تصور فرمائیے۔ جب زرتار دوپٹوں کے ذکر پر، زرتار دوپٹوں کی طرف اشارے ہوں گے، یعنی نہ سیہ مست کو وضو کے وقت یا مُنہ کے غرارے ہیں۔ بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشاروں پر اشارے ہوں ——— اور پھر ناز سے اُلجھے ہوئے کُرتے پہ دھرے ہات ——— پر ان کا گرمئی پہ ہاتھ دھر کر ایکٹنگ کرنا، سمجھنے والا سماں نہیں اور یہ سب کچھ مخصوص دوستوں ہی کی محفل میں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس ماحول میں ہر شخص جھوم رہا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر آپ کو جوش صاحب کی طرزِ سوچ سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ میں نے کوشش اس بات کی کی ہے کہ جوش کا کلام پڑھا جائے تا کہ آپ کا دل بہل جائے۔ اس لیے کہ انسان اگر خدا کے نزدیک ہونے میں خوش رہ سکتا ہے یا پھر ——— یا پھر ——— !

اللہ کا شکر کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا اور میری گاڑی اُن کے پاس سے ہی گزرتی رہی تھی جو اس وقت آپ کی

ہے۔ یہی کہ "بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔"

مذہب کے معاملے میں ناپختہ ہم تک سبھی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، چہرے پہ نورانی داڑھی۔ غرض مجھ جیسے اور آپ جیسے مسلمان تھے۔ جو زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہتے ہوں اور خدا اور رسولؐ کا نام آتے ہی گردن جھک جاتی ہو مگر ہمارا عمل؟ سراسر غیر اسلامی، نماز روزہ بھی دکھاوا، اس لیے کہ جب تک مذہب کی روح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔ اس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجیے اور اس کا مقابلہ رسول اللہؐ کے کسی ادنیٰ سے صحابی سے بھی کر کے دیکھ لیجیے۔ عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

جوش صاحب جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان کا ہمنوا نہیں۔ قطعاً نہیں اور میں اُن مولویوں کا بھی ہمنوا نہیں جو خدا اور رسولؐ کا ذکر بھی معاوضے پر کرتے ہوں بلکہ میرے دل میں اُن درویشوں اور بوریہ نشینوں کا احترام ہے جنھوں نے مذہب کی خدمت اس انداز سے کی جس میں نمائش کا کوئی پہلو نہ تھا۔ بلکہ عاجزی ہی عاجزی تھی۔

جوش صاحب آج بظاہر دہریئے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کٹر شیعہ بھی تو رہے ہیں۔ کیا کوئی شیعہ دہریہ ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ہو سکتا ہے۔ جوش صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ مگر یہ جواب تسلی بخش نہیں۔ اس لیے کہ دہریہ کبھی بھی شیعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ رسولؐ کی عظمت کو بھی دل و جان سے مانتے ہیں۔ بس ذرا خدا سے دل لگی رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ہم جیسے ہی مسلمان ہیں۔ یہ جو مسلمان نہیں ہیں تو اس قلابازی کی بھی ایک وجہ ہے۔ جب یہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے تو انھیں ایک دن یک لخت یہ آرڈر ملا کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیے۔ اُس وقت ان کا ساتھ، کوئی دس بارہ آدمیوں کا تھا، دو بچے تھے۔ بیوی تھی اور اس کے ساتھ عزیز و اقارب، حیدرآباد سے نکلے تو تین برس تک ذہنی اذیت میں مبتلا رہے۔ پیٹ کی مار کے ہاتھوں عاجز رہے۔ تن کا رشتہ روح سے برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ اس وقت جو ڈگمگائے تو آج تک نہیں سنبھلے۔ کہتے تھے کہ خدا کہتا ہے۔ میں رزاق ہوں اور میں جوں کہ ان شبیہ کو بھی محتاج ہوں۔ اگر خدا ہوتا تو اپنے بندے کو یوں عاجز نہ بناتا۔ یہ تھے وہ واقعات و حالات جن میں یہ خدا سے ناراض ہوئے۔ خدا کے منکر تو آج بھی نہیں۔ زبان سے کچھ ہی کہتے رہیں مگر خدا کے وجود کا اقرار قدم قدم پہ کرتے ہیں۔ اُس وقت بھی کیا جب یہ اُفتاد پڑی تھی ؎

اس طلسم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری

جوش صاحب خدا سے ناراضی کا ایک اور واقعہ بھی سنایا کرتے ہیں:

"میں ایک دن صبح ہی صبح سیر کے لیے نکلا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک بڑھیا پھٹے حالوں، ڈولتی ٹیکتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے ترس آیا۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا۔ اُس نے لینے سے انکار کیا۔ کہا۔ ایک امیرزادہ مجھ کو مہینے میں پانچ روپے لینے کے لیے دیتا ہے۔ جیسے تیسے کر کے گزارہ کر لیتی ہوں۔ میں ڈرتی ہوں کہ شاید اُس سے مانگنے کی نوبت آ جائے۔ مگر ابھی نہ لوں گی۔"

"میں نے [illegible] خود سے پوچھا۔ اس کی حالت پر مجھے ترس آ رہا تھا مگر [illegible] نہیں کیا تھا۔ اس بات نے مجھے [illegible] دیا۔ وہ میں اور تم کا [illegible] ' یعنی خدا سے نہیں بچے :"

ایک دن خدا کے بارے میں ' اپنے ایسے ہی "ارشاداتِ عالیہ" سے محظوظ کر رہے تھے کہ ——— [illegible] کی کر کے خدا کا وجود خود ہی آگے نہ ——— [illegible] نے کہا۔ " جوش صاحب اگر خدا نکل آئے تو پھر آپ کا کیا بنے گا ؟"

کہنے لگے۔ "میں جنت میں [illegible] کے بغیر [illegible] جو جائیں گے [illegible] جیسے ہم سب [illegible] ظاہر ہو گا [illegible] اپنے بندوں سے انتقام لے۔"

یہ عام طور پر [illegible] سے سوچتے ہیں۔ [illegible] منزل پر پہنچا دیتا۔ کہتے ہیں۔ [illegible] خوشی اور حیرت کے ساتھ بیگم کو آواز دی۔ وہ آئیں تو کہنے لگیں۔ کمرا بڑا معطر ہے۔ اس کے بعد میں نے نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس نے کہا کہ کمرے سے خوشبو آ رہی ہے۔

[illegible] میرے گھر میں یہ بات [illegible] ہر شخص کا [illegible] تھا [illegible] پہنچ نہ تھا۔

واقعی اگر یہی خواب کسی [illegible] دیکھتا [illegible] تو وہ اپنا بھی [illegible]!

جس [illegible] جانے کا وسیلہ [illegible] بنے۔ انہوں نے ہی نظام سے انہیں روشناس کرایا تھا۔ [illegible] کی تعریف کی کہ اس وقت جوش ہی ہندوستان کا [illegible] شاعر ہے جو اپنے اندر [illegible] رکھتا ہے۔ [illegible] میں نے آج تک کسی شاعر کی تعریف نہیں کی مگر [illegible] جوش کے کلام نے اتنا متاثر کیا ہے کہ آپ سے عرض کروں کہ انہیں یہاں بہ عہدہ خاص بلا لیا جائے۔ اس وقت [illegible] کی جو پوزیشن تھی اور جوش صاحب جتنے بڑے شاعر تھے۔ [illegible] ستاروں پہ کمندیں پھینکنے والے ایک بڑے شاعر تھے۔ چنانچہ [illegible] مگر انہیں (بقول شاہد احمد دہلوی) انگریزی ادب کے شعبہ تراجم میں [illegible]۔

حیدرآباد میں ان کا خوب [illegible] سے یہ [illegible] نظام کے [illegible] حیرت ہے جوش صاحب [illegible] ——— [illegible] پھر [illegible] حیدرآباد میں چلا آیا کہ جب یہ نظام کے حکم سے [illegible] [illegible] ان سے [illegible] تھے۔ وہ [illegible] جس وقت انہوں نے حیدرآباد [illegible] [illegible]

کھانے کے بعد جوش کے منظوم جام و مے کے بڑے قصے مشہور تھے۔ پہلے پیتے تو تھے۔ مگر اتنے باقاعدہ نہ تھے۔ وہاں کی روزانہ نشست میں معمول تھا کہ جوش صاحب منظوم جام و مے کے چھینٹے اڑاتے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس عالم میں اللہ کے منہ میں جو آتا کہہ گزرتے۔ وہ کہتے بادہ و جام کے [illegible] میں تو یہ کہتے [illegible] اعلیٰ بڑے تھرڈ کلاس انسان ہیں تو یہ کہتے تھرڈ کلاس، اتنا اچھا آدمی تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

نشے ہی کی حالت میں منظوم جام سے کہا۔ اچھا تو پھر بادہ و جام پر نظم ہو جائے۔ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اور اسی حالت میں نظم فرما دی۔ وہ تو تھا ہی اس لیے چھپ نہ سکا۔ یہ نئے شاعر دکھیل دیے گئے۔

ہاں صاحب! شراب پینے کا تو لطف ہی یہ ہے کہ خود بھی بہکے، اپنے ہم نشین کو بھی بہکائے۔ انشا نے جو کہا ہے "زاہد بہک بھی بہکا" تو کچھ غلط نہیں کہا۔

جوش صاحب نے بھی، حیدرآباد سے بھاگنے کی بابت کچھ یوں بتایا تھا۔

"ہم نے نواب صاحب کی ملازمت جتنا بھی عرصہ کی، خوش نہ رہے۔ بلکہ اپنی بدبختی پر گھر آ کر اپنی بیوی کے سامنے رویا کرتے تھے۔ نواب کی سمجھ آئی۔ ذمہ داریوں پر ہوتی تھی۔ کسی نے بات نواب صاحب تک پہنچا دی کہ جوش صاحب آپ کی نوکری کو بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں اور گھر جا کر رویا کرتے ہیں۔

دوسرے ہم نے نواب کے خلاف نظم لکھ ڈالی ——— وہ اُسے اُمرا اور وزرا کی محفل میں پڑھ ڈالا۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ مجھ سے کہا۔ جوش صاحب آپ نے یہ کیا غضب کر دیا۔

مجھے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا کہ مجھے نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جنگل کی آگ کی طرح ایک ہی دو گھنٹوں میں میرا استعفیٰ نواب صاحب تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب اور بھی تانے کہ ایک تو ہمارے خلاف نظم پڑھی۔ اُلٹا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یعنی برطرف کرنے کا حق بھی، ان کے استعفیٰ نے باقی نہیں چھوڑا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لکھ دیجیے، استعفیٰ منظور اور [illegible] دنوں کے اندر خارج البلد کیا جاتا ہے۔ اس پر نواب صاحب خوش ہوئے کہ ہاں یہ بات اچھی ہے۔

جوش صاحب کہتے ہیں کہ میری اتنی گستاخی پر بھی نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح سے معافی مانگ لیں اور نوکری بحال کر دی جائے۔ مگر میں نہ مانا اور میں نے حیدرآباد کو خیرباد کہہ دیا۔ حالانکہ میرے دوست، میری بیوی کہتی تھی۔ نوکری کا معاملہ ہے معافی مانگ لیجیے۔ مگر میں نے اپنی خودداری کو چند سکوں کے عوض نہ بیچا۔"

اب یہ روزانہ پیتے ہیں۔ باقاعدگی سے پیتے ہیں۔ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ گھڑی اتنی باقاعدہ نہیں چلتی۔ جتنے یہ باقاعدہ چلتے ہیں۔ ایک بار جب گاندھی جی نے انھیں شام کا وقت ملنے کے لیے دیا تو انھوں نے کہا۔ "گاندھی جی کوئی اور وقت دیجیے یہ وقت تو میرے شراب پینے کا ہے۔"

جوش صاحب کے جو دوست شراب نہیں پیتے۔ اُن پر پھبتیاں کستے ہیں۔ نابالغ قرار دیتے ہیں۔ بچہ پارٹی کہتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جوش صاحب پینے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ مگر جب بیٹے نے پینی شروع کر دی تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔

کی۔ "وہ مجھ سے پہلے [illegible] میں اس ماحول کا شکار ہوا تھا۔ مگر میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر نتیجہ کیا ہوگا؟"

یہاں میں جگر اور مجاز کے سلسلے میں انشا کا ذکر کیا تھا۔ انشا کے ذکر سے ایک اور بات ذہن میں ابھرتی ہے کہ اگر وہ انشا کے ماتھے پر انشا نہ ابھرا ہوتا تو جوش پیدا ہی نہ ہوتے۔ یہ انشا ہی شخص ہیں جنہیں پہلے الفاظ کو رنگ کرنے لگے تھے۔ نئے نئے الفاظ گھڑا، نئی نئی تشبیہات تراش ڈالیں۔ جوش کے ان ورثہ ہے انشا کا۔ جوش کی قادرالکلامی مسلّم، مگر جوش کے مصرعوں میں انشا جھانکتے ہیں۔ میں جوش کو انشا سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں مگر یہاں ذرا سی ذہنی فضا الگ ہے جو انشا کے راستے سے جوش تک پہنچی۔

میں نے یہاں انشا اور جوش کا جو موازنہ کر لیا ہے۔ ایسا صرف میں نے ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے۔ ویسے میں میر و غالب کے بعد سے دوسرے شاعر اور کو اپنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لیے میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ جوش کو جوش کی حیثیت سے اور انشا کو انشا کی حیثیت سے لیں۔ یہ دونوں صرف ایک پڑاؤ پر ملتے نظر آتے ہیں۔ ورنہ شعری زندگی کے میدان میں دونوں دور دور کھڑے ہیں۔

جوش صاحب کو شاعرِ انقلاب کہا گیا ہے۔ مگر میں انھیں شاعرِ جذبات ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ شاعرِ انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ صرف اقبال ہے۔ ان کسی حد تک اقبال کو ہی شاعرِ انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلابی شاعری کو اپنایا۔ مگر جوش نے جوش ہی جوش میں ایسا نہیں کیا۔ [illegible] توڑ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا مرکز جسم و قلب ہے۔ روح نہیں تھی۔ انقلابی شاعری کی روح اگر کسی کے ہاں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اقبال بنیادی طور پر صرف شاعر تھے ہیں۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے۔ روح بھی ہے۔

انقلاب جنوں کو کہتا ہی بھلے۔ مگر وہ کلیتاً تعمیری نہیں ہوتا۔ تعمیری ہوتا تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے۔ جس سے فکر و عمل کا ایک تسلسل سا قائم ہوا ہے اور انقلاب اس کا نتیجہ ہے۔ جس سے ہنگامے تو بہت سے پیدا نکلتے ہیں۔ مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ محض داخلی شاعری پوری شاعری نہیں ہوتی۔ خارجی شاعری کی چاشنی کے بغیر پورا شاعر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جوش کے ہاں یہ دونوں پہلو ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ کبھی ان پر خارجی شاعری کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی داخلی کا۔ دونوں چیزیں بیک وقت اور ایک ہی تخلیق میں ان کے ہاں نہیں ملتیں۔ یا کم ملتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ ان کی تکنیک کا ایک موڑ اور ایک آہنگ ہوتا ہے۔ یہ نظم کو غزل کی طرح ملغوبہ بنانا نہیں چاہتے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری سی جو نظمیں سامنے آ رہی ہیں۔ وہ کچھ غزلِ مسلسل ہی کے سے انداز کی ہیں۔ جیسے "دعوت سفر" اور "مقدم بہار"۔

غزل کے بارے میں ان کے تاثرات تو آپ نے سنے ہی ہوں گے۔ ایک حکایت یہ بھی ہے۔ الفاظ بھی انہی کے ہیں

"ایک مرتبہ دہلی میں جگر، فراق وغیرہ سے غزل کے متعلق بحث ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا۔ "آپ غزل سے اتنے خائف کیوں ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "یہ بحث اس وقت نہیں۔ کل صبح آپ کے ہوٹل میں آکر بتاؤں گا۔" چنانچہ دوسرے دن صبح پہنچا، تو انھوں نے پوچھا۔ "جوش صاحب آج دیر کہاں لگا دی؟" میں نے کہا۔ "قبلہ! کیا عرض کروں۔ کوئی سواری نہیں ملی پیدل چلے

چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور جواہر مل کا بیان مجھے بڑا پسند آیا۔ ویسے اشا مل قابل آدمی تھا اور پکاسو کا آرٹ میری سمجھ سے باہر ہے مگر میرا کلام سراپا الہام ہے۔ کل جو پٹنے کے قریب گاڑی لڑی ہے۔ اتنا بڑا حادثہ میں نے کبھی نہیں سنا ـــــ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جگر نے بیچ میں ٹوک کر کہا: "جوش صاحب آپ کیا اول فول بک رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "حضور اول فول نہیں بک رہا ہوں۔ غزل کہہ رہا ہوں۔"

ان میں ایک بات اور بھی عجیب دیکھی کہ آپ غزل کے بڑے دشمن ہیں لیکن شعر و شاعری کے سلسلے میں جب کسی سند کی ضرورت پیش آئے گی تو پڑھیں گے غزل کے شعر۔ آپ خدا کے بھی خلاف ہیں لیکن قدم قدم پر خدا کے وجود کا بھی اقرار کرتے جائیں گے۔ اب ان کے بارے میں رائے قائم کرے تو کیا کرے ـــــ واقعی یہ ایک چکرا دینے والی شخصیت ہیں۔

جگر کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ان سے استفسار کیا: "جگر کی شاعری کے بارے میں حضور کی رائے کیا ہے؟"

"اپنا مسلک چھوڑ دوں تو بات کروں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ میں صنفِ غزل کے خلاف ہوں اور جگر غزل کے شاعر تھے۔"

"آپ اپنے مسلک سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ جائیں۔"

"یہ بات ہے تو جگر غزل کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ ڈوب کر کہتے تھے۔ مگر آخری دنوں میں جذبے کی وہ شدت نہیں رہی تھی۔"

"یہ بات تو نہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری میں زیادہ غور و فکر ملتا ہے۔ زیادہ جاندار غزلیں ملتی ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ واعظ پن آ گیا تھا جیسے ـــ

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں ـــ تو کتاب اٹھا

"دوسرے جگر کے ساتھ فراق بھی غزل کے شاعر ہیں۔ فراق کے ہاں [illegible] زیادہ ملتی ہے اور جگر کے ہاں تغزل۔"

میں نے شرارتاً کہا: "جگر کے ساتھ فراق کا نام نہ لیں۔ فراق تو شعر کہتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بحر میں ہوں یا نہ ہوں۔"

"فراق جگر کے نہیں مرتبے کے آدمی ہیں۔ مگر دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بڑا اونچا مقام ہے۔ بہرحال جگر کے انتقال سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنہائی میں اضافہ ہو گیا ہو۔"

میں نے کہا: "آپ کو چاہیے کہ ان پر ایک بھرپور مضمون لکھیں۔"

"ان پر لکھوں گا۔ میں جو اپنی سوانح (یادوں کی برات) لکھ رہا ہوں۔ اس میں اپنے سارے دوستوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا اور اس میں اپنے اٹھارہ معشوقوں کا بھی ذکر کروں گا۔"

"سب کچھ سچ سچ لکھ دیں گے؟"

"فی الحال تو شاعری کروں گا۔ مگر لکھ کے رکھ جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ میرے مرنے کے بعد وہ حصہ بھی شائع کر دیا جائے۔"

"بہت سے [illegible] چھپوا دیجیے نا؟"

"بعض میرا ذکر چاہیں۔ جن کا ذکر کروں گا۔ ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ ان کے شوہر بڑا چکھیں گے ——— وہ تو جوش کے ساتھ پھنسی ہوئی تھیں؟"

دوسری مرتبہ جب میں دلی گیا تو جوش صاحب اپنے کمرے میں نہ تھے۔ ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ وہ بار بار گھر پر ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ جوش صاحب گھر پہنچے یا نہیں۔

میں بیٹھے بیٹھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا۔ آواز آئی: "یہاں کوئی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں؟"

میں نے کہا: "مجھے تو معلوم نہیں کہ کون ہیں۔ مگر آپ کون بول رہی ہیں؟"

جواب ملا: "بیگم جوش بول رہی ہوں۔"

اس پر میں نے کہا: "بھابی آداب عرض!"

بیگم جوش نے اس وقت زمانے بھر کا درد اپنی آواز میں سمو کر کہا: "جوش صاحب کے کیریکٹر کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ وہ ان کیا گل کھلاتے پھرتے ہیں۔"

اب میں ان کی باتوں کا جواب کیا دیتا، چپ ہو رہا۔

جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے اٹھارہ عشقوں کا حال بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ دلچسپی ہو تو اسے پڑھ دیکھیں۔ مثلاً وہ ایک دو واقعات کا ذکر کرتے چلیں:

"فراغت کی بارہ بجے رات، عمر رہیں گا اور دورہ تھا۔ اس پیسے کی کمی تھا کہ میری "ٹوکریوں" کے گزشتے کا جشن بڑی دھوم دھڑکے سے منایا جاتا۔

تمہیدات سے آگے نکل کر صرف دو بڑوں کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔

رات ہوتے ہی جگمگ جگمگ کرنے والے شامیانے میں ملی جان کا شیرہ نے جب قدم رکھا تو سب کی نگاہیں چہرے پر ٹک کر رہ گئیں گویا ہر نظر میں ایک زیر قلال دی گئی ہے۔

ملی جان کا نام تھا، ڈوب ڈوب کر شیریں حرکات اور کرسی کا شیرہ کا تھا۔ جس کے چہرے کی شکر میں تھوڑا سا نمک بھی تھا اور اس وجہ سے جب وہ اپنے پیسے کی لرزش اب و تاب کے ساتھ ناچتوں کے حلقے سے نکل کر سامنے آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چاند اپنی پنج ہزاری حلقوں جلوہ گر ہے۔

سامنے آتے ہی پہلا وار اس نے یہ کیا کہ اپنے ساقیوں کی جھنکار میں شے ہوئے، حنا سے رنگ پاؤں کے ساتھ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کے پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ ہی ایسا نظر آیا جیسے کوئی کبوتر رقص کرتے کرتے کبوتر کی چھتری پر آکر بیٹھ گیا یا دریا کے کنارے پر ایک چھلاوا چھوڑ دیا گیا۔ پر ہاتھ رکھتے ہی بجلی سی کر کے انگڑائی لی اور یکایک ملی جان نے وہ پنج ہزاری سی وحشی آنکھوں کو دعا بند کر کے اپنی سہانی اور گول پنڈلیوں سے ڈھمکا شروع کر دیا جیسے صبح کے عالم میں نشہ کی ہوا دھیرے دھیرے چلتی ہے یا جامعے کا ہوتے ہی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں اور وہ

سارنگیوں کے گز ایک مدد آمیز نشاط آفریں جھنجھناہٹ کے ساتھ درخشاں تاروں پر یوں کروٹیں بدلنے لگے۔ جیسے برکھا کی برستی
تی راتوں میں کسی برہا کی ستائی الھڑ کے دل میں ارمان مچلنے لگتے ہیں۔

طبلے کی، دل پر ضرب مارنے والی گمک، سارنگیوں کی گونج میں تیرنے والی چھن چھن، گھنگھروؤں کی رگوں میں چٹکیاں لینے والی کھن کھن
پنچ تنی سازوں کی دھاروں پر تاروں کی تانوں کی گونج ان سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسا متحرک منظر پیش کر دیا گویا کسی خواب کے جزیرے سے
ون کی بات گزر رہی ہے۔ جب جان کا مجرا ختم ہوا تو دیر تک سناٹا بجتا رہا۔

اس کے بعد چار طوائفیں مجرے کرتی رہیں۔ رنگ جما نہ سکیں۔ ہر مجرا پھیکا پھیکا سا رہا۔

البتہ جب پانچویں طوائف تھرکتی آئی۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی، کانوں میں بالیاں، گلابی ساری، شہابی مکھڑا تو دیکھنے والوں کی نگاہیں اٹھ
نے لگیں، بزرگوں نے، خوردوں سے نظر بچا کر کنکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں کے حلقے میں بالوں کی سفیدی کا غم چکر کھانے
لگا اور سانسوں سے یہ صدا آنے لگی کہ

نیست کہ دل بردہ و خوں کردہ ہے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

طوائف نے ابھی مشکل سے زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی تھیں اور اس کی چنچل جوانی میں وہ زور تھا جیسے کوئی اس کو پیچھے کی طرف
کھینچے رہا ہو۔

وہ بری کوئیل اور مدھر آواز، رنگ، ترنت اور ناچ میں ابھی خام تھی لیکن اس کی کچی جوانی کا رس، اس کی خامی کو یوں سہارا دیے
ہوئے تھا گویا کرشن جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رادھا مستی خرام کر رہی ہے۔

جب ترنت کے دوران میں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تو ایسا دکھائی دیا۔ جیسے کالی زلفوں کے اوپر
چاندنی نکل آئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس نے دادرا چھیڑا تو سارے گلا کی چلت پھرت اس کے گلے کے کٹے پٹے میں یوں گھومنے لگی۔ جیسے
ہوا کی رو میں دھان کے کھیت سرسرانے لگتے ہیں اور جب گاتے گاتے ناچتے ناچتے وہ میرے قریب آئی اور یکایک جھک گئی تو ایسا
معلوم ہوا گویا گلاب کی نرم شاخ جنت سے لٹک کر دوہری ہو گئی۔

اور آخر کار جب داد کی خاطر وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی سے نکلتے ہوئے کٹے پٹے کی لپٹوں نے میرے
چاروں طرف احاطہ کر لیا اور اسی کے ساتھ ساتھ جب اس کی نازک مہندی والے نرم ہاتھ نے میرے ہاتھ کو دفعتاً چھو لیا تو اس لمس لطیف نے
ایسا تازیانہ مارا کہ میرا تن بدن تپ کر جھنجھنانے لگا۔

یہ سب پہلا عشق، آدھی رات کی شبنم کے مانند گرا اور میرے خوابیدہ وجود میں جذب ہو کر مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر گزر گیا
اور رخصت ہو گیا لیکن تاکے چونکہ اس نے نئے گل کھلانے اور میری کشت حیات میں عشق کے بہت سے درخت پیدا کر دیے۔ آج بھی
جب میں اپنے اس ابتدائی بات کی پشت پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کی ماہ وصال کی ابھاری ہوئی سوئی ہوئی رگیں اور اس کی درازئ عمر کی تپتی ہوئی

جھریوں کے نیچے وہ شباب وہ جوش، وہ کشادہ اور چوڑی پیشانی اس شیر کا سب بھی نظر آتا ہے اور دل سے غم کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

رہے نام اللہ کا!

یہ تھا جوش صاحب کے مشوروں کا "ابتدائیہ"۔ میں جوش صاحب کے اس پہلے عشق پر اس لیے یقین کرتا ہوں کہ بغیر شدید جذبہ کے اس قسم کی تحریر عام ہو ہی نہیں سکتی۔ واہ واہ کیا خوبصورت نثر لکھ گئے۔

یہ داستان سے وہ وہ خودی یا ان کے جائز و ناجائز تقاضوں سے بچنے کے لیے بیوی کی تند مزاجی کی پناہ بھی لیتے ہیں۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر جب بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کی سب بیویاں، بڑے بڑے جابر بادشاہوں، شداد، فرعون، چنگیز خاں، ہلاکو اور نیرو کی مجموعہ ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہ شاعر انقلاب اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں۔ کچھ ان کی کمزوریاں ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں دبنا پڑتا ہے پھر وہ منہ پھٹ ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی قلعی بند ہی رہتی ہے۔ یہ ہر وہ بات جو بیوی سے چھپانے والی ہوتی ہے۔ چھپاتے ہیں۔ مگر بیوی سے چھپانے والی باتیں دوستوں سے کہتے ہیں کہ وہ چھپ نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کی کچھ دبتی رہتی ہے اور وہ شیرنی سے شیر کی تربیت لی جا رہی ہیں۔

ہمارے جاننے والوں میں، اردو میں شاید ہی کوئی ایسا نہیں ہے۔ جسے جوش صاحب سے تھوڑی بہت نسبت دی جا سکے۔ ان کا لیا جتنا جب کوئی ہی ان۔ ایسی پیدا ہوتا ہے تو وہ اوپر کی دنیا کو دو تین پشتوں کی ذہانت کرنے چھوڑ دیتا ہے۔

جوش صاحب سگریٹ کبھی کبھار پیتے ہیں۔ مگر سگار اور حقہ بہت پیتے رہتے ہیں۔ پچھلے برس لاہور آئے تو ایک حقہ بھی خریدا تھا۔ کہتے تھے کراچی میں یہ حقہ چھ روپے کا ملتا ہے۔ یہاں پانچ روپے کا ملا ہے۔ لاہور والے بہت شریف لگتے ہیں (پھر مزاحاً اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ لاہور میں خوش رہتا ہے اور کراچی میں ناخوش)۔

جوش صاحب نے حقہ خرید کر تانگے میں رکھوایا اور خود کو اس انداز سے رکھا جیسے تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہو۔ جس میں سے کسی تھا کہ اس وقت آپ کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آپ کی تصویر لے لے۔

"ہاں بھئی ہاں، اگر کوئی اس وقت میری تصویر لے لے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ مگر حقہ والی بات یہ ہے کہ ہمارا خاندانی حقہ ہے میرے والد صاحب بھی جب باہر نکلتے تھے تو وہ بھی گاڑی میں حقہ رکھوا لیتے تھے۔ میں ان سے ذرا مہذب ہوں۔ اس لیے کہ میں حقہ صرف گھر پر پیتا ہوں۔

راستے میں مجھ سے پوچھا۔ "یہاں پر پہلے کبھی ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ تقسیم سے پہلے میں اس کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ اب وہ خوب دلی میں ہے اور بہت حال ہے۔ اس ہوٹل سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ فلاں فلاں اور فلاں میرے پاس ہوٹل میں آیا کرتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں سیدہ نامی ایک رنڈی تھی۔ بلا کی گاتی تھی اور پھر

میں نے عرض کیا" اور پھر آگے بھی کچھ کہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ تم بڑے کُند ذہن ہو۔

ادبی دُنیا کے سامنے جوش صاحب کا باقاعدہ تعارف سب سے پہلے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کرایا تھا۔ رسالہ "معارف" میں بڑا اچھا تبصرہ لکھا۔ مولانا ان دنوں اپنے دلکش اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی وجہ سے بڑے ہی ہر دلعزیز تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مولانا نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ یعنی ان کا الحادی دور ختم ہو چکا تھا۔ جب کوئی نیا نیا مسلمان ہو تو وہ دو ہزار رکعت پڑھنے کو بھی کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا۔ پھر ایسے زاہد، جو ہر وقت مثنوی مولانا روم بغل میں رکھتے ہوں۔ وہ اگر اس رند خرابات کی تعریف کریں تو اپنی جگہ بات کچھ کم اہم بھی نہ تھی۔

بات یہ ہے کہ مولانا ماجد علم اور ادب کے رستے سے مذہب کی طرف لوٹے تھے۔ اس لیے انھوں نے ادیب کو ادیب کی حیثیت سے پہچانا۔ آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے۔ اُس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مولانا ماجد ہی نے سب سے پہلے انھیں معتبر جذبات کہا اور شاعر انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کہا۔ شاعر یات پر لکھا تو یہ شاعر شباب بھی بنے۔ انھیں سب سے پہلے شاعر شباب کس نے کہا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جوش صاحب جلسے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چند بے تکلف دوست ہوں تاکہ ہر گفتہ اور ہر ناگفتہ بات کہی جا سکے تاہم رہنے کی حد تک شعر سنانے کی حد تک۔ ان کی نگاہیں صرف بے تکلف دوستوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ حاضرین میں غیر مانوس شکلیں ہوں گی تو انھیں شعر سنانے میں ہچکچاہٹ ہوگی۔ بعض اوقات غلط قسم کے احول میں کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اصرار ہوگا تو ایسے جملے بھی کہہ گزریں گے جو دلآزاری کے ذیل میں آتے ہوں۔

ایک دفعہ یہ اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے چہک رہے تھے۔ لہک رہے تھے۔ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور اپنا کلام ترنم سے سنا رہے تھے (ان کا کلام گھن گرج والی آواز میں تو سب نے سنا ہوگا مگر ترنم کے ساتھ سننے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے)

ایسے میں دو تین صاحب آن وارد ہوئے۔ جن سے جوش صاحب واقف نہ تھے۔ پہلے تو انھوں نے عینک میں سے ان حضرات کو بڑے غور سے دیکھا۔ جب انھوں نے سلام وعلیکم کہا تو انھوں نے بڑے زور سے لاحول ولا قوۃ! کہہ کر اپنی بیاض بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا جوش صاحب چپ کیوں ہو گئے؟

پھر کہنے لگے "میں اُس وقت تک شعر نہیں سناؤں گا۔ جب تک کہ فضا سازگار نہیں ہو جاتا۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ شعر نہ سنایئے مگر اس شعر کا مطلب تو بتا دیجیے۔ غالب کے نسخہ حمیدیہ میں ایک شعر ہے۔

جوش صاحب نے پوچھا "کونسا بدمعاش شعر ہے وہ!"

شعر ہے:

بجز پرواز شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

چودھری صاحب نے کہا: "یہ شعر غالب کا ہے تو ہوا کرے۔ ہم اس نشست سے مرعوب ہونے والے نہیں۔ مگر یہ شعر مطلب کی لحاظ سے ہے کہ اور" میں عادت غالب کے قصیدے اس شعر کو قصیدہ کہتا ہوں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہوں میں کچھ آپ نے ادا کیا نہیں کچھ۔ یہ شعر کہیں نہیں ہے۔ حیثیت یہ ہے کہ غالب فارسی میں سوچا کرتے تھے اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ مگر غالب اس شعر کو فارسی میں کہتے تو وہ اپنے مفہوم کو اپنے مصرعہ انداز میں بیان کر جاتے۔ مگر ترجمہ اردو میں ہی۔ ایسے — غالب کے اور بھی متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جو نامکمل ہیں۔ جو پورا مفہوم ادا کرتے۔ ہم تک خواہ مخواہ ایسی میں پہنچتا پانی ہو رہے ہیں۔"

حیدرآباد کے دوران قیام (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۹ء) فانی مرحوم نے جوش صاحب کو ایک عجیب سی بات بتلائی کہ گھنٹوں تک روحوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلے کچھ پڑھا۔ درمیان کر عینوں بخشی تو روحیں موجود ہو جاتی تھیں۔ اب یہ بیٹھے ان سے مختلف سوال کر رہے ہیں۔

میں نے روح سے پوچھا — "آپ نے کسی شاعر کی روح کو بھی بلایا تھا؟"

"ہاں غالب کو بلایا تھا۔"

"پھر کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

میں نے پوچھا: "آپ کا نام؟"

کہنے لگے: "غالب مغلوب!"

"میں آپ کے مزار پر گیا تھا۔"

"میرا قیام مزار میں نہیں۔"

"اردو شاعری کا کیا معیار ہے آپ کے نزدیک؟"

"اے میاں! ظرف لازم"

"آزاد القادری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے پوتے ہوتے ہیں۔ ان میں کے شاگرد کے شاگرد ہو جائے۔"

"ساری عمر آپ وصل کی تمنا کرتے رہے۔ اب تو مقصود مل گیا ہوگا۔"

"اے جوش! ہم تو یہاں بھی اداؤں کے شکنجے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پوچھا ——— "اور کسے بلایا تھا؟"

"ٹیگور کی روح کو بلایا تھا۔ اس نے سارے جواب ہندی میں دیے۔ حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا۔ ایک دفعہ فانی نے رنڈیوں کو بلایا تھا۔ جس نے کوئی شائستہ نہیں کی۔ سب کی سب تھیں۔ ہم سنتے رہے ہیں۔"

پھر اس واقعہ پر تبصرہ فرمایا: "یہ سب فریب کا فریب ہے۔ ہر انسان کے اندر غنودہ حالت میں سب کچھ موجود ہے۔ دیکھیے یہ کچھ مرنے کے بعد مزاحمت کو پوری ریشیدں قائم ہو رہی۔ استاد اپنے شاگرد کے اندر کی گرہ ہی کھولتا ہے۔ جس میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے

وہ میز غالب اور انیس ہو جاتا ہے۔ جس میں کم صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ فرخ ناروی بن جاتا ہے۔

نگار کے صفحات پر جوش ملیح آبادی کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر نیاز صاحب کے قلم سے، میں یہاں جوش صاحب کا ایک خط (جو نگار ہی میں چھپا تھا) اور ایک اخبار کا تراشہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تاکہ ان دونوں کی ناراضی کا تھوڑا بہت پس منظر سامنے آجائے ——— اور اس کے ساتھ ان دونوں کے کرداروں پر بھی روشنی پڑے۔ بشرطیکہ آپ کا بھی رجحان ہو، کہ تحریریں بھی صاحب تحریر کی داخلی کیفیات کا اظہار ہوتی ہیں۔

خط بھی پڑھیے۔ مگر اس پر جو نوٹ نیاز صاحب کا ہے۔ وہ بھی قابل توجہ ہے۔ دیکھیے بڑے آدمی لڑتے بھی ہیں تو کس شائستگی کے ساتھ!:-

○ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار

○ نثر میں جواہر ریزوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

یہ تھے عنوان اور ضمنی عنوان! ——— اب نوٹ ملاحظہ ہو:

رُوح دیکھو ایک ہے پاک و لطافت مآب
نظم میں زیر حجاب، نثر میں بے نقاب

پہلی جولائی [illegible] کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا۔ جس پر میرا پتہ "نیاز محمد خاں فتحپوری دفتر نگار لکھنؤ" درج تھا۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے نیاز محمد کے نام سے پکارنے والوں میں اب میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہے۔ جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں۔ لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا۔ جس کے آخر میں جناب جوش کے دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھ کر حیرت مسرت میں تبدیل ہوگئی کیونکہ مضمون کیا تھا ایک آبشار جواہر تھا اور بے اختیار سعدی کا یہ شعر زبان پر آگیا ؎

بست ہدیہ وصلم چو فتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

لیکن اس کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مائیگی کے باعث شایان شان اس کی داد نہ دے سکے ؎

بہیت کہ چو نتوش بنازے
تشریف دہ دراستیانم

مجھے امید ہے کہ حضرت جوش آئندہ بھی اپنے "انشائے عالیہ" اور "افکار نادرہ" سے اسی طرح نگار کو زیر بار کرم فرماتے رہیں گے۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شائستۂ پائے تو بود

نیاز

"جلسے سیاسیوں میں، یا دوش بغیر، ایک تھے۔ ستر بہتر برس کے ناتواں، لیکن بلا کے تیکھے اور کڑوے خوش کلام شاعر" ـ اللہ بخش

ہدایت اللہ خاں بھی کسی سے کم بہت ... میں ایک تھے (ترجمہ) ... قیامت کے خوف سے خلیل اللہ خاں!

خلیل اللہ خاں تو دل ہی دل میں خوش تھے کہ ان کی وہ مخالفت باقی نہیں رہی ہے جو دونوں کو سنایا کرتی تھی اور اسی بنا پر وہ اب — "وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے"۔ کے مصداق بن چکے ہیں۔ اس لیے ایک تھے خلیل خاں، چنانچہ ایک روز سر پر دستار ہدایت اللہ خاں کے خلیل خاں غضب کا تماشا دیکھنے کی خاطر اس کے بیٹے کے ایک سپاہی نے ان سے کہا۔" ہدایت اللہ خاں تمہاری مونچھیں سے تو چلّاتیاں ... کرتی ہیں۔ مگر تمہیں اپنے بیٹے کی کچھ خبر ہے۔"

"ہم سے بیٹے کی کیا بات کہتے ہو" (ہمارے بیٹے کی کیا بات کہتے ہو) ہدایت اللہ خاں نے خفا ہو کر جواب دیا۔ اس پر اس سپاہی نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا "خلیل خاں اللہ تمہارے بیٹے کو بڑے باغ کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

"ہم سے بیٹے کا" (ہمارے بیٹے کو) ہدایت اللہ خاں نے تیوری چڑھا کر ... اور ان کی سفید داڑھی کے بال سیاہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے حساب کی کمانیں کم نہیں ہونے پائی تھیں اور ان کے بیٹے کی خبریں آپس میں گشتی ہوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خاں محل کے پھاٹک پر نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خاں نے، جو غصے کی کچھ تاب کے ساتھ، سامنا کرتے ہوئے خلیل خاں سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا: "کھلیل کھاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم ہمارے کالے پوت میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس سالے کو باگوں باگوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو" (خلیل خاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس سالے کو باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اس کے کہ مسکراتے ہوئے خلیل خاں کچھ جواب دیں۔ ہدایت اللہ خاں نے اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی درمیان میں کود پڑے اور ایک نے ان کی لاٹھی پکڑ کر کہا۔" کمانیں کہاں گئے جو ہدایت اللہ خاں۔ اگر خان صاحب بہادر کو خبر ہو گئی تو جانتے ہو کہ اس بڑھاپے میں تمہاری کیا گت بنا دی جائے گی۔"

غرض کہ اس روز کا یہ ہنگامہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیشی و کینہ پرور بڑا خان [illegible] بھول جانے یا معاف کر دینے والا انسان ہی نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ بڑا ... اور لاٹھی ٹیکتا ہوا بڑے باغ پہنچ کر "کاشے" پر بیٹھ گیا —— اور جب اپنی ... خوبصورت ساتھ خلیل خاں، حسب دستور، ہدایت اللہ خاں کے کالے پوتے کو لیے ہوئے بڑے باغ میں نمودار ہوئے تو اس بڑھے ... نے ڈپٹ کر آواز دی کہ "ٹھارہ ہو خلیل کھاں۔ بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو ہاتھ کر لیو" (ٹھہرے رہو خلیل خاں، بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو ہاتھ کر لو۔)

وہ الاپ ... بلکہ سنتے ہی ان کا رنگ ... غزال وحشی کی طرح ... بھاگ کھڑا ہوا اور خلیل خاں نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔" ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو ... ہم تم پر کیا ہاتھ اٹھائیں ... تم اپنا حوصلہ نکال لو۔"

"اچھا ہم سے ... ہو" (اچھا ہم سے ... ہو) کہہ کر ہدایت اللہ خاں نے اپنی داڑھی ... میں ...

مانی و رُوحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کر کے بھرپور واٹی ماری کر پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آئے گا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی ہی آسانی کے ساتھ اپنے واٹی پر روک کر خلیل خاں نے کہا: "فِش!"

اس غیر متوقع حیرت بداقت آمیز ضرب سے بل کھا کر ہدایت اللہ خاں نے پھس پھس کیا کرتا ہے اور سے (فِش فِش کیا کرتا ہے اور سے) مرہ جلد کر کے دوسری واٹی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا۔ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرتب ہے اور سے۔ کمٹاخ۔ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرتب ہے اور سے۔ کمٹاخ۔ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرتب ہے اور سے۔ کمٹاخ۔ "فِش!"

غرض خلیل خاں کی "فِش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھس پھس کا کرتب ہے اور سے" نے اس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھول گیا۔ اس دم پھولنے ہی میں آخری بار "پھس ——— پھس ——— کا ——— کرتب ہے" کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

سنتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق ایک فتح پوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عرف "نگار باز" سے بھی پچیس تیس برس تک یہی "فِش" اور "پھس پھس کا کرتب ہے اور سے" کا کھیل کھیل کر اب چند ماہ ہوئے فارغ ہوئے ہیں۔

اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتح پوری ہدایت اللہ خاں "استاد کے "پھسے راغ" میں چاروں شانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خاں "شکر خورے کو شکر" اور "موذی کو ٹکر" کی زندہ مثال بنے ہوئے فتح پوری کی ندرو شہرت استاد کو ہدایت اللہ خاں کے کاسے پہنتے "کی طرح" "اِخدیا خون" کی جو اُگلانے پھر رہے تھے۔

جاہانہ انتقاد ——— مردہ باد!

خیرہ تالوانی ——— مردہ باد!

احساسِ کمتری ——— مردہ باد!

بغض و ذہنی ——— مردہ باد!

"پھس پھس کا کرتب ہے اور سے" ——— مردہ باد!

والسلام جوش

اس خط میں نیاز صاحب کا بھی کردار واضح ہے اور جوش صاحب کا بھی۔ نیاز صاحب کا اس پیشہ کر انھوں نے اس خط کو ایک مشاہیانہ کرم کر کے اپنے پرچے میں جگہ دی۔ عام ادیب تو سوچا کر بیٹھتی ہوگی۔ جوش صاحب کا کردار یہ کہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بھی

[illegible] منظورات کا سلسلہ لیا۔

اس ضمن میں جوش صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شکایت کو نجی صحبت اور خط میں چھپا لیا۔ مگر نیاز صاحب کا ظرف دیکھیے کہ انھوں نے اس شکایت کو [illegible] چھپ چھپا کے بھیج دی۔

نیاز صاحب نے جن بزرگوں کا ذکر [illegible] ہے [illegible] جوش صاحب نے [illegible] کر دیا جن کو [illegible] جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا۔

نیاز فتح پوری: یہ [illegible] کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "ذوقِ ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اسی زمانے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ جہاں [illegible] صاحب کے [illegible] حضرت نیاز سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میری جوانی کی ابتدا تھی اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی طرف قدم بڑھانے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی" کو بے حد پسند کیا [illegible] ادب پر [illegible] جو کبھی بھلایا نہ جا سکا۔

اس زمانے میں نیاز صاحب داڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے منہ پر داڑھی کچھ اچھی نہیں لگتی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے، اس وقت میرے پاس [illegible] کے سوا اور رکھا ہی کیا۔

میرے مجموعوں میں ترتیب بھی [illegible] علم و فکر کی [illegible] نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت مجھ پر علم و فکر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہو گی۔ نیاز کا سا [illegible] مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد (دکن) میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور میں نے ان کو ان کے میزبان جوش صاحب [illegible] اپنے گھر [illegible] کیا۔

بڑا افسوس کہ میری وہ مخلصانہ محبت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ [illegible] اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر ختم ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی افسوسناک گھڑی تھی کہ اس محبت میں ایک دوست کی شرافت سے [illegible] کی بنا پر نیاز اور جوش کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا تھا۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ [illegible] وہ اس قدر اوچھے اور گرے [illegible] کہ اس سے [illegible] کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں [illegible] ہو گئی نیاز صاحب مجھ سے برہم ہو گئے۔

نیاز صاحب [illegible] کہ مشتعل ہو جانے کے بعد [illegible] کے اعلان سے یہ بات [illegible] ہوتی ہے کہ وہ [illegible] پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک نگار کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرا کرتے رہے۔ اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا۔ انھوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک لمحہ تامل سے کام نہ لیا۔

ہر چند میں اس وقت جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا۔ اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے خط لکھے۔ جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن کر دیا جاتا۔

پھر بھی نہایت واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرط غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کون معاف کر سکتا ہے ایسے فرد ایسے شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لیے انھوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی کیا۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سن لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیع اوقات ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس اچھلتی جوانی اور اس ناچتی جوانی کے گرجتے برستے اشتعال میں کس کی مجال تھی کہ عنبری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا۔

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خود سرشار
کے ٹلنے سے ابر کے دیکھا نہ کسی نے

لہٰذا میرے جواب نہ دینے کو براہ کرم میری شرافت پر محمول نہ فرمایئے کہ:

بنیاد تھی اس کی نوجوانی میری

بہر حال اب وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم دونوں صاحب مضروب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ناقابل برداشت بڑھاپے سے سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں۔ لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا نمو پھوٹ آیا ہے۔

اس منزل میں ہمارے واسطے یہ نازیبا اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور غلط جذبات کی بنا پر امر حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لیے کامل ذہنی سکون اور دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیاز چند ایسے گنے چنے مستثنیٰ افراد میں سے ہیں۔ جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دوں پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آ رہا ہے۔

جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے علوم کے شہزادے ہیں اتنے شعر کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور

ماش و ملک کو تو نے بے شمار باتیں لکھیں تو بولی ہیں تجھے ساختہ پہچانتا ہے کہہ کر لکھے سے اعلان
کاش پیدا تجھ سی کا سا خلاق حرف نشاط پھر کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ جیسا کیا گیا جانے
اپنے دو جشن و نوحے میں ہم دیوانوں سے"

یہ مضمون کچھ مصنوعی جوش و نیاز قسم کی چیز بنتا جا رہا ہے۔ میں نے اس خواہش سے بچنے کی کوشش تو کی مگر بچ نہ سکا۔ پچاس پچپن برس سے ہم کو اس "زبانی" کا مرض ہے۔ بھلا بننا جانے کہاں؟ اور جوش کی شیشہ و تکذیب واضح کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ نیاز نے جوش صاحب کے خلاف خوب خوب لکھا ہے۔ یہ سب باتیں چونکہ محض تعصب کی بنیاد پر قائم تھیں اس لیے وہ پانی پر کھینچی ہوئی لکیروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب نے جوش صاحب کے خلاف جتنے بھی حربے آزمائے وہ ان کی شہرت کے سیلاب کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

شاید نیاز کو ۱۳ برس کی تنگ نظری نے یہ سبق دیا کہ بار بار کھوپڑیوں میں چند عقل کا اکھوا پھوٹا؟ ——— اور یوں دونوں مل گئے ہے —

جوش صاحب کی ایک آرزو یہ لغات بھی ہے۔ ادارہ جرمنی میں تو پھر دیکھیں کہ کیا کچھ شائع نہیں ہوتا۔ کیا کچھ بنا نہیں رہتے شعر، ذخیرہ الفاظ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اردو ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار ہو۔ پچاس برس میں تو وہ لغت تیار ہوئی تھی۔ پچاس میں ۱۵۰ اسکالروں نے مل کر کام کیا تھا۔

میں چاہتا ہوں ہر لفظ کا صحیح استعمال بتایا جائے۔ شعرا و ادبا کی کچھ کیفیتیں ہیں جیسے سسکی، سسکی، ہچکی، جب تک ان کی آواز کا فرق کا پتہ نہ چلے، بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک لغت کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر مشین بھی ہو جو سسکی، سبکی اور ہچکی کا فرق بتائے۔

پھر جیسے شاعر نے الفاظ کی ضرورت ہے۔ جو ابھی تک بنے ہی نہیں۔ مثلاً آنا، نیند آنے والی کیفیت کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ اونگھ، نیند آنے والی کیفیت کا دیا۔ اس کے لیے میں نے "کرنی" کا لفظ بنایا ہے یا "آزار کش" بھی ہو سکتا ہے۔ پھر سونے کے لیے ایک لفظ خواب ہے۔ اس ایک لفظ کی مختلف کیفیتیں کر مل سکتے ہیں نے ۲۵ لفظ بنائے ہیں۔ مثلاً پڑھتے ہوئے نیند آ جائے تو اس کے لیے میں نے "خواب مطالعہ" کا لفظ بنایا ہے۔ ریل میں نیند آ جائے تو اس کے لیے "خواب حرکت"۔ مطلب یہ ہے کہ اردو کو اتنے الفاظ دیے جائیں کہ اس کو ہر کیفیت کو ظاہر کر سکیں۔

پھر الفاظ میں بھی خاندان ہوتے ہیں، قبیلے ہوتے ہیں۔ ہمیں الفاظ کا آپس میں ملاپ کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی لفظ نیچ خاندان کا تو نہیں۔ مگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو خاندانی الفاظ کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ پردہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا جائے۔

میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ جو بیٹری سے چلتا ہے۔ جوش صاحب ترنگ میں تھے۔ میں نے اسے آن کر دیا اور انھیں پتہ بھی نہ چلا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ جنّت ملے گی۔ اس تاجرانہ ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھلا ہوتا ہے۔

ملاؤں کی معرفت یہ زہر چڑھ گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دور رہنا چاہیے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں سب سے کم وہم ہیں۔

مادی اور روحانی پہیوں کے ساتھ ساتھ جب تک ایک پہیہ فضیلت کا نہ لگے گا۔ اس وقت تک بات مکمل کر سامنے نہ آسکے گی۔ پیغمبر رسول نے جو کچھ فرمایا کہا تو بہت بڑی بات کہی۔ رسول کی بڑائی سے کوئی بھی انسان منکر نہیں ہو سکتا پھر رسول نے جو باتیں کہیں۔ وہ اس وقت کے لوگوں کے ذہن اور ماحول کے مطابق کہیں۔ مگر وہ باتیں آج بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ یہ بڑائی ہوتی ہے ایک پیغمبر کی۔"

کسی نے کہا۔ "جناب قرآن کی باتیں رسول کی باتیں تو نہیں ہیں۔ انھیں آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔"

اس پر جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا:

کیا کہوں، کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں میں

اور اس کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت یوں فرمائی ——— "جانو! کچھ عرصے کے بعد انسان موت پر بھی قابو پالے گا۔ اس لیے کہ جتنی توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ اگر بحال رکھی جا سکیں تو موت کا وجود نہ رہے گا۔

وہ جو آپ کے ایک دوست پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ادب پڑھاتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ مجھے ایک دن کہنے لگے: "جوش صاحب! میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے انھیں ڈانٹ دیا کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سوال کیا جاتا ہے۔ پوچھا نہیں جاتا۔"

پھر انھوں نے کسی بات پر کہا ——— "پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کا جواب پھُر!"

پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے کسی بات پر کہا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "کیوں کا کوئی جواب پیدا نہیں ہوا جو کہو تو کوئی نوبت آئی ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، جوش صاحب نے فرمایا۔ "ایک علامہ یہ ہیں۔ ایک علامہ وہ تھے۔ یعنی علامہ عبداللہ عمادی! جو بات کہی ترازو کا تول، ہر مشکل کا حل موجود! ——— ایک دفعہ ہم علامہ کو رنڈی کے کوٹھے پر لے گئے۔

مولانا سے بڑے مودب ہو کر عرض کیا۔ "مولانا! میرے ایک دوست کے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے تو میری اور میرے دوست کی عزت افزائی ہوگی۔"

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا۔ "اگر یہ بات ہے تو ضرور چلوں گا۔"

مقررہ وقت پر، میں مولانا کو لے کر چلا۔ رنڈیوں کا بازار آیا تو کہنے لگے۔ "ارے جوش یہ تو رنڈیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔"

مہمان! مگر میرے دوست ذرا تنک مزاج ہیں۔" اس عالم میں نے انہیں دونوں کے ہاتھوں سے گزرتا، یعنی لیلیٰ سینہ
سانی مذہبی جوڑے پانچوں کا پاجامہ، چلنے میں بھاگنے کی سی کیفیت دیکھ کر بھی کتر رہے تھے۔

ایک جگہ میں نے عرض کیا: "مولانا! یہ میرے دوست کا مکان؟"

"الحمدللہ"

میں نے ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "چلیے!"

مولانا کو شک گزرا کہ یہ مکان بھی کسی طوائف کا ہے۔ چونکہ وہ کسی پر بدگمانی کرنی جانتے نہ تھے اس لیے فوراً ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ تب تک وہ پیچھے پیچھے تھا پہلی منزل پر پہنچ کر مولانا نے کھنکارا تاکہ صاحب خانہ کو علم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ ادھر سے نسوانی آواز آئی "بے تکلف چلے آئیے۔"

مولانا آگے بڑھے تو ایک نے زنانی شکل دیکھ کر انتہائی حیرت کے ساتھ کہا: "تشریف رکھیے۔"

بوکھلاہٹ میں مولانا نے کہا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"آپ کس کو پوچھ رہے ہیں؟"

اس پر مولانا وہاں پڑھتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ اب میں نے کہا کہ دو پیسے بچیں راستہ بھٹکتے ہیں۔" میں تمہیں سمجھوں گا ----- میں تمہیں سمجھوں گا ----- رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا ----- رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا!"

ان کے علاوہ ----- جوش صاحب کی اور بھی بہت سی باتیں ٹیپ ریکارڈر میں موجود ہیں۔ مگر وہ ایسی نہیں کہ انہیں لکھا جا سکے۔ جو کچھ یہاں تحریر میں آگیا ہے وہی قدرے زیادتی والی بات ہے۔ اس لیے کہ نشے کی حالت میں ان کی جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی سنجیدہ صورت تو نہیں دینی چاہیے۔

جوش صاحب اپنے دوستوں کی مدد بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں دوست دشمن، اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ شوق اس حد تک ہے کہ ایک اسامی کے لیے متعدد سفارشیں کر گزرتے ہیں گے

متعلقہ صاحب کہیں گے۔ جوش صاحب کل آپ نے ایک اور صاحب کی سفارش کی تھی۔ آج اسی شعبہ سے اور اسی جگہ کے لیے ایک اور صاحب کے لیے کہہ رہے ہیں جگہ ایک ہے۔ بتائیے فرمائیے کہ دونوں میں سے کسے قابل توجہ سمجھا جائے۔"

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تجربہ ہے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ "لکھنؤ میں فلاں ادارے نے ہماری کتابیں بلا اجازت چھاپ رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیا جائے۔"

"ہاں ہاں ضرور کرو۔ میں تمہیں کمشنر کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ اور واپسی پر بتانا کہ کیا ہوا۔ خدا بچے ان شاء العزیز!"

حال ہی میں قمر حسین صاحب نے یہ تحریر شائع ہو کر آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت ہو تو وہ مجھے میسر ہوگی۔ اس یقین کا ان کے ساتھ یہ چند سطر یہ تحریر کر رہا ہوں۔

موسمِ برشگال کی دھوم دھام بیان کم کر دی ہے۔ لیکن اولیائے خرابات نے اپنی دنیا دل سے اس اُمنڈ بھرے ابر و باراں کو جیرۂ قلزم سے بھی بڑھا دیا ہے۔

آپ کا پرستار
جوش

صہباگسار، محبوب پاک پروردگار، مردود دم چار یار"

اس خط کے چھپوانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ خط میں کوئی خاص بات بھی نہیں۔ مگر جہاں جوش صاحب نے دستخط فرمائے، اس کے ساتھ جو لکھا "محبوب پاک پروردگار ——— مردود دم چار یار" یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔

یہ خط لکھتے وقت میں نے جوش صاحب سے عرض کیا تھا۔ اب ایسا نہ کیجیے کہ کر وہ صاحب جن کے خلاف آپ نے لکھا ہے غلط لیں۔ مگر آپ کے پاس پہنچ جائیں تو انھیں بھی اسی نوع کا خط لکھ دیں کہ اس کی مدد کی جائے۔

اس پر ہنسے، مگر بات بدل گئے ——— "اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر میں متعلقہ صاحب سے کہتا ہوں ——— ایسی سے جو زیادہ خوبصورت ہو۔ میری سفارش اس کے لیے ہے۔"

ہندوستان میں، ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ سبھی سے برابری کا ملنا جلنا تھا۔ جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام سے روزانہ مل سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک مرتبہ مولانا آزاد سے ملنے گئے تو وہ جواہر لعل سے باتیں کر رہے تھے۔ انھیں انتظار کرنا پڑا۔ چند منٹ انتظار کیا تو ان کی طبیعت نے اس طرح زک گوارا نہ کیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر یہ شعر لکھ کر واپس آ گئے ؎

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر اور وقت مولانا

مولانا اور پنڈت جی کی گفتگو ختم ہو چکی تھی یا کیا کر وہ دونوں کاغذ کا پُرزہ پڑھتے ہی ہنستے ہنستے باہر آ گئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔

اصول کی خاطر یہ بڑے سے بڑے آدمیوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ تکلف نہیں برتتے، ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ اس کی جھلک ان کے خطوں میں بھی ملے گی۔ جو انھوں نے دوسرے فراموش اور تغافل شعار افسروں اور بڑے آدمیوں کو لکھے۔ مثلاً لکھنؤ کا ڈپٹی کمشنر کبھی سے نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے ڈانٹ کے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ مجھے بھی آپ سے ملنا تھا۔ چونکہ آپ اوروں سے نہیں ملتے اس لیے میں آپ سے کبھی ملوں۔ اس خط کا صاحب بہادر پر اچھا اثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے سب سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔

یہاں بڑوں سے ملنا انھیں مہنگا بھی پڑا۔ سکندر مرزا سے ان کے تعلقات تھے۔ چیف کمشنر سے ان کے تعلقات تھے۔ انھوں نے انھیں سبز باغ دکھائے کہ پاکستان آ جائیے ہم آپ کے لیے یہ کر دیں گے۔ وہ کر دیں گے۔ جب یہ ان کی ترغیب پر پاکستان آ گئے تو یہاں کے اخبارات نے شور مچایا کہ جوش صاحب یہ کچھ کر رہے ہیں۔ غلط کر رہے ہیں اور ساتھ اب وقت بھی جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ غلط سوچ

سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر مرزا (اس وقت کے صدر پاکستان) کچھ کرسکے اور نہ چیف کمشنر اور بالآخر جوش ملیح آبادی کو "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" والی بات ہوئی۔ یہ غلطی انھوں نے اتنی بڑی کی تھی کہ زندگی بھر پچھتاتے رہیں گے۔

غرض یہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہری ہو گئے۔ ان کے اور دوستوں کی طرح مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ میں کراچی گیا تو ملاقات اس لیے نہ کی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کراچی گیا تھا اور انھیں سے بغیر ملے واپس چلا آیا تو انھوں نے مجھے بڑے دکھ کے ساتھ لکھا:

حضرت!

آپ کراچی تشریف لائے اور میرے وجود کی نفی کرکے مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دلی آتے تھے تو ایک فرد کی حیثیت سے میرے پاس ہمیشہ آتے تھے۔ لیکن اب چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں اس بنا پر آپ کی نظروں میں اپنی توقیر کھو چکا ہوں۔

آپ اپنے ذوق و قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں۔ جس سے اسلامی دنیا منہ پھیر چکی ہے۔

جاؤ بابا سے ہٹو بھی موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے مر جانے تو دو

جوش

اس خط سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے کتنی جگہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آکر کتنے افسردہ ہوئے۔

ایک بار میرے دل میں جوش صاحب کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی۔ خط لکھ مارا۔ جواب آیا:

بندہ نواز!

"آپ کو شاید علم نہیں کہ میری ہستی ایک ایسے شیشے کے مانند ہے۔ جس میں نگاہ آر پار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس امر کا یقین فرمائیے کہ اگر میرے دل میں آپ کی جانب سے ذرہ برابر بھی کدورت ہوتی تو میں اس کو آپ پر ظاہر کیے بغیر چین سے بیٹھتا ہی نہیں۔

اس منفی رُخ کے بعد آپ کو مثبت رُخ بھی دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دوستوں کے ہجوم میں اپنے دل میں آپ کی جانب رغبت و اُنس محسوس کرتا ہوں۔

اب رہی میری کوتاہ قلمی اور "جوابِ غزل" سو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں مدت سے اس باب میں ہمیشہ وہ رہا ہوں جس کو "مرفوع القلم" کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اس اُفتادِ طبع کے دوش بدوش میری جوان تک مصروفیت بھی ایسی جان لیوا ہے کہ میرے سر پر دوستوں کے خط پکتے ہوئے میں پیش ہوئی ہمواروں کے مانند ٹپکتے رہتے ہیں۔ لیکن جواب لکھنے کی فرصت ہاتھ نہیں آتی۔

آپ کو اس کا علم ہو گا کہ اس وقت کس قدر اہم فرائض کا خون کر کے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور وہ بھی محض اس خیال سے کہ میری یہ خاموشی کہیں آپ کو مجھ سے مزید بدظن نہ کر دے۔

ان دنوں ایک خاصی طویل نظم "آدمی" کہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بھیج دوں اور ضرور بھیج دوں گا۔ بشرطِ فرصت!
میری تمنا ہے کہ یہ خط آپ کو تندرست، مطمئن اور شادکام پائے۔

نیاز مند

جوش

اپنے نام جوش صاحب کے خط چھپوانے کا مجھے کچھ شوق نہیں۔ متعدد خطوں میں سے چند خط اس لیے چھانٹے کہ ان میں جوش صاحب کی نفسیات موجود ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں آپ سے چھپانا مناسب نہ جانا۔

جوش صاحب مجلسی اخلاق و آداب میں اونچے نظر آتے ہیں۔ (بشرطیکہ وقت شام کے بعد کا نہ ہو)۔ مثلاً کسی شہر میں جائیں گے اپنے دوستوں سے ملنے خود جائیں گے۔ یہ امید نہیں رکھتے کہ وہ خود ملنے آئیں۔ اسی ذاتی ضابطے کی بنا پر ایک بار مجھ سے کہا:

"دیکھو بھئی۔ تم جو کل ہمیں اپنے ہاں بلا رہے ہو تو اس میں فیض اور صوفی تبسم کو ضرور بلانا۔ اس لیے کہ ہم ان سے خود ملنے نہ جائیں گے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ دونوں حضرات کراچی گئے تھے اور مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ اس لیے ہم ان کے پاس خود نہ جائیں گے۔ مگر تمہارا پاس کرنا بنتا ہے۔"

ابھی چند مہینے ہوئے کہ لاہور آئے تھے اور اسی دن یہ اعلان فرما دیا کہ کل واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ان کے آتے ہی چلے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ میں نے چڑ کر کہا۔ "کل کی بجائے آج ہی چلے جائیے۔ بلکہ ابھی چلے جائیے۔"

میرے یہ کہنے پر دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر کہا۔ "اچھا کل نہیں جائیں گے۔ ایک دن تمہاری خاطر سے رک جائیں گے۔"

یہ اس شخص کی باتیں ہیں۔ جس نے بڑے بڑے ذات صاحبوں کو جوتی کی نوک پر نہیں لکھا۔

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جوش صاحب لاہور آئے ہوئے تھے۔ قائداعظم کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بانیوں کو پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں تو وہ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دینے کو ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ٹکا سا جواب دیا ——— "میں شرکت سے معذور ہوں۔"

کسی نے کہا۔ "قائداعظم کی برسی کے سلسلے میں مشاعرہ ہے۔ انکار نہ کیجیے۔ سو باتیں ہوں گی۔"

"باتیں ہوں گی تو ہوں۔ میں بلامعاوضہ نہ جاؤں گا۔ خود قائداعظم نے مسجد شہید گنج کا مقدمہ لڑا تھا تو مسلمانوں کے لیڈر ہوتے ہوئے مسلمانوں سے دس ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا تھا۔ میں بھی تو قائداعظم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔"

بانیانِ مشاعرہ بلامعاوضہ سے بلانا چاہتے تھے۔ قائداعظم کا نام لے کر سامنے کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے۔ مگر یہ طرح ہی نہیں دے

رہے تھے۔ مگر اس وقت جوش صاحب کے ایک دیرینہ دوست مولانا ابوالخیر مودودی نے مسعود صاحب سے چپکے سے یہ کہہ دیا: آپ وقت مقررہ پر آ جائیے گا۔ جوش صاحب مشاعرے میں شرکت کریں گے اور صدارت کریں گے۔

مشاعرے کا وقت قریب آیا تو مسعود صاحب آن پہنچے۔ جوش صاحب نے ان کی شکل دیکھتے ہی کہا: بھئی یہ پھر شاعرے والے تو پھر آ گئے:

مولانا ابوالخیر نے فرمایا "پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں میں نے بلایا ہے۔"

"کس لیے؟ کیا بات ہے؟"

"تاکہ آپ کو مشاعرے میں لے جا سکیں۔"

"دوستی کا امتحان نہ لو۔"

"ہم کچھ کہیں، اب تو آپ کو جانا پڑے گا۔"

"ابوالخیر تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جانا پڑے گا۔"

دیکھا آپ نے! ان دو ظرافت کا یہ رنگ جو کبھی دیکھنے میں ہے میرے دوستوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔

سارا زمانہ یہ مشہور ہے کہ جوش صاحب مانتے نہیں۔ میں نے بھی یہ باتیں سن رکھی تھیں۔ مگر میرے ساتھ تو انھیں خصوصی تعلقات کا دعویٰ بھی تھا۔

جشنِ نقوش کے سلسلے میں (جو انجمنِ ادبی مسائل (پاکستان) نے منایا تھا) ہیکر زمان صاحب کے علاوہ میں نے بھی خط لکھا کہ آپ ضرور ... اور یہ بھی واضح کر دیا کہ انجمن آمد و رفت کا کرایہ پیش کرے گی۔ کوئی معاوضہ پیش نہ کر سکے گی۔

جوش صاحب کا جواب آیا:

"عزیزم!

"آپ ہمارے دل کو کیوں دکھاتے ہیں۔ بے شک میں آپ کا بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ اگر آپ کرنے کی غیر مستحسن مرمت واقعی آپ کی تقریب میں شرکت کروں۔

یہ بھی کہہ دوں کہ اگر میں آؤں گا تو آپ ہی کی خاطر، لیکن آپ کا مہمان نہیں بنوں گا۔ وہ ایک روز اپنے پاس سے ہوٹل میں ٹھہروں گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہو گا اور یہ بھی کہ واپسی کا کرایہ بھی میں آپ سے نہیں لوں گا۔ اگر ایسا نہیں کرنے کا تو جھوٹا۔"

مخلص: جوش

اس خط کے ملنے پر یہی خیال تھا کہ جو جی میں آیا لکھ دیا ہے۔ مگر تقریب کے دن آ جائیں گے۔ جون کا مہینہ، جوش صاحب نے پھر معذرت بھی نہ کی تھا۔ مگر ... تقریب سے ایک دن پہلے جوش صاحب لاہور میں موجود تھے۔ جیسے ہی کیا ... روپے دیا گیا گرمی میں ... میں ان کے آنے کی خبر سن کر خوش ہو گیا ——— انھوں نے نقوش کی تقریب میں پوری دل جمعی سے حصہ لیا۔

لاہور سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انھیں آمد و رفت کے سلسلے میں روپے دلوائے۔ مگر انھوں نے واپس کر دیئے ———

کہا ــــ "اس تقریب میں شامل ہونا تو میرے فرائض میں سے تھا۔ روپے پیسے کا کیا سوال!"

ایک اور مشاعرے کے سلسلے میں ان کے ایک دوست نے، جو اتفاق سے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ پہنچے۔ دیکھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب اسٹیشن پر موجود نہیں۔ ان کے نائب موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا ـــ "بھئی خود کیوں نہیں آئے؟"

"ایک ضروری کام میں لگ گئے ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پر آنا غیر ضروری تھا۔"

یہ کہتے ہوئے اپنا سامان پھر گاڑی میں رکھوا دیا اور اس مشاعرے میں شرکت نہ کی۔ جہاں سے ایک ہزار روپیہ اور آمد و رفت کا کرایہ ملنا تھا۔

دیکھا آپ نے جوش صاحب روپے کے سامنے بھی تنے رہتے ہیں۔

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا۔ اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا نظر آتا ہے۔ وہ ویسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا، شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

اقبال ایک مستقبل شناس سیاستدان

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا، وہ تاریخ اسلام کا عظیم ترین المیہ تھا۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمانوں کی قوم آپس میں منتشر ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی ایک المیہ تھا۔ بٹی ہوئی اقلیت انتشار اور موثر قیادت سے محروم ہو گئی۔ یہ بھی ایک المناک پہلو تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کیونکہ ماضی کبھی واپس نہیں آتا۔ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اور اس کا قافلہ ہمیشہ مستقبل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کے طالب علم ہوتے ہیں وہ ماضی کے واقعات کو کرید کر دیکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور حالات کا [illegible] تقاضا کیا ہے۔ کیا اس سے گریز ممکن تھا یا نہیں اور مستقبل میں بھی پھر اسی قسم کی تکرار کے امکانات ہیں۔

علامہ اقبال برصغیر کی وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ایک ٹھوس سیاسی حقیقت کے پیش نظر برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا تصور پیش کیا۔ اور نہ صرف ایک تجویز سامنے رکھی بلکہ اس تجویز کے خدوخال واضح کر سکے۔ جو اس تصور میں مضمر تھے۔ گویا علامہ نے ملت کو ایک نئی راہ دکھائی جس پر چل کر وہ نہ صرف سیاسی آزادی حاصل کر سکتی تھی بلکہ اپنی تہذیبی اقدار کو عمل میں لانے کے لیے اس سے ایک بہتر گاہ کا قیام بھی ممکن تھا۔ ویسے یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس کے لیے آنے والی نسلیں بھی ان کی ممنون و احسان مند رہیں گی۔

لیکن میرے نزدیک علامہ اقبال کے کارنامے کا ایک اور پہلو ایسا ہے جو اس لحاظ سے اس سے بھی عظیم تر ہے کہ انہوں نے مستقبل کے پردوں کو چیر کر ان پہلوؤں کو بھی بھانپ لیا جو اپنے جلو میں المناک حادثات اور واقعات کا ایک طویل سلسلہ لیے ہوئے تھے۔ اور نہ صرف بھانپا بلکہ ان کی طرف واضح اشارے بھی کیے اور نہ صرف اشارے کیے بلکہ ایسے عملی قدم بھی اٹھائے۔ جن کی بابت اگر لوگ پہچان لیتے تو شاید غم کا زمانہ نہ دیکھنا پڑتا۔ شاید سرحد کے اس پار مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کی نوبت نہ آتی اور شاید ہندوستان کی عظیم مسلم اقلیت اتنی بے بس نہ ہوتی جتنی بے بس وہ آج نظر آ رہی ہے۔ مستقبل شناسی قیادت کا حقیقی جوہر ہے اور علامہ اقبال میں یہ جوہر بدرجہ اتم موجود تھا۔

اگر ہم ماضی سے نقاب اٹھائیں اور ذرا غور سے حضرت علامہ اقبال کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں کا جائزہ لیں تو ہم یقیناً اس صداقت تک پہنچیں گے کہ حضرت علامہ کے نزدیک برصغیر کے مسلمانوں کے لیے واحد حل یہ تھا کہ ان کی جدوجہد کے دو رخ ہوتے
اوّل: مسلم اکثریتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ وہ ایک آزاد مملکت کا روپ دھار سکیں۔ گویا ان کی تحریک تخلیقِ وطن کی تحریک ہوتی
دوم: مسلم اقلیتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں جو ایک موثر اقلیت کے شایانِ شان ہوں۔ گویا یہ تحریک تحفظِ حقوق کی تحریک ہوتی۔ لیکن ہوا کیا؟ کہ تحریک نے ایک ہی رخ لے لیا یعنی آزادی کی تحریک۔ اگرچہ مسلم لیگ کی قیادت [illegible] کے ذریعے سے ایک [illegible] نہیں تھی۔ [illegible] قیادت [illegible] نہ کیا گیا۔

ں کے بعد جو مسلم اکثریتی صوبوں کے پہلو بہ پہلو مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور بہت بہادری کا اور ثابت
سے لگایا۔ لیکن یہ نعرہ ان کی قسمت بدل نہ سکا۔ جو قیام پاکستان سے جاری رہا اور عین تقسیم کے وقت تک بلند ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس کے فوراً بعد ہندوستان کے
ہندو مسلمانوں کو گلے سے نہیں لگا سکتے تھے اور ان کا ردعمل وہی تھا جو ایک ایسی بپھری ہوئی قوم کا ہو سکتا ہے جو جیتے ملک کی بلا شرکت غیرے
ملکیت کی امیدوار تھی۔ اس کے ایک اچھے خاصے حصے سے محروم ہو گئی۔ مگر اقلیتی صوبوں کے مسلمان اپنی تحریک کو ایسے نعروں پر استوار کرتے
جو حقیقت کا روپ دے سکتے تو شاید ۱۹۴۷ء کے قتل عام اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی میں اتنی شدت نہ ہوتی۔ جو ہم نے
دیکھی اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست کے بنیادی تضاد کو حضرت علامہ نے ۱۹۲۸ء ہی میں بھانپ لیا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اقلیتوں کو ویٹیج (weightage) یعنی تناسب آبادی سے زیادہ حقوق دینے سے جہاں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ وہاں اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل جاتی تھی اور وہ اپنے گھر میں ہی بے اثر ہو جاتے تھے۔ تو وہ اس سیاست سے بیزار ہو گئے اور انھوں نے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش سے چند مضامین "انقلاب" میں لکھوائے۔ جن کا عنوان تھا: "ہندی مسلمانوں کے لیے ایک وطن"۔ جن میں تجویز پیش کی گئی کہ شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ جب مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنما بعض شرائط پر مخلوط انتخاب کا اصول قبول کرنے پر راضی ہو گئے تو انھوں نے اس متوازی آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری بننا قبول کیا جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور جو نہ صرف جداگانہ انتخاب کی تائید و حمایت میں پیش پیش تھی بلکہ اس امر کا بھی شدت سے مطالبہ کرتی تھی کہ اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت دستور میں تسلیم کی جائے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اگر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست کو صحیح خطوط پر چلانا ہے تو مسلم اکثریتی صوبوں کو اپنے مخصوص مسائل حل کرنے کے لیے الگ تنظیم درکار ہے چنانچہ انھوں نے "مسلم آؤٹ لک"، "سیاست" اور "انقلاب" کے ایڈیٹروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کی تجویز اپنے ادارتی کالموں میں پیش کریں۔ تاکہ حضرت علامہ کے ہاتھ مضبوط ہوں اور وہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے عملی قدم اٹھا سکیں۔ چنانچہ
۱۰ نومبر ۱۹۳۰ء کے شماروں میں تینوں اخباروں نے مقالات افتتاحیہ لکھے۔ جن میں اس رائے کا اظہار کیا کہ:

> "جب تک صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار کمزور نہ ہو گا جب تک سندھ الگ صوبہ اور سرحد اور بلوچستان کو کامل اصلاحات نہیں ملیں گی اور جب تک پنجاب کے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ذریعے اکثریت حاصل نہ ہو گی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کی زندگی معرض خطر میں رہے گی۔"

ان اخباروں نے دردمندانہ قوت سے اپیل کی کہ وہ:

> "جلد سے جلد شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کرکے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے عملی تدابیر کا فیصلہ کریں۔"

جیسا پہلے لکھا جا چکا تھا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو حضرت علامہ کی دعوت پر برکت علی اسلامیہ ہال میں لاہور کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس کی صدارت خود حضرت علامہ نے کی۔ اس اجتماع میں یہ حضرات شریک ہوئے: ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ سید محسن شاہ۔ مولوی غلام محی الدین

قسمت ... حبیب اللہ، سید مراتب علی شاہ، مولوی محمد علی، میر جماعت علی، میاں فیروز الدین احمد، مسٹر عبدالمجید ملک مدیر مسلم آؤٹ لک، سید حبیب مدیر سیاست۔ غلام رسول مہر و عبدالمجید سالک مدیران انقلاب: خان سعادت علی خان۔ ملک امیر شمس الدین، ڈاکٹر ... میاں حق نواز۔ مولوی فضل الدین۔ شیخ ... فضل کریم۔ عبداللہ۔ ... علامہ اقبال نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اور متفقہ طور سے فیصلہ ہوا کہ ایک کانفرنس میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلمانوں کو بلایا جائے۔ قانون ساز مجالس کے ممبروں اور ... کے مسلمانوں، مختلف اسلامی ... کے نمائندوں اور دیگر سرکردہ لوگوں کو شرکت کے لیے بلایا جائے۔ ایک مجلس استقبالیہ بنائی گئی جس کے صدر حضرت علامہ تھے۔ سیکرٹری کے عہدے پر ... مقرر ہوئے اور خان سعادت علی خان فنانشل سیکرٹری بنے۔ ایک ہفتہ بعد حضرت علامہ کی کوٹھی پر ایک اور اجلاس ہوا۔ جہاں کانفرنس کا نام "آل انڈیا مسلم کانفرنس" قرار پایا۔ اور مسٹر ... ملک کے ساتھ مولانا حبیب کو بھی سیکرٹری بنایا گیا۔

یہ تحریک مقبول ہونے لگی۔ سندھ میں شیخ عبدالمجید ... اس کے حق میں زمین ہموار کرنے لگے اور پنجاب کے مسلمان اخبارات شد و مد سے پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس پروپیگنڈے کے انداز کو سمجھنے کے لیے اس دو کالمی چوکھٹے کا متن ملاحظہ ہو۔ جو "انقلاب" میں ہر روز ... کے بعد چھپتا تھا:

> پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان، اسلامی ملک ہیں
>
> ان میں اسلام کا علم بلند رکھو
>
> شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس عنقریب ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس میں پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی مسلمان جمع ہو کر ان تدابیر پر غور کریں گے۔ جن سے ان علاقوں میں مسلمانوں کی موجودہ اکثریت محفوظ کی جا سکتی ہیں اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں اسلام کی بقا چاہتے ہو تو شمالی ہند کی کانفرنس میں آؤ۔

اتنے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا الٰہ آباد سیشن ہوا۔ جہاں حضرت علامہ نے اپنا تاریخی خطبہ پیش کیا۔ جس کے عمل میں آنے کے پیچھے یہاں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چنانچہ اسی بنا پر جلد ۵۰۰۰ ... لیکن جب حضرت علامہ نے محسوس کیا کہ علیحدہ اسلامی مملکت کے حق میں کسی بڑے مسلمان رہنما نے ایک لفظ تک نہ کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور کانفرنس کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ... ان کے ... میں ایسے امکانات نظر آتے تھے کہ علیحدہ اسلامی مملکت کا نعرہ جماعت ساز لوگوں کے ہاتھ میں پروپیگنڈا بن کر [illegible] جا سکتا تھا۔

۱۹۳۰ء کے بعد حضرت علامہ نے حضرت قائد اعظم کے نام جو خطوط لکھے۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ جو کچھ ۱۹۳۰ء میں کہہ چکے تھے وہی زیادہ شد و مد سے کہنے لگے۔ میں چند اقتباس پیش کرتا ہوں:

اوّل: اسلامی قانون کے ایک طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو ٹھیک طرح سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم قوت لایموت کا حق محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اس

وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ یہاں ایک آزاد اسلامی ریاست یا آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں نہیں آ جاتیں۔ (۲۸ مئی ۳۷ء)

دوم: ان حالات میں ظاہر ہے کہ ایک پر امن ہندوستان اسی صورت میں ممکن ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی بنیادوں پر اس ملک کی تقسیم زعمل میں لائی جائے۔ (۲۱ جون ۳۷ء)

سوم: پنجاب کے بعض مسلمان پہلے ہی سے یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ ایک نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس منعقد کی جائے اور یہ خیال تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چہارم: آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قومیں قرار دیا جائے جو ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی طرح حق خود ارادیت کی مستحق ہوں؟

پنجم: میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو اس مرحلے پر مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ یہ قدم مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی ——— دونوں قسم کے صوبوں کے بہترین مفاد میں ہے (۲۱ جون ۳۷ء)

نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس، شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو قومیں قرار دے کر ان کے لیے حق خود ارادیت کا مطالبہ اور اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کرنے کی تجویز میرے اس موقف کو ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علامہ مسلم اکثریتی صوبوں کی جدوجہد کو الگ رو پہ چلانا چاہتے تھے۔ میرے اس خیال کو اس وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ جب اگست ۳۷ء کے وسط میں ہم لوگ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے حضرت علامہ سے ملے۔ تو انہی کے مشورے پر اس جماعت کا نصب العین شمال مغربی ہند میں مسلم اسٹیٹ کا قیام قرار پایا اور انہی کے کہنے پر ہم نے سرحد اور سندھ کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشنوں کا الحاق قبول کیا۔

حضرت علامہ نے جو کچھ کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ۱۹۴۰ء میں قرار داد لاہور کی منظوری کے فوراً بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک اکثریتی صوبوں کی لیگ، دوسری اقلیتی صوبوں کی لیگ، دونوں آپس میں ایک دوسرے کا دست و بازو بنتیں۔ لیکن ان کے مقاصد مختلف ہوتے۔ طریق ہائے کار مختلف ہوتے اور نعرے بھی مختلف ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید بعد کے المناک حادثات سے گریز ممکن ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت علامہ زندہ رہتے۔ تو برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کے دو رخ ضرور متعین ہوتے۔

اقبال کی اِنسان دوستی

ڈاکٹر عبد المغنی

اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اس میں نہ کوئی امتیاز ہے اور نہ انفرادیت، اقبال کے علاوہ بھی بہت سارے شعرا و ادبا کا موضوع انسان ہی رہا ہے، اور آج کل تو ہر شخص ہی بہر صورت کا موضوع انسانیت کو قرار دے رہا ہے لہٰذا جب بات اتنی عام ہو گئی ہے تب اس بات کی تفصیل میں کیوں کوئی ہی پڑے گا، چنانچہ جہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ بہت سارے افراد زندگی کے بہت سارے گوشوں میں اپنی کوششوں کا مقصود انسان کو بتاتے ہیں اور اگر وہ نہ بھی بتائیں تو بہر حال، بعض اوقات غیر شعوری طور پر ہی سہی ہر کوئی انسان اپنی حدود سے باہر تو جا سکتا نہیں، کسی نہ کسی طور پر اس کے ہر عمل کا مطمح نظر، آخری تجزیے میں، اس کی اپنی ہی ذات ثابت ہو گی۔ لہٰذا ہمیں اس عمومیت سے صرف نظر کرنا ہی پڑے گا اور موضوع انسانیت کو چند سخت حدود میں باندھنا ہی پڑے گا، اس بندش کے بعد ہی معروف حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیائے ادب کی چند عظیم ہستیاں واقعی ایسی ہیں جنہوں نے لطیف انسانی کے اسرار کو اپنے جذب و اظہار سے فاش کرنے کی کوشش کی اور کچھ نہ کچھ، وشیاں ہمیں وجود انسانی کے متعلق دے گئے، مثلاً رومی، دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے اور اقبال) لیکن میں نے جس بات سے اپنے مضمون کا افتتاح کیا ہے وہ اتنی عام نہیں ہے کہ اس میں ہر کس و ناکس کو شامل کر دیا جائے۔ جس نے انسان کے متعلق چند بصیرت افروز نکتے دریافت کر لیے ہیں، حضرت انسان کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتے کی باتیں تو وہ کسی رنگ میں کہہ گئے ہیں جن کا مقصد کسی بھی شکل سے اپنی مرکزی شخصیت کو اجاگر کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بات دراصل انسان، بحیثیت انسان، کو جیسا کہ وہ ہے اس کی تمام داخلی و خارجی کیفیتوں کے ساتھ، شعوری طور پر موضوع سخن بنانے، اس کی تمام کمزوریوں اور توانائیوں، مشکلوں اور صلاحیتوں کو زیر بحث لانے کی ہے، تاکہ کائنات اور حیات کے ساتھ اس کے رشتوں کو واضح کر کے اس کی حدود اور امکانات پر روشنی ڈالی جائے اور اس طرح اس کے مقصد وجود اور نصب العین کو اجاگر کیا جائے، پھر اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لے کر اس کے مسائل کے ساتھ ان کے حل پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان وسیع معنوں میں اب تک دنیا کے کسی شاعر نے انسان کو موضوع نہیں بنایا، بجز اقبال کے اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے، اتنی تشریح اور تنظیم کے ساتھ انسان کیا، کسی بھی موضوع سے بمشکل کسی شاعر کے بس کا روگ بھی نہیں، یہ کام تو ایک فلسفی اور عالم ہی کر سکتا ہے، اور اقبال جو ایسا کر پائے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عالم اور فلسفی بھی تھے، بلکہ انھوں نے اپنی عالمانہ اور فلسفیانہ حقیقتوں کو اپنی شاعری میں جذب کر دیا تھا، اتنا ہی نہیں، وہ فکر اور فن دونوں دائروں میں مجتہد تھے، صرف قرآن سے وہ اصول لے کر اپنے زمانے تک دریافت شدہ علوم و افکار کی تحقیق و تنقید کر کے انھوں نے اپنا ایک مستقل نظام فکر مرتب کیا اور اس نظام فکر کا بہترین اظہار انھوں نے اپنی شاعری ہی میں کیا اور اس مقصد کے لیے شاعری کے نقوش و علائم اور اسلوب و آہنگ کی بھی تجدید کی اور اس کی مثال دنیائے ادب میں کہیں اور نہیں ملتی، لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے تو یہ

نہ صرف خاص بلکہ خاص الخاص ہو جاتی ہے، یعنی اب عبارت اس طرح ہوتی ہے کہ پورے صفحے میں انسان معدوم، موجود شخص اقبال صرف بچ گئے۔

ظاہر ہے کہ استشہاد سے پہلے انسان سے شغف، گہری انسان دوستی کا اشارہ ہے۔ اقبال کی انسانیات کسی ماہر حیوانیات یا ماہر نفسیات کی دل چسپیوں پر مبنی نہیں، اس میں خشک سائنسی انداز اور اعداد و شمار کے سرد تجزیے کو دخل نہیں، اس میں فلسفیانہ نظریہ بازی اور موشگافی کو بھی کار فرمائی نہیں، اس میں سیاسی نعرہ بازیوں اور اقتصادی الجھنوں کا بھی گزر نہیں ——— اقبال کی انسانیات کا محرک و مقصود صرف ایک جذبہ ہے، بنی نوع انسان کی ہمدردی اور یہ چیز سراسر اخلاقی یا زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو ایک رُوحانی جوہر ہے اور اس جوہر کو کوئی ٹھوس نام دینا چاہیں یا اسے ایک ضابطے کے تحت لا کر دیکھنا چاہیں تو کہیں گے کہ ہم اس ہمدردی کا سرچشمہ مذہبی ہے، خاص کر اقبال کے سلسلے میں تو مذہب کی تخصیص اسلام کے نام سے بھی کر دی جا سکتی ہے، یعنی آخری تجزیے میں اقبال کی انسان دوستی در اصل ان کے اس اجتماعی شعور کا مظہر ہے جس کے تار و پود اسلام کے نظریۂ زندگی سے مرتب ہوئے ہیں۔ اقبال کا اجتماعی شعور بجائے خود ایک مستقل اور نہایت وسیع موضوع ہے۔ یہاں ہم بہت اختصار کے ساتھ چند نمایاں نکتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات و حیات کسی حیوانی ارتقا کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سراسر ایک الٰہی تخلیق ہے، پوری کائنات کا خالق ایک باشعور اور با اختیار ہستی ہے، اور پوری نوع انسانی ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے، اور حیات انسانی کا ایک واضح مقصد ہے، جس کی تکمیل کے لیے ہی یہ پورا نگار خانۂ ہستی سجایا گیا ہے اور اس تکمیل کے لیے خالق ہستی نے خود ایک ضابطہ، ایک نظام فطرت تجویز کیا ہے اور اس کا نام بھی خود اسی نے اسلام رکھا ہے، اس طرح اسلام در حقیقت کسی فرقے کا پیدائشی دھرم، یا کسی نسل و قوم و ملک کا سرکاری مذہب نہیں بلکہ یہ نام ہے زندگی کے ایک نظریے اور ایک نظام کا، اس کے کچھ اصول اور کچھ ضابطے ہیں، جو انھیں تسلیم کرے اور بجا لائے وہ مسلم ہے اور جو ان سے انکار کرے وہ غیر مسلم۔ چناں چہ اسلام خالص اصولی بنیاد پر ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کے تحت تمام بنی آدم کی ایک ملی وحدت قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں رنگ، نسل، وطن، رتبہ اور اثاثہ وغیرہ کی تنگ اور غیر فطری بنیادوں پر کسی قسم کی تفریق و تمیز روا نہیں رکھی جائے گی، ہر شخص کی حیثیت صرف اس کے انفرادی عمل و کردار کے مطابق متعین ہو گی، اور اس عمل و کردار کا معیار ہو گا — خدمت خلق، یعنی ذاتی خوبیوں کا اعتبار اسی وقت قائم ہو گا جب وہ اجتماعی فلاح و بہبود میں معاون ہوں، اس لیے کہ خالق نے ہر انسان کو انفرادی طور پر اس زمین پر اپنا نائب سلطنت مقرر کیا ہے، لہٰذا ہر فرد کی یہ خلقی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق عالم انسانیت کی درستی اور بہتری کے لیے انتہائی حد تک کوشش کرے اور اگر اس کوشش میں کوئی کوتاہی ہو گی تو اس کا خمیازہ اس کو برداشت کرنا ہو گا، یہ دنیا دار العمل ہے، یہاں عمل اور رد عمل کی بنیاد پر ایک قانون مکافات جاری ہے، اور انسان کی زندگی صرف اسی خاک دان تک محدود نہیں، موت اک زندگی کا وقفہ ہے، اور اس دنیا کی زندگی بس ایک مہلت کا عرصہ ہے، اس کے بعد ایک دوسری دنیا ہے جہاں شخص کی حیثیت اس کے ان افکار و اعمال کی بنا پر متعین کی جائے گی جو اس نے اس دنیا میں انجام دیے ہیں، اور وہ دنیا ایک پائدار دنیا ہو گی جس کے قیام کی کوئی حد مقرر نہیں، چناں چہ جو کچھ غلط یا صحیح ہم یہاں کریں گے اس کے برے یا اچھے نتائج ہمیں ایک مدت مدید تک بھگتنے پڑیں گے۔

اس طرح اقبال کی انسان دوستی اپنے اندر ایک عقیدے اور فریضے کی گرم جوشی اور سرگرمی رکھتی ہے۔ اقبال انسان کے دوست اس لیے ہیں کہ وہ خود اپنے دوست ہیں۔ انسان دوستی ان کا مقصدِ وجود اور وظیفۂ حیات ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کا فلسفۂ خودی ہی اپنے جذبات کی عملی شکل انسان دوستی ہی میں پاتے ہیں اور خودی کا مفہوم یہ تسلیم ہوگا کہ انفرادی شعور کی تربیت اور اس کی تہذیب اجتماعی کام ہے کیونکہ ہر فرد اپنے دل اور دماغ اور دست و بازو کی روحانی و مادی پرورش اس مقصد سے کرتا ہے کہ وہ خود اپنی ان تربیت یافتہ قوتوں سے عام انسانیت کی خدمت بجا لائے۔ ورنہ اقبال نہ تو اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد کسی خانقاہ میں بیٹھے پر چلہ کھینچ کر اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ روشن اشیاء کرتا چلا جائے، اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد اپنی قوتوں کو ابھار کر دوسروں پر غالب آ جائے اور ان پر تسلط جما بیٹھے۔ اقبال کی خودی کی معراج ہے خلافت فی الارض، اور اس خلافت کا جو معیار اقبال نے تجویز کیا ہے وہ فقر ہے، نہ کہ شہنشاہی اور اس فقر کے جو نمونے اقبال نے اسلامی تاریخ کے عہدِ زریں یعنی خلافتِ راشدہ سے پیش کیے ہیں ——— ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ ——— وہ سب کے سب جس اصول پر عمل پیرا تھے وہ یہ تھا: "سید القوم خادمہم" (قوم کا حاکم، قوم کا خادم)۔ اس طرح انسان دوستی اقبال کے تصور میں محض دردمندی کا ایک انداز نہیں بلکہ درحقیقت انسانیت کا معیارِ کمال ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ صاحبِ قوت اور صاحبِ عقیدہ ہوتا ہے اتنا ہی اس پر انسان دوستی کا فرض عاید ہوتا ہے، اور اس فرض کی کما حقہ ادائیگی اسی وقت ہوگی جب انسان کو ذخیرہ و وسائل کے مطابق کمال درجے کی قوت حاصل ہو جائے اور اس قوت نے خود اپنے استقلال اور صاحبِ قدرت کی کامیابی پا لی ہو کی جانچ یہی اس کسوٹی پر ہوگی کہ اس نے انسان دوستی کا حق کہاں تک ادا کیا۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا — مروّت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی — سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی   اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

———

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود   اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

———

انسان دوستی کے اس بلند معیار سے جب اقبال نے اپنے زمانے کے عالمِ انسانیت پر نگاہ ڈالی تو انھیں بہت صدمہ اور بڑی تشویش ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک، صرف دو ڈھائی سو سال کے اس عرصے میں، جب دنیا کا انتظام اہلِ کے ہاتھ سے نکل کر اہلِ مغرب کے پنجے میں آگیا، انسانیت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، مشرق سے مغرب تک پورا انسانی معاشرہ ایک سڑتی ہوئی لاش کی طرح پھٹنے لگا، انسان اور انسان کے درمیان سارے اخلاقی رشتے ٹوٹ گئے، اصولوں کی جگہ اغراض نے لے لی، مفادات کو مقاصد کا درجہ دے دیا گیا، سائنس کی ترقی اور مشین کے فروغ نے تمام اخلاقی قدروں کو تباہ کر دیا، ناقص فلسفوں اور استبدادی نظاموں نے آدمی کو حیوانی پستیوں میں گرا دیا ———— کمیونزم، کیپٹلزم، نازی ازم، فاشزم، امپیریلزم، سب نے مل کر اپنے اپنے طور پر آدمیت کو و تمام قومیت میں تقسیم کر دیا، اور ایک طرف تو اپنی قومی ریاستوں کے دائرے میں انھوں نے خلقِ خدا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور دوسری طرف عالمی سطح پر ایک قوم کو دوسری قوم سے درندوں کی طرح لڑا دیا۔ اس طرح فکر و عمل کے ان خود ساختہ نظاموں نے خدا کی زمین کو ظلم و ستم سے بھر دیا۔ کہیں انسان کو رنگ و نسل کے اعتبار سے گورے اور کالے میں بانٹ دیا گیا، کہیں معیشت کے اعتبار سے اسے سرمایہ دار اور مزدور، اور سود اور ادنیٰ اور اعلیٰ کے الگ الگ خانوں میں بند کر دیا گیا، کہیں عورت اور مرد کو ایک میدانِ عمل میں لا کر دونوں کو ایک دوسرے سے وحشیوں کی طرح بھڑا دیا گیا اور اقبال نہ صرف سطح کے ان احوال و واقعات کو دیکھ دیکھ کر کبیدہ تھے، بلکہ ان کی تیز نگاہیں تہوں کو چیرتی ہوئی تھیں اور خرابی کے ان سرچشموں کا سراغ لگا رہی تھیں جہاں سے ہلاکت کے زہریلے دھارے پھوٹ پھوٹ کر انسانیت کو مسموم کر رہے تھے۔ چنانچہ اقبال اپنے زمانے کے حالات کو محض عارضی و ہنگامی حوادث نہیں سمجھ رہے تھے جو وقت کے ساتھ گزر جانے والے ہوں، بلکہ یہ حالات ان کے نزدیک گہرے مرض کی علامات تھیں جن کی گرفت جسمِ انسانی پر وقت کے ساتھ ساتھ اور بڑھنے والی تھی اور اسی لیے اقبال انسانیت کے مستقبل ہی کی طرف سے پُرتشویش تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان فکری نظاموں اور عملی اداروں پر سخت سے سخت تنقید کی جو ان کی نگاہ میں خرابیِ احوال کے ذمے دار تھے اور اپنی حد تک بڑھ چڑھ کر آگاہ کر کے چشمۂ انسانیت کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کی نگاہ میں ڈارون، ہیگل، مارکس، فرائڈ، نیٹشے سب کے سب انسانیت کے مجرم تھے، اس لیے کہ جدید تمدن اور تہذیب کی بنیاد ان ہی حضرات جیسے دوسرے مفکروں کے نظریات ہیں اور وہ تمام تحریکیں جنھوں نے عالمِ انسانیت میں ظلم و ستم کا بازار گرم کیا اور وہ تمام اشخاص جو ان کے علم بردار تھے، سب کے سب ان ہی نظریات کے پروردہ تھے۔ اقبال کے نزدیک وہ قوتیں جو انسانی معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں ان میں سرِفہرست یہ ہیں: الحاد، شکم پرستی، وطنیت، لادینی سیاست، جنسی انتشار۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے   حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

———

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(طلوع اسلام)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(خضر راہ)

نظامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا! طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

ہر نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

یہ تہذیبِ حاضر نے عطا کی [illegible] کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

خضر راہ، طلوع اسلام، وطنیت (بانگ درا)
ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، فلسفہ، مکہ اور جنیوا، مقصود، زمانۂ حاضر کا انسان، مغربی تہذیب، عصر حاضر، حکیم نطشہ، مرد فرنگ، عورت کی حفاظت، فنون لطیفہ، جمہوریت، مسولینی، انتداب، لادینی سیاست، دام تہذیب (ضرب کلیم)
آزادی افکار، ماہر نفسیات، فلسفی، ابلیس کی عرضداشت، سینما، فلسفہ و مذہب، دین و سیاست

...ے حضور میں" (بالِ جبریل)

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز)

عالمِ انسانیت کے موجودہ حالات سے یہ بے زاری، مستقبل کے متعلق یہ تشویش اور تہذیبِ حاضر اور اس کے تمام اداروں اور ...
... یہ ساری باتیں قنوطیت یا کلبیت کے اشارے نہیں اور نہ ایسی بات ہے کہ اقبال جدید سائنس کے تمام انکشافات ...
... کے منکر ہیں، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جدید علوم سے انسانیت کے جو امکانات روشن ہوئے ہیں اور انسانی ارتقا کی جو امیدیں ابھری ہیں ان کا
... اس قدر کامیاب اور زیادہ شاندار طریقے پر دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کیا، حقیقت تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر اقبال عصرِ حاضر کے وہ یکتا شاعر
ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے تہلکہ خیز اور حیات درشت افکار و علوم کو اپنے کلام میں اس درجہ جذب کر لیا (یہاں تک کہ ان کی حقائق سے
... اصطلاحات تراشیں) کہ وہ جزو شاعری ہو گئے، سائنسی، سیاسی، معاشی الفاظ کو انھوں نے اپنے آہنگ میں سمو لیا اور سائل و نفس پر اس
... شدت سے گفتگو کی کہ وہ بیان کی شاعری کے تار و پود ہو گئے۔ بعض وقت تو ان کے فکر و گفتار کی شوخیاں اس نقطے کی طرف پرواز کرتی
ہیں جس پر پہنچ کر فطرت کی جناب میں گستاخیوں کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ بلکہ بہت سارے اشعار تو فطرت کو للکارتے نظر آتے ہیں اور
... اس کو فطرت کی خیرہ سری کا انداز نہیں رکھتی اس میں ایک ولولے ساز کا تیور ہے، شاعر اپنے دور کے انسانی کمالات کے تصور میں
... آتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر کے لیے وہ ان کمزوریوں کو بھول گیا ہو جن کا نہایت بھیانک نقشہ وہ بارہا پیش
... ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

"روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"

لیکن یہ سارا نشاط و انبساط محض برائے نشاط و انبساط نہیں ہے اور اس رجائیت کا سرچشمہ محض دانشِ حاضر کی سطحی تابانیاں نہیں۔
... مستقبل کے متعلق تشویش اور اس کے امکانات کی توقع، اقبال کی انسان دوستی کے ان دونوں پہلوؤں کو جس نے یہ دکھانے

سکتا ہے [illegible] کہ ان کی اہمیت کس طرح تہذیبی اور روشنی کے درمیان تمیز اور توازن کر سکتے ہیں اور یہ کہ ان کی شخصیت ایسی
حقیقت [illegible] ہے۔ وہ جدید انسان کو کم نظروں کے ساتھ ساتھ اس کی قوتوں سے بھی واقف [illegible] کر [illegible]
قوانین [illegible] سے بچنا [illegible] سکتے ہو۔ تاریخ کے طویل ادوار میں وہ ایک [illegible] ہے۔ [illegible]
جدید علوم نے جو طاقتیں انسان کے ہاتھوں میں دے دی ہیں وہ بہت ہی خطرناک ہیں۔ ان کے [illegible] میں بڑی چیزیں اور ذرا
سی ایک ذرا سی چوک روئے زمین پر آدمیت کا خاتمہ کر دے سکتی ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اقبال کے تصورِ انسانیت کی یہ جامعیت اور ان کے کلام کی شمولیت و ہمہ گیریت حاصل [illegible] ہے ان کے اس نظریۂ حیات اور اجتماعی نصب العین کا جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اقبال نہ صرف یہ کہ ایک صاحبِ پیام مفکر [illegible] بلکہ وہ ایک اسلامی شاعر بھی ہیں یعنی ان کا فلسفہ [illegible] کتاب [illegible] اور [illegible] کا اثر نہیں۔ اس کے [illegible] ہے اقبال نے اپنے وقت کے فلسفوں پر جو تنقید کی ہے اور [illegible] کے متاثر [illegible] پیش کیا ہے وہ اسی اسلامی موقف کا نتیجہ ہے۔ اسلام [illegible] انسان [illegible] کے درمیان [illegible] فطری معقول اور مکمل طریقہ بتایا ہے۔ ان کے نزدیک جدید انسان علم و عقل [illegible] کے باوجود جس درجہ پریشان اور [illegible] ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ فطرت اور طریقِ حکمت سے [illegible] ہٹ گیا ہے۔ اور اگر آج بھی وہ اپنے عقل و علمی کمالات کی باگ اسلام کے ہاتھ میں دے دے تو عقل و علم کی [illegible] اور [illegible] ختم ہو جائیں اور ان کی جگہ [illegible] برکتیں اور رحمتیں دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیں۔ حاصل یہ [illegible] مقام [illegible] ہے جہاں پہنچ کر اقبال [illegible] ہو جاتے ہیں کہ بار بار خالقِ آدم سے مخاطب ہو کر [illegible] شکوہ سنج ہوتے ہیں [illegible] یہی وہ مقامِ عشق ہے جس میں اقبال کا دردِ انسانیت ان کی [illegible] اور [illegible] مشکل ہوتی ہیں اور انسان [illegible] کہ اس کی [illegible] پر پہنچ جاتی ہے اور اس میں [illegible] گہرائیاں اور پہنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کا تصور بھی [illegible] انسان پرستی [illegible] انسان پرستی [illegible] خدا کی [illegible] ہمیشہ پستیوں کی طرف جاتا ہے اور یہ ہمیشہ [illegible] قوم [illegible] وطن اور نسل، اور خود اپنی ذات کی تنگ حدود ہی میں [illegible] کر

ؔ وہ بنیادی طور پر انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی اخلاقی حیثیت سے بھی واقف ہیں۔

اس لیے کہ اس انسان پرستی کا کوئی ٹھوس معیار اور کوئی واضح موقف اور کوئی معین اصول نہیں ہوتا، یہ ایک سیال کی طرح موقع
کے اعتبار سے کبھی ذات، کبھی قوم اور کبھی وطن کے مختلف ظروف میں ڈھلتی رہتی ہے، اس کے برخلاف خدا پرست انسان
دین اور ایک شریعت کی ٹھوس بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اگر وہ دین اور شریعت آفاقی ہے، جیسا کہ اسلام ہے، تو اس پر مبنی
دوستی بھی آفاقی ہے، یعنی یہ شریعت دین انسان دوستی واضح طور پر چند معین قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک عالمی اخوت کا قیام عمل میں لاتی
ایسی مضبوط اور مستحکم اخوت جس کے سامنے رنگ و نسل اور زمین و زر کی ساری حدیں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں، یہ اخوت کسی بھی حالت میں
انسانیت پرستی کو نہ تو مذہبی و سیاسی فرقوں اور جماعتوں میں بانٹتی ہے اور نہ نسلی و معاشی قبیلوں اور طبقوں میں تقسیم کرتی ہے، یہ
پورے معنے میں عام انسانی حریت اور مساوات کو بروئے کار لاتی ہے اور قانون قدرت کے مطابق انسانی معاشرے میں عزت و
صرف ایک معیار قائم کرتی ہے، یعنی حسن عمل، ایسے انسانی معاشرے میں ہر فرد صرف اپنے ذاتی کردار کی بنا پر پست یا بلند
: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اقبال اسی معنے میں انسان دوست تھے، انسان پرست نہیں تھے، اور اسی
میں وہ ایک آفاقی شاعر تھے، نہ کہ وطنی و قومی شاعر اور یہی انسانی آفاقیت اقبال کی شاعری کا مشن اور پیغام تھا۔ اس مشن کو
عمل ہونے کے لیے اقبال کے ذہن میں ایک پورا نقشہ، ٹھوس اور عملی نقشہ، مرتب تھا، وہ ایک تدریج کے ساتھ سب سے پہلے
پھر مشرق اور پھر پوری دنیا کو مخاطب کرتے ہیں، یہاں تک کہ وطنیت کے مخالف ہونے کے باوجود وہ اس تدریجی نقشۂ عمل
نمایاں مقام اپنے وطن ہندوستان کو بھی دیتے ہیں، اس لیے کہ اپنے دور کے مشرق میں وہ غیر منقسم برصغیر ہندوستان کو ایک
مقام پر فائز دیکھتے ہیں۔

"روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"

آدم کو ثبات کی طلب ہے   دستورِ حیات کی طلب ہے

دین مسلکِ زندگی کی تقویم   دین سرِ محمد و براہیم

—— (ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام)

نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی   بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

——

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں   کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

—— (شب معراج)

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات   مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

—— (احکامِ الٰہی)

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا   میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

——

تجھے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے خداوندا! خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی، استغفر اللہ! یہ دردِ سر نہیں، دردِ جگر ہے

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہی ہے اقبال کی انسان دوستی کا وہ اہم رخ جہاں سے وہ تمام عالمِ انسانیت پر ایک وسیع نگاہ ڈالتے ہیں اور خالص انسانی و اخلاقی سطح پر فروغِ دوام کے لیے چند اصول و عقاید اور ضابطہ تجویز کرتے ہیں جن کو مان کر انسان خلافتِ ارضی کے اس مقام کا اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکتا ہے جس سے اونچے کسی مقام کا تصور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ اس مقامِ بلند پر فائز ہونے کے لیے اقبال نے مردِ کامل کا ایک آئیڈیل پیش کیا ہے جس کو اپنے کلام میں انھوں نے بیشتر "مومن" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور اس مومن کی صفات و خصوصیات انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ دراصل یہی انسانِ مومن اقبال کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے اور خدا کے بعد یہی وہ ذات ہے جس کی ستائش میں شاعر نے اپنے دل کا پورا سرمایہ صرف کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس ذات کا مثالی نمونہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ان کے اصحاب اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد رجال و اشخاص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک مومن کسی نسل، قوم یا کسی خاص فرد کا نام نہیں، بلکہ سر تا سر ایک مسلمہ مثالی شخصیت ہے، جس کے چند عام اوصاف ہیں، جس شخص کا بھی جی چاہے وہ ان اوصاف کا اتباع کر کے مردِ مومن بننے کی کوشش

بنتا ہے۔ اس طرح کی شخصیت ہر دور اور ہر مقام کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے، اور یہی شخصیت انسانیت کا نقطۂ کمال ہے، ان انسان نے جتنی بھی قوتیں عناصر کو عطا کی ہیں، وہ سب اسی کی ذات میں مرتکز ہوتی ہیں، چناں چہ یہی شخص روئے زمین پر خالق کے تخلیقی منصوبے کو بروئے کار لانے والا ہے اور اس طرح خالق کا مقصود ہے، اور یہی شخص عصرِ حاضر کا وہ مہدی و ناجی ہے جس کا اقبال کو انتظار رہا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(مردِ مسلمان)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(مومن)

دُنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(مہدی برحق)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

(کافر و مومن)

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

(تن بہ تقدیر)

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(مردِ مسلمان)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(مسجد قرطبہ)

اپنی انسانیت دوستی کا یہ مرکزی نقطہ قائم کرنے کے بعد اقبال نے اپنی ہمدردیاں پورے عالمِ انسانیت میں بکھیر دیں۔ بڑی وسیع نظری کے ساتھ انھوں نے جدید و قدیم، مشرق و مغرب، یہاں تک کہ اسلام اور غیر اسلام کے تمام اداروں اور اشخاص سے دل چسپی لی

ان کے افکار کو [illegible] پیش کیا، ان کے ادعات کو پرکھا، ان کی اقدار کو زیر بحث لا کے اپنے معیار کی روشنی میں ان کو پسند کیا اور پھر ان کو
قبول، یعنی عقلی اور ایمانیت کو مومن کی متاعِ گم شدہ سمجھ کر بلا امتیاز زد و قدح جہاں سے بھی ملے اٹھا لیا۔ اس میں نہ مسلم و کافر کی تخصیص
کی اور نہ مشرق و مغرب کی، بلکہ اسلام کے علاوہ قدیم مذاہب —— عیسائیت، ہندو دھرم، بدھ مت ——
اور جدید نظام ہائے فکر —— مثلاً جمہوریت اور روسی اشتراکیت —— سبھی کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا، ان کو اپنی چیز
سمجھا اور اپنا لیا، فلسفہ، ادب اور سائنس کی بے شمار شخصیتوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح اقبال نے اسلام کو ایک کھلا اور ایک
جوڑنے والی طاقت کے طور پر پیش کیا اور اس کو ایک نیوکلیس بنا کر اس کے گرد عالم کے تمام بکھرے ہوئے پاروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش
کی۔ اس کوشش کے چند اہم پہلوؤں کی طرف ہم ذیل میں مختصراً اشارہ کیے دیتے ہیں۔

اقبال دوسرے مذاہب کی مقدس شخصیتوں کا بے حد احترام اور تکریم کرتے ہیں بلکہ حقیقت منصفانہ انداز میں ان کے پیغام و
نصائح کو اس طرح پیش کرتے اور ان کی تحسین کرتے ہیں جیسے یہ پیغام اور نصائح ان کے دل کی آواز اور ان کے لیے جزو ایمان ہوں۔ گویا
اس طرح وہ اپنے قارئین کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان پیغام و نصائح کا اتباع بھی انہیں اسی طرح نجات کا رستہ دکھائے گا جس طرح
اقبال کا وہ محبوب پیغام ہے وہ اسلام کہتے ہیں۔ یہ واقعہ جہاں اقبال کی عام انسان دوستی اور رواداری کا ثبوت مہیا کرتا ہے وہیں ان
کی اصول پسندی کی بھی شہادت دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے پیش نظر کسی قوم اور فرقے کی مصلحت اندیشی
نہیں بلکہ ایک آفاقی نصب العین کا فروغ ہے اور وہ اس نصب العین سے موافق مواد کو جہاں بھی ملے، اختیار کر لینے کے لیے ہر
وقت آمادہ رہتے ہیں اور اس طرح ایک عالمی برادری کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں جس میں تعصب و تنگ نظری کی بجائے خلوص و صداقت کی بنا پر
ہوگی اور کسی کو دوسرے کے خلاف تعصب کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اسی اصول پسندی کی ایک علامت اقبال کی
کبھی وطن دوستی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے دلی تڑپ ہے۔ بعض سیاست دان اور بعض شاعر و ادیب تحریک پاکستان کے بعد اقبال کو
فقط ایک فرقے کا شاعر سمجھنے اور کہنے لگے ہیں حالانکہ کلام اقبال کی پوری اسکیم اور اسپرٹ اس مسلک کی زندہ تردید ہے۔ "رام"،
"گوتم"، "نانک" وغیرہ شخصیتوں کے متعلق اقبال نے جو خیالات کا اظہار کیا ہے اور "صدائے درد"، "تصویر درد" اور "شوالہ"
وغیرہ نظموں میں جو جذبات انہوں نے ظاہر کیے ہیں پھر ان کا عام اصولی موقف جو ان کی پختہ کار شاعری کا محور ہے یہ سارے حقائق مل
کر ایک ایسا وسیع انسانی نقطۂ نظر ثابت کرتے ہیں جس کا منبع یہ ہے کہ [illegible] تمام انسانوں سے یکساں ہے۔ اس میں غرض یہ ہے کہ وہ تمام ملت
کو ساری کائنات پر ایک اصول وحدت کی طرف بلاتے ہیں مگر اس اصول وحدت کو کہنے سے تفرقہ سمجھا جائے تو پھر اس طرح اصول اتحاد
میں سوچنے والوں کو مختلف شکلوں میں دیکھا گیا ہے۔

اقبال کی نہایت کوشش [illegible] کے ساتھ سمجھے انہیں تمام دنیا کے [illegible] سے محبت ہے [illegible] کو ہمیشہ
پر محبت رہنمائی ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب ایسا رونما ہو جو [illegible] کو اس کی حقیقی جگہ دلائے۔ اقبال انسانی شرف و
صداقت کے [illegible] قائل ہیں وہ [illegible] بلند ہیں اور [illegible] کو ایک نظر [illegible] لیکن ان کا کہنا [illegible]
تمام [illegible] کہ اقبال کے نزدیک [illegible] ہر فرد کی [illegible] انفرادی قدر و قیمت

جو سرمایہ داری کے ... پر منحصر ہے اور کہتے ہیں کہ وہ معاش کو بجائے اخلاق پر مبنی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اقبال کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرہ
اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو کہ مزدور کو بھی اپنی محنت کے مطابق ویسے ہی مواقع حاصل ہوں جیسے سرمایہ دار کو ہوں، دولت مواقع
... پیش کرنے والا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ... حد پر اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ مساوات اسی وقت ممکن ہے جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا
... اپنی آسائش حاصل کرنے کی اجازت نہ ہو، سرمایہ کو چند ہاتھوں میں جانے کی رخصت نہ ہو اور کم سے کم ضروریات ہر شخص کی بہ آسانی
پوری ہو سکتی ہوں یعنی بہ حیثیت مجموعی معاشی نظام انصاف پر مبنی ہو۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے اہم موضوعات میں ایک 'سرمایہ و محنت'
ہے۔ "خضر راہ" "فرمان خدا (فرشتوں کے نام)" وغیرہ مستقل نظمیں یا ان کے مستقل حصوں کے علاوہ بھی بے شمار مقامات پر متعدد
عنوانوں سے اقبال نے اس موضوع کو چھیڑا ہے۔

یہ معاملہ محض پس ماندہ عوام اور مزدوروں کا نہیں تھا، بلکہ پوری انسانیت ہی جس کے عذاب تھی، صرف سرمایہ دار مزدور کو
استحصال نہیں کر رہا تھا، بلکہ ہر انسان دوسرے انسان کو استحصال کرنے کی تاک میں تھا۔ ایک خدا کو چھوڑ کر انسان کی پیشانی بے شمار آستانوں پر
جھکی ہوئی تھی۔ انسان ہی انسان کا خدا بنا ہوا تھا۔ نتیجۃً انسانوں ہی کے درمیان ایک طبقہ اتنا بلند ہو گیا تھا کہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجا رہا تھا اور
دوسرا طبقہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کر رہا تھا۔ اقبال انسان کی اس تذلیل پر سخت مضطرب تھے، چنانچہ جہاں کہیں
انہیں اس تاریکی کے پردے کو پھاڑتی ہوئی کوئی بجلی کی کرن بھی نظر آ جاتی تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اقبال نے وسیع مطالعے اور راست
سامنے اور گہرے تجربے سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ دنیا کی کل اس لیے بگڑی ہوئی ہے کہ مغربی استعمار، فرنگی الحاد اور کلیسائی اخلاق دنیا
اجتماعیت پر مسلط ہو گیا ہے اور اپنی ہوس رانیوں اور جفاکاریوں سے تہذیب انسانی کے پورے سرمائے کو غارت کیے دے رہا ہے،
یعنی اقبال کے سامنے نقشہ یہ تھا کہ ایک طرف اہل کلیسا کا اقتدار پوری انسانیت پر ظلم کر رہا تھا اور دوسری طرف تمام بنی آدم مظلوم
تھے ـــــــ اس صورت حال میں روس کے افق سے اشتراکیت ابھری، اس نے ایک طرف کلیسا کی غارت گری کو چیلنج کیا، تو دوسری
طرف عام حریت اور مساوات انسانی کا دعویٰ کیا۔ اقبال چونکہ ایسی ایک تحریک کے منتظر تھے اور خود اپنی حدود میں ایک انقلاب کا راستہ ہموار
کر رہے تھے، انہوں نے نہایت پرجوش طریقے پر اور بڑی توقعات کے ساتھ اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ "کارل مارکس کی
آواز" "اشتراکیت" "فرمان خدا" "سرمایہ و محنت" (خضر راہ) "بلشویک روس" جیسی نظمیں لکھیں۔ یہاں تک کہ "جاوید نامہ" میں
جمال الدین افغانی سے ملت روسیہ کو ایک پیغام دلایا۔ لیکن اشتراکی روس کی دہریت اور مارکس کی تحریک الحاد نے اقبال کی تمام امیدوں پر
پانی پھیر دیا۔ یہاں تک کہ بنیادی طور پر انہیں مغربی جمہوریت اور مارکسی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہونے لگا۔ اقبال کی اشتراکیت سے
امید ترقی اور اس توقع کی شکست کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے، جاوید نامہ میں ملت روسیہ کے نام افغانی کا پیغام تو سراسر اسی
احساس شکست پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ "لینن خدا کے حضور میں" اشتراکیت کے کمزور پہلوؤں اور بنیادی نقص کا بھرپور جائزہ ہے
"ابلیس کی مجلس شوریٰ" بھی اسی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔

اقبال کے پیش نظر انسان کی دوستی و ہمدردی کا جو آئیڈیل تھا اس نے ان کی نگاہ میں اپنے وقت کی تمام اجتماعی قوتوں کو گرا دیا۔ وہ
... مغربی ... اور ... سے بیزار ہو گئے، تو دوسری طرف ملاؤں اور صوفیوں کو بھی انہوں نے ہدف تنقید بنایا تھا

ان مسئلوں کی روشنی میں مشرقی جماعتوں کی ذمہ داری تھی تو مغرب نے مشرق کو مرعوب بنا رکھا تھا، مشرقی اقوام مغرب سے مرعوب ہو کر اپنا راہ عمل بھول گئی تھیں
اور سیاسی اور روحانی بیماریوں سے نڈھال ہونے کے سبب سے انتشار کا شکار ہو چکی تھیں۔ اس طرح ایک کا آلہ کار اور دوسرا مظلوم تھا اور مسلمان جو دنیا
کو اپنے اپنے انداز میں اسلام کے اصل مقاصد سے غافل ہو گئے تھے اسلام کے انسانیت کی تعمیر کا جو مقصد تھا، وہ خود بھی گمراہ اور
غلام ہو گئے تھے، دوسروں کے لیے عملی اصلاح ان سے کیا ہو سکتی؟ لہٰذا اقبال عالم انسانیت کی اصلاح کے لیے فکر و نظر میں ایک نیا
اور ہمہ گیر انقلاب لانا چاہتے تھے، انھوں نے اس بات کی پوری وضاحت اپنے کلام میں کی ہے کہ وہ انسانی سماج کے تمام دائروں میں اسلام
اور اس کی کتاب قرآن کی بنیاد پر ایک کلی انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان اپنی غلط اندیشیوں اور بداعمالیوں کی بدولت جس جال
میں گرفتار ہو گیا ہے اس سے رہائی اسی وقت ممکن ہے جب تمدن کو خدا ناشناس اور لادینی مشرقی و مغربی علم برداروں سے چھین کر اسلام کے حقیقی نمائندوں
کے ہاتھ میں دے دیا جائے، تب ہی انسان کی آئندہ نسلوں کی بقا اور ترقی ممکن ہے۔ ورنہ انسانی تمدن کی گاڑی جس رخ پر جا رہی ہے وہ اسے
کسی تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی انسان دوستی کسی تعصب اور جذباتیت پر مبنی نہیں بلکہ یہ ایک خاص اصول اور فکر و
نصب العین سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں افراط و تفریط نہیں، کامل توازن اور اعتدال ہے۔ یہاں عقل کی بھی اہمیت ہے اور عشق کی بھی
یہاں جلال بھی اسی حقیقت کا ایک رخ ہے جس کا دوسرا رخ جمال ہے۔ یہاں لطافت اور صلابت دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی وہ توازن
ہے جو اقبال کے فلسفہ ترقی اور فلسفہ خودی کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ بعض ستم ظریفوں نے اقبال کے فلسفے کو نیٹشے کے تصورات سے
ماخوذ قرار دے کر اس میں فلسفہ جبر و قہر کے عناصر دریافت کیے ہیں، یہاں تک کہ اس کو فاشزم سے ملوث بھی کر دیا ہے۔ اس مغالطے کی
شروعات اقبال کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک وضاحتی خط، مکاتیب اقبال، میں موجود ہے، جس میں انھوں نے
متعدد الزامات کی پرزور تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ خودی کی ترتیب اس وقت کی تھی جب نیٹشے کے افکار کی خبر
بھی نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے کلام میں انھوں نے متعدد مقامات پر نیٹشے کی سخت تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں: بہ مذہب فرنگی
ہیں اور اپنی ایک غزل میں اس نظریہ پر تبصرہ یوں فرماتے ہیں کہ نیٹشے اپنے قلبی واردات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا اور اس لیے صحیح علم
کے دریافت کرنے کے باوجود صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔ اسی طرح اقبال کا تصور شاہین خود اس نظم سے آشکار ہے جو اس عنوان
سے "بال جبریل" میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی شاہین کی تصریحات کلام اقبال میں جا بجا ملتی ہیں، پھر مکاتیب اقبال میں ان کا وہ
مشہور خط ہے جس میں انھوں نے شاہین کی صفات ——— توکل، غیرت، حمیت، بے نیازی وغیرہ ——— گنائی ہیں اور
ان اوصاف کی بنا پر اس پرندے کے ساتھ اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ خودی اور شاہین کے متعلق اقبال کے تصورات کا اصل مرتبہ
یہ ہے کہ وہ نرمی کے ساتھ درشتی کو بھی انسانیت کا ایک ضروری عنصر قرار دیتے ہیں کیونکہ کائنات کی ترتیب جس نظام پر ہوئی ہے اور
فطرت کا جو اصول ہے، اس کی روشنی میں افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں رحمت و شفقت کے ساتھ قوت و طاقت کا وجود بھی ناگزیر ہے
ورنہ انسانیت عدم توازن کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ اقبال کی انسان دوستی میں عدم تشدد یا نرے عدم تشدد نام کی کوئی چیز نہیں، ان
کی نظر میں یہ چیز انسان کے حق میں نادان دوستی ہو گی، وہ اس چیز کو کمزوری اور بزدلی کی علامت سمجھتے ہیں اور سفلی اور دو

سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ ایک مکمل فرد اور معاشرے کے اندر سختی اور نرمی دونوں اوصاف برابر برابر موجود ہونے چاہئیں اور موقع کے مطابق ایک حدِ اعتدال میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے کا استعمال ہونا چاہیے، اور یہ کہ نرمی بھی اسی کی معتبر اور مفید ہے جو سختی کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن　　تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

——— (شعاعِ اُمید)

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید　　جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

——— (ہندی اسلام)

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار

——— (مستیٔ کردار)

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

——— (فلسفہ)

دُنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت　　ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

——— (مہدیٔ برحق)

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

———

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر　　یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

——— (اقوامِ مشرق)

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں　　پُرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

——— (شُعیبِ مشرق)

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ رُوح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

——— (مغربی تہذیب)

مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق　　عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

——— (عصرِ حاضر)

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی　　ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے

(حکیم نطشہ)

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　نرا نفس ہے اگر نغمہ نہ ہو آتش ناک

(جلال و جمال)

—

جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک　　اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(اشتراکیت)

—

جہانِ مغرب کے بت کدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں　　ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیّار کی نمائش

(کارل مارکس کی آواز)

—

یہ وحی دہریتِ روس پر ہوئی نازل　　کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

(بلشویک روس)

—

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی　　کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

(مشرق)

—

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری　　جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

(مشرق و مغرب)

—

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

—

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

—

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

—

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

—

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے　　وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

(صدائے درد)

—

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

(تصویرِ درد)

—

نامِ حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے　　اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

(خضرِ راہ)

—

بالاصل، اقبال کی انسان دوستی چند مبہم خواہشات اور آوارہ جذبات کا مظاہرہ نہیں، یہ ایک واضح مقصد اور معین اصول کا اظہار ہے، اس کا منتہا زندگی کے ایک نصب العین سے ہے۔ یقیناً اس کا محرک ایک فطری اور بے اختیار درد دل ہی ہوگا، مگر اس کا مقصود عالم انسانیت کی نشو و نما ہے۔ اقبال شاعر اور فن کار ضرور تھے اور پورے طور پر تھے لیکن وہ ایک باشعور اور حقیقت پسند فن کار اور شاعر تھے، اور فن شعر ان کے کلام کی ثانوی حیثیت ہے۔ یہ موضوع، موضوع ان کا انسان ہے، اپنی تمام عصری دستوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ، اقبال کے مطالعہ و فکر نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی انسان دوستی کے مبہم و رومانی تقاضے کو محض چند خوابوں اور نغموں میں تحلیل کر کے نہ اڑا دیں، بلکہ اسے ایک ٹھوس فکری و عملی شکل دیں، تاکہ فی الواقع انسان کی نجات اور فروغ کے امکانات پیدا ہوں۔ اقبال نے اپنے عہد کی انسانیت کے جو امراض تشخیص کیے، وہ بنیادی طور پر تین ہیں: بے یقینی، بے عملی، باہمی تنافر، اور ان امراض کا جو علاج انھوں نے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے: محکم یقین، پیہم عمل، باہمی محبت ——— اور یہ باتیں محض مجرد اور مبہم احساسات نہیں، بلکہ ایک معین اجتماعی نصب العین یعنی اسلام کے واضح اصول و اقدار ہیں۔ ——— اور یہ امراض اور ان کا علاج کسی خاص ملک یا امت کا وقتی و فروعی نہیں، بلکہ دراصل یہ انسان کی ان بنیادی و آفاقی کمزوریوں کا، جو تاریخ کے ہر دور میں شکلیں بدل بدل کر ابھرتی رہی ہیں اور وہ اساسی و آفاقی علاج ہے جو ابتداً انسانیت سے مختلف شکلوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

(ارتقا)

———

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی　　　علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

———

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا　　　بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

———

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

———

مذہب سے ہمارے نوجوانوں کی بے رخی

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

یورپ کے ایک صاحب دل ر۔ ڈبلیو۔ ٹرائن کا قول ہے:

"Religion, in true sense, is the most joyous thing the human soul can know. The real religion is an agent of peace, of joy and happiness. Let our places of worship grasp these truths and then such crowds will flock to them that their very walls will seem almost to burst."
(In tune with the Infinite P. 205.)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب ہے کیا چیز؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ [illegible] ایک بے [illegible] ہے جس سے ابد [illegible] جوش کا نام ایمان ہے۔ اس جوش کی تکمیل عمل کرتی ہے اور ایمان و عمل [illegible] مذہب کہلاتا ہے۔ مذہب [illegible] انقلاب پیدا کرتا [illegible] منزلوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ یہ کائنات ایک [illegible] ہے جس سے [illegible] کائنات کی تجلیاں [illegible] ہر چار سو پھیل رہی ہیں۔ جب [illegible] حجاب [illegible] جذب و شوق کی [illegible] ہیں۔ [illegible] ایک نیا [illegible] ہے۔ نظر میں [illegible] ہر منظر پیکر [illegible] ہو جاتی ہے اور اس عالم کیف و سرور کے سامنے زمان و مکان کی [illegible] حقیر معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حکیم مشرق نے فرمایا تھا:

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے، مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کہتے ہیں کہ [illegible] کائنات کی مختلف توانائیوں کے نام ہیں یعنی برق، [illegible]، روشنی، [illegible] وغیرہ، جن کا [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] کر دو نیم کر سکتی ہے۔ چنانچہ [illegible] ایک [illegible] سکتی ہے [illegible] حاصل ہوتی ہے [illegible] علم و عشق [illegible] ہو۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے   تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ درد آشنائے   چو جوئے در کنارِ کوہسارے

اہلِ مغرب کے پاس علم تو ہے لیکن عشق موجود نہیں، نتیجۃً ان کا طرزِ حیات کے لیے صنعت بنا ہوا ہے

ہمہ دور با شعلہ ہائے عمر جز ساعتی دیدہ ام

آنچناں زہرے کہ از وے ارہا در پیچ و تاب

انقلاب اے انقلاب

۱۵ جنوری سنہ ۶۱ء کو رہبرِ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان کی نیشنل اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور بالخصوص فرمایا:

"I believe that real fullness of life can be achieved only by bringing about a workable and effective balance and co-ordination between the forces of religion, philosophy and science. If the first two (religion and philosophy) fail to assert their full weight, the chances are that the uncontrolable monster of science will submerge mankind under stark materialism attended by complete moral and spiritual anarchy leading perhaps to total destruction. It is only religion, backed by a rational and pragmatic philosophy, that can save the world from such a harrowing destiny."

انسانی روح ایک پراسرار تخلیق ہے۔ جس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا پورا علم ہمیں آج تک نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ روح ایک لافانی عنصر ہے جو قیدِ زمان و مکان کو پسند نہیں کرتی۔ اگر ہمارے خواب و خور کی عارضی لذتیں ہی اصل ہیں تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عیش پسند جنہیں تمام مادی وسائل بخوبی حاصل ہیں لیکن ان کا رشتہ روح اور کیفیت سے منقطع ہے، یہی شے ہے جو انسان کو دنیا میں اضطراب کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ روح کا یہ سفر ابتدائے آفرینش سے شروع ہوا ہے جو لامتناہی، لامحدود اور دائمی ہے۔ روح دراصل ایک ایسا مسافر ہے جو اس خاکدان سے گزر کر منزل بہ منزل لافانی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے۔ اور:

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ   (نجم)

(تمہاری آخری منزل اللہ ہے)

یورپ کا ایک صاحبِ فکر کیا پتے کی بات کہتا ہے:

"The individual existence begins on the physical plane and then rises through successive gradations of ethereal and celestial spheres to a destiny of unspeakable granduer and glory."

واقعاً اس میں نیت کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے:

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا
اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝ (۸۴ : ۱۶–۱۹)

(شفق شام کی قسم، رات کی اور جو ستارے اس کی قسم جنھیں رات جمع کر لیتی ہے نیز چاند کی قسم جب وہ بدر کامل ہو جاتا ہے کہ تم زینہ بزینہ منزل بہ منزل اوپر کو چڑھو گے۔)

ان آیات میں کسی غیبی طاقت سے ملنے کا ہم ارادہ ہے۔ [illegible] ایک پہلو یہی قوت سیاب میں منعکس ہو [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] کی آیات [illegible] کے قریب پہنچا دیا تھا۔ [illegible] کو نظام شمسی کی حرکات کا حیرت انگیز مطالعہ کیا تھا اور اس میں وقت، جنت، دوزخ کی [illegible] تک پہنچ کر اس غیبی طاقت کو تھام لیتے ہیں۔ [illegible] کی جو حکمت کرلیتے ہیں وہاں تک پہنچنے کی [illegible] قسم بھی [illegible] انھیں [illegible]

بقول ڈاکٹر [illegible]:

"By yielding to Nature we can conquer it" (The projection of the Astral self.)

کیونکہ [illegible] قوت ہے کہ بقول اقبال:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

[illegible] نے کافر لوگوں کے [illegible] ہیبت سے [illegible] تمہاری فوج سے ان کی تعداد [illegible] بہت زیادہ ہے۔ [illegible] پر فتح کا حکم دے دیا:

[illegible] ۝

کیونکہ ہم ان پر قدرتی طور سے غالب ہیں [illegible] قوت سے انھیں شکست دے سکیں گے۔

اس قوت کا ایک مظاہرہ [illegible] ہمارے صدر [illegible] کی بعض حرکات سے [illegible]۔ قوم [illegible] کے [illegible] ہیبت سے [illegible] اس کا اثر دیکھیے کہ ہمارے صدر کی [illegible] نے کہا:

"Ayub was like a tiger in a village and no body knew where he would strike next."

[illegible] کشمیر کا [illegible] امریکہ کی مدد سے حل ہوگا اور [illegible] کی مداخلت سے [illegible] فیصلہ [illegible]

اس قوت سے ہوگا جو بندۂ مومن کے ہاتھ میں ہوگی۔ ایران اور روم کی عجیب قوت کو عربوں کی تلوار نے نہیں، بلکہ ان کے ایمان نے شکست دی تھی۔ ہندوستان کی وسعتیں مٹھی بھر مسلمانوں کی بے پناہ قوت سے مسخر ہو گئے تھے، ان کو شاہین چیتے کے سامنے ہندوستان کے کبوتر کبھی نہیں ٹھہر سکے۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری (اقبال)

پاکستان عالمِ اسلام کی سب سے بڑی سلطنت ہے، جو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کی تھی اور دنیا نے ... بار بار اعلان کیا تھا کہ ہم عہدِ حاضر کی سطح پر اسلامی نظریات کو اس رنگ میں پیش کریں گے کہ دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور کیپٹلزم، کمیونزم اور دیگر ازموں سے ... انسانیت ہم سے فکر و ہدایت کی طالب ہوگی۔ اس حسین خواب کے پورا ہونے کی صورت ابھی تک یہ ہے کہ ہم خود ... ہوتے، ... میں جذب و شوق کی قندیلیں جلتے، کائنات پر غلبہ کی کمند پھینکتے اور عشق کے پر لگا کر رب کائنات تک پہنچتے۔ لیکن افسوس کہ ہم ... دنیا داری میں مشغول ہو گئے۔ کاروبارِ حکومت کی ایک خاص تعداد اور ثروت ہی ڈوب گئی۔ ہمارے افراد بے ... اور ... کے فتنے کا شکار ہو گئے اور ہمارے نوجوان طبقہ یعنی ہمارے کل کے رہنما، الحاد و عیش کوشی، جس کی بدترین صورت ... ہے، کی طرف نکل گئے۔

یوں تو معاشرہ کا کوئی حصہ بگڑ جائے تو قومی ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ لیکن نوجوانوں کا بگاڑ قوم کی ہستی ہی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اس لیے ہمارے مفکرین کا فرض ہے کہ وہ ان کی گمراہی کے اسباب کا سراغ لگائیں اور علاج بتائیں۔ میری ناقص رائے میں چند اسباب یہ ہیں:

اوّل: ہمارے نظامِ تعلیم میں تہذیب و اصلاحِ نفس کا کوئی شعبہ موجود نہیں۔ مکاتب ابتدائی جماعتوں میں چند فقہی مسائل بتلانے اور ارکانِ اسلام گنوانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیکن نوجوان کے دماغ میں اسلامی اقدار کا نقش راسخ کرنے، اللہ کی محبت پیدا کرنے اور تمام نظام ہائے حیات میں سے اسلام کو برتر و بلند تر ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ اوّل تا آخر نصابِ تعلیم میں کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی، جو ہمارے اسلاف کے علمی، سیاسی اور ثقافتی کارناموں پر روشنی ڈالے۔ ان کے ایثار و تسلیم، ناز و نیاز اور ذوق و شوق کی داستانیں سنائے، دنیائے غیب و شہود میں تعلق قائم کرے اور ہمارے ماضی، حال و استقبال کو جوڑے۔ انسان ایک صاحبِ عقل مخلوق ہے۔ جو فلسفیانہ دلائل ہی سے قابو میں آتا ہے۔ دنیائے اسلام میں ایسے سینکڑوں فلسفی و مفکر تھے اور کچھ اب بھی موجود ہیں، جنھوں نے تربیت ... میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، مثلاً رومی، غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ، جلال الدین دوانی، خواجہ میر درد، فرید و جیلی، علامہ اقبال وغیرہ۔ جب تک ان حضرات کے فلسفے کو داخلِ نصاب نہیں

بنایا جائے تو خود بخود ہماری ذہنی اور دینی ترقی ہو جائے گی۔ مگر ایک بات یاد رکھئے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو دنیا کے سوچنے کا انداز بدل سکتے ہیں تو زمانہ طالب علمی کے دور ہی سے چند ایک غیر ملکی شعرا کے ساتھ اپنے ادب تک پہنچنے کا انتظام کریں تو نتائج بہت خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

اس وقت ہمارے ہاں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ صرف معاش کی حد تک محدود ہے۔ جس سے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی تخلیقی قوت اور ہمت میں اضافہ نہیں ہوتا کہ انسان ہر دور میں کا طالب ہے انسان کے تقاضے جسمانی ضروریات سے جدا ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم مادی ضروریات سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اب ہمارے ادب کا یہ فرض ہے کہ حقیقی عظمت و توانائی کا شعور پیدا کرے۔ ہمارا ادب بے شمار شعراء اور نثر نگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ایک بھی صاحب طرز پیدا نہ ہوا۔ جیسا کہ حکیم مشرقؒ نے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

ہماری تاریخ کا باب روشن ہے جنہوں نے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے دلوں پر حکومت کی۔ آج برصغیر ہند و پاک میں ہزاروں مزار موجود ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ تقریباً ان سب بزرگوں کا تعلق ہے حضرت خواجہ اجمیری، نظام الدین اولیاء، داتا گنج بخش، فرید الدین گنج شکر اور دیگر اولیا [illegible] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جو شہروں میں اس وقت [illegible] پانچ اور دس [illegible] پھرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کے ادوار میں بڑے بڑے ادیب پیدا نہیں کر سکتے۔ اور ہم وقت کے ساتھ [illegible] لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے دور میں علم و ادب کے چراغ روشن تھے اور پھر روشنی ادب کے سینوں میں منتقل ہو سکی۔ ہماری قوم میں ایک ہی حقیقت بار بار [illegible] ہوتی ہے کہ ادب ساز حیات ہے اور اگر یہ چیز نہیں تو پھر:

ع : مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

دوم : قوم و ملک کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہمارے رسالوں میں ہماری ثقافت اور تہذیب کا عنصر نہیں بلکہ مغرب کی طرف یورپ کے بعد اثر کا یہ سبب ہے ہماری اخلاقی اور روحانی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کے یورپ کا مذہب عیاشی اور پیشہ ورانہ رسائی ہے۔ اس کے اہل قلم سے بلند اور پاکیزہ ادب کی توقع کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے رسالوں میں ان کا اثر پورا ہو رہا ہے اور ہم ان سے بھٹک جاتے ہیں۔

اخلاقی ادب کا حصہ تاریخ ہمارے لیے خصوصیت سے اہم ہے۔ وہ لوگ ہمارے بادشاہوں کو عیاش، ہمارے اولیاء کو مکار اور عیار ثابت اور ہمارے فلسفہ کو کمتر بتاتے اور لکھتے ہیں۔ اسلام کو عیاشوں اور رہزنوں کا مذہب قرار دیتے ہیں اور ہمارے نوجوان کا ساتھ اپنی تاریخ سے ہٹ گیا ہے۔ ہماری اخبارات میں شائع سیرت نبی تو شاید ہی کہیں نظر آئے لیکن ولیم ہیٹ وغیرہ ہمارے سامنے ادبی ... کے نام سے ان کی تحریریں ہر جگہ ملیں گی۔ اس وقت پیش کئے ہوئے جملے آگے جو کچھ مت کہو۔ ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ ٹائم اور ریڈرز ڈائجسٹ ہیں۔ یہ رسائل ہماری ثقافت و تہذیب ہمارے

وطن اور ہمارے اسلاف پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔ اور ہمارے نوجوان انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں

منسلہ خواتا فضائل واقع ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مدرسہ یا کالج اساتذہ اور اس کے بعد لیڈروں کی نقل کرتا ہے۔ جو والدین خود انگریز مغرب پرست اور خدائی بیزار ستم پرستار بند ہوں۔ ان کے بچے عموماً انہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ استاد کی زندگی سے بھی شاگرد گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اکثر مدارس بالخصوص مدارسہ جن کی آمدنی ایک ہزار ماہانہ سے بڑھ جاتی ہے ان کے بیشتر اساتذہ اسلامی انداز فکر و نظر سے دور ہیں۔ جذب و شوق کی مستیاں تو رہیں ایک طرف اب قدوس کے سامنے ایک سجدہ تک ان پر گراں گزرتا ہے۔ ایسے والدین و اساتذہ سے متاثر ہونے والے بچے کیا خاک نمازی ہوں گے اور کیا ہوں۔ جب شام کے وقت کسی تفریح گاہ میں کوئی جوڑا ایک خوبصورت کار سے نکل کر کسی ہوٹل یا سینما کا رخ کرتا ہے تو بعض دیکھنے والے کہتے ہیں: "یہ ہے زندگی" اور اس سچی زندگی تک پہنچنے کے لیے وہ ہر قسم کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہی جوڑا کار سے نکل کر پارک میں جائے نماز بچھاتا اور کئی آنکھوں کے سامنے نماز عصر یا مغرب ادا کرتا تو اس کے نتائج کچھ ہی اور ہوتے اور خوشگوار ہوتے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبال)

سوم: نوجوانوں کی بے راہ روی کا ایک سبب ہمارا سینما ہے۔ جہاں ناجائز معاشقہ، دنگہ فساد، چوری چکاری اور رشوت ستانی کے انوکھے طریقے سکھائے جاتے ہیں، اور عریاں رقص و نغمہ سے حیوانی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جاتا ہے۔ فلم تعلیم و تدریس کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو فلمیں ہماری تہذیب، روایات اور اقدار کی آئینہ دار نہ ہوں انھیں ممنوع قرار دیا جائے۔ اگر ہمارے پونے نو کروڑ دیہاتی سینما کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو ہم شہری بھی ان بدآموز فلموں کے بغیر جی لیں گے۔

بالآخر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ نوجوانوں کو راہ راست پر رکھنے اور ثابت قدم رکھنے کی ذمہ داری والدین، اساتذہ، ارباب تعلیم، علماء، ڈاکٹروں، جرنلسٹوں، علما، شعرا، ادبا سب پر عاید ہوتی ہے اور اس کا راستہ صرف ایک ہے کہ ان کا رابطہ اللہ سے قائم کیجیے۔ ان کے تاریک سینوں میں ایمان کی شمعیں جلائیے۔ انھیں عظیم بنانے کے لیے ان کے سر رب عظیم کے سامنے جھکائیے اور انھیں علم و عرفان کے ایسے مینار بنا دیجیے کہ ان کی روشنی سے شاہراہ حیات جگمگا اٹھے۔ اور ہر چار سو سے بہتر انسانیت کی تکمیل اسلام کے وسیع اور روشن نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہمارے قائد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی دور رس نگاہ بھی پوری ہو گی جو صدر ایوب کی کتاب کے صفحے میں جاگزیں ہے اور جس کا اظہار گزشتہ عید میلاد النبی کی تقریب پر آپ نے یوں فرمایا تھا:

"Dear Countrymen!

.........The secret of real progress is that we should comprehend the basic principles of Islam, hold fast to them and under the search-light of the past discover fresh avenues for their application in the present

and the future. If we fail to do this, there is no doubt that Islam will certainly live but the Muslims as such will probably languish away. ....Our Country was founded in the name of Islam and it can subsist only on this name. There is no other basis for our national cohesion and solidarity except Islam. This basis cannot be sustained by vociferous professions of our idealism alone. We must translate our idealism into action for our sheer survival. The greater the harmony between our faith and practice, the greater will be the strength of Pakistan......... unless we rise to the occasion and make an honest search to discover صراط مستقیم, I am afraid, our spiritual, moral, material and national existence will be seriously imperilled."

(Pakistan Times 26/5/61)

آئیے! حکیم مشرق کے الفاظ میں سب بار بار دعا کریں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے   پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے   مرا نورِ بصیرت عام کر دے

فنِ تحقیق

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ہماری بہت سی تاریخی کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے شروع کی جاتی تھیں۔ یعنی حمد و نعت کے بعد، انبیاء علیہم السلام کے مختصر حالات لکھا کرتے تھے۔ پھر تمام خلفائے اسلام اور مختلف سلاطین کا تذکرہ ہوتا تھا اور جب مؤرخ اچھی طرح تھک کر چور ہو جاتا تو وہ لشتم پشتم اپنے زمانے کے حالات تک پہنچتا تھا۔ ایسی حالت میں، ظاہر ہے کہ وہ اپنے معاصرین کا سرسری جائزہ ہی لے سکتا تھا اور اہم پہلو ہمیشہ کے لیے رہ جاتا تھا۔ قریب قریب یہی انداز آج کل کے اکثر تحقیقی مقالات کا ہوتا ہے جن میں اصل موضوع سے متعلق بہت کم مواد ہوتا ہے اور غیر ضروری مباحث کے لیے کوئی ایک دو نہیں، بلکہ متعدد ابواب لکھا کرتے ہیں اور غیر متعلق اقتباسات سے مقالات کا حجم بڑھایا جاتا ہے۔ بعض مقالات ایسے لکھے گئے ہیں کہ ان میں نثر و نظم کی پوری داستان تو موجود ہے لیکن موضوع سے متعلق صفحات بہت کم ہیں۔ گویا وہ اپنی وسعت اور پہنائی میں داستانِ امیر حمزہ ہیں لیکن تحقیق اور جانچ پڑتال سے ان کا بہت کم واسطہ ہے۔ ایسی سرسری 'تحقیق' عام ہے۔ اسی طرح ہماری تنقید بھی سرسری اور ہوائی ہوا کرتی ہے یعنی تنقید کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلے کتاب کے موضوع سے متعلق چند جملے تمہید میں لکھے جاتے ہیں، پھر کتاب کے ابواب کی تفصیل دے دی جاتی ہے۔ اور اگر زیادہ کرم فرمایا تو یہ بھی کہہ دیا کہ فلاں باب زیادہ اچھا یا زیادہ کمزور ہے۔ پھر اس کتاب کی چند موٹی موٹی خوبیاں یا خامیاں جو سرسری مطالعے ہی سے نظر آتی ہیں، بیان کردی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ خوبیوں کا مختصر تذکرہ کر کے خامیوں کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:

> "امید ہے کہ یہ خامیاں آئندہ ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی، نیز یہ کہ کتاب بہر حال اچھی ہے اور مصنف کے حسنِ ذوق کی شاہد ہے۔"

ہمارے ہاں تنقید کا عام انداز یہی ہے۔ اسی طرح بعض تنقید نگار جب کسی "فرمائشی" تنقید کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں تو اُن کی ایسی تنقید محض تعریف کی طرح انشاء کے گورکھ دھندے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریزی کے ایک "اردو" نقاد ایک مرتبہ ایک صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "وہ نظم و نثر دونوں میں کافی (یعنی ناکافی نہیں) شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کا انشا پردازی کی طرز نگارش بہت نمایاں ہے اور ان کے طرز میں ایک انفرادیت ہے جو اُن کی دل کشی بڑھاتی ہے"

---

* یہ توسیعی لیکچر سندھ یونیورسٹی میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کل پاکستان اردو تہذیبی کانفرنس منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۷۰ء میں اجلاس پیش کیا گیا تھا۔

> کیا گیا ہے۔ انھوں نے شاعری کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دی ہے اور زیادہ تر ان کا شمار شاعروں میں ہوتا ہے۔ قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا رنگ لا چکے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے یہاں نئے تاثرات کا وجود ہے۔ ۔۔۔ سے زیادہ ان کی شاعری میں لطافت نمایاں ہے اور ان کا احساس ۔۔۔ ان کی شاعری کو خصوصیت سے پر اثر بناتا ہے۔۔۔۔ اردو ادب پر ان کے اہم احسانات ہیں۔[۱]

یہ ایک طرح مشق یکمہ وقت ہے۔ "زیر مشق" نقاد نے ایک ادیب اور پرنس دونوں کو خوش کرنے کے لیے تنقید لکھی ہے جو شاید پہلے بہت کمی کھائی دی ہی پیمانہ رکھی گئی تھی اور ۔۔۔ تھی جہاں ۔۔۔ "رماز ترکیتم" ——— اس کا تنقید اور تحقیق کے ذکر سے مقصد صرف یہ ہے کہ ۔۔۔ کہاں ہیں۔

تحقیق بظاہر ۔۔۔ تنقید سے ۔۔۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال" کے سلسلے میں صحیح لکھا ہے کہ

> "تاریخی تنقید میں ۔۔۔ ادب کے احوال کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر تاریخ ہی کی طرح بیان کیا جاتا ہے اور یہ انداز سائنٹفک تنقید کا ۔۔۔ تنقید میں ادب کی پہچان عقل اور تجربے کے معیار سے ہوا کرتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں بھی شخصی ذوق اور انفرادی تجربہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس کی راہیں ایسے ۔۔۔ تعلقات کی ہو جاتی ہیں جہاں اجتماعی پیمانہ اپنا عمل دخل ہوتا ہے۔ بہرحال تنقید جس طرح کی ہو، تاریخ، عقلیات، اجتماعیات اور نفسیات سے قریب تر ہونا پڑتا ہے اور جب تنقید کے یہ رشتے قائم ہو جاتے ہیں تو پھر تحقیق اور تنقید کے درمیان بہ مشکل تفریق رہ جاتی ہے۔"[۲]

اس بات کے ساتھ ہی دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کیا کچھ کر لیا ہے اور اس مقصد کے لیے اب کیا کرنا ضروری ہے۔

اسلامی طرز تحقیق

قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے علم حدیث کے بارے میں روایت اور درایت کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں ان پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے مروجہ اعتماد کا عالم یہ تھا کہ ۔۔۔ بہت بڑی چیز ہے۔ وہ عام شعرا اور سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پاس مستند روایت ۔۔۔ کہ جس کے ساتھ روایت ہو ۔۔۔ وہ واقعہ بیان کیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو ۔۔۔ تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ کس مذہب کے تھے؟ ۔۔۔ عالم تھے یا جاہل؟ ۔۔۔

۱۔ رسالہ "نگار" – حیدرآباد – جولائی ۱۹۶۵ء

۲۔ رسالہ "اردو نامہ" کراچی – اپریل تا جون ۱۹۶۱ء

تمام جزئی باتوں کا پتا لگانا بے حد مشکل تھا لیکن ہزاروں محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا گیا جس کی بدولت کم از کم ایک لاکھ شخصیتوں کے صحیح حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، فسق، بدعت، شقاوت کی خاصیت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے بے تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود قرار دیا ہے۔ مرفوع، موقوف، قولی، فعلی، تقریری، نیز آحاد، متواتر، مشہور، عزیز، غریب۔ اسی طرح صحیح، حسن اور مقبول، مردود وغیرہ کتنے اقسام حدیث ہیں جن کی تقسیم خود اپنی جگہ اس امر کی شاہد ہے کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری تھی اور ان کا معیارِ تحقیق کس قدر بلند تھا۔ فنِ روایت کے بعد درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی ایک حدیث کے تمام راوی (شروع سے آخر تک) ثقہ اور مستند تو موجود ہیں لیکن ممکن ہے کہ متنِ روایت میں کوئی خامی موجود ہو۔ چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی جائے گی۔ محدثین نے درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کو پرکھنے کے لیے یہ اصول قائم کیے ہیں۔

۱۔ واقعہ مذکورہ کیا اصولِ عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا عام میلان کیا واقعے کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ اگر واقعہ کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ واقعے کے متعلق راوی کے قیاس اور رائے کو کہاں تک دخل حاصل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعے کو جس طریقے سے ظاہر کیا ہے وہ واقعے کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس واقعے کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا۔ اور اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ نہیں لے سکا؟

۶۔ اس امر کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے واقعے میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا وہ حدیث قولی ہے جو کچھ خود کیا ہے وہ حدیث فعلی ہے اور جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا تو وہ حدیث تقریری ہے۔ جس حدیث کو ہر زمانے میں بکثرت لوگوں نے روایت کیا ہو کہ احتمالِ کذب نہ رہا ہو، اسے متواتر کہتے ہیں اور آحاد وہ ہیں جن کی روایت میں اتنی کثرت نہ ہو۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ مشہور جس کو ہر زمانے میں تین یا زائد راویوں نے روایت کیا ہو۔ ۲۔ عزیز جس کو ہر زمانے میں دو دو راویوں نے روایت کیا ہو اور ۳۔ غریب جس کو کسی زمانے میں ایک ہی راوی نے روایت کیا ہو۔ آحاد کی وہ روایت جس کے راوی کی سچائی مسلم ہو وہ مقبول کہلاتی ہے ورنہ مردود۔ پھر آحاد مقبول میں سے وہ حدیث جس کو ہر زمانہ کے خوب یاد رکھنے والوں نے ہر زمانے میں روایت کیا ہو اور اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور معتبر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو صحیح کہتے ہیں۔ اگر ایسی آحاد مقبول جس کے راویوں کا حافظہ کم ہو تو اسے حسن کہتے ہیں۔ یہ بھی سمجھنا ہے کہ مرفوع وہ حدیث ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو۔ اور موقوف وہ حدیث ہے جو کسی صحابی کا قول یا فعل ہو۔

۱۔ [illegible] محدثین نے بھی سیرۃ النبی اور الفاروق کے متعدد [illegible] روایت کے [illegible] اصول کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ کوئی حدیث اگر عقل [illegible] [illegible]

سیرت نبوی حتیٰ کہ [illegible] کے یہ اصول اس قدر اہم ہیں کہ ان کو صداقت اور دیانت کا اچھا خاصا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تیسری صدی کے محدثین نے بہت سی روایات سے مانند بنا دیے ہیں جو کہ روایات کتب احادیث میں منقول ہیں سب کی سب مستند و معتبر ہیں۔ چنانچہ محدثین نے بیان فرمایا کہ جب کسی راوی اور روایت کو پرکھا جاتا ہے تو اس کے معاصر راویوں کے بیانات سے بھی اس روایت کی جانچ نہیں کی۔ امام وکیع کا مشہور مقولہ ہے کہ جب ایک محدث روایت کرتے ہیں تو ان کی تائید کسی دوسرے راوی کی روایت سے ہو [illegible] کے علاوہ [illegible] تھے۔[1] عربی زبان کا واقعہ ہے کہ ۴۴ھ میں امام مسلم بن حجاج نے حدیث کا اندازہ کیا تو ان کے حافظے سے مشہور ہو چکے تھے [illegible]۔ یہ حالات دیر تک ایک [illegible] قائم نہ [illegible] ابن خلدون [illegible] کے معاشرے کے سماجی حالات و [illegible]۔ چنانچہ جب علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے [illegible] تو انہیں یہ احساس ہوا کہ روایات کی پرکھ میں [illegible] ہے کہ ان واقعات کو [illegible] جن کے بغیر [illegible] بھی قبول کر لیا جاتا ہے اور ان روایات کو حالات کے تقاضے کے مطابق جانچنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان حالات کے تحت ایسا واقعہ رونما ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات پر نظر کرنی ہوگی[2] ہے۔ کیونکہ انسان کے زمان و مکان کا واسطہ انہی چیزوں سے ہے کیونکہ ان کے بغیر کوئی [illegible] تاریخ نہیں ہو سکتی۔

مغربی طرز تحقیق

مشرق و مغرب کے اصول تحقیق اب ایک ہو چکے ہیں، قریب قریب یہی اصول اب مغرب کی کتابوں میں بھی بیان ہونے لگے ہیں۔ The methodology of Science کی مشہور کتاب Carter V. Good کی Educational Research میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:[3]

> "کسی واقعے کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ معلوم کیا جائے کہ [illegible] حاصل ہوا؟ راوی کون تھا؟ اس کے ذاتی حالات یعنی مزاج، مذاق، کردار و گفتار کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا تعلق اور واقعات سے کیا تھا؟ واقعہ نگاری کی نوعیت کیا ہے؟ پھر اس خاص واقعے کے کتنے عرصے کے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ وہ روایت اصل الفاظ کی بنا پر بیان کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ اس واقعہ کتنا ہے اور ترمیم یا اضافہ کس حد تک ہے؟"

مستند، اسماء الرجال، قواعد و [illegible] روایت [illegible] یا منسوب الیہ کی عادت کے خلاف ہو یا کسی ایسے شخص کی روایت ہو جس سے کسی اور نے روایت نہ کی ہو [illegible] یا روایت میں راوی کی ذاتی رائے شامل ہو یا جس کے سمجھنے میں راوی سے غلطی کا امکان ہے تو ایسی روایت پایۂ ثبوت سے ساقط ہو جائے گی۔

۱۔ خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی۔ مضمون: تاریخیت ۲۔ مقدمہ ابن خلدون

۳۔ یونیورسٹی [illegible] سنہ ۲۵۰-۲۵۹

سل ... [illegible] ۔ ۷ [illegible] نے قائم کیے ہیں یا [illegible] ۔ [illegible] نے جو کریڈٹ ہمیں ... لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سب کے سب اور
... مسلمانوں کے اصول حدیث سے ماخوذ ہیں جیسے ہیں کہ اُن پر خود مغربی مستشرقین کا خاصہ عمل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اصول، فکری
... یا نظریاتی تحقیق کے ذیل میں آ سکتے ہیں لیکن عملی تحقیق کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں اور یہ محض اس لیے ہے کہ اُن کے یہاں بلکہ اب
... کے یہاں بھی ... عقیدہ باقی نہیں باقی جو مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ میں تھی۔ موجودہ دور کا محقق صرف اس بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ اس
... نے موضوع سے متعلق کوئی معاصر شہادت ڈھونڈ نکالی۔ اب اسے مزید تحقیق و تنقیح سے سروکار نہیں۔ اور اس کے لیے اُس کے
... کوئی گنجائش بھی تو نہیں۔ وہ کہاں سے اور کس طرح معلوم کر سکتا ہے کہ معاصر راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ؟ نکتہ رس ہے یا محض الذہن؟ حافظہ
... ہے یا نسیان کا شکار؟ بے جا عقیدت رکھتا ہے یا بغض پرور ہے؟ ملازمت یا خدمت گزاری کی وجہ سے خوشامدی اور ذہنی پستی
... ہے یا حق گو اور بے خوف ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات اگر اُٹھائے بھی جائیں تو اُن کا حل کہاں اور کیونکر مل سکے گا؟
... بات پر اکتفا کر لیا جاتا ہے کہ جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے ماحول اور معاشرے کا جائزہ لے لیا جائے اور اُس کی "باقیات"
... مطالعہ کیا جائے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ ہم لوگوں نے اس انداز سے بھی بہت کم کام کیا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ اس
... کا احساس بھی بہت کم ہے۔ ایک موٹی مثال "عالمگیریات" کی ہے۔ یعنی اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق جو ہمارے فضلا کا یہ دعویٰ
... ہمارے برصغیر میں اس پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے تو کیا وہ انصاف سے بتا سکیں گے کہ عالمگیر کی مذہبی پالیسی کے لیے اُن اسباب
... پر بھی غور کیا گیا ہے جو اخلاقی اور روحانی طور پر اُن کو متاثر کیے ہوئے تھے؟ میری مراد ہے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے صاحبزادگان
... افسوس اور ان کے پوتے یعنی حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مساعیِ جمیلہ سے۔ انھوں
... نے اپنے کثرتِ مکتوبات سے اور خود اپنی صحبتِ بابرکت سے اُس کو متاثر کیا تھا۔ افسوس کہ ہم نے عموماً اُن خانقاہوں سے ہنوز رجوع
نہیں کیا جہاں اس قسم کے بکثرت جواہر پارے موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے بارے میں وقائع نعمت خان عالی کا یہ شعر پڑھنے ... [illegible]
... ہوگا:-

افترا و زور و بہتان، فال و خواب خواجگان شیدوخدعہ دعوتِ شیخانِ سرہندِ ما ... من

... اس شعر پر ہم نے غور بھی کیا ہوتا کہ وہ حقیقت نگار ہے یا حقیقت سوز؟

... عالمگیر کے معتمدین میں سے قاضی شیخ الاسلام، شایستہ خان، عاقل خان، سیف خان، بختاور خان، مکرم خان، مصطفیٰ خان،
... [illegible] بہادر وغیرہ بکثرت لوگ ایسے ہیں جن کے نام ان بزرگوں کے متعدد مکتوبات موجود ہیں۔ کیا یہ مکتوبات تصوف کے ساتھ
ساتھ مذہبی کاوشیں بھی ... نہیں؟ ان بزرگوں کے امرا اور خلفا میں سے بہت سے ایسے بزرگ ہیں جن کی تصانیف موجود ہیں اور اُن سے بعد
... سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالات کے لیے بہت کچھ مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ خود سندھ کے مختلف بزرگانِ دین کے ملفوظات اور
... [illegible] سے بہت ... ہیں اور ان حالات کی قدر کے لیے کسی شاہ کی نہیں بلکہ کسی جوہری کی ضرورت ہے۔

۱۹۷۳ : Towards improving Ph.D programme

خارجی شہادت

غیر مادی کس حد تک کار آمد ہو سکتی ہیں؟ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں اصل تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے کے حصول سے متعلق ہیں۔ لیکن چونکہ اس مدد میں ان کا ذکر ناگزیر ہے اس لیے ہم چند سطور ان پر بھی لکھ رہے ہیں۔ شعر کو اپنا موضوع بنایا ہے جس میں پھیلاؤ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ایسا کام محض ایک سرسری جائزے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور وقت نظر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ یہ "تحقیقی سرمایہ" نہیں کہلا سکتے۔

بعض حضرات کسی شاعر یا کسی صنف کی تاریخ لکھتے ہیں تو وہ تقلید یا سطحی مطالعے سے کام لیتے ہیں اور بنیادی ماخذ تک نہیں پہنچ سکتے۔ بہرحال کام کسی نوعیت کا ہو سب سے پہلے ایک موضوع کا تعین کیا جاتا ہے اور کتابیات کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کی جاتی ہے تاکہ موضوع سے متعلق تمام مواد کی معلومات فراہم ہو سکیں۔ امریکا والوں نے Documentation Center ۹۰۵ ۔ بنایا ہے جس سے یہ تمام کام مدد ملتی ہے۔ تاہم اگر ہمارے ملک میں ایسے مراکز قائم ہو جائیں تب کہیں جا کر آپ جیسے فضلا کی کارگزاری میں طلبہ بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی مختلف صلاحیتوں کے پیش نظر ان کے لیے مختلف اہم موضوعات منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔ مثلاً طالب علم کو اگر شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ ہے تو اس سے ہم یہی کہیں گے کہ کسی بڑے چوڑے موضوع کے بجائے اپنا کام کسی ایک شاعر تک محدود رکھ کر تحقیق کرو اور سب سے پہلے کلام جمع کرو۔ یعنی اس شاعر کے متعلق تمام ضروری تذکرے اور تاریخیں دیکھ ڈالی جائیں اور حالات میں جہاں کہیں اختلاف نظر آئے خاص طور پر توجہ کی جائے تاکہ دیگر معاصر یا اہم شہادتوں کے ذریعے اس کی تحقیق و تنقیح کی جا سکے۔ شاعر کے اساتذہ اور تلامذہ کے حالات اور تصانیف کا بھی پتا چلایا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نے اپنے اساتذہ نیز معاصرین سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کیا ہے اور کیوں؟ اگر نتیجہ مختلف ہے تو اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا پس منظر اور پیش منظر واضح ہو سکے۔ اسی طرح اس شاعر کے مختلف تلامذہ کی تصانیف اور مختلف صلاحیتوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ استاد اور شاگردوں کی انفرادی خصوصیت ابھر کر سامنے آ سکیں۔ یعنی یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شاعر یا مصنف اپنے اساتذہ یا معاصرین سے کہاں تک متاثر ہے۔ اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تلامذہ یا معاصرین کو متاثر کرنے کی کس حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر اس شاعر کے ماحول کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی ذہنی تعمیر اس کے ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات بھی بہت کچھ متاثر کرتے ہیں۔ پھر اس کے مذہب، عقائد اور احباب کے مزاج اور مذاق کا اندازہ لگانا بھی بہت مفید ہوگا۔ یہ کریدنا بہت دور رس ہوتے ہیں اور فنکار کی شخصیت کے ایسے گوشوں میں پہنچ جاتے ہیں جن کا علم کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ بعض اوقات شاعر کا اور اس کے شعر سے بھی اس کا تعلق ہوتا ہے۔ پھر اگر معاملہ "معاصرین" کا ہے تو اس کو بھی پیش نظر رکھنا ہے کہ ان تمام خارجی کیفیات کا اثر اس پر کس حد تک ہوا ہے اور کس طرح وہ ان سے متاثر ہو سکتے تھے۔ اس قسم کے معاملات کے سلسلے میں کسی طرح کا فرق بھی روا رکھنا ظلم ہے کیونکہ ۔۔ خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات ۔۔ بے شک علامہ اقبال کے زمانے کا یہ واقعہ ہے جو یاد ہے کہ ایک بار ڈاکٹر شیخ صاحب مرحوم نے غالب شعراء کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ غالب کے مطالعے کا سنایا

؎ احمد حسن کریمی فاضل بچوں کے مسلک کی خدمت ہے ۱۹۶۵ء کے بعد میں شائع ہوا

جس کا ایک نسخہ ہی نہیں تھا۔ میں نے اس کے حصول میں اپنی معذوری ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ کیمیا یا ڈاکٹری کی ایک کتاب کے میسر نہ ہونے پر کوئی دوسری کتاب تجویز کر سکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنی ہو گی کیونکہ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

خارجی شواہد کے پہلے تذکروں اور تاریخوں کے علاوہ بعض مرتبہ معمولی معمولی رسائل بلکہ اخبار بھی بہت اہم ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں کسی شخصیت کے متعلق کوئی اشارہ بھی مل جاتا ہے تو اس سے تاریخ وغیرہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں وقت تک اس نے کیا کیا لکھ لیا تھا۔ اکثر معاصر تذکرے، دیوان یا کلام کے مجموعے ایسے ہوتے ہیں جن سے بہت حالات کے ساتھ کسی شاعر کے جو اشعار بطور نمونہ پائے جاتے ہیں ان سے ان غزلوں کا شاعری کا پتا چل سکتا ہے جو ایسے مجموعوں کی ترتیب کے وقت تک تیار ہو چکی تھیں۔ پھر داخلی شواہد سے، ایسے امور کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے اور شاعر کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے کے لیے یہ کام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ معاصرانہ چشمک اور ... کے متعلق اچھے بلکہ برے اشعار یا حوالے بھی کسی شخصیت کے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے انضمام و تفہیم کے لیے ماہرانہ صلاحیت کی یقیناً ضرورت ہے اور آپ جیسے فضلا کی رہبری میں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔

خارجی مواد کی تلاش اگر کسی ہیرو، شاعر یا مصنف یا کسی شخصیت پر کام کیا جائے اس کے وطن اور مقامات قیام کو بھی دیکھا جائے۔ گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے سفر سے بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کی استعداد کے متعلق مختلف علوم و فنون سے بھی متعلقہ ہونا ضروری ہے کیونکہ جو چیز براہ راست حاصل ہو سکتی ہے وہ زیادہ اہم ہوا کرتی ہے اور یہ کہ مختلف ماخذوں کے لیے ترجموں سے کام لینا صحیح نہیں۔ کیونکہ ترجمے کا اصل نہیں ہو سکتے اور تحقیقی نکتہ شناسی اور جزرسی سے یہ مقصد پورا نہیں کر سکتے۔

داخلی شہادت

داخلی مواد کے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس شخصیت کی کل تخلیقات کا جائزہ تدریجی ترتیب و توقیت کے ساتھ لیا جائے تاکہ اس کے ذہن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ دیکھیے زبان، انداز بیان اور تشبیہات ایسی چیزیں ہیں جو کسی شخصیت کے عیوب و ہنر کی چغلی کھاتی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ شخص کس طرح کی زبان بولتا تھا؟ کیا کیا تشبیہات و استعارات استعمال کرتا تھا؟ کون سے جذبات و خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے؟ زمانے کو پسند یا ناپسند سے اس کا تعلق کس حد تک تھا؟ کون سے اصناف سخن اسے پسند تھے؟ کون سے موضوعات سے اس کا تعلق تھا؟ یہ تمام باتیں خود اس کے کلام سے یا اشاروں سے مل سکتی ہیں۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی ان کے اسباب پر بھی غور کر لیا جائے تو اس شخصیت کی نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھائی جا سکتی ہیں۔ قصیدہ گو شاعر کی مدح سرائی جیسے خوشامد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ... کی نفسیات کا ... شاعر کا قلب ... کہ کیا وہ کسی اپنے معاصر کو کسی طرح ... کہ معاشرے کے ... سے متاثر ہوتے ہوئے کہانی دیتے ہیں۔ مذہبی مجالس میں مثنویاں لکھنے والا اپنے اس ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جس میں ... چاہتا تھا، خواہ وہ میدان کارزار ہو، خواہ مجلس مرثیہ نگار اسی طرح مثنوی ... والے مرثیہ نگار ... اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ گویا ایسے مصنفین سے ... کا روزن کھل جاتا ہے۔ اور اگر یہ مختلف صفات ...

ہونے کے ذریعہ قدیم کا تجزیہ و تحقیق سے ایک ایسے مختصر دیوان یا مخطوطے کی شناخت ہو سکتی ہے جس نے غیر معروف ہونے یا کسی کوتاہی کی
اور دست انتشار کے باعث شہرت حاصل نہ کر سکا ہو۔

داخلی شہادت کے لیے سب سے پہلے دیکھیں، مصنف یا شاعر کی تخلیقات ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے کلام سے موجودہ یا ناپید ایسے مطالب حل ہوتے ہیں کہ اجمال کے بعد جو تفصیل ہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ مثلاً ولی (م ۱۱۱۹ھ) کے دیوان کی پہلی غزل میں سے یہ چار اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا ہوں ترے نانو کریم صد زبان کا   کیا ہوں ترے شکر کیں عنوان بیاں کا
جس گرد کی پاؤں رکھیں تیرے رسول واں   اس گرد کو میں کحل کروں دیدۂ جاں کا
ہے صدق و عدالت و حیا علم سوں اپنی یاد کر   مجھ تب کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی   یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

ان اشعار سے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ شعر کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ ان کا کہنے والا کوئی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے۔

۲۔ دوسرے شعر (نعتیہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فارسی شعرا کی تقلید کو اپنا شیوہ بنایا ہوگا۔ اسی لیے اس شعر میں حضرت جامی کا یہ مشہور شعر ملحوظ رہا ہے:

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

۳۔ شاعر نے تیسرے شعر میں چاروں خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی منقبت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منقبت کے ایسے مضامین ہماری شاعری میں شاذ ہی نظر آئیں گے۔

۴۔ شاعر نے چوتھے شعر میں وحدت الوجود کے عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت شیخ علی رضا سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۳۳ھ) سے بیعت[1] تھا۔

۵۔ اسی چوتھے شعر کے دوسرے مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا غزل کا شاعر ہے۔

ان پانچ باتوں کے علاوہ ایک اور چیز یہ بھی ہے کہ یہ حمد و نعت والی غزل جو حسن خاتمہ کی ہے، دیوان کے شروع میں رکھی جاتی ہے ـــــــ ظاہر ہے کہ شاعر کے آخری عہد میں کہی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس غزل میں وہ عمر کے اس دور میں ہے جو ولی نے دہلی آ کر حضرت شاہ گلشن علیہ الرحمہ کے مشورے پر شعرائے فارسی کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔
مثلاً کا یہ تجزیہ ایک حیرت انگیز کوشش ہے۔ آپ جو نہ سمجھ سکے وہ بہتر طریقے پر اپنے طلبہ کو بہم پہنچاتے ہوں گے۔ داخلی شہادت

---

[1] یہ بزرگ حضرت شاہ سعداللہ گلشن (متوفی ۱۱۴۰ھ) نقشبندیہ تھے اور چشتیہ بھی۔ چشتی ہونے کا اشارہ ولی نے اس شعر میں کیا ہے جس میں اپنا نام بھی دیا ہے:

بعد شاہ بخت، ولی اللہ   پیر کامل علی رضا پایا

سلسلے میں ہم نے اپنے طلبہ کو اُن کے نصاب کے شعرا کا مطالعہ کراتے وقت کلام کی توقیت اور ترتیب بھی سمجھائی ہوگی۔ شعرا و ادیبوں میں مختلف اصنافِ سخن کی تاریخِ تصنیف شاذ ہی ملتی ہے اور غزلیات میں تو معدوم ہی ہے۔ (سوائے حاتم یا حسرت جیسے دو چار شعرا کے) لیکن طلبہ کے لیے اس کی شناخت از بس ضروری ہے۔ چنانچہ عرض ہے کہ اگر کسی ظاہری شہادت سے یہ تعین نہ ہو سکے تو شاید اس طرح ضرور کامیابی ہو سکتی ہے کہ شاعر کے ایک مخصوص جذبے سے متعلق تمام اشعار یک جا کر لیے جائیں، پھر ان کے الفاظ اور اسالیب کی باہمی مناسبت پر غور کیا جائے۔ اگر یہ مناسبت قریب تر ہو تو ظاہر ہے کہ یہ اشعار بلکہ ان اشعار والی غزلیں قریب العہد ہوں گی۔ اسی طرح ہر جذبے سے متعلق شاعر یا مصنف کے الفاظ، محاورات، تلمیحات، مصطلحات، تشبیہات و استعارات نیز مختلف خیالات وغیرہ اگر یک جا کر لیے جائیں تو جس شخص کے کلام و دہن سے ان کا اظہار ہوا ہے اُس کی گفتار اور کردار دونوں کی قلمی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور اس خود گفتہ تاریخ سے بڑھ کر اس شخصیت کے حالات کے لیے اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ اس قسم کی سبک شناسی یقیناً مشکل چیز ہے لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص ایک سال میں صرف ایک طالب علم بھی اس طرح کا تیار کر سکے تو وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ: ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

طلبہ میں جب اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ آسانی سے اصلی اور الحاقی کلام کے درمیان حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں اور یہ چیز نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم نام اور ہم تخلص شعرا کا کلام اکثر آپس میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ امر موجبِ افسوس نہیں کہ ہم نے ابھی تک فارسی میں حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ، حضرت احمد جامؒ ژندہ پیل، عمر خیام، عثمان مختاری، ظہیر فاریابی، عمادی غزنوی، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، زیب النساء وغیرہ کے الحاقی اور اصلی کلام کا تجزیہ نہیں کیا، اسی طرح اُردو میں سودا، قائم، انشا، نیز میر اور یقین وغیرہ کے کلام میں ہم نے ابھی تک حدِ فاصل کا کوئی خط نہیں کھینچا۔ اگر ہمارے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر داخلی شہادت کا صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

داخلی شہادت کے سلسلے میں ایک اور چیز بہت اہم ہے اور وہ ہے کیفیت و آہنگ۔ ایک غزل یا ایک تحریر کا آہنگ شروع سے آخر تک ایک ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ بقول اقبال

دمادم نقشہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرارِ زندگی نیست

بات یہ ہے کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے ہی مختلف حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ شادی، غمی، بیماری اور پریشانی سبھی کے سائے لگی ہوتی ہیں۔ پھر مختلف نوع کی مصروفیات بھی درپیش ہوتی ہیں۔ اسی لیے بڑے سے بڑا ادیب بھی تحریر کے جھولات سے پاک نہیں۔ پہلے کے اساتذہ زیادہ تر اور آج کل کے اساتذہ کم تر اس بات کی طرف توجہ دیتے ہیں کہ فلاں شعر ضعیف ہے یا فلاں شعر بوجھل ہے اور ایسا کیوں ہے۔ اسی طرح نثر کی خوبیاں بھی اور کمزوریاں بھی کی شناخت کرانے سے بھی بہرطور گریز کرتے ہیں اور اگر اس انداز سے کوئی استاد تعلیم دیتا ہے تو اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ادب ہمارے ادب کہہ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن کیا موجودہ دور کے فاضل نقادوں میں سے کوئی ایسا ہے جو شعر کی [illegible] یا شعر کے جھول اور اس کے اسباب کی بین تفہیم کرا سکے۔ اگر اس قسم کی بے آہنگی کے اسباب کی تلاش کرنا مشکل ہے تو کم از کم موقوف و بے ربط کی ناموزونیت اور شکستِ ناروا [illegible] کی شناخت کرا دی جائے۔ ورنہ حسنِ بندش اور [illegible]

جیسے اصطلاحات بالکل بے معنی بلکہ وہ بالکل غلط استعمال ہو رہا ہے۔

ایک اور چیز جو دکنی مخطوطات کے ذیل میں ضروری ہے وہ قدیم تذکرے ہیں۔ ہمارے اکثر ادیبوں کے پیش نظر تذکروں کے علاوہ قدیم تذکرے نہیں ہیں اس لیے ان کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تاریخی اور معاشرتی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے کیا ضرورت ہے کہ دیوان کا ہر جزو ادب عالیہ کا شاہکار ہو۔

چند مشورے

اب یہاں تحقیق کے متعلق چند مشورے پیش کیے جاتے ہیں جن کو عمل میں لانا چاہیے۔ مثلاً ہمارے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کی تفصیل سے بحث کی جائے۔ مثلاً علامات، ضرب الامثال، محاورات، تلمیحات، تشبیہات، استعارات پر مستقل مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ ہم ان کی اصل اور اشتقاق پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ پھر ان کو شرح اور ان کا استعمال بتایا جائے اور مختلف زبانوں میں ان کی صورتیں معنوی حیثیت سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی مثالوں کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ ہم نے قدیم ادب کی تفصیلی صنعتوں کے خصوصی مطالعہ پر بھی مستقل مقالے تیار نہیں کرائے جو کہ اشد ضرورت ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ لسانیات کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ اردو زبان کے صرفی و نحوی ارتقا پر بھی کام کیا جا سکتا ہے تاکہ خود اردو زبان اور کیفیات کی اصل اور ابتدا کا تعین کیا جائے۔ اس سلسلے میں علم عروض، قافیہ، بیان و بدیع وغیرہ اور نثر کی تاریخ وغیرہ معلوم ہو سکے گی۔ قدیم اہل زبان کی عبارتوں سے اردو کی اصل کا تعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ صوتیات اور لسانیات سے متعلق بھی بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اب تک مختلف ادوار میں مختلف اسباب کے اختلاف کی وجہ سے ایک ہی لفظ کے املا کس طرح تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ادوار کی تقسیم اور تمام متعلقہ مسائل کے حل کے لیے تبدیلیوں کا لسانی نقطۂ نظر سے جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بنانے کا کام بھی شروع کر دیا جا سکتا ہے تاکہ ایک نظر میں یہ معلوم ہو سکے کہ ایک مصنف نے کون کون سے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات وغیرہ کہاں کہاں استعمال کیے ہیں۔ نیز افراد، مقامات اور مختلف تصانیف اور اقوال وغیرہ کا ذکر اس مصنف نے کب کب اور کس طرح کیا ہے۔ افسوس کہ ہم نے اپنے ادبی شاہ پاروں سے متعلق بھی ہنوز ایسا کام نہیں کیا۔ یہی حال فارسی کا ہے کہ سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی کے باب میں بھی ہم نے ابھی تک کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ عربی زبان و ادب پر مختلف اثرات سے متعلق بھی مستقل مقالات کی ضرورت ہے۔ پھر خود ہمارے ملک کے بکثرت عربی شاعر گزرے ہیں جن کی ترتیب و تہذیب کی بھی بڑی ضرورت ہے اور یہ کام اگر ہم نے ابھی نہ کیا تو ان کا ہمیشہ کے لیے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ خود ہمارے ملک کے بکثرت اور مخطوطات خراب و خستہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

بعض بنیادی طور سے نثر و نظم کی اہم کتابیں ایڈٹ و مرتب کرائی جا سکتی ہیں اور مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھوائے جا سکتے ہیں۔ :
کام بنانے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک حقیقت یہ ہے کہ تصحیح و ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے کہ کن کن مخطوطوں کی تعیین سے اختلاف قرأت

۱؎ محترم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کل ہند اورینٹل کانفرنس کے گیارہویں اجلاس منعقدہ حیدرآباد دکن کے خطبۂ صدارت میں ... کے لیے جو مشورے دیے ہیں ان سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

کام رجب کا بہت دشوار ہو سکتا ہے۔ بعض کرم خوردہ نسخوں سے کٹے پھٹے اوراق کی کیفیت کے لحاظ سے درست کرنا اور شکستہ کو پڑھ کر تعبیر کا کوئی آسان کام نہیں۔ اکابر فضلا کے کاموں کو پیش نظر رکھ کر یہ کام سیکھا جا سکتا ہے۔ متن کی درستی اور حواشی کی فراہمی کے سلسلے میں بعض ثانوی اور جامع و مانع مصادر سے استفادہ کرنا بھی بڑی سلیقہ مندی ہے۔ ایسے کاموں کے لیے صرف فنی اساتذہ سے رجوع کرنا چاہیے جنھیں اس فن کا خاص تجربہ ہو کیونکہ ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

پھر رجوع کرنے میں کسی طرح کا تکلف یا اظہار تشکر میں کسی طرح کا بخل کبھی روا نہیں۔ کئی مرتبہ یہ دیکھا ہے کہ بعض صاحبان کی پوری پوری کتابیں درست کر دیں اور انھوں نے اظہار تشکر میں صرف اتنا کہہ دیا کہ فلاں صاحب سے بہت کچھ مشورہ کیا گیا ہے اور بس۔ ابھی حال ایک صاحب نے بڑی محنت سے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو مرتب کیا لیکن اس کے عربی ماخذوں کے سلسلے میں اساتذہ سے رجوع کرنے میں کوتاہی کی۔ چنانچہ ان کا بلند پایہ کام ادھورا رہ گیا ہے۔ پھر ایک خامی عام ہے جس کا ذکر شروع میں بھی کیا گیا ہے کہ تحقیقی مقالات کو بھی خواہ مخواہ طویل اقتباسات سے پُر کیا جاتا ہے اور کتب کے حجم کا رعب جمایا جاتا ہے۔ ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ سو صفحات پر محیط ہیں لیکن اگر ان کا خلاصہ کیا جائے تو وہ صرف ۲۰۰ - ۲۵۰ صفحات میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ ایسی کتابیں مصنف کے فوت ہونے سے پہلے ہی فوت ہو جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو ایجاز و اختصار کی مشق کرائیں تاکہ منطقی طور پر بھی وہ فضول بحثوں میں پڑنے کے عادی نہ بنیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی کم سے کم الفاظ میں کہی جا سکتی ہے۔ لیکن شاید رقم الحروف بھی تطویل کلام کے جرم میں قابل مواخذہ ہے۔ ع

صلاح کار کجا و من خراب کجا

شعور کی رو اور ناول نگاری

ڈاکٹر احسن فاروقی

انگلستان کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کی ناول نگاری میں ایک ایسا نیا طریقہ قصہ گوئی نظر آتا ہے جس کو Stream of Consciousness یا شعور کی رو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ایک حد تک ہمارے یہاں بھی تقسیم ہند کے بعد پایا جانے لگا ہے۔ ناول کے پڑھنے والوں کو یہ طریقہ عجیب، مبہم، عجیب شکل، عجیب ہیئت رکھتا ہے۔ انگلستان کے نقاد اور شیکسپیئر صاحب نے اس کی کمزوریاں ماننے کے باوجود اس کو قبول کیا۔ ہمارے نقاد اس سلسلے سے متنفر ہیں۔ اس کو افسانوں میں تفنن کی طرح پر پیش کرتے ہیں۔ اس کی بابت کچھ کہنے میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ فنی اشتراک ہے اور ایک اہم چیز ہے کہ اس کو ٹال دینا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ بہر حال کافی حضرات نے مجھ سے پوچھا ہے بہت سے سوال کیے: آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کو کیسے کہا جائے؟ آخر یہ ہے کیا بلا؟ آخر یہ دلچسپ کیوں نہیں ہوتا؟ اس سے آخر کیا فائدہ؟ اور میرے دل میں بھی یہ سوال اٹھتا ہے اور اب میں جب اب ہم ناول نگاری کے سلسلے میں پہلے مقام ہی سے آگے نہیں بڑھ سکے تو خیالات سے زیادہ تخیلی تجربوں کی کیا ضرورت ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ناول نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں؟ اس قسم کے تمام سوالات کا جواب پانے کے لیے میں یہاں اس نئے تکنیک کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں

Stream of Consciousness کا فقرہ جس کا ہم نے شعور کی رو ترجمہ کیا ہے۔ امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمس کی ایجاد ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی شعور ایک سیال چیز ہے جو بغیر کسی منطق کے زندگی بھر برابر چلتا رہتا ہے۔ شعور سے مطلب یہاں محض حافظہ، ذہن، منطقی قوت، ادراکی طاقت، تخیل یا اسی قسم کی دوسری تمام قوتیں نہیں جو پرانے طرز نفسیات میں الگ الگ سمجھی جاتی تھیں بلکہ ان تمام قوتوں کا اور متضاد قوتوں کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے دماغ کے اندر حرکت عجیب پیچیدہ طریقہ پر چلتا رہتا ہے۔ شعور اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو اس کے وجود اور اس کی رفتار کا علم ہے جب کہ اس کو اپنے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بات چیت یعنی زبان کے ذریعہ انسان اس کا کچھ حصہ ظاہر کرتا ہے مگر اس کے متعلق میں زبان بڑی محدود چیز ہے۔ زبان کے قواعد اور روایات محض ذہنی یا تخیلی ہیں۔ شعور کے ایسے نا اظہار کرنے سے پہلے جتنے تمام قدم ہو سکیں ان کو کیفیات جو قدیم ہیں جن کی طرف ماہرین نفسیات نے خاص توجہ دی۔ یہ کیفیات شعور کی رو کا خاص حصہ ہیں

ناول نگاری قصہ گوئی کا وہ روپ ہے جب کہ قصہ گو نے محض تخیل کی جس کے ماتحت وہ دیو پری اور مافوق البشر چیزوں کے سنا آتا تھا یا محض اخلاقیات کی جس کے تحت وہ اخلاقی قدروں کو اپنے قصے کا محور بناتا تھا چھوڑ کر نفسیات انسانی پر تکیہ کیا۔ اٹھارویں صدی سے انفرادی نفسیات کا جو علم ترقی کرتا گیا ناول نگار کے لیے بنیاد وہ ٹھہرا۔ اب بیسویں صدی میں شعور کی رو کو انسانی نفسیات

ہے اہم حصہ ثابت ہوا۔ ناول نگار کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کردار کی انفرادیت دکھانے کے بجائے اس کے شعور کی رو کے نقشے کھینچے۔ اس سلسلے میں نادر تجربہ ڈوروتھی رچرڈسن Dorothy Richardson نے پہل کر دی۔ پہلے اُس نے ایک ناول پوائنٹڈ روفز Pointed Roofs لکھی جو بڑھتے بڑھتے چودہ جلدوں تک چلی گئی اور سب جلدوں کا ایک نام اس نے پلگریمیج Pilgrimage رکھا۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتی ہے:

> اس ناول کی تصنیف کے دوران میں مصنف کو یہ تجربہ ہوا کہ تصنیف کے ذریعہ حقائق کا اظہار کرنے میں کتنی دشواریاں ہیں کیونکہ جب کسی حقیقت کو ایک صورت دی گئی تو محسوس ہوا کہ اس کی سیکڑوں اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اس اقتباس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس کا مقصد نفسیاتی تجزیہ ہے۔ نفسیاتی زندگی کے پُراسرار پیچ میں وہ گم ہو جانا چاہتی ہے۔ ناول کا نام پلگریمیج بھی اس بات کا اشارہ ہے کہ ذہنی سفر پر یا ذہنی کاوش میں روانہ ہونے کا معاملہ یہاں در پیش ہے۔ حق کا متلاشی تمام نفسیاتی پیچ و خم سے گزرتا ہے اور اس تک پہنچ جانا صعب مرحلہ ہے۔ یہ ایک نئی راہ ضرور ہے حالانکہ اسے ابھی تک فنی کامیابی کے درجے میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اس قسم کے جو نفسیاتی تجربے ایک طویل تصنیف میں ایک بے ربطی کے ساتھ دئیے گئے ہیں وہ کس طرح قاری کے لیے دلچسپ نہیں ہو سکتے۔ شعور کی رو کو نمایاں کرنے کی بنیاد تو پڑ جاتی ہے مگر ضرورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اس کو فنی درجے پر لایا جائے۔ اس کام کو ایک حد تک جیمس جوائس James Joyce اور ایک حد تک ورجینیا وولف Virginia Woolf نے پورا کیا۔ ان دونوں کے فن کو سمجھانے کے سلسلے میں کئی کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ یہاں ان کو پورے طور پر واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ سوال ان اصولوں، طریقوں اور ٹیکنیک کا ہے جس کے اور ان کے پیرووں کے ذریعہ وجود میں آئے اور جن کو برتنے سے اردو ناول نگاری میں نئے شگوفے کھلے۔

شعور کی رو والے ناول کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس میں قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے جیسے کہ کسی فرد کے دماغ میں تاثرات کی بے ہنگم یلغار ہوتی ہے۔ یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ انسانی شعور میں جو کچھ آتا ہے وہ نہایت درجہ بے ربط ہوتا ہے مگر جب کوئی شخص اپنے خیالات دوسروں کے سامنے ادا کرتا ہے تو زبان کے قواعد کا ربط اور منطقی ترتیب کا بھی اس پر حاوی کر لیتا ہے اور اس بنا پر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں آتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں ابھرنے والے تمام خیالات کو جوں کا توں رقم کرتا چلا جائے تو دنیا کا کوئی بھلا مانس اسے کم ہی کچھ سمجھ سکے گا۔ مگر شعور کی رو والے ناول نگار اسی گڑبڑ جھالے کو پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال جیمس جوائس کی یولیسس کا آخری باب ہے جس میں مسز بلوم کے خیالات کی رو اس طرح قلم بند کی گئی ہے کہ ایک جملہ بغیر وقفے کی علامت یا سٹاپ کے چالیس صفحوں تک چلتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ کون کیا سوچ رہا ہے اور وہ کہاں اور کس وقت اور کس حالت میں ہے۔ شعور کی رو سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ مسز بلوم سوچ رہی ہے۔ وہ اپنے میاں کے پاس لیٹی ہے جو اس پر زندگی میں پہلی دفعہ بیدار ہو گیا ہے۔ اس تکنیک نے اس کے خیالات کو ایک جذباتی رنگ سے دیکھا ہے۔ وہ بے شمار پڑھ جاتے ہیں حالانکہ ان کی ماضی میں بیوی ہونے کی تمام زندگی کے تعلقات کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قاری اور فرد کے شعور کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور خیالات کا وہ عالم سامنے آ رہا ہے جو ان کے ذریعہ ادا ہونے سے پہلے کا

ہوتا ہے۔ یہ عالم ہی شعور کی رو کے طریقہ کی بنیاد ہے۔ یہی عالم ایک اور طریقہ پر یوں سامنے آتا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف بھی موجود ہے اور اسی عالم کو قاری کے سامنے لا رہا ہے۔ ایک آدھ فقرہ جلد ہی یہ واضح کر دیتا ہے کہ شعور کی رو تو بیان ہو رہی ہے لیکن کسی کے اوپر سے کوئی شخص بار بار پردہ اٹھاتا جا رہا ہے۔ اس کی بہترین مثال ورجینیا وولف کی ناول "مسز ڈیلووے" ہے جس کا شروع ہے۔ مصنفہ شروع یوں کرتی ہے کہ:

> "مسز ڈیلووے نے کہا کہ وہ خود پھول خریدے گی۔ کیونکہ لوسی کو اس کے سب کام سپرد ہو گئے ہیں۔ وہ خالی نہیں ہے۔ دروازے چوکھٹوں سے نکالے جائیں گے۔ رمپلمیئر کے آدمی آ رہے ہیں اور پھر کلیریسا ڈیلووے نے سوچا کیا اچھی صبح ہے۔ ایسی تازی جیسے کہ بچوں کے لیے سمندر کے کنارے کھیلنے کے لیے بنائی گئی۔۔۔۔۔۔"

اور اسی طرح ناول چلتی چلی جاتی ہے۔ اس طریقہ میں پہلے طریقے سے زیادہ ربط نظر آتا ہے۔ جملے بھی پورے پورے ہیں اور ترتیب بھی ایسی بگڑی نہیں مگر پھر بھی بنیادی طور پر اس میں بھی ذہنی ربط کا فقدان اور خیالات کے دھارے کا تصور ہے جو پہلے طریقے میں۔ یہ دونوں طریقے سب سے اہم ہیں حالانکہ ان کے استعمال کے مدارج ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ان مخصوص طریقوں کو چھوڑ کر پرانے بیانیہ منطقی طریقوں پر بھی آ گیا۔ مگر ان مقامات پر بھی سوال زیادتی یا کمی ہی کا رہتا ہے کیونکہ ربط اور بے ربطگی کا امتزاج ایک حد تک لازمی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس وقت بھی جبکہ اس طریقہ میں کامل بے ربطی ہوتی ہے "ربط" کا وجود ضرور رہتا ہے۔ ناول نگار کے سامنے شعور کی بے ربطی اور منطقی ذہن کے ربط کو اپنی مرضی اور اپنے مقصد کے موافق ملانے کا سوال ہوتا ہے۔

ان سارے کھیل کا مقصد "رو" "دھار" یا بہتے ہوئے حرکت کا تاثر قائم کرنا ہے۔ اس دور میں زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ زیادہ تر ہم کو رفتار ہی رفتار دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے فلسفہ میں بھی مکان سے زیادہ زمان اہم ہو گیا ہے اور آخری نقطہ کوئی اٹل اور قائم حقیقت نہیں رہی بلکہ تبدیلی یا مسلسل حرکت ہو گئی ہے۔ کائنات تیزی کے ساتھ ارتقا کرتی بتائی جاتی ہے اور حقائق بھی ہر لحظہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے پیشتر ناول میں بھی ذہنی انفرادیت نہیں بلکہ ذہنی رفتار کی طرف توجہ لازمی تھا یا گیا، کیونکہ ناول نگار رفتار کے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے کہ انسان کا ذہن بھی انہیں چکر کھاتی ہوئی چیز ہی دکھائی دیا۔ لہذا لندن اور ڈبلن کے رہنے والوں کے لیے شعور کی رو ہی کو دکھانا قدرتی تھا مگر لکھنؤ ایسے پرسکون شہر کے رہنے والوں نے لکھا ہوتا تو وہ حسن نیش اور دکانوں سے زیادہ نہ جاتا۔ ان کی زندگی میں ہلچل مل جانے کے بعد شعور کی رو کی طرف توجہ ضروری ہو جاتی ہے۔ شعور کی رو کا نقشہ دکھانا اس دور کے ناول نگاروں کے لیے اتنا ہی قدرتی تھا جتنا کہ اٹھارویں صدی کے ناول نگاروں کے لیے حسن تمثیلی تشبیہوں سے الگ ہو کر انفرادی نفسیات پیش کرنا۔ زیادہ تر لوگ ہمیشہ صدیوں پیچھے ہی رہتے ہیں اس لیے فیلڈنگ پر بناوٹی کا الزام لگایا گیا اور اب جوائس پر "کنفیوژن" کا۔ بہرحال ہمارے شعور کی حدود کا احساس دلانا ہے ہم پر فرض ٹھہرا۔ اس کے لیے جو طریقہ DEVICE خاص طور پر استعمال کیا گیا وہ FREE ASSOCIATION تھا۔ نفسیات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کا ذہن کبھی ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکتا مگر اس کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بڑی سرعت آزاد تلازمے کے ماتحت ہوتی ہے جو تین اصولوں سے جاری نظر آتا ہے۔ پہلا حافظہ دوسرا حیات اور تیسرا تخیل یعنی

ے دماغ کو کچھ چیزیں یاد آتی ہیں کچھ محسوس ہوتی ہیں اور کچھ ہونے والی چیزوں کا وہ تصور کرتا ہے۔ دوسری قسم کی چیزیں موجود ہیں۔ پہلی
ر کی ماضی میں اور تیسری قسم کی مستقبل میں ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ضرور ہوتی ہیں حالانکہ منطقی طور پر یہ حد سے زیادہ
ے ربط ہوتی ہیں۔ ناول نگار ان میں سے ہر ایک کو ایک دوسری سے وابستہ کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں میرین بلوم ہی کے
شعور کی تصویر کو لے لیجیے۔ اس کے آخری حصّہ کو غور سے دیکھیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گھڑی بجتی سنی اور اس کے تصور میں چینی لوگ
ے اور انجیلیس کی تصویر یاد آئی۔ اس نے نوّے کو سوتا تصور کیا اور پڑوسیوں کی گھڑی کے الارم کا خیال کیا۔ وہ گھڑی کے بجنے کو گننے لگی
س کی نگاہ دیوار کے کاغذ پر پڑی اور دھیان تاروں کی سمت کے پھولوں کی طرف گیا اور اس کے ساتھ لمبارڈ اسٹریٹ پر گھر یاد آیا اور وہ کپڑے
یاد آئے جو اس کے میاں نے اسے دیے تھے۔ اب اس کی نگاہ اپنے میاں کی طرف گئی جو پاس ہی سو رہا ہے اس نے لیمپ بجھایا اور رشتے
یاد آیا کہ اسے جلدی اٹھنا ہے اور اس نے آنے والے دن کے کاموں کا تصور کیا۔ بازار میں خرید و فروخت، روٹی کی دوکان کا نقشہ سامنے
آیا اور خرید و فروخت کی طرف خیال گیا۔ ڈنڈاس کا تصور ہوا گھر کو صاف کرنے کا خیال آیا اور ڈنڈاس کو کھانا کھلانے کا۔ پیانو کو صاف کرنے
ا میز پر پھول لگانے کا اسباب اسے محسوس ہوا کہ پورا کمرہ پھولوں میں تیرنے لگا۔ اس نے قدرت پر سوچنا شروع کیا اور مناظر قدرت سامنے
آئے۔ وہ منکروں کو خدا کے وجود کا ثبوت سورج کی رفتار سے دینے کی سوچنے لگی۔ اسے جبرالٹر کے سورج پر خیالات اپنی محبت
کے دور میں یاد آئے۔ جبرالٹر یاد آیا اور محبت کی باتیں یاد آئیں اور اس کے بعد وہ سو گئی۔ غرض اس پورے نقشہ میں اہم بات کوئی بھی
نہیں ہے۔ باتوں کا ایک سے دوسری کی طرف حرکت اور پورے شعور کی حرکت اہم ہے۔ حرکت ہی دکھانا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سینما کے ٹیکنیک سے طریقے مستعار لے رہا ہے۔ قصّہ گویوں نے ہمیشہ عام تفریحات
پر نظر رکھی۔ ناول کو پاکٹ ڈرامہ بھی کہا گیا ہے اور ڈرامے کے ٹیکنیک کا اس پر بہت گہرا اثر ہے۔ اب عام تفریحات میں ڈرامے کی
جگہ سینما نے لے لی ہے اور اس کے ٹیکنیک کا بھی ناول میں آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فلم کی ڈرامے پر برتری اسی بات میں ہے کہ وہ زندگی
رواں دواں اور تیزی سے مقام اور زمانہ بدلتی ہوئی دکھا سکتی ہے۔ اس میں فلم کے قصّہ کا بھی مخصوص مقصد رفتار کا دکھانا ہوتا ہے۔ اگر
کسی فلم کو ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اس میں بھی مختلف قسم کے ٹکڑے ASSOCIATION OF IDEAS
کے حساب سے جڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کس تیزی کے ساتھ ایک تصویر دوسری کے بعد آتی ہوگی۔ کہیں ایک تصویر ایک دم دوسری
پر چھا جاتی ہوگی۔ اور کہیں ایک مرکزی تصویر سے وابستہ تصویریں جمع ہوتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ ایک موضوع کی تصویر سیکڑوں پہلوؤں سے بھی
دکھائی جاتی ہے۔ واقعات کی رو دکھانے کے لیے بھی بہت سی نئی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔ فلم بنانے والوں نے ان تمام ترکیبوں کے نام رکھ
لیے ہیں جیسے FLASH-BACK . CLOSE-UP . CUTS . FADE-OUT . SLOW-UP وغیرہ وغیرہ۔
یہ تمام ترکیبیں شعور کی رو والے ناولوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ورجینیا وولف کی ناول MRS DALLOWAY میں شروع ہی سے احساس ہوتا
ہے کہ شعور کی رو سینما کے ٹیکنیک پر چل رہی ہے۔ پہلے کلاریسا ایک پارٹی میں شرکت کے لیے تیاری کا خیال کرتی ہے۔ پھر اس کا دھیان ماضی کی طرف
جاتا ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ بڑی خوشگوار صبح ہے اب ایک FLASH-BACK ہوتا ہے جو بیس برس پیچھے لے جاتا ہے اور بورٹن کے تین
وہ سامنے آتا ہے۔ وہاں میں ایک (CLOSE-UP). ہوتا ہے جس میں اس کی پیٹر والش سے بات چیت رقم ہوتی ہے۔ پھر پیٹر والش

کے لندن میں ستمبر کی صبح ہوتا ہے جب MULTIPLE VIEW کی ترکیب استعمال ہوتی ہے اور کلیریسا کے شعور کو چھوڑ کر ایک ایجنسی کی طرف منعطف ہوتا ہے جو سڑک پر گھستا ہوا کلیریسا کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کے شعور کی رو سامنے آجاتی ہے اور اپنی ذہنی شکست سے بحث پر غور کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اب پھر ایک FADE-OUT ہوتا ہے اور اس کی یاد میں کل شام کی جنگ کی بحث بیٹھ جاتی ہے پھر FADE-OUT ہوتا ہے اور وہ لندن کی موجودہ حالت کا اپنے گرد جمع ہو کر خوش نظر آتی ہے۔ یہاں ایک CUT ہوتا ہے اور موڑ کر پھر وہ بحث برداشت کر رہی ہے حل کردہ باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ پھر FADE-OUT ہوتا ہے اور کلیریسا کے شعور کی رو سامنے آتی کہانی ہے اور وہ بحث بڑی ناداں کے وقت پر غور کرتی ہے۔ وقت تیزی سے بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماضی حال مستقبل FLASH ہوتے ہیں اور کلیریسا ماضی میں پیٹر اور ہیو کے ساتھ نظر آتی ہے۔ پھر CUT ہوتا ہے اور وہ حال میں آکر موسم کی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ پھر FADE-OUT ہوتا ہے اور وہ ماضی میں اپنی قوت کا احساس کرتی ہے۔ اس طرح زیادہ تر شعور کی رو والی ناولیں وہ سب تکنیک استعمال کرتی ہیں جو فلم بنانے والے MONTAGE کے ذریعے میں کرتے ہیں اور اگر فلم تکنیک سے واقفیت ہو تو اس قسم کی ناول کو سمجھنے میں ویسی ہی مدد ملتی ہے جیسی پرانی ناولوں کو سمجھنے میں تھیٹر کی تکنیک سے۔

مگر فلم زندگی کی ظاہری رفتار یا رو دکھا سکتی ہے اور جس حد تک شعور کی رو والی ناول میں یہ دکھایا ہوتا ہے اس حد تک فلم تکنیک اس کا ساتھ دیتا ہے مگر ناول نگار کو شعور کا پوشیدہ اور پراسرار پہلو بھی دکھانا ہوتا ہے نہیں تو اس کی تصویر فلم کی طرح محض سنسنی خیز رہ جائے گی۔ شعور کی رو کے ذریعہ ناول نگار کو اپنا شعور نہیں بلکہ کسی دوسرے فرد کا شعور سامنے لانا ہوتا ہے۔ ہر شعور کچھ انفرادیت رکھتا ہے مگر یہ اس قدر پراسرار ہوتی ہے کہ دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ شعور کی رو دکھانا کوئی بے معنی اور بیکار کا کھیل نہیں ہے اس کا بھی فنی مقصد ہے یعنی وہ تخیلی نقشہ دکھاتا ہے جو معنی خیز ہوتا ہے۔ شعور کی رو والی ناولوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسی باتیں سامنے لائی جا رہی ہیں جو زیادہ سے زیادہ معمہ ہوتی جا رہی ہیں۔ آخر ان کے معنی کیسے سمجھے جائیں۔ کیا ان کے کوئی معنی ہیں بھی؟ ان کو تکلیف دہ حماقت قرار دے کر ترک ہی کیوں نہ کر دیا جائے؟ اصل میں شعور کی رو والی ناول معمہ ضرور ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ جدید زندگی میں ہر چیز معمہ ہے اور بہت زیادہ لوگوں کی تفریح بھی معمے حل کرنا ہے مگر ہر تفریحی معمہ کی طرح یہ حل بھی کی جا سکتی ہے اور حل کرنے کے لیے کچھ اشارے بھی دیتی ہے۔ یہی خاص شعور تیں ہیں جو اسے معمہ بناتی ہیں اور جو یہی سے ہی اس کا حل بھی نکلتا ہے۔

(۱) ذہنی سوچ کا آزادانہ بہاؤ۔ بہاؤ کے مطابق التوا جس سے بے ربطی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعور کی رو بظاہر بے ربط نظر آتی ہے اور ایسے امور سامنے لاتی ہے جو کردار کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو اگر ہم یاد نہ رکھیں تو آگے چل کر اور بھی ابہام پیدا ہوتا ہے اور بے ربطی کا تاثر بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً 'یولیسس' میں بیوپالڈ بلوم ڈبلن میں گھومتا ہوا ایک اشتہار دیکھتا ہے جس میں لیہ نام کا ڈرامہ اکیس مسز بینڈمین پامر کی اداکاری کے ساتھ پیش ہونے کی اطلاع ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے۔ 'میں اسے پھر اس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل رات اس نے ہیملٹ کا پارٹ کیا تھا۔ شاید ہیملٹ عورت تھا۔ اوفیلیا نے خودکشی کیوں کی؟ بیچارے پاپا! کیٹ بیٹ مین کے بارے میں کس طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ ایڈلفی کے باہر لندن میں پوری شام انتظار کرتے رہے تاکہ اندر جا سکیں میری پیدائش سے برسوں پہلے کا واقعہ ہے پینسٹھ۔' یہ پاپا اور پاپا کا اوفیلیا سے تعلق بالکل ذاتی بات ہے مگر یہ تعلق کیا ہے؟ معاملہ

ہے کہ بلوم بھی وہ لمحہ ہے جو اوفیلیہ کی طرح خودکشی کی تھی۔ اس کی یاد بلوم کے ذہن پر طاری دکھائی گئی ہے۔ یہ ناول کے موضوعات سے ہر جگہ بڑی سنجیدگی سے متعلق ہوتی رہتی ہے۔ مندرجہ بالا ٹکڑے میں اس کی طرف پہلا اشارہ ہے۔

۲۔ مسلسل بے ربطی کا تاثر جو صنائع اور بدائع کے استعمال سے سامنے آتا ہے۔ مثلاً یولیسس میں اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کے طویل بیان میں کم از کم پچیس قسم کے صنائع استعمال ہوئے جن کے ذریعہ شعور کی بے ربطی کا عالم سامنے آتا ہے۔ اسٹیفن کا ذہنی عالم ایک منتشر ہو جاتا ہے جو آگے چل کر حل ہونے لگتا ہے۔

۳۔ تمام صنائع سے زیادہ استعارے کا استعمال ہوتا ہے جو اشاراتی یا رمزی سطح پر آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس اصول کو سامنے رکھا جاتا ہے کہ انسانی ذہن کا رجحان اشاراتی ہے اور اشارے [illegible] آج کل ہر قسم کے ادب کی روح رواں ہیں ہر ادیب مخصوص اور ذاتی اشارے استعمال کرتا ہے۔ شعور کی رو والے ناول نگار بھی کثرت سے اشارے لاتے ہیں جو بار بار دہرائے جاتے ہیں اور جن کو مختلف مقامات سے یکجا کرنے سے ایک مکمل اور مربوط تصور یا قصہ بنتا ہے۔ یولیسس میں اسٹیفن کی ماں کی موت اور بلوم کے باپ کی موت کے قصے مختلف مقامات پر اشاروں سے مل کر بنتے ہیں۔

ان ذرائع سے ناول نگار شعور کی بے ربطی کا تاثر بھی قائم کرتے ہیں اور ان پر ایک پوشیدہ ربط بھی عاید کرتے ہیں جس تک پہنچنے کے لیے کچھ ویسا ہی کرنا پڑتا ہے جیسے معمہ والی تصویروں میں مخصوص شکلیں پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتیں مگر ایک دفعہ غور کر لینے کے بعد پھر جب تصویر کو دیکھیے تو وہی سامنے آتی ہیں۔

جو کچھ اب تک ہم نے کہا وہ ناول کے بیانات یا ٹکڑوں سے تعلق رکھتا ہے مگر ناول اور ڈرامہ کا فن خاص طور پر مکمل تصنیف کا فنی ہیئتی پہلو ہے پلاٹ کی تشکیل سے سب سے اہم سروکار ہے۔ اس سلسلے میں شعور کی رو والے ناول نگاروں کا فن سب سے زیادہ پریشان کن نظر آتا ہے۔ اس فن کے سلسلے میں پہلے خیال عام قاری کی طرف جاتا ہے جس کی ناول میں دلچسپی قصے سے ہوتی ہے۔ اور جو یہ چاہتا ہے کہ قصہ ایسا ہو کہ اسے چھوڑنے کو جی نہ چاہے اور بغیر کسی خلا اور تنوع کے چلتا رہے۔ ایسے قاری کو شعور کی رو والے ناول میں کچھ نہیں ملتا۔ ایک صاحب نے قرۃ العین کے "میرے بھی صنم خانے" کو پڑھنے کے بعد کہا: "یہ ناول نہیں مضامین کا مجموعہ ہے۔" ایک اور صاحب نے اس ناول کے "پچھتر" صفحے پڑھ کر کہا: "میں دو سو صفحے پڑھ گیا کوئی قصہ تو شروع ہوتا ہی نہیں۔" ناول میں قصہ یا پلاٹ ہی سب چیزوں کی اہم ترین بنیاد ہوتا ہے مگر شعور کی رو والے ناول نگار اس سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ مگر وہ فارم یا ہیئت بنانے سے بری الذمہ نہیں ہوئے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے مستقل فارم یا ہیئت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اتحاد زمان و مکان کردار اور عمل سے موضوعات کے تناسب سے قدیم اصناف کی نقل سے اشاراتی تشکیلات سے سنجیدگی کی ترتیب سے۔ مناظر قدرت میں تبدیلیوں سے تاریخ کے تسلسل سے یا موسیقی کے آہنگ سے یا اسی قسم کے اور ذرائع سے مکمل تعمیر کا تاثر قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ناول یولیسس ہی ہے جس کو تعمیر کا اہم ترین شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ شاید اس سے پیچیدہ ناول شاید ناول نگار نے بھی کی پوری تاریخ میں کوئی نہ ہو۔ اس ناول میں تین افراد کے شعور کی رو کے مناظر پیش کئے گئے ہیں ایک لیوپالڈ بلوم دوسرا اسٹیفن ڈیڈالس اور تیسرا میری بلوم۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد اپنی جگہ پر بھی بے ربط ہے اور ایک دوسرے سے بھی کوئی ربط نہیں رکھتا۔ مگر جوئس اس کے پیش کرنے کے لیے ایسا ڈھانچہ بناتا ہے کہ معنی یہ مشابہت ہوتی ہے کہ ہیئت اور ہیولیٰ ایک ہو گئی ہے۔ اس ہیئت کی

سب سے عجیب چیز یہ ہے کہ سارا قصہ ایک شہر میں ایک دن (۱۸ گھنٹے) میں ہوتا ہے۔ قصہ ایک ہی وقت میں دو مقاموں پر شروع ہوتا ہے اور گھڑی کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اسٹیفن کے مارٹیلو ٹاور میں اور دوسرا بلوم کے گھر میں۔ اس کے بعد قصہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور گھڑی کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا واقعہ اسٹیفن کے مدرسے میں پڑھانے کا ہے جو دس بجے ہوتا ہے۔ تیسرے قصہ میں گیارہ بجے اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا ہوا جاتا نظر آتا ہے۔ پانچواں واقعہ بلوم سے تعلق رکھتا ہے جو دس بجے حمام میں ہوتا ہے۔ چھٹا ایک جنازے کا سین ہے جو گیارہ بجے اٹھایا جاتا ہے۔ ساتویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں ایک اخبار کے دفتر میں پہنچتے ہیں۔ وقت بارہ بجے کا ہے۔ آٹھویں میں پہلا بلوم ایک بجے کھانا کھاتا ہے۔ نویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں دو بجے لائبریری کو شعر پڑھتے ہیں۔ دسویں میں تین بجے مختلف کرداروں کو دو گھنٹوں میں جاتا دکھایا جاتا ہے۔ گیارھواں بار [illegible] اور تیرھواں بلوم کے فلسفہ و اقیات سے تعلق رکھتے ہیں جو چار بجے سے لے کر آٹھ بجے کے درمیان ہوتے ہیں۔ چودھویں میں اسٹیفن اور بلوم ایک اسپتال میں جاتے ہیں۔ پندرھویں میں دونوں ایک رنڈی خانے میں نظر آتے ہیں۔ یہاں بلوم اسٹیفن کو رنڈی کے چنگل سے چھڑاتا ہے اور اب سے دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سولھویں میں دونوں بہت کچھ قریب گاڑی کے اڈے پر پہنچتے ہیں۔ سترھویں میں دونوں بلوم کے گھر آتے ہیں۔ وقت صبح دو بجے کا ہے۔ آخری قصہ میں بلوم کی بیوی کے شعور کی رو ہے جو اس کے اپنے میاں سے زندگی بھر کے تعلقات کا نقشہ سامنے لاتی ہے۔ اس طرح تمام مواد ایک ڈھانچے میں آ گیا ہے حالانکہ اس کے اندر وہ وہ چیزیں آئی ہیں جو زمان و مکان کے تقاضے کے منافی ہیں پھر یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام واقعات چند لوگوں کے گرد ہیں۔ بنانے کے لیے اشاریاتی تراکیب بھی استعمال کی گئی ہیں جن کی گرفت [illegible] ذہنیں [illegible] ہے۔ یہی محسوس ہوتا ہے کہ ناول کے نام سے یہی نہیں بلکہ ہر ہر واقعہ سے۔ یورپ کی سب میں پہلی عظیم تصنیف یعنی ہومر کے اوڈیسی سے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس عظیم ایپک کی پیروڈی ہے۔ مگر یہ محض پیروڈی ہی نہیں بلکہ تمام انسانی تاریخ کا نچوڑ ہے جس میں تمام اہم مافیات ایک سن رسیدہ آدمی، ایک جوان آدمی اور ایک عورت کے ذریعہ تحریک اٹھانے سے ہوتے ہیں۔ ناول کا ایک "مقصد یہاں بھی فیلڈنگ کی طرح" بلکہ فیلڈنگ سے بھی زیادہ مضبوط طور پر پورا ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ شعور کی رو کا طریقہ محض تجربہ نہیں رہا بلکہ فنی کامیابی تک پہنچ گیا۔

ورجینیا وولف نے اس طریقہ کو کامیاب ہیئت تک پہنچانے کے لیے اسے موسیقی اور شاعری کے پیرایہ سے ہم آہنگ کر دیا اور [illegible] فاکنر نے دونوں کے طریقوں کا امتزاج کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ان کے طریقوں کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پیراؤں میں جن لوگوں نے ساتھ دیا ان میں الزبتھ بوون E. BOWEN گراہم گرین GRAHAM.GREEN کیتھرین این پورٹر KATHRINE ANNE PORTER رابرٹ پین وارن ROBERT PENN WARREN وغیرہ اور ڈی لامیر سواری DELAMORE SAWARI E اور یوڈورا ویلٹی EUDORA WELTY۔ ہمارے یہاں قرۃ العین حیدر نے ان کے تتبع میں قدم اٹھایا۔ مگر ان کی ناولوں کے حصے تو شعور کی رو پر چلتے ہیں مگر کسی ناول میں کوئی ہیئت مجموعی طور پر نہیں آتی۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہ اس جانکاہ محنت کے لیے تیار نہیں ہیں جس نے جوائس اور ورجینیا وولف دونوں کی جان لے کر چھوڑی۔ مگر ظاہر ہے جتنا سیدھا سادا اسلوب ہے اتنا ہی زیادہ توجہ اور محنت کا تقاضا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں شعور کی رو کو استعمال کرنے والے پہلے

مق ربا ہے [illegible] کی بہت سی میں پناہ لینے سے آگے جانے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے اول درجے کو بھی نا سمجھ پروفیسر
د ، رہنے کے لیے موجود ہیں، اس لیے ہر جدید ادب کو فن کر کر عام پڑھنے والوں پر دھونس ڈال دی جاتی ہے۔ یورپ
شدہ [illegible] کے بعد کے ناول نگار اس طریقے کو ترک کر کے پھر پرانے طریقوں پر واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کو پسند نہ کرنے والوں کی
یہ بے کری ایک وقتی ابال تھا۔ مگر جو لوگ ادب کو توجہ اور محنت سے پڑھنے کے عادی ہیں وہ اس میں اس وقت کے ادب کی طرف پہلا
دیکھتے ہیں بلکہ زیادہ تر پڑھنے والے جیمس اور برگساں کے فلسفے سے اسی طرح مانوس ہو جائیں گے جیسے کہ وہ ارسطو اور افلاطون سے
ر ، یا لاشعوری طور پر اس وقت واقف ہیں۔

مدار الدولہ نواب علی نقی خاں

نادم سیتاپوری

ڈاکٹر اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

[illegible] وہ سرحدوں میں گنجائش ہی کہاں تھی جو غداروں کی وہ طویل فہرست کی جاتی جس میں "زینت محل" کا نام بھی آتا ہے [illegible] "حکیم احسن اللہ خاں" بھی جس کو زندہ ہی جانتے ہیں اور "مدار الدولہ نواب علی نقی خاں" بھی ۔۔۔ غیر منقسم ہندوستان کی [illegible] تاریخ کتنی المناک ہے؟ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے محب وطن کا دامن کبھی پاک نہیں رہا۔ [illegible] تاریخ ان کی پردہ پوشی کرتی رہی۔ کبھی کبھی ان کی غداری کا ذکر [illegible] کے ساتھ غداروں کی طرف سے منہ موڑ لیا گیا۔ [illegible] کی بنیاد پڑتے ہی اس کے چاروں طرف "[illegible] دشمن" "جینی جیٹوں" کا جو سلسلہ پھیلا ہوا تھا اسے کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا ۔۔۔ [illegible] سو سال کے اندر ملک و قوم کا جتنا بڑا نقصان ہوا، اس "جینی جیٹوں" کے ہاتھوں ہوا اس کی مثال نہ بنگال کے "جعفر" کے یہاں ملے گی نہ دکن کے "صادق" کے یہاں! ان جینی جیٹوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو [illegible] کے لیے [illegible] رول ادا کیا تھا برطانوی سامراج کے عہد کی تاریخ سازی نے اس کا خاطر خواہ پردہ ڈال دیا ۔۔۔ اور آج کی تاریخ ان غداروں کے نام سے پاک نظر آتی ہے ۔۔۔ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں "لارڈ کلائیو" وغیرہ کے خلاف مقدمات نہ چلائے جاتے تو آج یہ کہنا [illegible] یہ جینی جیٹے وہ پہلے غدار ہیں جو بر صغیر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قدم جمانے کی غدارانہ ذمہ داری سب سے زیادہ [illegible] ہے۔ اودھ کے غداروں میں "نواب علی نقی خاں مدار الدولہ" کا نام تقریباً ایک صدی سے اودھ کے بچے بچے کی زبان پر [illegible] پہنچ [illegible] ہے کہ فروری ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کا الحاق کمپنی کی غدارانہ سازش کا [illegible] نتیجہ ہے ۔۔۔ لیکن [illegible] [illegible] انگریزوں کی [illegible] ہے ۔۔۔ جو غدر سن ستاون کے بعد نواب علی نقی خاں کے ساتھ [illegible] [illegible] کا نام [illegible] سلطان عالم واجد علی شاہ کے [illegible] نواب علی نقی خاں کو [illegible] بات کی [illegible] انگریز دوستی سے [illegible] تھا ۔۔۔

مدار الدولہ ثانی علی نقی خاں [illegible] نواب [illegible] حسین خاں کی [illegible] کے بعد [illegible] وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ واجد علی شاہ بہادر نے [illegible] کے مطابق ایک طویل خطاب سے سرفراز فرمایا ۔۔۔

[illegible] مدار المہام ۔۔۔

مدیر مہام سلطنت مختار الملک ـ گوہر سلسلہ سیف و قلم بازوئے شاہنشاہی ـ مرجع معقول
مورد عنایات الٰہی ـ ادراک صاحب رہنمائے صداقت و وفا ـ مرید مرشد پرست
نیک نہاد و فرزند حقیقت سرشت صفت آئین مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار
رستم ہند معتمد الدولہ مختار الملک علی نقی خان بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جان نثار ابو المنصور
سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زمان سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ
ملکہ و سلطنتہ

"وزیر الملک" مقرر ہونے کے بعد جتنا جتنا تقرب سلطانی علی نقی خان کو حاصل ہوتا گیا اتنی اتنی مخالفت بھی بڑھتی گئی یہاں تک کہ درباری سازشوں کا شکار ہو گئے بادشاہ کی نگاہیں بدل گئیں ــــــ مگر بعد میں صلح و صفائی ہو گئی اور وہ بھی کچھ نئے اکرام و اعزاز کے اضافے کے ساتھ ـ یعنی وزیر الملک ـ مدار المہام ثانی کے ساتھ "سلطان عالم" سے مشتق کر کے "حضور عالم" کے خطاب سے بھی سرفراز کیے گئے؛

علی نقی خان کا خاندان دو سو برس کا دور ہندوستان کے ممتاز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے دادا "مدار الدولہ اول نواب یوسف علی خان" خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد سے تھے۔ مدار الدولہ اول نواب یوسف علی خان کے والد خواجہ محمد موسیٰ کے ایک اور بھائی خواجہ محمد یعقوب بھی تھے۔ انہیں دونوں بھائیوں نے اس عظیم خاندان کی بنیاد ڈالی۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ نے تاریخی حوالوں کے ساتھ اس خاندان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے ـــ

"خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ محمد موسیٰ دو حقیقی بھائی خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے۔ خواجہ محمد یعقوب کو شہزادہ مراد بخش ابن شاہجہاں شہنشاہ دہلی کی بیٹی منسوب تھی اور خواجہ محمد موسیٰ شہزادہ روشن گہر المخاطب بہ نواب سربلند خان کی شادی سلطان معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دہلی کی صاحبزادی "جہاں آرا" سے ہوئی تھی۔ میر محمد امین نے جو آگے چل کر نواب سعادت خان و برہان الملک کے خطابات سے سربلند ہوئے۔ ۱۱۲۰ھ مطابق ۱۷۰۸ء میں ایران سے ہندوستان آکر انہیں نواب سربلند خان کی سرکار میں ستر روپیہ ماہوار پر فراشوں میں ملازمت کی تھی۔"

مدار الدولہ اول نواب یوسف علی خان محمد موسیٰ خان کے بیٹے تھے مگر بطن کسی اور سے تھے۔ چنانچہ سید غلام علی نقوی اپنی تصنیف "عماد السعادت" میں تحریر کرتے ہیں ــــ

"مدار الدولہ اول کے والد خواجہ محمد موسیٰ خان نے ہندوستان آکر معز الدین جہاندار شاہ کی شاہزادی سے شادی کی۔ مگر نواب موصوف شہزادی سے نہیں ہیں۔ شہزادی کی اولاد ہمیشہ قلعہ میں رہتی تھی اور وہ لوگ خواجہ زادہ کہلاتے تھے لیکن غلام قادر خان کی شورش کے بعد یہ لوگ قلعہ سے

نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کچھ حیدرآباد پہنچے۔ بعض راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ چلے گئے
اور دو یا تین لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ مختصر یہ کہ اولاد شہزادوں کے علاوہ خواجہ محمد مرتضیٰ خان کے چند
لڑکے اور لڑکیاں اور بیٹیاں ان میں سے ایک ساما قمر (اقل) اور دوسرے حکیم الدین
اور بہاء الدین ہیں۔" (ترجمہ فارسی)

خواجہ محمد مرتضیٰ کا آبائی مذہب اہلسنت تھا مگر نواب سعادت خان برہان الملک کی صحبت میں مذہب قدیم ترک کر کے امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ برہان الملک نے موصوف کو علاقہ "پچھرٹیہ"[1] متعلقہ خیرآباد (ضلع سیتاپور۔ یو۔ پی) جس سے سالانہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور جاگیر اور "وکیل السلطنت مختار الدولہ بہادر، صمصام جنگ" خطاب بھی عطا کیا۔ .... نواب مختار الدولہ (یوسف علی خان) کی کل بیویوں سے انیس بیٹے اور دو بیٹیاں حسب ذیل تھیں۔

(۱) اسد الدولہ نواب احمد علی خان (۲) حسین علی خان (۳) حسن علی خان جن کے بیٹے زین العابدین خان اور پوتے آزاد علی تھے (۴) عباس علی خان (۵) احتشام الدولہ رئیس الملک محمد علی خان جن کے ایک بیٹے "علی نقی خان" واجد علی شاہ کے زمانہ حکومت مدار الدولہ ثانی کے خطاب سے سرفراز ہو کر وزیر ناظم سلطنت اودھ بن گئے تھے (۶) شریعت الدولہ احمد علی خان جن کے دو بیٹے علی خان اور آرام الدولہ حسین رضا خان کرم الملک اور ایک دختر گوہر آرا بیگم تھیں جو نواب علی نقی خان (مدار الدولہ ثانی) کو منسوب (۷) جعفر علی خان (۸) علی رضا خان (۹) قاسم علی خان (۱۰) مہدی علی خان ...... (۱۱) علی محمد خان (۱۲) میر علی خان

مذکورہ دو بیٹیوں کے ایک کی شادی زین العابدین خان کے بیٹے میر نقی خان سے ہوئی اور چھوٹی بیٹی افضل بیگم بعد شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سعادت علی خان (۱۷۹۸-۱۸۱۴ء) کو بتمام بنارس بیاہی گئیں۔"

(تجلیات اودھ۔ مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ صفحات ۹۴۔)

نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵-۱۷۹۷ء) کے عہد میں اس خاندان کو پہلی بار شدید زوال اور انحطاط سے دوچار ہونا پڑا اس کے حقیقی وجوہ کیا تھے، تاریخوں میں اس کا صحیح جواب نہیں ملتا۔ صرف "احسن التواریخ" میں ایک واقعہ ملتا ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید "آصف الدولہ" اور مختار الدولہ خواجہ محمد مرتضیٰ کے درمیان کوئی تنازع بنا۔ جیسے مصنف کا بیان ہے:

"عمدۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک اعتماد الدولہ آصف جاہ برہان الملک یحییٰ خان اسفندیار جنگ شجاع الدولہ یحییٰ خان "آصف الدولہ" ہزبر جنگ یار وفادار سپہ سالار رستم بند، فدوی شاہ عالم بادشاہ فرزند نواب شجاع الدولہ بہادر عرش منزل نے

۱۔ قصبہ پچھرٹیہ، تحصیل مسرکہ ضلع سیتاپور کا ایک مشہور تاریخی مقام ہے جسے مغل عہد اور شاہان اودھ کے عہد میں عروج حاصل ہوا۔ اب ایک معمولی دیہات سا قصبہ ہے۔

"... میں جو بہت دبیت سالگی کے مسند ریاست اودھ کو زینت بخشی اور لکھنؤ کو ریاست گاہ بنایا۔ اور چونکہ اپنے سرکار کمپنی کے گوروں کو جو ملازم ریاست اودھ تھے برطرف کیا اور بجائے قرار حفاظت اپنے ملک اودھ کے کل علاقات متعلق راجہ جیت سنگھ یعنی بنارس جونپور اور متعلقات اس کے کو ایک ملک مع جمع معہ مال وسائر کے کمپنی کو دے دیا نسبت اس ملک کے بعض معتبرین کا قول ہے کہ نواب سے اس ملک کو "مختار الدولہ" نے جو نائب تھا اپنی کارسازی سے نکلوا دیا۔ لیکن یہ امر ظہور میں نہیں آیا تھا۔"

(احسن التواریخ مطبوعہ مطبع تنانی لکھنؤ ۱۸۷۶ء صفحہ ۴۲)

لیکن مختار الدولہ کی زندگی میں آصف الدولہ اس خاندان کے جبروت و اقتدار پر ہاتھ نہ ڈال سکے شاید اس کا سبب یہی ہو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ان کی پشت پناہی کر رہی ہو؟ لیکن مختار الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ نے ان کے بیٹے مدار الدولہ یوسف علی خان کو چین نہیں لینے دیا۔ اعزاز و مناصب سے بھی محروم کیا "پھر پیٹہ" کی جاگیر بھی ضبط کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی اس ناراضگی یا خفگی کا سبب یہ بھی ہو کہ مدار الدولہ کی صاحبزادی نواب افضل بیگم کی شادی ان کے مختلف البطن بھائی نواب سعادت علی خان کے ساتھ ہوا تھی جن سے آصف الدولہ کے تعلقات تمام عمر ناخوشگوار رہے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف نے لکھا ہے،

"نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان میں بوجوہ چند در چند صفائی نہ تھی۔ اس لیے اوّل الذکر نے مدار الدولہ کی جاگیر "پھر پیٹہ" ضبط کر لی جس پر انھوں نے بندیلوں کی مدد سے فتنہ و فساد برپا کیا چنانچہ فوج شاہی و انگریزی تنبیہ کو روانہ ہوئی اور اسی معرکۂ کارزار میں مدار الدولہ کام آ گئے۔"

(بیگمات اودھ صفحہ ۵۲)

آصف الدولہ کی وفات کے بعد جب نواب سعادت علی خان اورنگ آرائے صوبہ اودھ ہوئے تو انھوں نے بوجہ قرابت ان کی تلافیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ خدمت آبداری نواب مہدی علی خان (فرزند مدار الدولہ) کے سپرد ہوئی اور پرگنہ "پھر پیٹہ" کی آمدنی مدار الدولہ کی اولاد میں بحصہ شرعی تقسیم ہونے لگی۔

"پھر پیٹہ" (ضلع سیتا پور) سے اس خاندان کا تعلق برہان الملک کے عہد سے آصف الدولہ کے زمانے تک مسلسل قائم رہا۔ آصف الدولہ کے عہد میں جب یہ جاگیر ضبط ہو گئی تو "پھر پیٹہ" سے اس خاندان کا بہت کچھ تعلق ختم ہو گیا۔ مختار الدولہ کے زمانے کے بنے ہوئے تعمیرات کے آثار قصبہ "پھر پیٹہ" کے کچھ عرصہ اب بھی پائے جاتے ہیں اور اسی خاندان کا بنوایا ہوا ایک شکستہ امام باڑہ "پھر پیٹہ" میں آج بھی موجود ہے۔

اودھ کے شاہی خاندان سے تو قرابت اس خاندان کو حاصل ہو گئی تھی لیکن سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں جب علی نقی خان مدار الدولہ کے ثانی "مدبر" ریاست کے مسند وزارت ہوئے تو "پھر پیٹہ" کی جاگیر سے دوبارہ ان کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔

کہا [illegible] کی بدولت اسے [illegible] سے جو پایا گیا ہے ہو سکتا تھا۔ [illegible]
کے ساتھ ان کا تعلق ہے کہ چونکہ "مچھر ہٹہ" کے بہت سے واقعات (واجد علی شاہ وغیرہ) میں نواب کے قبضہ و تصرف میں [illegible]
تھا ہے۔ مثلاً جو بہت سے شاہی محلات کے تحت حاصل کیے گئے ہیں ——

انقلاب سن ستاون سے پہلے علی نقی خاں کے منصب جب واجد علی شاہ نے [illegible] میں گفتگو کرنے کے لیے
پاک رکھنے کے لیے انہیں بدلنے "مجبر ملکی" قرار دیا گیا بلکہ ان کا وطنی رشتہ "مچھر ہٹہ" سے جوڑ دیا گیا حالانکہ قطعاً [illegible]
"مچھر ہٹہ" کے لوگوں کی وطنیت سے دُور کا بھی علاقہ نہیں تھا.

مدارالمہام کے خاندان اور فرمانروایان اودھ کے مابین قرابت داری کا آغاز نواب سعادت علی خاں ابن شجاع الدولہ (۱۷۹۸ء - ۱۸۱۴ء) سے ہوا۔ مدارالمہام اوّل نواب یوسف علی خاں کی صاحبزادی افضل بیگم (ہمشیرہ مدارالمہام ثانی علی نقی خاں کی پھوپھی) کا نکاح نواب سعادت علی خاں "وزیر الملک" کے ساتھ ہوا اس کے بعد تین پشت تک کسی خاص قرابت کا پتہ نہیں چلتا ——

قرابت داری کا دُوسرا دور "سلطان عالم واجد علی شاہ" کی تخت نشینی سے شروع ہوا جب مدارالمہام اوّل کے پوتے نواب علی نقی خاں کی صاحبزادی نواب عالم آرا بیگم کے ساتھ شہزادگی کے زمانے میں ہوئی۔ یہ شادی تقریباً فروری ۱۸۴۲ء میں بڑے دھوم دھام سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی۔ دُولہن کو سسرال سے "نواب اعظم بہو" کا خطاب ملا۔ لیکن مشہور ہوئیں "نواب خاص محل صاحبہ" کے نام سے۔ نواب عالم آرا بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک دیوان [illegible] "بیاض عشاق" اور ایک مثنوی بنام "مثنوی عالم" ان کی یادگار ہے ——

واجد علی شاہ بہادر نے مسند آرائے حکومت ہونے کے بعد نواب عالم آرا بیگم کی موجودگی ہی میں ان کی حقیقی چچازاد بہن "نواب رونق آرا بیگم" سے رشتہ مناکحت کی خواہش کی جو مدارالمہام ثانی علی نقی خاں کی بیٹی تھیں —— اسلامی تہذیب اور ہندوستانی رسم و رواج کے خلاف ایک بہن کی موجودگی میں دُوسری بہن کے ساتھ عقد مناکحت بہت ہی مکروہ بات سمجھی جاتی ہے چنانچہ بادشاہ کی اس خواہش پر علی نقی خاں بہت پس و پیش میں پڑ گئے۔ نواب عالم آرا بیگم پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا مگر [illegible] ہٹ کے سامنے نہ بیگم کی کچھ چلی اور نہ علی نقی خاں کی۔ جون ۱۸۴۷ء میں رونق آرا بیگم کے ساتھ دھوم دھام سے شادی ہو گئی [illegible] کا خطاب عطا ہوا۔ پچیس لاکھ مہر قرار پایا۔ صاحب "قیصر التواریخ" کا بیان ہے۔

> "ہر چند کہ حضور عالم (علی نقی خاں) کو پاس خاطر نواب عصمت محل (عالم آرا بیگم) اور بنابر انداز ہندوستان زنانی بھی یہ قربت ازدواج صورت بہت ناگوار تھی مگر [illegible] فرمانبرداری بادشاہ و تمام عمدہ [illegible] منظور تھا۔ علاوہ [illegible] سب [illegible] متعلق اور جناب عالیہ (ملکہ کشور صاحبہ والدہ واجد علی شاہ بہادر) شریک [illegible] تھیں۔ صاحبان محل برائے خوشنودی بادشاہ اس امر کی [illegible] تھیں۔ بہر چند [illegible] نواب عصمت محل کا [illegible] حضور عالم (علی نقی خاں) سے [illegible] ہو گیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم [illegible])

علی نقی خاں اپنے حسن، اخلاق، فیاضی، وسعت قلب، فراخ دلی، مروت، سیر چشمی کی وجہ سے لکھنؤ بھر میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ مذہب کی سختی، قدیم عادت و دینداری کے لوازم بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے یہاں پائے جاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ "حسب معمول" "مجبور" تھے۔ ان کے خاندان میں اس دور عیش و نشاط کی وہ تمام باتیں اپنی بھرپور امنگوں کے ساتھ رقصاں و جلوہ افروز تھیں جن کی جلوہ سامانیوں سے کسی نواب یا رئیس کا گھر اس زمانے میں خالی نہیں تھا۔ اس خاندان کی خداداد خوبصورتی اور حسن اس زمانے کے لکھنؤ میں مثالی سمجھا جاتا تھا اور ترنم تو اس بلا کا تھا کہ اس کے دامن میں سیکڑوں حکایات اور افسانے جنم پا گئے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف جناب شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ تحریر فرماتے ہیں:

> "مشہور ہے کہ نواب علی نقی خاں کا خاندان خوش گلوئی اور خوبصورتی کے لیے شہرۂ آفاق تھا۔ خود ممدوح (علی نقی خاں) کو موسیقی میں بہت دخل تھا۔ اس ہم مذاقی کی وجہ سے واجد علی شاہ کو ان سے بہت موافقت اور مناسبت ہو گئی تھی۔"
>
> (بیگمات اودھ صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۷)

موسیقی تو اس خاندان کے مزاج میں رچ بس چکی تھی۔ اس کے علاوہ شعر و ادب کی اعلیٰ قدروں سے بھی اس گھر کا بچہ بچہ بہرہ یاب تھا۔ خود علی نقی خاں "سید" تخلص فرماتے تھے اور لکھنؤ کے خاص رنگ میں اچھا خاصا کہتے تھے۔ جب "قیصر باغ" کی ادبی صحبتوں کے یادگار ہی سے تاریخ و تذکرے خالی نظر آتے ہیں تو علی نقی خاں کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کہاں؟ اس تاریخی خاندان کے نوادر انقلاب سن ستاون کے بعد ہی گمنامی میں پہنچ چکے تھے اب ایک صدی بعد تو شاید کچھ بھی صفحۂ عالم پر موجود نہ ہو؟ ایک چھوٹی سی کتاب "بزم مجلسی" حصہ سوم مرتبہ عزیز الرحمن میر منشی قلعہ معلی دہلی (شائع کردہ مجیدیہ کتب خانہ کلاں دہلی) میں علی نقی خاں کا صرف ایک شعر ملتا ہے ؎

قربان سادگی کے [illegible] غضب سے
کیا جانے آج کیا تھا کہ سید خفا گیا

"الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) کے بعد نواب علی نقی خاں کے خلاف غداری اور انگریز دوستی کی جو داستانیں عوام میں مشہور ہوئیں، تاریخ کے واضح نقوش میں سے متفق نظر نہیں آتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "الحاق اودھ" کی جبریہ کارروائی سے ٹکرانے کی ان میں بہت ہمت تھی اور بحیثیت وزیر اعظم اودھ، انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں انگریزوں سے نپٹنے کے لیے اودھ کی کمزور اور غیر منظم طاقت کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا جائے؟ وہ اپنی منتشر اور کمزور فوجوں کی جنگی طاقت کا بھی اندازہ تھا اور سلطنت کا اسلحہ [illegible] سے بھی بے خبر نہیں تھے جو پہلی [illegible] قیصر باغ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنگ کا انجام بھی ان کی نگاہوں میں تھا اور میسور کا زوال بھی۔ جھانسی کی انقلابی جنگ اور رانی لکشمی بائی کی شکست ان کے سامنے تھی اور شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی وہ بے بسی بھی جس نے مقابلہ کیا سنہ (۱۸۵۷ء) کے بعد انھیں دلی قلعہ ہی میں محصور کر رکھا تھا۔ علی نقی خاں یقیناً یہ جانتے تھے کہ اودھ کی زبوں حالی میں کچھ نہیں ہے کہ وہ علم کر اپنے [illegible] بھی انگریزوں کا مقابلہ کر سکے۔

تاریخی حیثیت سے تا حال غیر ثابت ہے کہ علی نقی خاں نے اس سلسلے میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی کہ بادشاہ " الحاق نامہ" پر دستخط کر دیں۔ یہ ہو سکتا ہے اس کے اسباب وہی ہوں جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یا پھر اس کا تعلق ان کی فطری کمزوری اور سیاسی نااہلی سے ہو۔ لیکن کسی مستند تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انگریزوں سے اس سلسلے میں انھوں نے کوئی ساز باز کی تھی کیونکہ واجد علی شاہ کے کلکتہ روانہ ہونے کے بعد انگریزوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ انھیں بادشاہ کے ساتھ کلکتہ جانے سے باز رکھ کر کر دیا کہ ابھی ان کے اور وزارت کی حساب فہمی ہونا ہے؛

یہ تاریخی حقائق ایسے ہیں جنھیں سامنے رکھے بغیر ان کے مزعومہ غدارانہ کردار پر مہر تصدیق ثبت کرنا دشوار ہے۔ پھر بھی ان تاریخی حقائق کی چھان بین کے دروازے ارباب تحقیق و تاریخ پر بند نہیں ہو سکے ہیں جو علی نقی خاں کے صحیح کردار تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ الحاق اودھ کے بعد جب معزول بادشاہ انگریزوں کے پہرے میں کلکتہ روانہ ہو گئے تو " وابستگان دولت" میں سے کچھ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ جو کلکتے نہ جا سکے انھیں دشمن نئے حکمرانوں کے جبر و تشدد کا شکار ہونا پڑا، علاوہ ازیں عوام کی بے اعتنائیاں بھی برداشت کرنا پڑیں ——— لیکن جو ذلت علی نقی خاں کی ہوئی شاید ہی ایسی ذلتوں کا سامنا کسی اور کو کرنا پڑا ہو گا۔ کل تک جن کے در دولت کی آستاں بوسی خواص اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے پلک جھپکتے ہی عوام ان کے منہ پر گالیاں دینے لگے ——— وہ گالیاں بھی اتنی غلیظ و گندی کہ لکھنؤ کی روایتی تہذیب سر بگریباں تھی۔ عوام اور " شہدوں" کا تو ذکر ہی کیا؟ ہجو کی گئی اور اس اس طرح پر کہ نہ معزول بادشاہ کے ناموس کا خیال کیا گیا نہ علی نقی خاں کے اس وسیع اخلاق کا! جو چند روز پہلے خواص سے لے کر عوام تک موضوع بحث بنا رہتا تھا۔ غلط ہو یا صحیح؟ یہ رنگین شعر[1] جان صاحب کے نام سے مشہور کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

" اختر محل کو راس نہ آئی شب وصال
ایام کی حنا ابھی سے گدی نکل گئی "

علی نقی خاں کی ذلت و خواری کے کئی واقعات سید کمال الدین حیدر مصنف " قیصر التواریخ" نے لکھے ہیں۔ بادشاہ کی روانگی کلکتہ کے بعد کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

" چار دن کے بعد ایک اشتہار شہر میں لگایا گیا کہ فلاں تاریخ فلاں دن کو تماشائے عجیب رعایائے شہر کو دکھایا جائے گا کہ کبھی کسی نے آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔ ہر شخص کو ایک تجسس تھا ——— آخر روز شنبہ ۵ اپریل کو وقت سہ پہر کے شاہی سے پہلے سواری جناب اختر محل صاحبہ نکلی اس کے بعد حضور عالم (علی نقی خاں) گاڑی دو اسپہ نواب

---

[1] یہ شعر جناب شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ مصنف " بیگمات اودھ" نے سنایا تھا۔ شیخ صاحب تاریخ اودھ کے ماہرین میں ہیں۔ ان کا خیال بھی یہی ہے کہ الحاق اودھ کی کارروائی میں جناب علی نقی خاں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ (خادم سیتاپوری)

مکانات قصر ملک میں منزل وزارت زیب سر ہر طرف سے بگھی گاڑی بند۔ چوبدار چیف کمشنر کو پانچ بخشش (بکس) پر بر آمد ہوئی۔ کئی سوار بھی بحالت کذائی پیچھے۔ کچھ خاص بردار بے اسلحہ لباس کثیف سے گرد و در شاہی سے تحسین گنج تک زبان طعن و تشنیع بیاباں شہر ہر طرف سے بارش بے وقت برسا رہے تھے اگر چہ بہار چیف صاحب ہوتا غالب ہے کہ ڈھیلے اور پتھر بھی بجائے اوسے برستے۔ العیاذ باللہ !"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱٦۸)

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ علی نقی خاں اور نواب اختر محل* کی روانگی کلکتہ کے متعلق بھی "قیصر التواریخ" نے بیان کیا ہے:

"حضور عالم (علی نقی خاں) نے چیف کمشنر سے کئی مرتبہ رخصت طلب کی اور شقہ خاص بادشاہی دکھایا۔ منظور نہ کیا۔ آخر نواب (علی نقی خاں) نے نواب گورنر جنرل کو عرضی ارسال کی۔ حکم حکم باب عدم مزاحمت سفر صادر ہوا۔ بعد اجازت پھر بجائے سفر بہ استخارہ ایمانی پر کی گئی۔ خلاصہ تاریخ شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۵ جولائی حضور عالم مع عیال و لواحقین و ملازمین و رفیقان سر فروش۔ انیس گاڑی ڈاک اپنی و بیس کرانچی بیل واسطے اسباب ضروری نقد و جنس قسم طلا و نقرہ و پشمینہ وغیرہ۔ خوف معروف و خادمان از اثنیہ بعد نصف شب روانہ ہوئے۔

وقت روانگی یہ صورت ہوئی کہ شام سے رفقاء ملازمین در دولت پر حاضر ہوئے حضور خود و حضرتم سواری پر دگیان صحت ہوئے۔ ایک گاڑی میں چار سواریاں زنانی جب سوار ہو چکی تھیں ایک رفیق گاڑی کی چھت پر باسلحہ بیٹھا تھا بعد اس کے خود بدولت گاڑی چار اسپہ پر سوار ہوئے۔ نواب محسن الدولہ نواب جرار الدولہ بہادر بمقتضائے قرابت قریبہ "ٹالکر" چار باغ * ہم پہلو تھے۔

شہر کے شہدوں " نے شام سے دروازے پر ہجوم کیا تھا۔ پچاس روپیہ مرحمت ہوئے کہ آپس میں تقسیم کر لو۔ وقت سواری کے شور و غل نہ مچانا۔ کچھ منہ سے کلمات بیہودہ نہ کہنا۔ لیکن یہ موذی کب ماننے تھے۔ اکثر شہر بھر بازار میں مثل ٹڈی پھیلے ہوئے تھے اور شہر کے بنا کرے تماش بین سر راہ کوٹھوں پر منتظر تشریف آوری تھے۔ جب سواری نکلی شہدے کب اپنی زبان طعن و تشنیع سے باز رہ سکتے تھے۔ غرض جو خدا نے سنوایا سب نے سنا۔!"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۸۹)

* انقلاب لکھنؤ پر نہ نظم لکھے ملتے ہیں نہ نثری تصانیف۔ صرف ایک "مثنوی رشک ماہ تمام" میرے ہی اتفاقات کی زینت دیتے

۱۔ مثنوی رشک ماہ تمام پر میرا مضمون (انقلاب لکھنؤ کی ایک گمنام مثنوی) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ (اسپیشل نمبر) اگست ۱۹۵۰ء میں ملاحظہ ہو۔ مثنوی رشک ماہ تمام کا اصل مخطوطہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ (ادم سیتاپوری)

جس میں علی نقی خاں کے خلاف اسی انداز سے غلط بیانی کیا گیا ہے جس "الاقتدار" کی ذمہ داری علی نقی خان کے سر ڈالی گئی ہے یہ مثنوی ایک غیر معروف شاعر "محمد رضا خاں عاشق" کی ہے جو کہ واجد علی شاہ کی ملازمت کے شاگرد تھے۔ مثنوی کا سنہ آغاز ۱۲۷۰ھ میں ہوا اور اختتام ۱۲۷۲ھ میں۔

مثنوی نگار نے علی نقی خاں کو "عقل کل" کا خطاب دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دیا کچھ نہ شیطان نے اس کا جواب — وہیں "عقل کل" کو بلایا شتاب
معطلی جو خدمت میں اس سے کہا — کہا کیا تھا تم نے جواب یہ کیا؟
دیا سمجھتا تھا میں شکر آ — یونہی چاہیے۔ مرحبا مرحبا
تمہاری نہیں اس میں صاحب خطا — مقدر کا میرے فقط پھیر تھا
دیا عقل کل نے یہ سن کر جواب — خطا اس میں کیا میری عالی جناب
نہیں اس میں کوئی بھی میرا قصور — یقین آپ جانیں اسے اے حضور
میں بیٹا تھا مجھ کو کیا آفتاب — میں تو وہ تھا مجھ کو بنایا سحاب
کروں عرض مختصر گرچہ ہے طول — کرو التجا میری شاہا قبول
کرو اب نہ "درد" اور "زم" کا سوال — مناسب نہیں اس میں کچھ قیل و قال
یہی ہے مناسب جو کرتا ہوں عرض — نظر آتے ہیں اس میں اچھے ہی طور
اگرچہ بظاہر ہیں صورت بری — کرو "مہر" اس میں ہے اب بہتری

لیکن "مسند الاقتدار" پر مہر ثبت کرنے کی ذمہ داری واجد علی شاہ نے علی نقی خاں پر عاید نہیں کی ہے بلکہ انھیں مجبور کیا ہے بس ہیچ قرار دیا۔ مثنوی "حزن اختر" میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

جو وہ "واشد" اور "زمی" اس وقت تھے — سنا یہی انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے — تمہاری ریاست ہے بدنام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ — فقط نام کے تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک لاکھ لاکھ کا — ملے گا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا

علی نقی خاں جو سے تھے وزیر — وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر
مرے دل میں آیا تھا ہر دم خیال — جو ہونا تھا وہ ہو چکا کیا ملال
کرو "مہر" تم اس نامہ پر اب — گئی سلطنت تو گئی بے سبب
مگر سارے لوگوں نے چھوڑا مجھے — ملایا ڈرایا جھنجھوڑا مجھے

رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ — کیا ہم کو اس بادشہ نے تباہ
یہ پالیسی جو وزیر کو خوب ہے — یہ لاتی جو راضی جو صاحب ہے
علی نقی خاں کو دھتا دیا — کہ سب تب طعنہ میں ملا دیا

(مثنوی "حزن اختر" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنو ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۰۷-۲۰۸)

لیکن ———؟

علی نقی خاں کے خلاف اودھ کی روایت عامہ کے اس شدید ہیجان و منافرت کا تعلق نہ تو اودھ کا مسئلہ الحاق تھا اور نہ شاہ اودھ کے ساتھ علی نقی خاں کی غداری ——— اس کا پیچ "پس منظر" حقیقتاً کچھ اور ہی تھا جسے "عہد وزمان" کی قربت نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا کہ علی نقی خاں کی مخالفت کے اصل سبب کو تو عوام نے بھلا دیا اور "افسانوی پروپیگنڈہ" ان کے سارے کردار پر چھا گیا۔

علی نقی خاں کے خلاف منافرت کا جذبہ دراصل "الحاق اودھ" سے چند ماہ پیشتر اس وقت پیدا ہوا تھا جب "ہنومان گڑھی اجودھیا" کی "بابری مسجد" کا ہنگامہ اودھ میں پہلے "ہندو مسلمان تنازعے" کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ ہنگامہ اوّل سے آخر تک ان انگریز سازش کاروں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا جو بنگال اور میسور میں اپنے قدم جما چکے بعد للچائی ہوئی نگاہوں سے لال قلعہ اور قیصر باغ کو دیکھ رہے تھے۔ اس شرمناک سازش کو پروان چڑھانے کے لیے انگریزوں نے کس طرح جال پھیلائے تھے؟ اس کی تفصیلات اس عہد کی تاریخوں میں نہیں ملتیں۔ تاریخ ہمیں صرف اسی قدر بتا سکی کہ "بابری مسجد" میں نماز جمعہ کے وقت ہندو بیراگیوں نے ایسا بم خفیہ نمازیوں پر حملہ کر دیا اور "کپتان آر" اور "جان ہرسی" کی نگاہوں کے سامنے ۲۶۹ مسلمان نہایت بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا حالانکہ یہ دونوں انگریز اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے اجودھیا بھیجے گئے تھے۔ مسلمانوں کے اس قتل عام کے ساتھ کلام پاک کی بے حرمتی ہوئی اور مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔

یہ خونی کشت و خون اور فساد ایسا نہیں تھا جس پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا نہ ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا ایجی ٹیشن شروع ہو گیا جس کا سربراہ "امیٹھی" کے "سید امیر علی شاہ" کو بنایا گیا تھا جو ایک ذی اثر بزرگ تھے۔ کچھ لوگوں نے آئینی راستہ اختیار کیا۔ بادشاہ کے باب انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کچھ لوگوں نے "جہاد" کا نعرہ بلند کیا۔ جہادی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک اجتماعی طاقت حکومت کی مدد کے بغیر بابری مسجد واپس لے لے۔ اس جہادی جماعت کے میر کارواں یہی سید امیر علی شاہ تھے جن کا نام بعض لوگوں نے سید امیر الدین علی شاہ بھی لکھا ہے۔

ایک طرف تو آئینی اور دستوری تحریکات ہو رہی تھیں، دوسری طرف امیر علی شاہ کے نعرۂ جہاد نے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت کو ان کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا۔ بادشاہ اودھ کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ وہ کوئی فیصلہ "ریذیڈنسی" کے ایما کے خلاف کر نہیں سکتے تھے جب بادشاہ کی پالیسی یہ تھی تو ظاہر ہے کہ علی نقی خاں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت کس طرح کر سکتے تھے؟

"قیصر التواریخ" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے دربار میں انگریزوں کے سازش کار ایجنٹوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ بادشاہ اور وزیر اعظم (علی نقی خاں) تو بس برائے نام ہی تھے۔ یہ لوگ جو کچھ چاہتے تھے ہوتا وہی تھا۔ چنانچہ "قیصر التواریخ" کے یہ چند سطور اسی ماحول کی ترجمانی کی تصویر ہیں۔

"ادھر عجیب یہ ہے کہ اسی ہنگامہ میں ایک دن کپتان نیر صاحب نے صمد اللہ متوسل شاہی
سے کہا کہ تم ہمارا پیام بادشاہ وزیر سے جاکر کہدو۔ اجل بر دو شاہی رسید۔ جب یہ تبلیغ رسالت
کی (دا)یا ہمیں دھمکاتے ہیں حسب الحکم شاہی بعض مولوی گڑھی مذکور ماجرا اس معرکہ کپتان
بارلو صاحب کی ضمانت سے دو وقت پر حاضر ہوئے۔ حضور عالم (علی نقی خان) نے
انھیں اپنا مہمان کیا۔ آخر بے خبر اور کوتاہ اندیشوں نے "بہ طمع دنیا" اپنا کام کیا اور انھیں
بسلامت سرکار سے رخصت کر دیا اور بنا بر اپنے بچاؤ کی باتیں اور اٹکل ذہنی تراشیں اور
بادشاہ سے بہ اتفاق ہم زبان ہو کر عرض کیا اور پرچہ پیام مشروط ریذیڈنٹ کو بھیجا کر بنائے مسجد
ہنومان گڑھی میں کسی طرح ثابت و تحقیق نہیں ہوتی . . . . حسب الحکم سرکار
پانچ ضرب توپ فوج تلنگہ و نجیب مع افسران اہل اسلام و کپتان بارلو صاحب و حاجی مرزا حسین
علی کمیدان پلٹن (شاہی) کا گئی یہ سب روانہ ہوئے لیکن حکم ہوا کہ زنہار مولوی صاحب (سید
امیر علی شاہ) کو آگے بڑھنے نہ دینا اور ریذیڈنٹ سے متواتر پرچہ و پیام آنے لگے کہ جلد انسداد اس
فتنہ کا کرو اور حریفوں اور پاشت خوروں نے بادشاہ سے نسبت خلاف مولوی صاحب (سید
امیر علی شاہ) کی باتیں اپنے بچاؤ کی بنا بنا کے کہنی شروع کیں۔ ادھر حضور عالم (علی نقی خاں) سے
خائف تھے اور مستحق تھے اور "حب طمع" بھر چکے تھے پھر کیونکر صاف صاف خدا سے ڈر کر
عرض کرتے۔ غرض پندرہ دن تک مولوی صاحب (سید امیر علی شاہ) وہیں (شاہی مہمان) رہے
اس عرصہ میں مولوی جو سنتے رہے یہی تھا کہ جہاد فدا ہوئے تھے حسب الحکم "حضور عالم" متفق ہو کر
فہمائش کرنے چاہا کہ عام دین کو مرتد کریں اور مسجد عیدگاہ میں گول مول باتیں خوف حاکم
وقت اور خوف جان و آبرو از راہ موعظہ بیان کیں ——— جاہل یہ سن کر سب کے پہلے بگڑ بیٹھے
کہ واہ مولوی تم سب اہل دنیا ہو۔ کل تم نے ہم کو آمادہ جہاد کیا تھا اب حاکم وقت کے
بہکانے سے ہمیں مرتد کرتے ہو اب ہمیں فریب نہ دو۔ یہ فضیلت اہل دنیا جاہلوں کے
ہاتھ سے جاتی رہے گی —— یہ سن کر عوام سے ڈر کر چپکے چلے آئے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحات ۱۲۲-۱۲۳)

مجاہدین کا جذبۂ جہاد بجائے سرد ہونے کے ان باتوں سے تیز تر ہو گیا اور مجاہدین کی ایک بڑی تعداد سید امیر علی شاہ کی سرکردگی میں ایودھیا کی طرف بڑھنے لگی۔

فتنہ و فساد کی روک تھام کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ساری طاقت مجاہدین کے قتل عام پر کمربستہ تھی جس کے ساتھ شاہ اودھ کی فوجیں بھی "کپتان بارلو" کے حکم کی منتظر تھیں چنانچہ جب نہتے مجاہدین "سیاث گنج" سے "رودولی" کی طرف بڑھے تو شاہی افواج "ا،

گریزوں کی کئی کمپنیاں کپتان بارلو کی معیت میں ان پر ٹوٹ پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مسلمان خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ سید امیر علی شاہ بھی سجادۂ طاعت پر شہید کیے گئے اور مقتول مجاہدین کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ لاتعداد معاہدے "سلیمن" کے دورے کی رپورٹ اور شاہ اودھ کے خلاف بدنظمی کی طویل فہرست کے بعد۔ انگریزوں کے سیاسی ترکش کا یہ آخری تیر تھا جو بالکل نشانے پر جا کر بیٹھا۔ مدعا تو اس کا براہِ راست سلطنتِ اودھ کے خلاف تھا لیکن سازش کاروں اور مفاد پرستوں نے دھر لیا علی نقی خاں کو ر۔ جن پر بحیثیت وزیر اعظم بہرحال کچھ نہ کچھ ذمہ داری تو عاید ہوتی ہی تھی ——
اور یہی تھی اصل بنائے مخاصمت علی نقی خاں کے خلاف! چنانچہ چھ مہینے کے بعد، ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو جب الحاقِ اودھ کی کارروائی کا حکم ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علی نقی خاں کے سر عاید کر کے انھیں ہدفِ ملامت بنا لیا گیا۔

اجودھیا کا دردناک المیہ اور سید امیر علی شاہ کی شہادت کا واقعہ جولائی ۱۸۵۵ء میں ظہور پذیر ہوا اور الحاقِ اودھ کے لعنت پر شاہی مہر، ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو ثبت کی گئی۔ چھ مہینے کے اس مختصر عرصے میں علی نقی خاں کے خلاف مسلمانوں کا متحدہ محاذ برابر کام کرتا رہا۔ عام مسلمانوں کے دل و دماغ ان سانحات سے اتنا متاثر تھے کہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا آغاز ہوا اور مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے مسلم عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے انھیں دردناک واقعات کا سہارا لے کر فضا بنانے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کی جنگِ آزادی کے سلسلے میں کسی مورخ نے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا اشارہ اس عہد کے ایک اخبار "طلسم" لکھنؤ میں ملتا ہے۔

"وہ جو احمد اللہ شاہ گھسیاری منڈی میں مقیم ہیں جو چاہتے ہیں زبان پر لاتے ہیں۔ بے خوف و بیم ہیں۔ بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ نئی باتوں کی چھیڑ چھاڑ رہتی ہے۔ اکثر "مولوی امیر الدین علی صاحب" مغفور کا ماجرا یاد کرتے ہیں۔ ہونا کچھ نہیں زبانی جد جہاد کرتے ہیں ۔۔۔"

(بحوالہ نیا دور لکھنؤ اسپیشل نمبر اگست ۱۹۵۷ء)

علی نقی خاں کی اصل مخالفت کا سبب حقیقتاً "اجودھیا" کا المیہ اور سید امیر علی شاہ کا سانحۂ قتل تھا نہ ان کا مفروضہ غدارانہ کردار —— اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مطبوعہ ہجویہ مثنوی ہے جو حال ہی میں مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ سید امیر علی شاہ کے المیہ کے بعد اس سانحہ کے متعلق بہت سی نظمیں اور قطعات کہے گئے تھے جن کا مجملاً ذکر "قیصر التواریخ" نے بھی کیا ہے ——

"مادۂ تاریخ اور قصائد منظوم اس معرکے (معرکۂ اجودھیا) کے بہت سے کہے گئے اور طبع ہو کے سارے ہندوستان میں مشتہر ہوئے ——"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۲۸)

مثنوی "توضیح الشقی فی احوال النقی" انھیں میں سے ایک ہے جس میں علی نقی خاں پر یہی الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے ساز باز کر کے سید امیر علی شاہ کو قتل کرا دیا۔ اٹھارہ صفحات کی یہ مثنوی "مطبع اسلامی محمد اسلام خاں" میں چھپی تھی لیکن اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ مثنوی کس کی کہی ہوئی ہے؟ کس سن میں چھپی؟ اور یہ مطبع اسلامی لکھنؤ میں تھا یا لکھنؤ سے باہر؟

... معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ مطبوعہ مثنوی کا یہ منفرد نسخہ ہے۔ البتہ اس مثنوی کی ایک نقل محب محترم پروفیسر سید مسعود حسن ادیب کے کتب خانے میں ضرور موجود ہے جس میں کچھ ایسی تفصیلات بھی درج ہیں جو اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزری تھیں۔ یہ مثنوی کی نقل نواب ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی کے توسط سے جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب تک پہنچی ہے۔ یہ مثنوی کوئی قدیم مخطوطہ نہیں ہے بلکہ کسی مطبوعہ نسخے سے ۱۹۳۰ء میں نقل کی گئی ہے۔ ابتدا میں ہاتف مرحوم کی ایک قلمی یادداشت بھی شامل ہے جو من و عن درج ذیل کی جاتی ہے:

"یہ نقل ہم نے مرزا محمد عسکری تخلص ستم شاگرد فصاحت صاحب (ساکن رستم نگر) سے کی ہے۔ معلوم ہوا مرزا محمد عسکری صاحب سے کہ یہ مثنوی سروری نعمت اللہ صاحب لکھنوی کی تصنیف ہے اس کی تصدیق فیروز علی خاں ایڈیٹر "اودھ پنچ" ساکن پل غلام حسین لکھنؤ نے کی تھی۔ فیروز علی خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ مثنوی چھاپی گئی تھی مطبع کا اصلی نام نہ تھا بلکہ یہ لکھا تھا کہ "در مطبع گمنام طبع شد" چنانچہ علی نقی خاں نے بہت کوشش کی لیکن کسی مطبع میں اس کے طبع ہونے کا پتہ نہ لگا! یہ بھی فیروز علی خاں نے لکھا تھا کہ مطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ مطبوعہ نسخہ جات میں ایک نسخہ حضرت واجد علی شاہ کے سرہانے اور ایک نسخہ علی نقی خاں کے قلمدان میں ـــــ اور ایک نسخہ علی نقی خاں کی زوجہ کے پاندان کے نیچے جو کسی طرح پہنچا دیا گیا تھا تاکہ یہ لوگ خود بھی پڑھ لیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ سب نے اس کو خود پڑھا یا کسی سے پڑھوایا۔ بہرحال اس تصنیف کے حالات سے وہ لوگ کافی طور پر مطلع ہو گئے تھے۔ اسی بنا پر علی نقی خاں نے مطبعوں میں تحقیقات کرائی تھی۔ جس کتاب سے ستم صاحب نے نقل کی تھی۔ وہ قلمی نسخہ تھا اور صرف اسی قدر تھا جتنی یہ تحریر جنھوں نے بلحاظ صحت خود لکھا ہے اور پھر مقابلہ بھی قابل اطمینان کر لیا ہے۔ لفظ بلفظ صحیح ہے اور ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ تقریظ اصل کتاب قلمی میں موجود نہ تھی جو نقل سے ہم لکھتے ـــ۔

ہاتف عفی عنہ ـ ۳۰ اپریل ۱۹۳۰ء"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز علی خاں کے پاس جو مطبوعہ نسخہ تھا اس پر "در مطبع گمنام طبع شد" چھپا ہوا تھا میرے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے اس پر "مطبع اسلامی" چھپا ہوا ہے! ہو سکتا ہے کہ اس مثنوی کے کئی اور ایڈیشن بھی چھپے ہوں۔ "مطبع اسلامی" نام کے کسی پریس کا عہد شاہی میں پتہ نہیں چلتا!

اس مثنوی کے سن تصنیف یا سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا لیکن یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی "الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) سے پہلے اور معرکۂ جہاد اجودھیا کے بعد (جولائی ۱۸۵۵ء) چھ ماہ کے اندر شائع ہو چکی تھی۔ اس بات کی تصدیق

---

۱ نواب ذکی علی خاں ہاتف لکھنؤ کے علما میں سے تھے۔ ایک مذہبی ماہنامہ "تبصرہ" کے نام سے نکالتے تھے۔ چونسٹھ پینسٹھ سال ہوئے جب انتقال کیا۔

۲ یکم مئی ۱۸۸۰ء کو یہ ہفتہ وار اخبار فیروز علی خاں کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلا تھا۔ (دوام بیتاب چودھری)

اقت کی ان تفصیلات سے بھی ہوتی ہے کہ مطبوعہ نسخے واجد علی شاہ، علی نقی خان اور ان کی بیگم تک پہنچا دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ
ہر شنوی "الحاق اودھ" کے بعد چھپی ہوتی تو اس میں "الحاق اودھ" کے واقعہ کو کسی طرح پر نظر انداز نہ کیا جاتا ـــــــ بلکہ علی نقی خاں
کے خلاف وہ تمام پروپیگنڈہ اس شنوی میں مزید موجود ہوتا جس کا ذکر مولا کیا جا چکا ہے۔

شنوی نگار مولوی نعمت اللہ لکھنوی کا بحیثیت شاعر کیا درجہ تھا، کس کے شاگرد تھے؟ ان تمام تفصیلات سے لاعلمی کے
باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنی اعتبار سے اس ہجویہ شنوی میں کوئی خاص سقم نظر نہیں آتا۔ ہجو میں ابتذال اور حد درجہ سوقیانہ پن ہی اس زمانے
کی ہجویہ شاعری کا ادنیٰ تقاضے کمال سمجھا جاتا تھا پھر جیسا کہ شنوی کے نام سے ظاہر ہے یہ ہجویہ شنوی کہی بھی اسی لیے گئی تھی کہ علی نقی خاں
کے خلاف جی بھر کے دل کا بخار نکالا جائے اور ان کی عزت و ناموس کو رسوا اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔

شنوی اچھی خاصی طویل ہے لیکن کچھ زیادہ اختصار و انتخاب اس لیے ممکن نہیں کہ اس سے صحیح پس منظر کی پردہ کشائی نہ ہو سکے
گی اور یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید ان اجزا کو نظر انداز کر دیا گیا جو اصل موضوع کے خلاف ایسے حقائق پر روشنی پڑتی تھی جو
ابو دھیا کے سانحے اور امیر علی شاہ کے المیہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔

صرف حمد و نعت کے چند اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ جس سے نفس مقصد پر کوئی حرف نہیں آتا۔

شنوی مندرجہ ذیل چھ ابواب پر تقسیم ہے ـــــ

۱۔ حمد۔

۲۔ نعت سرور کائنات۔

۳۔ آغاز شنوی و شروع خطاب بہ نواب شقی۔

۴۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

۵۔ بیان شہادت امیر الشہید بسبب شہادت الوزیر المرید۔

۶۔ تقریظ۔

کل اشعار کی تعداد دو سو پالیس ۲۴۲ ہے جن میں بہت سے اشعار فارسی کے ہیں۔ حمد و نعت کلیتہً فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ بھی
کہیں کہیں تسلسل کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کھپائے گئے ہیں۔

حمد و نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنام خداوند فہم العطیہ   پدید آورد ہرچہ شد ناپدید
گہے ز یزیدے پدید آورد   حسین بہ آل یزید آورد
گہے تازہ فرعون پیدا کند   بہ موسیٰ نو ہویدا کند
خدائے کہ در عرصۂ امتحان   برد تیغ حکمش سر دوستان
. . . .

خدائے توانا خدائے قدیر　　خدائے سمیع و خدائے بصیر
خداوند جسم و خداوند جاں　　خداوند فرماندہ حکمراں

پس از حمد حق است نعت رسولؐ　　شود تا کلامم قسمت بہ قبول
امام رسل و خاتم الانبیاءؐ　　شہ ہر دو عالم وزیر خدا
رسول امم پیشوائے سبل　　حبیب خدا باعث جزو کل
زہے عبد مقبول خاص خدا　　کزاں بندگی شد خدا افتدا
رسولیکہ قرآں ادب زاد است　　امینیکہ جبریل ہمراز دوست

. . . .　　. . . . .

پس از حمد و نعت خدا و نبیؐ　　سہ و چند شعر است این مثنوی
پئے نذر نواب صاحب حشم　　من این نامہ نغز کردم رقم
بود تا بود آسماں برقرار　　مر این نامہ نواب را یادگار
من این نظم کردم بہ اردو زباں　　کہ عقلش بود سہل بر ہمگناں
ہر آنکس کہ وردش کند صبح و شام　　شود بر تنش نار دوزخ حرام

"آغاز مثنوی و شرح خطاب بہ نواب شفق" کا عنوان دراصل ان کے نام "علی نقی" سے متعلق رکھا ہے جس میں مثنوی نگار نے کس قدر معذرت کے ساتھ اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ "علی اور نقی" کے پاک ناموں کا کوئی اثر علی نقی خاں کے کردار پر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کا انکار کیا گیا ہے کہ ایسے شخص کا نام "علی نقی" ہو ہی نہیں سکتا۔

ارے او بنوہان سنگدل شفق　　ترا نام کب ہے علی نقی
بنوہان کے ننگ اسلام　　علی اور نقی سے تجھے کیا ہے کام
رکھے نام پر اون کے وہ اپنا نام　　کہ ہے نام بھی موجب احترام
یہ لائق ہے اوس کو کہ دینا ہے　　وہ ایسے لقب کا سزاوار ہے
مگر تجھ کو اے کافر بے حیا　　ائمہ کے ناموں سے ہے کام کیا؟
خدا کا تو دشمن ہے تو بے یقیں　　ائمہ کا کب تجھ کو ہو گا یقیں
اسے تو تو مردود شیطان ہے　　ترا دشمن دین و ایمان ہے
شقاوت سے تیری مگر اے شفق　　کتاب خدا کی اہانت ہوئی
ہوا غلبہ کفر یہ کچھ میاں　　کہ آگاہ ہے اوس سے سارا جہاں

نہ ایسا کسی نے سُنا تھا کبھی — ہوا تھا نہ ایسا نہ ہوگا کبھی
کتاب خدا اہلبیت نبیؐ — یہ دو جُزو ایمان تھے کل لئے شقی
بنزدِ جفا ہائے قوم جہول — ہوئی اوّلاً قتل آلِ رسولؐ
چنگیز نے تیرے پے جب جلو — کیا قتل آلِ رسالت پناہ
فقط ایک باقی جو قرآن تھا — اہانت کا اوس کی تو باعث ہوا

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

ارے یادگارِ یزیدِ پلید — ارے ابنِ ملجم کے خلف الرشید
ارے او ری حرامی ارے او شقی — ارے او منافق' ارے لعنتی
ذرا کچھ تو شرما تو اے نابکار — خدا کی ہے رات دن تجھ کو مار
یہ بے شرم کی جا کہ اعدائے دین — مہاراج اور ران سنگھ لعین
کریں کفر کی اپنے تائید سب — نہ ہو پاس دیں تجھ کو کچھ بے غضب
ملا ہندوؤں سے جو رشوت میں زر — طمع نے تجھے کر دیا "کور و کر"
ارے عبدِ دُنیا۔ ارے بے حیا — نہ آیا تجھے کچھ بھی خوفِ خدا
با اعلان کہتے ہیں سب اہل کین — لیا مول نوّاب کا ہم نے دین
ارے بے خبر تُو نے یہ کیا کیا — کہ دُنیا کے بدلے میں دیں کھو دیا
ارے گول احمق۔ ارے کورِ نر — ارے دشمنِ دیں۔ ارے بے خبر
ارے نطفۂ ہندوی بُت پرست — بنا کی بہت دین کی تو نے پست
ہنتوں نے دے کر زبے شُمار — کیا رام تجھ کو ارے بد شعار
ہوئی جبکہ توہینِ دیں اس قدر — اور اوس پر بھی تو نے نہ لی کچھ خبر
مسلمانوں کو تب ہوا ناگزیر — کہ ہوں متفق سب صغیر و کبیر
زبس جرم کفر تھا اون کو شاق — کیا اہلِ اسلام نے اتفاق

———

ما (حاشیہ مثنوی) یعنی دیوان رام چرن - ۱۲

بیان شہادت امیر الشہید بسبب شقاوت الوزیر المرید

امیر علی شیعیوں کے امام　　ہوئی غیرت دین اُن پر حرام
جب مرد مجاہد و کرار تھے　　شہامت میں عالم کے سردار تھے
خیال ان کو آیا نہ کچھ جان کا　　فقط پاس تھا اپنے ایمان کا
ہوئے متفق تا کریں انتقام　　کریں جا کے بُت خانوں کا انہدام
بنا مسجد منہدم کو کریں　　مٹا کفر و کفار کو اس سے دیں
وہاں ہو اذان و تکبیر برملا　　بجے خوب ڈنکا وہاں دین کا
سروں کو مخنثوں کے پامال کر　　پھریں خوب سا ان سے تیغ و تبر
ارادت یہ ان کی ہے جزا آفریں　　خدا نے دیا اُن کو سروار دیں
نہ کی کوتاہی دین کے کام میں　　کہ خود وہ مٹے اس سر انجام میں
مگر تھا جو تقدیر کا یہ لکھا　　شہادت انہیں تجھ کو سلطنت
ہزاروں مسلمانوں کے قتل پر　　کہ باندھ لی تو نے اسے بد گہر
ذرا جنگ جب تا تھے سب بیٹھا　　دغا کی دغا کی۔ دغا کی دغا
مسافر وہاں پہ سر راہ تھے　　تری اس دغا سے کب آگاہ تھے
وہ وزیرا تیسرا جو ہے بار نو　　کرانی کا بچہ حسد کا عدو
جدا راہ میں اس نے دھوکا کیا　　کہ غفلت میں توپوں سے اڑوا دیا
نہ تھا ایک جا لشکر اہل دین　　کوئی تھا کہیں اور کوئی کہیں
فقط چند تھے گرد و پیش امام　　صف جنگ میں صرف تھے وہ تمام
جو ہوتے وہ سب لشکر یک جا　　تو پھر "بارلو" کو چکھاتے مزا
فقط سات سو تھے یہ ایسے لڑے　　کہ سب برق ساں توپ پر جا پڑے
مقابل ہوئے جب وہ کفّار سے　　لیا چھین توپوں کو تلوار سے
ویران دین حسد اور ہوئے　　وہ پیکار جو سب دلاور ہوئے
ہوا سامنا فوج مقہور کا　　تقابل ہوا ظلمت و نور کا

کپتان بارلو

چلے مد توپوں پہ تلوار کے | اڑائے دھوئیں فوج کفار نے
ہوا تھا غلغلہ جب کہ تکبیر کا | تو منہ پھر گیا قوم بے پیر کا
جو رن چھٹ گئے فوج کفار کے | نہ ٹھہرا کوئی منہ پہ تلوار کے
سنو جس طرف شور تھا بھاگ بھاگ | نہ سیماب ٹھہرا چلی جب یہ آگ
جلے وہ پہلے تھے جو نیزوں سے بھاگ | ہوئی آب تلوار کی ان کو آگ
وہ دریا سے امڈی تھی فوج زرہ | یہ تیغیں بنیں ماہی بحر خوں
وہ نیزے وہ شمشیریں اور وہ خدنگ | یہ سب پی گئے بحر خوں کے نہنگ
چمکتی تھیں واں جتنی تیغ و سناں | گراتی تھیں کفار پر بجلیاں
کیا غازیوں نے جو دہاوا وہاں | فلک نے کہا الاماں الاماں
یہ تھا دم بہ دم فوج اسلام کا | کہ دم بند تھا رستم و سام کا
نہ تھے چند[1] سے گو ہوئی کارزار | مگر سب عینوں کا تھا کارزار
جو تھے کافروں میں بچے تا جنگ | ہوا عرصۂ زندگی ان پہ تنگ
بہ شمشیر و خنجر بہ تیر و تبر | شد از کار بسیار را پا و سر
بسوم جگر دوز و گرز گران | یکے کشتہ بیجان۔ یکے نیم جان
چو چار آئینہ پوش کان یک قلم | بہ تیغ دو دم رفتہ سوئے عدم
بسے پہلوانان لشکر شکن | گریزاں شدہ از نہیب بزن
چو دادند جنبش گران گرز را | بجان لرزہ افتاد البرز را
بہ تیغ سفاہان مغفر شگاف | کہ از فرق بشگافتہ تا بناف
بسا زخم دادہ بجنبد دست | کہ از دست افتاد بسیار دست
ز دود سیہ شد نمودار تیغ | چو برق درخشندہ از تیرہ میغ
بہ تیغ دلیران ہنگام جنگ | شدہ رابکان جلد توپ و تفنگ
ز اللہ اکبر چنان نعرہ ہا | کہ گوش فلک کر شدی بر سما
بپا گشتہ ہنگامہ رستخیز | نہ جائے فرود نہ پائے گریز
ہوئے اس قدر کشتہ پیر و جوان | کہ بہنے لگیں خون کی ندیاں

---

[1] توپ چند۔

جو اس بھیس میں خوں پر گیا بارلو — ہوئی موج بہنے لگا وہ لہو
زمیں جوش میں تھا وہ طوفان خوں — ہوئے غرق سب کافران زبوں
غرض سیکڑوں واں پھنسے تھے لعیں — کیے واصل اسفل السافلیں
دیا چھین توپوں کو اک وار میں — پڑا تہلکہ فوج کفار میں
وہ لشکر وہاں سے فراری ہوا — عجب خوف اسلام طاری ہوا
وہ سب بھاگ نکلے ذرا دیر میں — پڑا فرق ہے دو بکشیر میں
نہ توپیں رہیں اور نہ گولے رہے — وہ جرّار تلوار تولے رہے
نیامد دگر کس دراں رزمگاہ — کہ آید بہ پیش یلان الہ
امام زماں سید امیر علی — کہ تھے اشجع الناس حق کے ولی
دلیران عالم کے سردار تھے — وہ کھینچے ہوئے رن میں تلوار تھے
یہی کہتے تھے ہاں بڑھے جائیو — یہ ہے موقع امتحاں بھائیو
اگر چاہتے ہو بچو نار سے — نہ موڑو یہاں منہ کو کفار سے
کھلے ہیں یہ در ہائے جنت تمام — ہے تحت السیوف آج دار السلام
دلیروں نے جس وقت حملہ کیا — تلنگوں نے ہیبت سے منہ پھیر دیا
تلنگوں نے لی جبکہ راہ فرار — تو پھر "بارلو" نے بلائی "گمار"
ہوئے مجتمع تب ہزاروں گنوار — لگی ہونے ہر سمت سے مار مار
معینوں نے بل کرکے زرغہ کیا — انھیں زور پر چار سو سے دھر لیا
عقب سے کئی توپیں لا کر وہاں — لگے چھرے برسانے پھر ابر ساں
ہوا آخر کار ان کو شہید — مظفر پھری واں سے فوج یزید
ترے ظلم سے ظالم رو سیاہ — ہوئے قتل کیا سیکڑوں بے گناہ
ہوا "بارلو" شمر اور تو یزید — امیر علی چوں حسین شہید
بھلا تو تو اے کالے بد یقیں — مسلماں کہتا تھا اپنے تئیں
یہ کیسا مسلماں ہے تو اے شقی — کہ اسلام کی تجھ سے ذلت ہوئی
بتا نیہ کفر اور یہ دعوائے دیں — ہزار آفریں صد ہزار آفریں
مگر . . . . واقعی ہے تو نے جیا — کہ ہے اپنی ہی فوج کو مارتا
یہی تھا گر اسلام کا مقتضا — یزید لعیں بھی مسلماں تھا

ارے دشمنِ دین اے بدنہاد
بلاشک ہے تو ابنِ ابنِ زیاد

نہیں تجھ کو ہرگز اگر پاسِ دین
تو کچھ دل میں خوفِ خدا بھی نہیں

عدالت اسی کی تھی کیا مقتضیٰ
کہ ہو مستغیثوں کی گردن زنی

وہ بے دین و غافل ترا بادشاہ
تو اس کا وزیرِ ضلالت پناہ

وزیرے چنیں شہریارے چناں
جہاں چوں نگیرد قرارے چناں

وزارت سے واقف تو ہرگز نہ تھا
مگر دے کے جورو کو بھڑوے دغا

کہ اس مال زادی نے او بد شعار
زنا سے جنیں بیٹیاں بے شمار

بہت آپ کو تو نے رسوا کیا
ولیکن ترے حق میں اچھا کیا

وہ سب بیٹیاں کام آئیں ترے
رئیسوں امیروں کو ڈولے دیے

کئی ان میں بھیں نذرِ شاہِ اودھ
وزارت ملی تجھ کو بے جد و کد

بدولت ...... کے اے بے ہنر
کیا تو نے حاصل یہ سب مال و زر

ہیں آخت بھلی جب سکندر شاہ
ستارہ ترقی پہ ہے سال و ماہ

تکبر تجھے کیوں نہ ہو جاہ کا
کہ سسرا ہے واجد علی شاہ کا

میں قربان اس جاہ و جبروت کے
وزارت تصدق میں ہے ...... کے

بہت تو نے تدبیر معقول کی
کہ بیٹی کو دے کر وزارت یہ لی

اب اک اور دے دے ریزیڈنٹ کو
کہ جس میں وزارت کو جنبش نہ ہو

ہوئی جب سے تجھ کو وزارت نصیب
ترا حال ہے کچھ عجیب و غریب

نہ پایا تجھے ایک دم ہوش میں
رہا رات دن خوابِ خرگوش میں

نہ خوفِ خدا ہے نہ پروائے دین
نہ دنیا کی ذلت کا پاس اے لعین

مگر تجھ سے سرگرم صبح و مسا
اطاعت میں جورو کی ماں سے سوا

اور اس کا بیاں کیا ہو جو حال ہے
کہ سارے جہاں کی بد افعال ہے

کسی سے نہیں اس کا بہتر لبھا
نہ تسکین ہوا تیری گر ار دلی

گھیے، فیل و خر بھی اسے یاد ہیں
تو سمجھے وہ ان سب کو مانندِ خس

مگر کیا دلیری و جرأت ہے واہ
کہ ان سب سے ...... نکلی نہ آہ

کسی طرح اس میں نہیں ہے شک
کہ ہے اس کو بیمارئ آتشک

فرنگی کا شاید ہوا تھا گزر
کہ باقی ہے اس کا ابھی تک اثر

کہیں جھلکا پور سے رنگی ہوئی — کہ واقف یہ نادر سے رنگی ہوئی
زمانے میں جاری یہ شہرہ ہے — کہ اک... میں دس سکا سکھا ہے
جب اخلاق تب اسود یا اپنے پاس — وہ بے چین ہو کر نہاتی تھی غسل
ہے آثر بیاں غایت حسین — علاج اوس سے کرتیا تب یا میں
ہوا ذاکر اپنے احسان ہوا — کہ مرہم ہوا زخم پنہاں ہوا
وہ بیتاب ہونے سے بس رہ گئی — جو اسکد میں اوس کے بچی گئی
سوا اوس کی شیریں بدنے تقتبان — کہ قائم جھلملا رہی ہے بیگم کا جہاں
میں آگاہ اس سے ہیں خلق عام — کہ ہے گھر میں تیرا وہ قائم مقام
خود اک روز اس نے تسلے دیا — تشکر سے اس طرح کی گفتگو
خدا تجھ کو دنیا میں دائم رکھے — سدا تیرا جور و کرم قائم رکھے
ارے اے حیا دشمن بد شعار — تو ساقی ودو پوشیدہ رنگ تھا
نہ اس پر بھی آئی تجھے کچھ حیا — سمجھ کر کے تو نے غضب ہی کیا
نہیں تجھ کو پوشیدہ ہرگز یہ راز — کہ جور و کرم ہے تیری دھار سے ساز
کہ آرتی ہے تجھ سے ہم سدا — کہ قائم ہے کیا سالے ور با خدا
ارے بے تمیز تجھ کو نہیں کیا تمیز — کہ قائم ہے کیوں اس کو اتنا عزیز
یہ تعریف خوبی جسے نام ہے — لسے ورع و تقویٰ سے کیا کام ہے
نہ کچھ وصف قائم ہے خوب ہے — فقط نفس قائم ہے مرغوب ہے
لسے اس لیے اس طرف میل ہے — کہ اوسکا (ہی) ذکر قائم اقبل ہے
کہاں تک کروں تیری جور و کا حال — کہ قصہ زمانے کا ہے وہ جنجال
کسی سے نہیں اوس کو خوف و ہراس — سمجھتی ہے میں بادشاہ کی ہوں پاس
رعایائے سلطان ہیں سب اس کو پیش — جو بیگانہ ہیں وہ ہیں اپنوں سے بیش
جمعیت جس صورت اس کی حاصل ہوئی — تمنائے دل خوب حاصل ہوئی
جو جیا سٹی کی اوس شہر کی جستجو — ملا ایک سے اک جوان خوبرو
جسے ملنے لگے اوس کو خوش رو جوان — ترقی منور تمہاری ہی تھا

۱؎ تصور کا مشہور بھانڈ

الفت اپنے یاروں سے جیش مدام　　تجھے یاس حسرت سے رہتا ہے کام

دہن جوتیوں کا لاڈ اسے ابکار　　ترے سر پہ رہتا ہے ہر دم سوار

ملاحت میں اوس کی تو سرگرم ہے　　جو وہ سخت ہے تو بھی تو نرم ہے

تما تنے ڈھے نکلتا ہے گز　　کہ بجھے نہ وہ آتش جان سوز

غرض انتہا کی وہ بے باک ہے　　بڑی بیسوا اور چالاک ہے

الفت سا تو وہ فعل بد سے بکار　　شب و روز ہے اوس پہ شیطاں سوار

بد آئین و بد وضع و مکار ہے　　وہ سارے زمانے کی عیار ہے

یہ سب کچھ ہے لیکن بے انصافیوں　　بیان حقیقت ہے اب صاف یوں

وہ گو راغب فعل معیوب ہے　　مگر پھر بھی تجھ سے کہیں خوب ہے

اگر فعل بد کرد آں بد نہاد　　دل بندگان خدا کرد شاد

تو آں فعل بد ہم نہ چنداں بد است　　کہ آبد دل بندگان زان بد است

کہیں اوس نے وہ مردم آزاریاں　　کہ جن سے کریں مردم آزاریاں

چہ ارباب کفر و چہ اصحاب دین　　کسو کو ضرر اس سے پہنچا نہیں

شریف و خوش اطوار رند و خراب　　سبھوں نے ذات سے اوسکی سب فیض پا

نہیں کچھ تری طرح سے وہ لئیم　　تری بہت بیشک وہ بنت کریم

نہیں اوس کو امساک ہرگز ذرا　　کہ ہے چشمہ فیض جاری سدا

وہ خلق و سخاوت پہ باندھی کمر　　کہ شاہ و گدا سب گئے اوس کے گھر

بنے درگاہ اوس کی مہبط احترام　　کہ جھکتے ہیں جا کر جہاں خاص و عام

کسی سے نہیں اوس کو انکار و عار　　وہاں سب کا ہوتا ہے اصلاح کار

مجرد بہ یکسو ز بیں بارگاہ　　چہ روئے سفید و چہ بخت سیاہ

ہر آں اہل حاجت کہ خواہد... !　　کند از درش خواہش دل حصول

ذلیلوں کو اوس نے وہ بخشا وقار　　پیادوں کو بھی کر دیا ہے سوار

وہ با غرض بد کار و قحبہ سہی　　مگر حق تو یہ ہے کہ کسبی ہے غنی

سخاوت مس عیب را کیمیاست　　سخاوت ہمہ درد ہا را دواست

وہ ہر چند بد وضع و بے آب ہے　　مگر دشمن دیں نہ زنہار ہے

اگر مرتکب وہ زنا کی ہوئی　　گنہگار اپنے خدا کی ہوئی

مگر تُو نے اے ظالم بد شگون — کیا سیکڑوں بیگناہوں کا خون
کیا اوس نے ظلم اپنے ہی نفس پر — ہوا تجھ سے خلق خدا کا ضرر
کیا اوس نے صرف جنگ ناگہاں — ہوا کار اسلام تجھ سے تباہ
خدا تجھ کو غارت کرے اے شقی — کہ تجھ سے ہوا گبر و بدخواہ دین
جو دیندار ہو وہ ملامت کرے — تجھے جلد اللہ غارت کرے
بحق تو اے دشمن مومنان — مرا قول سے سعدیست حسد و زبان
مُبارک ملی آن فسرا ای شاد — کہ از بہرۂ نیاد و دین تیاد
الٰہی کیا جس نے دین کو تباہ — ہے وہ بھی کہ زمین میں زدیا
ہے جب تک کہ زور میان جنگ — ہے جب تک کہ گرم روز گار
جلو ہے جب تک شعلہ در — گشادہ ہو جب تک کہ باب سقر
وہ کفر خدا میں گرفتار ہو — خدا کی لعنت اس پہ ہر بار ہو
شب و روز وہ رنج میں مبتلا ہے — کف یاس و حسرت میں ملتا ہے
سرش مطرح قہر جانکاہ باد — دلش مورد لعنت اللہ باد

تقریظ

ہیں ایک بزرگ بہاں یگانہ — بے مثل ہیں اوحد زمانہ
شاعر ماہر بڑے سخن گو — مالک ہیں عطا نظم و نثر کے دو
کامل ہیں یہ وہ بلکہ اکمل — سب شاعروں سے جناب افضل
ہوتا ہے کلام اون کا کیا واہ — اقلیم سخن کے ہیں وے شاہ
ذی مرتبہ ذی صفات والا — مقبول جناب حق تعالیٰ
ممکن نہیں مجھ سے اون کی توصیف — ہو سکتی نہیں ہے مجھ سے تعریف
کیا خوب یہ مثنوی لکھی ہے — اور ہر کی داد خوب دی ہے
ہے جنگ کی ہر ہر جا خوب توضیح — اور حال شقی کی خوب تفضیح
جو کچھ کہ بیان واقعی ہے — کچھ اپنا مبالغہ نہیں ہے
پر ایک سے اوس کا گیا ہے — تحریر وہ اس میں سنا ہوا ہے
قبل اس کے نہ تھی جسے امارت — بیٹی کے عوض ملی وزارت

اس پر بھی صبر نہ اس کو آیا — رشوت کا مال خوب کمایا
دنیا کے عوض میں دین کو کھویا — اس خرچے تو دونوں کو ڈبویا
جا کر کوئی پوچھے اس شقی سے — یعنی نواب علی نقی سے
بتلا تو ذرا مجھے تو اے حشر — کیا تجھ کو بھلا تھی حاجتِ زر
نوابی پر بھی ہو نہ قانع — نیکی بھی ہوا تو ان کو مانع
ہر چند کہ تھی نہ حاجت اس کی — کھٹے کے اثر کو کیا کرے وہ

دینار و دراہم فراواں
رکھتا تھا وہ نطفۂ حیوان

لکھنؤ کا عروج و زوال

ڈاکٹر مسعود نیر رضوی

۱۷۷۵ء سے پہلے کی جس تہذیب کو ہم اودھ کی تہذیب کا نام دیتے ہیں وہ دراصل بیشتر سلطنتِ لکھنؤ کی تہذیب تھی۔ لکھنؤ کے قریب تر شہر چھوٹے چھوٹے تہذیبی مرکز خیال کیے جاتے تھے لکھنؤ سے بہت مختلف تھے۔ شجاع الدولہ کے عہد تک اودھ کے حکمرانوں کا مستقر فیض آباد تھا اور لکھنؤ دربار کی رونق میں صاف نظر آتا تھا لیکن شجاع الدولہ کے فرزند آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالحکومت بنالیا۔ اس وقت سے لکھنؤ کی ترقی اور خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور اس عظیم شہر کا مستقبل بہت تاریک اور خطرناک نظر آ رہا تھا۔ لکھنؤ کی دولت و حشمت دیکھ کر دہلی اور دوسرے مقامات کے اہلِ کمال اور معززین نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس شہر کو مختلف حیثیتوں سے مالا مال کر دیا۔

اسی برس تک لکھنؤ کے چراغ کی لو تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ آخر واجد علی شاہ کے عہد میں انتزاعِ سلطنت (۱۸۵۶ء) کے بعد اس کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ اور اب کمال لکھنؤ چھوڑ کر دوسرے قدر دانوں کی تلاش میں نکل گئے اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ پر زوال آ گیا۔ عروج و زوال کی داستان کچھ اس طرح ہے:

(۱)

آصف الدولہ اور اودھ کے جانشین سعادت علی خاں کے زمانے تک اودھ مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں کے حکمراں سلطنتِ مغلیہ کی طرف سے اس پر حکومت کرتے تھے اور مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے ان کا لقب "نواب وزیر" تھا۔ اصولاً انہیں مغل بادشاہ کی چشم و ابرو کے اشارے پر چلنا چاہیے تھا لیکن اب یہ نیابت فقط برائے نام تھی۔ حقیقتاً اودھ کے حکمراں خود کو دہلی سے آئے ہوئے احکام اور ہدایات کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اس صورتِ حال کے ذمہ دار ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ دار تھے۔ جو نواب وزیر اور بادشاہ دہلی کے درمیان حائل تھے اور پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خاموش تہیہ کر چکے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ نہایت منظم اور مکمل منصوبے بنا کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ عمل کر رہے تھے اور بادشاہ اور نواب کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تعلقی انہیں منصوبوں کا ایک جز تھی۔

دہلی اب بھی ہندوستان کا دارالسلطنت اور مغل بادشاہ اب بھی ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اب اس کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور مغلوں کی بادشاہت ختم ہو رہی تھی۔ اس تنزل کا سبب انگریزوں کے دخل در معقولات کے علاوہ یہ بھی تھا کہ خود مغل حکمراں وہ خوبیاں کھو چکے تھے جو تیمور گورگان سے لے کر بابر اور اکبر اور ان کی تہذیب کی رگوں میں دوڑ رہی

۱۔ سوانحاتِ سلاطینِ اودھ میں سید کمال حیدر دارالحکومت کی منتقلی کو ۱۷۷۵ء کا واقعہ بتاتے ہیں لیکن دوسری تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں مسند نشین ہوئے اور بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسند نشینی کے پہلے ہی سال لکھنؤ میں قیام مستقل کر دیا۔

...عظم کے جانشین بزم پر رزم کو قربان کر چکے تھے۔ ان کی فعالیت ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کی جنبشیں کٹھ پتلیوں کی طرح تھیں جن کی ڈوریاں انگریزوں، سیٹھوں، مرہٹوں اور جاٹوں، روہیلوں، سبھی کے ہاتھوں میں آتی رہتی تھیں اور ان کے بازی گروں میں اپنے فن کے سب سے زیادہ ماہر انگریز تھے جو دھیرے دھیرے پورے ملک کی سیاست پر چھائے چلے جا رہے تھے۔

آصف الدولہ کے عہد تک اودھ پر بھی انگریزوں کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکنے کے لیے ضروری تھا کہ نواب وزیر کو اپنے قابو میں لائیں۔ یہ مقصد کئی طریقوں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ نواب کو اپنا ممنون کر کے، اپنا محتاج بنا کر یا اپنے سے مرعوب کر کے۔ انھوں نے پہلی صورت کو مصلحتِ وقت سمجھ کر آصف الدولہ کو ان کی ماں بہو بیگم صاحبہ کی کثیر دولت دلوا دی۔ آصف الدولہ انگریزوں کے ممنونِ احسان ہوئے اور اخلاقاً ان سے دوستی نبھانے اور مختلف طریقوں سے ان کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں پر بھی یہی حربہ کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے وزیر علی نے مسندِ نیابت پر بیٹھنے کا قصد کیا۔ لیکن انگریزوں نے ان کو ہٹا کر شجاع الدولہ کے بیٹے سعادت علی خاں کو مسند نشین کیا۔ یوں سعادت علی خاں کا اقتدار بھی انگریزوں کی بدولت قرار پایا اور خود ایک جوہرِ قابل ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کی مرضی کا پابند ہونا پڑا۔

سعادت علی خاں کے بیٹے غازی الدین حیدر نے نیابت ملنے کے بعد ۱۸۱۹ء میں "ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ غازی" کا خطاب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اب اودھ صوبے سے ملک ہو گیا اور مغلیہ سلطنت سے برائے نام تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اس انقلاب کے پس پردہ بھی انگریزوں کی حکمتِ عملی تھی۔ اور یہ اقدام انھیں کے فائدے سے کامیاب رہا۔ اس کے بعد سے اودھ کا ہر بادشاہ شاہِ شطرنج تھا۔ ملکِ اودھ میں انگریزوں کی حیثیت شریکِ غالب کی ہو گئی اور اب سیاسی اور مالی معاملات کا کیا ذکر، بڑی حد تک اپنے نجی معاملات میں بھی اودھ کا بادشاہ ان کی دخل اندازیاں روکنے پر قادر نہ رہا۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے قطع نظر اودھ کے نظامِ سلطنت میں خود بھی کمزوریاں تھیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے عمال برسرِ اقتدار آ جاتے تھے جو اپنے منصب کے اہل نہیں ہوتے تھے اور محض سفارشوں اور تعلقات کے بل پر منصب حاصل کر کے نظم و نسق کو زیر و زبر کر ڈالتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے امجد علی شاہ کے عہدِ سلطنت کی تصویر یوں کھینچی ہے:

"حکومت ضعیف، نیا طور ہوا۔ اس دولت میں رنڈیوں کا دور ہوا۔ ۔ ۔ ۔ قوتِ ممیزہ شہر سے اڑ گئی۔ کسی کو ماں نے مدد سالار نہ چھوڑا، بیٹا رسالدار تھا۔ کسی کی بہن نے پیشہ سے منہ نہ موڑا،"

١۔ وزیر علی کو گرفتار کر کے کلکتے میں قید کر دیا گیا جہاں چھتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور سلطان شہید ٹیپو کے بیٹے کے قریب دفن کیے گئے۔ (سوانحات ص ۲۴۷) وزیر علی شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ شعر ان کے حسبِ حال ہے:

جوں سبزہ زمانے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گلشنِ شاداب میں پھولے نہ پھلے ہم

٢۔ اب یہ لفظ عصمت فروش عورتوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے لیکن پہلے یہ عام عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

نالا سالار ہوا...... غیرت نے منہ پھیر لیا۔ ایک کو دوسرے سے کینہ ہوا......
یہ رسم تو بڑی تھی جس کا جو حصہ جتنا ڈیہہ پاتا تھا، ٹھیکہ کار آزمودہ ڈھونڈھا جاتا تھا...... اب
تو یہ خود مبحث ہوا۔ جہاں کو نیزہ بازوں کا سالار کیا، جسے دیکھ کر بے حد پریشانی جہمار کیا۔ جو
چھچھوندر چھوٹنے میں بڑا پھول ستے تھے، چکاری کے بجائے جلوے سے منہ موڑتے تھے۔ اب جو
ایک مدہ پھلجھڑی سی پٹاخا تیار کرکے محل میں چھوڑ دی (جیسے کوئی حسین لڑکی بادشاہ کے حرم میں داخل
کی) "آتش خانے کے دارو غہ ہوئے...... گر پیش خدمت بشیر ہے تو بادہ عزیز حضرت
(بادشاہ) کا مشیر ہے۔ خالہ خلوت میں پائیں نشین، بابا جلوت میں صدر امین۔ آفت سرکار میں،
ربی وخبار میں ہو۔ جس کی اندھا دھند لاٹ کی ہے اس کی ہر سو دہری بھٹے کی قدر کی ہے۔ دکر مقصد رس
تا انصاف تو کا نشانہ داڑھی گھمنڈی زیر زبان ہے، وزیر کی محل کی گلیوں میں گرم جوانی ہے......
اور جس کی رشتہ داری داستانی ہے وہ سب پر سبقت لے گیا...... جان کے فیصلے کر بیٹھے ہوتے
ہیں...... ہر دم ہر زبان یہ سخن ہے، "الملک والملک رو سیاہ کی بھی ہے!...... ؎

آگے چل کے لکھتے ہیں:

"سلطنت سمرقندی کا جو حال ہے، وہ محل سے مسافروں کی راہ چلنا محال ہے۔ وہاں دیہے بستیوں میں
ڈاکے پڑتے ہیں۔ ملک اجاڑ ہو گیا ہے...... چلا وہ اپنا گھر بھرتے ہیں۔ گاؤں خالی ہو گئے
جنگل میں زمین دار مرتے ہیں۔ قبولیت میں کچھ تھا، پٹے میں کچھ اور ہے...... مزروعہ زمین
بیکار پڑی ہے۔ اور جبر کا ایک بہانہ ہے...... رعیت کا گلہ ہے اور چھری کا گھمنڈ ہے۔ بد معاش
تیز اور قہر، دو جیب معاذ خنب ہے" ؎

سالاروں کا حال بھی دیکھ لیجیے:

"مدراستوں میں...... سب سے زیادہ اندھیر ہے...... دارو غہ خود متلاشی ہے کہ کون سا شکے
والا ماشی ہے۔ ہنر جوہر ارشوت کا پیام ہوتا ہے۔ اس امید پر فرشی سلام ہوتا ہے......
کہیں کا یہ دستور العمل ہے، دیتے بنے تو جرأت تیر قبول ہے۔" ؎

اس انداز میں حکومت کے مختلف شعبوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مبالغے اور جدت ادا سے قطع نظر ان تمام بیانات سے نظم حکومت میں بدعنوانیوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس دور کی تاریخوں کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو حال کا سرور نے کنایۃً ذکر کیا

ا؎ چھچھوندر: آتش بازی کی ایک قسم

؎ ص ۲۲۳ ۔ فسانۂ عبرت: مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کتاب نگر لکھنؤ (اصول لب علی شاہ)

ہے، اُن میں سے بیشتر کا واقعی وجود تھا اور وہ بڑی حد تک ایسے ہی تھے جیسا سرورؔ نے اُن کو پیش کیا ہے۔ غرض اس امر میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ دیسی حکمرانوں اور اُن کے اہل کاروں میں خود غرضی کی بہت کمی تھی۔ نااہلوں کو کلیدی عہدے مل جانا، ملکی سیاست میں انہماک اور اپنے کام سے زیادہ دوسرے عہدہ داروں کے کاموں میں حریفانہ دلچسپی، دوسروں کو نیچا دکھانے اور خود زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کر لینے کی کاوشیں، غداری، درباری سازشیں، خالص سیاسی داؤں پیچ، یہ سب وہ عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو آہستہ آہستہ فنا کی طرف لیے جا رہے تھے اور آخر کار انھیں تمام بدانتظامیوں کو حجت بنا کر ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے "انتظامِ مملکت" کے ادعا کے ساتھ اودھ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

انتزاعِ سلطنت کے وقت واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا میں نہایت مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی۔ آصف الدولہ کے بعد وہی ایسے حکمران تھے جن سے عوام دلی محبت کرتے اور ان کو اپنا سمجھتے تھے۔ ان کی شرافت، نرم مزاجی اور سب سے بڑھ کر رعایا دوستی نے ان کو عوام کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ان کی معزولی پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور لکھنؤ سے ان کی روانگی پر شہر میں کہرام مچ گیا۔ لیکن عوام کو نہ تو اپنی قوت کا احساس تھا نہ ان میں کوئی تنظیم تھی، اس لیے بادشاہ کے ساتھ اس بے انصافی اور انتزاعِ سلطنت پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی؛ غزلوں، نظموں اور لوک گیتوں میں نوحہ خوانی تو بہت کی گئی لیکن انگریزوں کے جبر سے ٹکرانے کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔

سلطنتِ اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح آ گئی۔ انھیں اس پر قابض ہوتے وقت معمولی مزاحمت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔ البتہ اس کے دوسرے سال ۱۸۵۷ء میں جب ملک کے دوسرے حصوں میں جنگ اور انقلاب کے شعلے بھڑک اٹھے تو لکھنؤ بھی ان کی لپیٹ میں آ کر ایک بڑے محاذِ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ بیلی گارد (ریذیڈنسی)، عالم باغ اور سکندر باغ وغیرہ کے معرکوں میں مقامی سپاہیوں نے شجاعت اور جاں بازی کے کارنامے دکھائے اور دشمن تک سے داد وصول کی۔ لیکن انگریزوں کی منظم فوجوں اور جدید حربی لیاقت کے آگے اور کچھ اپنے ہی غدار ساتھیوں کی بدولت جیت نہ سکے۔ اس طرح آزادی کی یہ پہلی جدوجہد پورے ہندوستان کی طرح لکھنؤ میں بھی ناکامی پر ختم ہوئی۔

(۲)

اس بڑی تحریک ۱۸۵۷ء کا معروف نام "غدر" ہے۔ لکھنؤ میں آج بھی بڑے بوڑھوں میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اسے "ہنگامہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام اس تحریک کو ایک بڑی بدامنی اور زبردست ہنگامے کی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ عوام کی اکثریت کو اس کا احساس نہیں تھا کہ انگریزوں کی حکومت ہو جانے کا مطلب کیا ہے اور اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے۔ صرف چند لوگ ایسے تھے جو اس کو جنگِ آزادی سمجھ کر جذبۂ وطن میں سر بکف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی جن لوگوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا وہ اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کی خاطر میدان میں آئے تھے۔ "حقوقِ انسانی" کے اس دور میں عام طور پر بادشاہوں اور حکومتوں کے ردّ و بدل سے متعلق عوام کا رویہ "ما را چہ ازیں قصہ کہ گاو آمد و خر رفت" کا مصداق ہوتا تھا۔ حکومت کے انتخاب کے سلسلے میں انھیں اپنی قوت اور اہمیت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ صدیوں اور پشتوں سے ان کا اعتقاد اور تجربہ انھیں یہ بتاتا چلا آ رہا تھا کہ ان پر کوئی نہ کوئی مسلط ضرور رہے گا، وہ

شالا سالار رہا...... غیرت نے منہ پھیر لیا۔ ایک گرد سرے سے کینہ تھا......
یہ رہی تدبیر عقل جس کا جو حصہ جتنا ذہن پاتا تھا، فیتہ کار آزمودہ دھو شھا جاتا تھا..... اب
تو یہ خود مبحث تھا۔ جلاد کر نیزہ اندوں کا سلاد کیا، ہمیں دیکھ کر بے حد پریشانی کا اظہار کیا۔ جو
پچھنڈ منہ چھپنے میں بڑی پھرتی کرتے تھے، چنار کا پھر کے گلگت سے منہ موڑتے تھے، اب جو
ایک مدہ پچھنڈی کی پتنا تیار کرکے محل میں پھینکا (جیسے کوئی حسینہ لڑکی بادشاہ کے حرم میں داخل
کی) آتش خانے کے دارو غہ ہو گئے...... اگر پیش خدمت بشیر ہے تو بہادر عزیز حضرت
(بادشاہ) کا مشیر ہے۔ خالہ خلوت میں پانی نشین، باجا جلوت میں صدر امین۔ دُخت سرکار میں،
انی اخبار میں اور جس کی اندر جوان لڑکی ہے اس کی باہر سرداری بٹھنے توڑ کی ہے۔ اگر قصد رس
نافہ ہے تو کا خیاداڑ کی گھوڑی زیر ران ہے، ڑ کی محل کی گلیوں میں گرم عنانی ہے......
اور جس کی رشتہ دار دہقانی ہے وہ سب پر سبقت لے گیا...... جان کے فیصلہ کر بیٹھے ہوتے
ہیں...... ہر دم بر زبان یہ سخن ہے، الملک الملک رو سیاہ کی بہو ہے آ...... ؎

آگے بڑھ کے لکھتے ہیں:

° حضرت سعدانی کا جو حال ہے، بد عمل سے مسافروں کو راہ چلنا محال ہے۔ دن دیہاڑے بستیوں میں
ڈاکے پڑتے ہیں، ملک اجاڑ ہوتا ہے...... چلو وہ اپنا گھر بھرتے ہیں۔ گاؤں خالی ہو گئے
جنگل میں زمین ور مرتے ہیں، قبولیت میں کچھ کھا، پنچے میں کچھ ادا ہے...... مزروعہ زمین
بیکار پڑی ہے، لومڑ کا ایک ٹھانہ ہے...... رعیت کا گلہ ہے اور چھری کی گھہ ہے۔ بد معاش
تیز اور قلم رو میں دھماؤ چلنا ہے۔ ؎

عدالتوں کا حال بھی دیکھ لیجیے:

° عدالتوں میں...... سب سے زیادہ اندھیر ہے...... داروغہ خود تماشہ ہے کہ کرو ساتھ
والا ماشی ہے۔ بترا جہر از شوت کا پیام ہوتا ہے۔ اس امید پر فرشی سلام ہوتا ہے...
کچہری کا یہ دستور ہاسل ہے، دیتے بنے تو کچھ امقدر سبیل ہے۔ ؎

اس انداز میں حکومت کے مختلف شعبوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مبالغے اور جذبات آرائی سے قطع نظر سمرقند کے ان بیانات سے نظم حکومت میں
بد عنوانیوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس دور کی تاریخوں کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو حال کا سرور نے کنایۃً ذکر کیا

؎ پچھنڈ: آتش بازی کی ایک قسم
؎ ص ۲۰۳ - فسانۂ عبرت: مرزا رجب علی بیگ سرور، مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، کتاب نگر لکھنؤ (اعمال نامہ جی شاہ)

ہے اُن میں سے بیشتر کا واقعی وجود تھا، اور وہ بڑی حد تک ایسے ہی تھے جیسا سرورؔ نے اُن کو پیش کیا ہے۔ غرض اس امر میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ دیسی حکمرانوں اور اُن کے اہل کاروں میں خوبیوں کی بہت کمی تھی۔ نااہلوں کو کلیدی عہدے مل جانا، ملکی سیاست میں انہماک اور اپنے کام سے زیادہ دوسرے عہدہ داروں کے کاموں میں حریفانہ دلچسپی، دوسروں کو نیچا دکھانے اور خود زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کر لینے کی کوششیں، غداری، درباری سازشیں، خالص سیاسی داؤ پیچ، یہ سب وہ عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو آہستہ آہستہ فنا کی طرف لیے جا رہے تھے اور آخر کار انہیں تمام بدانتظامیوں کو حجت بنا کر ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے "الحاقِ سلطنت" کے اعلان کے ساتھ اودھ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

انتزاعِ سلطنت کے وقت واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا میں نہایت مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی۔ آصف الدولہ کے بعد وہی ایسے حکمران تھے جن سے عوام دلی محبت کرتے اور اُن کو اپنا سمجھتے تھے۔ اُن کی شرافت، نرم مزاجی اور سب سے بڑھ کر رعایا دوستی نے اُن کو عوام کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اُن کی معزولی پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور لکھنؤ سے اُن کی روانگی پر شہر میں کہرام مچ گیا۔ لیکن عوام کو نہ تو اپنی قوت کا احساس تھا نہ اُن میں کوئی تنظیم تھی، اس لیے بادشاہ کے ساتھ اس بے انصافی اور انتزاعِ سلطنت پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی؛ غزلوں، نظموں اور لوک گیتوں میں نوحہ خوانی تو بہت کی گئی لیکن انگریزوں کے جبر سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔

سلطنتِ اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح آ گئی۔ انہیں اس پر قابض ہوتے وقت معمولی مزاحمت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔ البتہ اس کے دوسرے سال، ۱۸۵۷ء میں جب ملک کے دوسرے حصوں میں جنگ اور انقلاب کے شعلے بھڑک اُٹھے تو لکھنؤ بھی اُن کی لپیٹ میں آ کر ایک بڑے محاذِ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ بیلی گارد (ریذیڈنسی)، عالم باغ اور سکندر باغ وغیرہ کے معرکوں میں مقامی سپاہیوں نے شجاعت اور جاں بازی کے کارنامے دکھائے اور دشمن تک سے داد وصول کی۔ لیکن انگریزوں کی منظم فوجوں اور جدید حربی لیاقت کے آگے اور کچھ اپنے ہی غدار ساتھیوں کی بدولت جیت نہ سکے۔ اس طرح آزادی کی یہ پہلی جد و جہد پورے ہندوستان کی طرح لکھنؤ میں بھی ناکامی پر ختم ہوئی۔

(۲)

اس بڑی تحریک ۱۸۵۷ء کا معروف نام "غدر" ہے۔ لکھنؤ میں آج بھی بڑے بوڑھوں میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اسے "ہنگامۂ غدر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام اس تحریک کو ایک بڑی بدامنی اور زبردست ہنگامے کی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ عوام کی اکثریت کو اس کا احساس نہیں تھا کہ انگریزوں کی حکومت ہو جانے کا مطلب کیا ہے اور اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے۔ صرف چند لوگ ایسے تھے جو اس کو جنگِ آزادی سمجھ کر دہلی میں سربکف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی جن لوگوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا وہ اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کی خاطر میدان میں آئے تھے۔ مطلق العنانی کے اس دور میں عام طور پر بادشاہوں اور حکومتوں کے ردّ و بدل سے متعلق عوام کا رویہ "ما را چہ ازیں قصہ کہ گاو آمد و خر رفت" کا مصداق ہوتا تھا۔ حکومت کے انقلاب کے سلسلے میں انہیں اپنی قوت اور اہمیت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ صدیوں اور پشتوں سے ان کا اعتقاد اور تجربہ انہیں یہ بتاتا چلا آ رہا تھا کہ اُن پر کوئی نہ کوئی مسلط ضرور رہے گا۔

بنی نوع انسان سے جُدا کوئی قوم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانیوں نے اس قوم کی حکومت بھی تسلیم کر لی جس کے افراد کے متعلق اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ۱؎

اور جب انھوں نے دیکھا کہ انگریزوں کا نظمِ سلطنت چُست ہے اور وہ دیسی حکمرانوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہو رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے اور ماننے لگے کہ حکومت کرنا انگریزوں ہی کا حق ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجے میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ختم کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ہندوستان کے ساتھ صوبہ اودھ اور بیت السلطنت لکھنؤ بھی برطانوی سامراج کا جز ہو گیا۔

لکھنؤ کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ اس مغالطے میں ڈال سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہر دم زوال پذیر یہ شہر اپنی تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے بھی پس ماندہ رہا ہوگا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

"سبحان اللہ! چہ شہرے ست دل پذیر و چہ مکانے ست بے مثل و نظیر!! جائے ست دل فریب و مکانے ست عجیب، منزہ از نقص و عیب۔ جمیعے ست بس دلپسند خوش سواد، کہ دامانش گلزار باد۔ و معمورے ست از اقسام و انواع چیزہا!!"

[نجات حسین خاں عظیم آبادی کا روزنامچہ "سوانح لکھنؤ" ۲؎]

"...... لکھنؤ کا کیا کہنا! اللہ اللہ، وہ سرکار ابر گہر بار تھی، وہ ہندوستان کا بغداد تھا، جو بے سر و پا وہاں پہنچا امیر ہو گیا۔"

[غالب بنام میاں داد خاں سیاح ۳؎]

۱؎ "سپاہی سے صوبیدار" (خود نوشت سرگزشت سیتارام) مترجمہ لفٹیننٹ کرنل ڈی۔ سی فلاٹ اور خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی۔ سیتارام لکھتا ہے:

"یہ بات مشہور تھی کہ صاحب لوگوں (انگریزوں) کی پیدائش ایک شے سے ہوئی ہے جو کسی درخت سے نکلا تھا اور یہ خیال اب تک بھی دُور دراز مقامات میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی جوان میم ہمارے گاؤں میں آ پہنچتی تو لوگ دیوی سمجھ کر اُسے ڈنڈوت کرنے لگتے۔ لیکن اگر کوئی بڈھی میم ہوتی تو اس کو جادوگرنی سمجھ کر جنگلوں میں بھاگ جاتے" (صفحہ ۳۰) سیتارام نے ایک بڑھی عورت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "میں سمجھتی تھی کہ یہ لوگ انڈوں سے کسی درخت پر ایک جزیرے میں پیدا ہوتے ہیں جو یہاں سے بہت دور ہے" (ص ۳۱)

سیتارام ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک سپاہی تھا جو ترقی کر کے صوبیدار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی سرگزشت ہندوستانی زبان میں لکھی تھی جس کا انگریزی ترجمہ لیفٹیننٹ کرنل نارگیٹ نے کیا تھا۔ زیر نظر اردو ترجمہ اسی انگریزی کتاب سے کیا گیا ہے۔ مشمولہ "خوب خیال" [illegible]

۲؎ "بہار ستونِ لکھنؤ" سو برس پہلے۔ از پروفیسر سید حسن۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

۳؎ [illegible] میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام: ڈاکٹر سید معین الدین عقیل۔ [illegible] مکتبہ [illegible] حیدرآباد (دکن) ۱۹۷۰ء ص [illegible]

"جب سے دہلی کا عروج و اقبال مٹا ہے اور دہلی میں اگلے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہ گیا ہے، اُس وقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں جو لکھنؤ سے تمول اور شان و شکوہ کے لحاظ سے دعویٰ ہمسری کا کر سکے۔"

(ولیم نائٹن[1])

"بعد خرابی شاہجہان آباد (دہلی) یہ زمین (لکھنؤ) بسی۔ سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا۔ دُور دُور اس شہر کا شہرہ ہوا، نام ہوا۔" (رجب علی بیگ سرور[2])

"...... یہ شہر لکھنؤ نواب آصف الدولہ بہادر کا آباد کیا ہوا ہے جس کی بے مثالی کا ہر شہر و دیار میں چرچا ہے۔ کم و بیش سو برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اتنی مدت میں آباد بھی ہوا، اُجڑ بھی گیا..... جب تک عہد شاہی رہا وہ زمانہ اس کے اوج عروج کا تھا۔ دُور دُور سے لوگ دیکھنے کو آتے تھے، صفحۂ دل پر یہاں کی تصویر جنت نظیر کھینچ لے جاتے تھے۔ لکھنؤ ہر چیز کا طغرا تھا، ہر علم و فن کا یہاں کامل اُستاد تھا...."

(فدا علی عیش[3])

آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنی سلطنت کا مستقر بنایا اور اچانک لکھنؤ شمالی ہند کا مرکز نظر بن گیا۔ آصف الدولہ کی دلآویز شخصیت، بے اندازہ فیاضی، علم دوستی اور اہلِ ہنر کی قدر دانی نے بہت جلد لکھنؤ کو مرجعِ خلائق بنا دیا۔ جس وقت دہلی کی سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا، لکھنؤ کے چراغ کی لَو اونچی ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ادبیات کے واقف خوب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں دہلی سے کتنے باکمالوں نے لکھنؤ کو بسایا۔ گردشِ زمانہ نے دہلی کے چراغ کا بچا کھچا روغن لکھنؤ کے کنول میں انڈیل دیا۔ اور دہلی ہی نہیں، ہندوستان بھر سے قدر دانی اور معاش کے طلبگاروں نے کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا۔ یوں لکھنؤ کی تہذیب کی تشکیل ہوئی۔ اس تشکیل کی رفتار نہایت تیز تھی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب تقریباً ایک مختصر مدت میں وجود میں آ گئی۔ اس کے پس پشت صدیوں اور قرنوں کے تجربات و روایات کارفرما نہیں تھے۔ چند سال کے اندر اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کر لیں اور بہت تیزی کے ساتھ ثقافت اور معاشرت کے لحاظ سے ایک واضح امتیاز و تشخص اختیار کر کے اپنے عروج کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔ یہ ارتقائی منزلیں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دورِ نیابت ہی میں طے ہو گئیں۔ غازی الدین

---

(۱) شبابِ لکھنؤ (ترجمہ "پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ" مصنفہ ولیم نائٹن) مترجم محمد حامد علی۔ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۱ء ص ۵

(۲) گلزار سرور۔ افضل المطابع محمد تقی خان پریس (سن طباعت درج نہیں)۔ دیباچہ

(۳) فسانۂ دل فریب۔ منشی فدا علی عرف لچھے صاحب عیش لکھنوی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۱ء ص ۲

(۳) غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) اور نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے دورِ بادشاہت تک لکھنؤ کی تہذیب اپنی آخری بلندیوں کو پہنچ چکی تھی۔ اس عہد کا ایک خاکہ ہمارے سامنے مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں پیش کیا ہے جس کی تصدیق سرور کے ایک دوسرے ہم عصر کے بیان سے بھی ہوتی ہے:

سید فضل علی دعویٰ جو نصیر الدین حیدر کے عہد میں گھومتے پھرتے لکھنؤ پہنچے تھے اپنی کتاب "فسانۂ عجیب" میں لکھتے ہیں:

"...... جب میں اس شہر لکھنؤ میں پہنچا تو سیر کا شوق تھا۔ چوک کو جو دیکھا تو راستہ دو رویہ دکانیں زینت سے آراستہ تھیں۔ ہر جا پر ارباب نشاط رقص کرتے ہیں بازاروں کا یہ حال ہے:

احوالِ بازار

کوئی کہتا ہے "کیا نکلیں ہیں بیٹے" — کوئی کہتا ہے "مرچوں کے پٹے ہیں"
"... بڑی ... کہاں ہیں" — "کنارے کی کلائی دیکھیاں ہیں"
لیے پھرتے ہیں شہدے روٹیوں کو — "کرے کھاری کی بیادے ڈھیری دو"
صدا کرتا ہے کوئی ہاتھ اٹھا کے — "معطر پھول ہیں تو ہیں سب کے"
یہ شہدے اور قاروں کا عالم — گویا چاند اور تارے ہیں باہم
وہ شربت کو جو اس کو بنا سکے — شب ماہ کا سماں پانی میں ہانے
وہ ہی ہیں کو جیساں ہاں بہتے — گویا چاند اور تارے ہیں برسے

---

(۱) یہ انداز اب بھی موجود ہے پہلے اس کا سلسلہ دریائے گومتی کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا لیکن اب اس کا طول اکبری دروازے سے گول دروازے تک محدود رہ گیا ہے۔ آج بھی اس کی فضا میں ایک عجیب قسم کی سی کیفیت ہے جو اس کو دوسرے بازاروں سے ممتاز کیے ہوئے ہے۔

(۲) شہدے: عام طور پر شہدا کا لفظ اوباش اور رذیل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک پیشہ ور فرقے کا نام تھا۔ سید فضل علی کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شہدوں کا ذریعہ معاش روٹیاں بیچنا تھا:

لیے پھرتے ہیں شہدے روٹیوں کو — کرے کھاری کی بیادے ڈھیری دو

شہدے بہت کا ہاتھ کا شانہ اور اس کا تماشا: شہدے شامیانے کا کام کرتے تھے اور خوشی کی تقریبوں میں جا جا کے ترنم پیتے تھے مثلاً بیاہ کی تقریبوں میں جنازہ اٹھانے والے شہدوں کا دیا ہوا پر آج وصال کا آیا ایک اخلاقی سبق تھا کہ انسان کو خوشیوں کے ہجوم میں بھی موت سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ لکھنؤ میں ابھی چند شہدے باقی ہیں لیکن پیشہ ورانہ حیثیت سے ان کا وجود تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ (سید فرخندہ یوسف علی)

(بقیہ ملاحظہ کیجیے)

نہ دیکھا ہم نے ایسا حسن اسلوب   کہ ہو دیکھے سے جس کے شیریں تن من

مٹھائی وہ کہ ہے دیکھو تو گویا

اسی میں مال حلوائی نے کھویا

غرض سارے بازار کا حال لکھتا تو جب [کذا ..... لکھتا موجب ؟] طول کتاب کا ہو۔

اس مقام کا ثانی مثل

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہر ایک کوچہ فرحت افزا اور ہر ایک راہ دل کشا۔ شہر ہے یا یہ طلسمات ہے!![ٹ]"

نصیر الدین حیدر ہی کے عہد میں ایک انگریز سیاح ولیم ایشن بھی لکھنؤ آیا تھا۔ اُس نے لکھنؤ میں اپنے قیام کے حالات اپنی کتاب 'ایک مشرقی بادشاہ کی نجی زندگی' میں درج کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"...... صرف ایک عظیم الشان شہر جسے میں نے دیکھا ہے ... میرے نزدیک لکھنؤ کے نشیبی حصے سے، اپنی تنگ و تاریک گلیوں، لمبے بھدے اُونٹوں اور گنجان بازاروں سے مشابہ ہے اور وہ شہر قاہرہ دارالسلطنت مصر ہے۔

ڈریسڈن، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے۔ مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھُری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اُوپری بنے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہو گی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں، وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تمنچے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں، اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس ٹہلتے بلتے

بقیہ۔ لہ۔ ہندوستان "سرفروش تمنا" میں شہروں کے بازار اور انداز گفتگو کی تقریباً یہی حالت دلچسپ تصویر کشی کی ہے)

ٹ۔ فوائد عجیبہ: مجموعہ کارخانہ نثار علی، لکھنؤ۔ حسب الحکم سلطان سلطانہ ۱۲۰۰ھ صفحہ ۲۰۲

لڑتے ہیں اور لکھنؤ والوں کے پندارِ خودی و خود پسندی کا اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

"یہ امر کہ یہاں اہلِ لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں، تعجب خیز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کمپنی کے فوجی پیشے میں اودھ ہی کے پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطۂ بنگال کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

"باشندگانِ لکھنؤ میں اس کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور بیچے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔" [1]

سپہگری کا مذاق عام ہونے کی وجہ سے اس فن میں بڑی بڑی باریکیاں پیدا کر کے اس کو بہت دلچسپ بنا دیا گیا تھا۔ شمشیرزنی اور نیزہ بازی کے پیچیدہ داؤں پیچ ایجاد کیے گئے۔ اس کے علاوہ کشتی، بانک، بنوٹ وغیرہ کو اتنی ترقی دی گئی کہ ان کو ایک نئے فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یوں تو لکھنؤ کا قریب قریب ہر ایک باشندہ سپہگری میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رکھتا تھا لیکن جس نے اس میں خصوصی مہارت بہم پہنچا کر اس کو گویا اپنی زندگی کا موقف بنا لیا تھا وہ بانکوں کا طبقہ تھا۔ بانکے اپنے ... اور اطوار کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھے۔ مظلوم کی حمایت میں ظالم سے بھڑ جانا، حریفوں کی تعداد کا لحاظ کیے بغیر بے دھڑک سرِ بازار للکار دینا، جو اُن سے مدد طلب کرے اُس کے لیے جان کی بازی لگا دینے سے دریغ نہ کرنا، ایک وضع مقرر کر کے مرتے دم تک اور ہر حالت میں اُسی پر قائم رہنا، جرأت اور خودداری پر کسی طرح بھی آنچ نہ آنے دینا، یہ سب ایسی خصوصیتیں تھیں جنھوں نے اُن کو ایک امتیازی حیثیت دے دی۔ واقعات گواہ ہیں کہ اُن کے اٹل ارادوں کو بادشاہ تک جنبش نہیں دے سکتے تھے۔ جستجو کی طرح وہ مقصد کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ اُن کی بہادری شجاعت سے گزر کر تہوّر کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ اُن کی وجہ سے شہر میں آئے دن کشت و خون اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور اس دور کے دنوں میں لکھنؤ تلواروں کی جھنکار، قرابینوں کے دھماکوں اور جنگی نعروں سے گونجا کرتا تھا۔ ولیم نائٹین لکھتا ہے:

"اس شہر کے گلی کوچے میری نظروں میں بالکل افسانے معلوم ہوئے گویا کہ عالمِ رویا میں یکایک دفعتاً کسی ایسے عجیب ملک میں آگیا ہوں جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں جن کے بشرے سے جنگجوئی ٹپکتی ہے اور جن کا تذکرہ میں نے لڑکپن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔" [2]

ایک اور مغربی سیاح ولیم ہاورڈ رسل لکھنؤ کو دیکھ کر اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے:

"منظر ایک ایسے خاموش ٹھہرے ہوئے سمندر میں سے اُبھرتے ہوئے لاجوردی اور سنہرے

---

[1]، [2] ۔ شبابِ لکھنؤ، ص ۳۰۲

محلوں، میناروں، گنبدوں، مقدس برجوں، کھمبوں کی قطاروں جیسی متناسب ستونوں والے طویل برآمدوں اور سائبان دار چھتوں کا ایک منظر! میلوں میل نگاہ دوڑاتے چلے جاؤ، یہ سمندر پھیلتا جاتا ہے اور اس کے درمیان اس پرستانی شہر کے مینار چمکتے نظر آتے ہیں۔ سنہری برجیاں دھوپ میں جگمگاتی ہیں اور چند گنبد ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جھلملاتے ہیں۔ کہیں بھی بدنمائی اور بے زیبی دیکھنے میں نہیں آتی۔ ہمارے سامنے ایک شہر ہے جو پیرس سے زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ بارونق ہے۔ کیا یہ شہر اودھ ہی میں ہے؟ کیا اسے ایک بداطوار، ازکار رفتہ اور انحطاط زدہ [شاہی] خاندان نے تعمیر کیا ہے؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھ کو تو اتنا حسن و تاثر نہ روم میں محسوس ہوا، نہ ایتھنز میں، نہ قسطنطنیہ میں، نہ اپنے دیکھے ہوئے کسی بھی دوسرے شہر میں اور اس [شہر] کو میں جس قدر زیادہ غور سے دیکھتا ہوں، اسی قدر اس کی خوبیاں مجھ پر کھلتی جاتی ہیں۔"[۱] (ترجمہ)

ایک طرف رسل لکھنؤ کی عمارتوں کی نفاست اور نزاکت دیکھ کر اس کو پرستانی شہر کہہ رہا ہے دوسری طرف ولیم نائیٹن یہاں کی سیاسیانہ فساد دیکھ کر دنگ ہے۔ دراصل جغرافیہ کے ساتھ ہی لکھنؤ کی فضاؤں نے ایک خاص لطافت کو بھی پروان چڑھایا جو بظاہر متضاد سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا سبب صوبۂ اودھ کی زرخیزی تھی۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے پوری عملداری کی دولت کھنچ کھنچ کر لکھنؤ میں آتی تھی اور اس زمانے میں لکھنؤ کی فی کس آمدنی یا صحیح اصطلاح میں قوت خرید کا اوسط آج سے کہیں زیادہ تھا۔ شہر سے باہر جو لوگ یہ دولت پیدا کرتے تھے ان پر جو گزرتی ہو لیکن لکھنؤ میں یقیناً سونا برستا رہتا تھا۔ اور یہاں بھی دولت کی تقسیم مساوی نہ تھی۔ بہت سے گھر ایسے بھی تھے جہاں دن کو چولھا اور شام کو چراغ مشکل سے جل پاتا تھا لیکن امرا کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ امرا بالعموم اسراف کی طرف مائل رہتے تھے اور بے محابا دولت خرچ کرنے کو یہ اپنی صفت سمجھتے اور اس پر نازاں رہتے تھے۔ یہ کمال کے قدر دان اور جدت کے شوقین تھے اور خاص طور پر انھیں کی بدولت لکھنؤ کی ہر ہر ادا میں ایک نکھار پیدا ہوتا گیا۔

علم، فن اور زندگی کے مختلف شعبوں میں لکھنؤ نے جو امتیازات حاصل کیے ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ لکھنؤ کی فضا میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ہر چیز میں اس شہر کا اپنا ایک سانچہ بن گیا تھا جو بیرونی اثرات کو اپنی مخصوص شکل میں ڈھال لیتا تھا۔ باہر کے رہنے والے بھی جب لکھنؤ کو آ کر بستے تھے تو اسی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ بیتے کرے اپنی وضع کے پابند کم ہی ہوں گے جو "یورپ کے ساکنوں کے جنس جنس پکارنے" کے باوجود اپنی جگہ قائم رہے۔ علاوہ بریں وہ آصف الدولہ کا عہد تھا اور لکھنؤ کی تہذیب اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچی تھی۔ ورنہ بعد کے آنے والوں کے لیے لکھنؤ کے سحر سے بچنا محال تھا اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہو کے رہتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

۱؎ بحوالہ "LUCKNOW PAST AND PRESENT" از کرامت اللہ ... ہائی تیج کار پریس لکھنؤ ۱۹۵۱ء ص

> علی الخصوص مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خراب ہے۔ یہاں ہر فن کا اُستاد ہے۔ سیکڑوں گل خرد، بد عمل، کندۂ ناتراش، اطراف و جوانب سے آ آ بستے، شہرے میں آ پہلے پھول وضع دار ہو گئے۔ ح۱

فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ لکھنؤ میں نئے نئے شگوفے لائی۔ شاعری میں ایک طرف غزل نے لکھنؤ میں آکر خود کو رنگ برنگ کے پھولوں سے اتنا سجایا کہ اس آرائش کے پیچھے اس کی اصل صورت بھی چھپ گئی، دوسری طرف مرثیہ پانچوں ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس شان سے نمودار ہوا کہ مذہب و ادب سے ٹکرا گیا اور پھر بھی اپنی صنف میں منفرد رہا۔ موسیقی میں ایک طرف ٹھمری اور غزل کا نیا اسکول قائم ہو گیا دوسری طرف میر علی نے سوز خوانی کے ذریعے اس شائستہ فن کو ایک عجیب راہ پر لگا دیا۔ یہ سوز خالص کلاسیکی راگوں کی بنیاد پر استوار ہونے کے باوجود نغمہ و سرود سے الگ چیز معلوم ہوتے تھے۔ح۲ موسیقی کے ساتھ رقص کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ عوام کی کوششوں کے علاوہ تنہا واجد علی شاہ نے رقص کے بیسیوں طرز ایجاد کر دیے۔ مصوری میں لکھنؤ کا قلم اپنے جزئیات اور سبز رنگ کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے اگرچہ مغل، راجپوت اور پہاڑی قلم اس سے بہتر ہوتے تھے۔ فنِ تعمیر میں لکھنؤ وہ عظمت اور شکوہ پیدا نہیں کر سکا جو مغلوں کی عمارتوں کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے لیے پتھر کا استعمال ناگزیر ہے۔ لکھنؤ کی عمارتوں میں پتھر کم لگایا جاتا تھا لیکن اس کمی کو یہاں عمارتوں کی سجاوٹ اور حسنِ تناسب سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ فنِ تعمیر کا ایک اعجازی شاہکار ہے اور اس کو آج بھی غیر ملکی سیاح اور سند یافتہ معمار حیرت سے وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ امام باڑہ خاص دیسی صنعت، فن اور کاریگری کا نادر نمونہ ہے جس کے بنانے میں عام مزدوروں کے ساتھ خاندانی شرفا کا خونِ گرم بھی پسینا بن کر شامل ہوا ہے کیونکہ قحط کے زمانے میں روزگار بہم پہنچانے اور اپنی شکلیں چھپائے رکھنے کی خاطر اس کی تعمیر راتوں کی تاریکی میں بھی جاری رہتی تھی۔ اس عظیم الشان تعمیر کا نقشہ دہلی کے معمار کفایت اللہ نے بنایا تھا لیکن اس کا انداز دہلی کی عمارتوں سے مختلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں دوسرے شہروں کے باکمالوں نے بھی بہت حصہ لیا تھا، البتہ لکھنؤ پہنچ کر ان کے فن میں نمایاں تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس تبدیلی کا سبب لکھنؤ کا وہ عام مذاق تھا جو ان کے فن پر اثر انداز ہوتا تھا۔

انگریزوں نے لکھنؤ کو "باغوں کا شہر" کہا اور یہ بہت موزوں نام تھا۔ یہاں باغات بہت شاندار تھے۔ ان باغوں کے پھل اپنے رنگ روپ اور مزے کے لحاظ سے اپنی نوع کے عام پھلوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ باغبانی اور گلہ بندی کے فن میں نئے نئے تجربے کیے گئے اور یہاں کے باغوں میں جاپانی بونسائی تک کے نمونے مل جاتے تھے۔ح۳

ح۱ دیباچہ فسانۂ عجائب۔ ح۲ سوز خوانی پر حاشیہ آگے دیکھیے۔ ح۲۔ سوانحات سلاطین اودھ: ص

ح۳ بونسائی (B O N S A I) اہل جاپان کا خاص فنِ باغبانی جس کے ذریعے تناور قسم کے درختوں کی پرورش اس طرح کرتے ہیں کہ وہ چند بالشت سے زیادہ اونچے نہیں ہونے پاتے۔ اسی تناسب سے ان درختوں کی پتیاں بھی چھوٹی کر لی جاتی ہیں۔ مگر پھلنے کے ساتھ قد و قامت اور بڑے درختوں کی طرح ہوتا ہے درختوں کے تنوں اور پھلوں میں کہرا اور گنگا جاتی ہے۔ ان کی عمریں بھی ان کو
(باقی اگلے صفحے پر)

گفتگو نے بھی لکھنؤ میں ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ضلع جگت اور پھبتی وغیرہ میں لوگ کوشش کر کے مہارت حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آداب محفل، نشست و برخاست کے انداز اور اعلیٰ طرزِ گفتگو سیکھنے کے لیے باضابطہ تربیت ہوتی تھی اور اس کے لیے طوائفوں کے بالا خانے بہترین تربیت گاہ تھے۔ سرشار ان طوائفوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"........ خوش مزاج، مردم شناس، روزمرہ شستہ، دم تقریر رمز و کنایہ۔ اس کوچے کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش، اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔"[1]

یہ طوائفیں محض عصمت فروش یا فن فروش عورتیں نہیں تھیں بلکہ معاشرے کے اعلیٰ افراد کی طرح تعلیم و تربیت حاصل کرتی تھیں اور اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان میں متعدد صاحب دیوان شاعرات بھی تھیں۔

طوائفوں کی طرح بھانڈوں کا طبقہ بھی لکھنؤ میں ایک خاص شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ آداب و اطوار میں نہایت مہذب اور بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بھانڈ اپنی مضحک نقلوں سے محض کشت زعفران زار ہی نہیں بناتے تھے بلکہ اکثر مزاح کے پردے میں معاشرے کی خرابیوں اور اونچے طبقے کے افراد، بلکہ بادشاہوں تک کی ذاتی کمزوریوں ——— اور کبھی کبھی سیاسی غلطیوں کی بھی بے دھڑک نشاندہی کر دیتے تھے۔ یہ بھانڈ معاشرے کے سب سے بے باک نقاد تھے۔

معاشرے کی وہ خرابیاں جو زیادہ دولت اور تمدنی ترقی کا لازمہ ہوتی ہیں لکھنؤ میں بھی موجود تھیں۔ فضول خرچیاں، مختلف قسم کی بازیاں، عشرت، رسائل شوق، جھوٹی نمائش، یہ سب چیزیں ایک طرف معاشرے کو گھن کی طرح لگی ہوئی تھیں دوسری طرف تکلف و تصنعات حد سے

البتہ ... قسموں کے مطابق ہوتی ہیں، چنانچہ جاپان میں بعض درخت چار چار سو برس سے زیادہ کی عمر کے موجود ہیں جن کا قد دو ڈھائی فٹ سے آگے نہیں بڑھنے پایا ہے حالانکہ عکسی تصویروں میں وہ کوہ پیکر درخت معلوم ہوتے ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے لگائے ہوئے ... عیش باغ میں پھلوں کے جو درخت تھے وہ ایک ایک دو دو ہاتھ سے زیادہ اونچے نہ تھے اور اس کے باوجود یہ سب درخت باقاعدہ پھلتے تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنی ولیعہدی کے زمانے میں نواب علی نقی خاں کی معرفت جو صفدر باغ لگوایا تھا اس میں بھی ایسے پھلوں کے کئی چمن تھے۔ واجد علی شاہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک چمن میں بالکل ناشپاتی کے درخت لگائے تھے۔ ایک میں بالکل سیب کے درخت لگائے تھے..... ایک چمن مطلق شفتالو کے درختوں کا تھا..... ایک چمن امرود کا اور ایک نارنگی ہزارہ کا تھا۔ ایک نارنگی ولایتی اور ایک شریفے کا تھا..... تعجب یہ ہے یہ درخت باوجود ثمر دار (یعنی قد آور قسم کے تھے) مگر ایک گز سے زیادہ بلند نہ تھے۔" (محل خانہ شاہی۔ دربار پریس لکھنؤ ۱۹۰۴ء ص ...)

[1] دیباچہ "فسانۂ عجائب"۔

پر مگرمچھ اور جانوروں نے حقیقت پر کرسی کا اقتدار رکھا تھا۔ فریب کاری نے اخلاق، مجبوری نے تکلف، اخلاقی بزدلی نے ادب تہذیب کا نام اختیار کر لیا تھا اور عیش کوشی نے رسم و رواج کے پردے میں قوتِ عمل کو معطل کر دیا تھا۔ اسی لیے لکھنؤ کی تہذیب میں خوبصورتی تو بہت تھی لیکن عظمت اور بلندی بہت کم تھی۔

لکھنؤ کی تہذیب پر کوئی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک اس ضمن میں اودھ کے حکمرانوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ مغلیہ سلطنت کے کسی دور میں ہم بادشاہ اور رعایا میں وہ ذہنی قرب اور دونوں کے طبائع میں اس سے زیادہ ہم آہنگی نہیں دیکھتے جتنی اودھ کے اس دور میں دیکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں میں آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کو خاص طور پر اپنی رعایا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آصف الدولہ کے انتقال پر لکھنؤ کے گھر گھر رونا پیٹا گیا۔ دینے کی صدائیں بلند تھیں تو واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے مہاجرت پر شہر بھر میں کہرام مچ گیا اور یہ واقعہ اودھ کے کئی لوک گیتوں کا موضوع بن گیا۔

اودھ کے سب ہی حکمران شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آصف الدولہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ سعادت علی خاں خود شاعر نہ تھے لیکن بہت سے شاعر ان کے دامن سے وابستہ تھے۔ غازی الدین حیدر کو لغت سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے ایک بہت عظیم اور جامع لغت "تاج اللغات" کے نام سے تالیف کرایا۔ نصیر الدین حیدر کو بھی لغت سے دلچسپی تھی، اس کے علاوہ وہ شاعر بھی تھے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کی ادبی سرگرمیوں کا زیادہ ذکر نہیں ملتا لیکن ان دونوں کی تلافی واجد علی شاہ نے کر دی۔ بادشاہوں کا کیا ذکر، کسی بھی ادب کی تاریخ میں ان سے کثیر التصانیف لوگ کم ہی نکلیں گے اور اتنے متنوع موضوعات پر شاید ہی کسی شخص نے قلم اٹھایا ہو۔ شاعری میں ان کے مجموعے اپنے دامن میں غزل، قصیدے، مثنوی، مرثیے، نوحے، سلام، رباعی، قطعے وغیرہ سے لے کر ٹھمری، کبت اور دوہے تک رکھتے ہیں۔ اردو ڈراما میں اوّلیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان کی تصنیفیں ادبیات، خود نوشت، تاریخ، مذہبیات، علمیات، جنسیات، موسیقیات، صنعت و حرفت، فلسفہ و اخلاق وغیرہ نہ معلوم کتنے موضوعوں کو محیط ہیں۔ شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے خزانے سے وظائف اور تنخواہیں پاتی تھی۔

اودھ کے حکمرانوں کے اس ذوق اور قدر دانی نے بیت السلطنت میں قلم کے سپاہیوں کا ایک ٹڈی دل لشکر تیار کر دیا تھا۔ عام طور پر یہ حکمران اہلِ فن کی قدر دانی میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اکثر ان کی گستاخیاں بھی سہہ لیتے تھے۔ ایسے متعدد واقعات ہم کو تاریخ اور روایت میں ملتے ہیں جہاں اودھ کے حکمران کم حیثیت اور غریب کاریگروں تک کی ناز برداریاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تقریباً یہی حال دوسرے امرا اور اکابر کا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں کوئی بھی فن یا ہنر تھا، قدر دانی اور قدر دانوں کی تلاش میں کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنے اور لکھنؤ ان سے چھلکنے لگا۔ چونکہ انھیں اپنے فن کی پوری قیمت ملتی تھی اس لیے انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایسے تخلیقات پیش کیے کہ جو اس کا ایک افسانہ معلوم ہوتی ہیں اور اگر اب تک ان کے آثار نہ باقی رہ گئے ہوتے تو ان کی حقیقت پر یقین کرنا مشکل ہوتا۔

اودھ کے حکمرانوں کے مختلف النوع مشاغل کو عوام نے بھی اپنی بساط کے مطابق اختیار کر لیا تھا۔ مگر وہ عیش کے نشے

تیتروں کی جنگ کرواتے تھے تو یہ سڑک کے کنارے گھیرا ڈال کر مرغ، تیتر اور بٹیریں لڑاتے تھے، یہ بھی نہ ہو تو مرغیوں کے انڈے لڑا کر خوش ہو لیتے تھے۔ اگر واجد علی شاہ لاکھوں سے بھی زیادہ صرف کر کے اپنے رہس کے جلسے ترتیب دیتے اور ان کو اسٹیج کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارتیں بنواتے تھے تو یہ بھی کھلی ہوئی جگہوں پر تخت بچھا کر اور پردے باندھ کر اندر سبھا کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ غرض بادشاہوں کے تقریباً تمام مشاغل سے چھوٹے پیمانے پر عوام بھی دل بہلایا کرتے تھے۔

سلطنت اودھ کے بانی نواب سعادت خاں برہان الملک کا وطن ایران تھا۔ اسی وجہ سے اودھ کی تہذیب پر ایرانیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یوں تو مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پورے ہندوستان کی تہذیب ایران سے متاثر ہوئی لیکن اودھ پر ایرانیت کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ لباس کی وضع قطع، بالوں کی تراش خراش، مکانوں کی اندرونی آرائش ایران کے انداز پر ہوتی تھی۔ فارسی سرکاری زبان تھی اور تحریر و تقریر دونوں پر اس کی حکومت تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو اس پر حاوی ہوتی گئی۔ دوسری طرف اہل لکھنؤ کی جدت پسندی اس میں نئی نئی تبدیلیاں پیدا کرنے لگی، اس طرح ایرانیت کا وہ رنگ جو ابتدا میں بہت گہرا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا پڑنے لگا اور دوسرے بہت سے رنگوں کی آمیزش کے باعث اتنا نمایاں نہ رہا۔ جتنا شروع میں تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب پر ایرانیت کے اثر کے بارے میں پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "جب اٹھارویں صدی میں دہلی کی مغل حکومت "شمشیر و سناں" کی منزل سے نکل کر "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہوئی تو اودھ میں بھی ایک نیم خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد امین برہان الملک سعادت خاں تھے جن کی رگوں میں بھی خون گردش کر رہا تھا...... یہیں کی پہلی خصوصیت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جسے لکھنؤ کی تہذیب میں ایرانیت یا عجمیت کے عنصر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گو دہلی کی درباری اور جاگیردارانہ فضا اس اثر سے محفوظ نہیں تھی لیکن یہاں اس کا اثر ذرا زیادہ گہرا اور نمایاں تھا کیونکہ اس دفعہ اس میں مذہبیت بھی شامل تھی۔ اس کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی، تنگ نظری یا عصبیت کی شکل میں نہیں، ایک عقیدے سے جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا اور چونکہ حکومت اور عوام دونوں نے اس سے گہرے شغف کا اظہار کیا اس لیے اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی زندگی، موسیقی، فن تعمیر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے فنون لطیفہ پر پڑا۔" [1]

اودھ کے شاہی خاندان کا مذہب شیعہ تھا اور ان حکمرانوں کو اپنے مذہبی مراسم، عزاداری وغیرہ میں خاص انہماک تھا۔ الناس علیٰ دین ملوکہم کے مصداق اودھ کی تہذیب اور ثقافت پر بھی شیعیت کا پرتو پڑا۔ ایام عزا میں عام طور پر لوگ لہو و لعب سے گریز کرتے تھے۔ تعزیہ داری، مجالس عزا اور مذہب کے ان مراسم میں جو بالعموم شیعوں سے مخصوص تھے ہندو اور اہل سنت حضرات بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔

۱۔ افکار و مسائل، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۴۴ (مضمون: لکھنؤ۔ ادبی مرکز)

مراسم مذہب سے کہیں زیادہ ثقافتی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور فروغ دیتے گئے اور اصل تعزیہ داری میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ مراسم ہر ہند
مذہب کے بعض مراسم بھی اسی شکل میں مل کر شریک ہو گئے۔ مثلاً جس طرح ہندوؤں میں کوئی مراد برآنے کے لیے ست نرائن کی کتھا کہی جاتی
ہے اسی طرح مسلمانوں نے منت کے طور پر جناب سیدہ کی کہانی کہنا شروع کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ست نرائن کی کتھا اور جناب
سیدہ کی کہانی کے بعض جزو بالکل یکساں ہیں۔ سوزخوانی میں بھی مرثیوں کے پُردرد بند ہندو راگ ملا کر سنائے جاتے تھے۔[۱]

مذہب کا ذکر کرتے ہوئے ذہن فوراً نوابِ اودھ کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُن کی بے تعصبی
اگرچہ ذاتی طور پر پورا سلسلہ مذہب کا پابند تھا۔ اور ان میں سے بعض تو کٹر شیعہ تھے اور اپنے عقائد میں حد درجہ غلو رکھنے والے تھے لیکن
یہ پابندی ان کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ ملکی سطح پر ان کی نظر میں شیعہ اور غیر شیعہ، مسلم اور غیر مسلم کی ایک حیثیت تھی۔ حکومت کے بعض
اہم منصب ہندوؤں کے ہاتھ میں رہتے تھے اور دیوان کا عہدہ تو گویا انھیں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ یہ عہدہ دار پورے خلوصِ نیت سے
جاں نثاری کا حق ادا کرتے تھے اور اودھ کے حکمران نہ صرف ان کے سچے قدردان تھے بلکہ ان سے دلی محبت بھی رکھتے تھے۔

ہندوؤں کے مذہبی تہواروں سے بھی حکمرانوں کو خاص دلچسپی تھی۔ آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے تھے۔ اس کے بارے میں میر نے
ایک مدحیہ مثنوی بھی کہی جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر

محمد بخش مہجور کی "نورتن" کے ابتدائیے سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے یہاں بھی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ غازی الدین حیدر کی مدح
میں ایک قصیدہ مہجور نے لکھا ہے۔ اس میں "تعریفِ ہولی" کے عنوان سے یہ شعر ملتے ہیں:

---

۱ سوزخوانی کے لیے موسیقی کی قدیم اور مشکل صنف دُھرپد کا انتخاب کیا گیا اگرچہ اس وقت تک خیال کی گائکی دُھرپد پر غالب آچکی تھی لیکن چند
خصوصیات کی بنا پر سوزخوانی کے لیے دُھرپد ہی کا اپنا زیادہ موزوں تھا۔ شریعتِ اسلامی غنا کو اس شرط پر قبول کرتی تھی کہ اس میں گلے بازی
اور گٹکریوں سے کام نہ لیا جائے۔ دُھرپد کی بھی یہی شرط تھی کہ گانے میں گلے کو بیجا نہ ہلایا جائے۔ سوزخوانی میں ظاہر ہے کہ الفاظ پر سب سے
زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ خیال کے برخلاف دُھرپد کی بھی امتیازی خصوصیت یہی تھی کہ اس میں الفاظ ادا کرنے پر بھی اتنا ہی زور دیا
جاتا تھا جتنا راگ کی پیش کش پر۔ البتہ دُھرپد میں لمبی آلاپ کھینچنا ممنوع تھا لیکن سوزخوانی میں اس پابندی کو ہٹا دیا گیا اور خاص اسی سبب
سوزخوانی میں یہ حیرت خیز وصف پیدا ہوا کہ سوز راگداری سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے لگے۔ میر علی سوزخواں (جو دُھرپد کے ماہر
استاد تھے) اور ان کے شاگردوں نے سوزخوانی کے بنانے سنوارنے میں بڑے کمال صرف کیے۔ بھیرو، دیپک، جوگیا، درباری، جھنجھوٹی
اور بعض دوسرے راگ راگنیوں کی بنیاد پر سوز کی بہترین دُھنیں بنائی گئیں۔ ان باکمالوں نے اپنے فن کو اجتہاد کے اس درجے تک پہنچا
کر دیا کہ جو راگ خوشی کا تاثر پیدا کرتے ہیں وہ بھی سوز میں ڈھل کر غم کی کیفیت ظاہر کرنے لگے۔ (میر علی کی رکھی ہوئی سوز کی بعض دھنیں اب
بھی باقی ہیں لیکن انھیں صحیح طور پر پیش کرنے والے سوزخواں نہیں رہے)

بھادوں کے موسم میں تیری بزم کا دیکھا یہ رنگ — غٹ کے غٹ باندھے ہوئے آئی حسینانِ جواں
پھرتے ہیں رنگِ شفق میں شکلِ مرغابی ہوئے — ہاتھ میں شیشے لیا بھر کے سب پچکاریاں

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو ہندوؤں کی راس لیلا اور سری کرشن جی کی شخصیت سے بہت دل چسپی تھی۔ اُردو کا پہلا ڈرامہ جو واجد علی شاہ نے لکھ کر اسٹیج کیا وہ "رادھا کنھیا کا قصہ" تھا۔ یہ ڈرامہ دراصل راس لیلا ہی کو ترقی یافتہ اور پرشکوہ شکل میں پیش کرتا تھا۔[1] فرماں روایانِ اودھ کا فوجی کردار ایک طرح سے شجاع الدولہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور ملک گیری کی نسبت اب اُن کا میلان ملک داری کی طرف زیادہ تھا۔ آصف الدولہ غالباً اس سلسلے کے آخری شخص تھے جنہوں نے باضابطہ فوج کے ساتھ شریک ہو کر جنگ کی۔ میر تقی میر شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صاحبزادہ آصف الدولہ بہادر . . . جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے۔ جدھر کا رُخ کرتے دھواں سا اُٹھا دیتے اور توپ خانے کے زنجیرے کو تلوار سے کاٹ دیتے۔"[2]

لیکن ذاتی طور پر یہ پورا سلسلہ شجاع اور فنِ حرب سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور ان میں سے بعض حیرت انگیز جسمانی قوت کے مالک تھے۔ ان کی زور آوری کے کچھ واقعات تو موجودہ زمانے کے معیار کو دیکھتے ہوئے ناقابلِ یقین سے معلوم ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنے صیغۂ فوجی کی طرف بطورِ خاص توجہ کر کے اپنی عسکری قوت کو بڑھانا چاہا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا یہ بیان پڑھیے:

"[واجد علی شاہ] انتظامِ سلطنت کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنی فوج کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی نئی پلٹنیں اور رسالے بھرتی کیے۔ روزانہ صبح کی نماز پڑھ کر پریڈ کے میدان میں پہنچ جاتے تھے اور فوجی قواعد کی جو فارسی اصطلاحیں خود ایجاد کی تھیں اُن کے مطابق تین چار گھنٹے فوج کو قواعد کرواتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر فوج کا کوئی دستہ وقت پر پریڈ کے میدان میں نہ پہنچے تو اس پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کیا جائے اور اگر وہ خود سلطنت کے ضروری کاموں کے علاوہ کسی اور وجہ سے غیر حاضر ہوں تو اُن پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ ان کی یہ فوجی سرگرمیاں انگریزوں کو پسند نہ آئیں اور وہ ان کو ترک کرنے پر مجبور کیے گئے۔"[3]

جس طرح اودھ کے حکمرانوں کے دُوسرے شوقوں کا اثر عوام نے قبول کیا اسی طرح اُن کے سپہ گری کے شوق نے بھی لکھنؤ کی عوامی زندگی پر اثر ڈالا اور یہی وجہ تھی کہ ولیم نائٹن کو لکھنؤ ایک ایسا شہر نظر آیا جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ حرب و ضرب کے اسی عام مذاق نے اُردو مرثیے کو اس دور میں جذبۂ شجاعت سے ایک منفرد صنفِ سخن بنا دیا اور اسی عام فضا کا اثر تھا کہ اس دور کی بیشتر اُردو داستانوں میں التزام کے ساتھ جنگ کے مناظر ملتے ہیں۔

---

[1] ص ۱۰۳ — لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔

[2] ذکرِ میر — مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۹ء ص [illegible]

اودھ کے محکوم حکمرانوں کی عشرت پسندی، نااہلی اور عیش کوشیوں کی داستانیں ہمارے سامنے اس صورت میں آئی ہیں جنہیں انگریزوں اور ان کے حاشیہ نشین مورخوں نے روم کا نیرو، انگلستان کا چارلس اور فرانس کا چودھواں لوئی بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر سب اپنے حق میں ہمدردانہ نظر کے منتظر اور اس کے مستحق ہیں کہ ان کی ایک ہمدردانہ اور غیر جانب دارانہ تاریخ لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ انھوں نے اپنے وطن کو کیا دیا۔

لکھنؤ کی ثقافت کا ایک نہایت درخشاں پہلو یہاں کے دو بڑے مذہبی فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد تھا۔ یہ اتحاد اس شہر کی روایت بن گیا تھا اور آج تک اس کا اثر باقی ہے۔ اس روایت کی بنیاد اسی زمانے میں مستحکم ہو چکی تھی۔ آصفی کا میلہ، شاہ مینا کا عرس اور چہلم کے جلوس یکساں سارے شہر کی دلچسپی، توجہ اور انہماک کا مرکز بنتے تھے۔ ادبی جلسے ہوں یا راگ رنگ کی محفلیں، ان میں شریک ہونے والوں کے لیے مذہب و مسلک کی کوئی قید نہیں تھی۔ علم، ادب اور فن کی تمام راہوں پر یہ دونوں فرقے دوش بدوش آگے بڑھ رہے تھے، دونوں یکساں داد و انعام سے نوازے جاتے تھے اور لکھنؤ کو بام عروج تک پہنچانے میں دونوں کا برابر کا حصہ تھا۔

اس مثالی یک جہتی کے پیچھے فرمانروایانِ اودھ کی بے تعصبی تو کام کر رہی تھی لیکن اس کے پس پشت جو سب سے بڑی قوت کارفرما تھی وہ تھی اردو زبان۔ اردو ہی دونوں فرقوں کو اتنا قریب لے آئی کہ دونوں ایک معلوم ہونے لگے۔

۱۸۵۶ء انتزاعِ سلطنتِ اودھ کا سال ہے اور یہی وہ سال ہے جس کے بعد سے لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت زوال کی طرف جھکتی چلی گئی۔ جو سبب دُور دُور سے اہلِ کمال کو کھینچ کھینچ کر لکھنؤ لایا تھا وہ ختم ہوا اور یہ شیرازہ بکھرنے لگا۔ قافلے کے قافلے ہجرت اختیار کر کے لکھنؤ سے جانے لگے۔ انھیں کے ساتھ لکھنؤ کے اہلِ کمال بھی قدردانوں کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے اور اب دوسری دیسی ریاستوں رامپور، بنارس، الور، بھوپال وغیرہ کے عروج کا زمانہ آیا۔ یوں لکھنؤ کے اقبال کا ستارہ ڈوب کر دُور دُور تک شہروں میں روشنی کر گیا۔

اودھ کے علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ لکھنؤ جہاں سلطنت بھر کی آمدنی کھنچ کر آجاتی تھی، تہی دست ہونے لگا اور اب یہاں کی دولت لندن پہنچنے لگی۔ اس طرح لکھنؤ کی خوش حالی کو ایسا دھکا پہنچا کہ اسے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ دولت کی فراوانی ہی خاص طور پر لکھنؤ کو مرجعِ خلائق بنانے کا سبب تھی، چنانچہ دولت کے ساتھ ہی لکھنؤ کی مرجعیت اور مرکزیت نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حکومت سے چھٹکارا پانے کی پہلی تحریک شروع ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ لکھنؤ میں بھی یہ آگ دہک اٹھی لیکن دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ اس آویزش میں لکھنؤ نے وہ کچھ دیکھا جو کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک مختصر سی مدت میں یہ محلوں اور سنہرے گنبدوں کا پرستانی شہر بربادی اور ویرانی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ جن بارونق بازاروں میں زندگی اور زندہ دلی کا ہجوم رہتا تھا، ان میں وحشیوں کی وہ کثرت اور انسانی گوشت کے سڑنے سے تعفن کی وہ شدت ہوئی کہ ایک عرصے تک کتوں اور کرگسوں کے سوا انسانوں کا اُدھر سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ بڑے بڑے باغوں کے تقاضے گولوں سے بھر گئے اور پھر ان باغوں میں ہل اٹھنے لگے۔ بے شمار عمارتیں زمین کے برابر کر دی گئیں جن میں وہ بھی ہے شیخ زادوں کا بنوایا ہوا قلعہ مچھی بھون بھی شامل تھا۔ جا بجا نزولات اور دوسرے واقعات

نوادر لُٹ گئے یا تلف ہو گئے یا انگلستان کے عجائب خانوں اور شخصی ذخیروں، ہندوستان کے انگریزوں اور ریاستوں کے توشہ خانوں کی زینت ہو گئے۔ اس غارت گری میں صرف انگریز ہی نہیں، ہندوستانی فوج کے تلنگے اور بہت سے "گھر کے چراغ" بھی شریک تھے۔

۵۷ء کے واقعات متعدد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہاں فدا علی عیش کے بیان کے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جن سے لکھنؤ کی تباہی اور اہلِ شہر کی خانماں بربادی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ عیش لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے ...... لکھنؤ میں ہزاروں بم کے گولے اتارے۔ آگ برسا دی .... صدہا مکان لوٹے، ہزاروں کا انتقال ہوا۔ اس سے جو بچے اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا ...... شہر کے تین ناکے بند تھے، ایک ناکہ کھلا تھا۔ بھاگنے کا وہی راستہ تھا۔ ہزاروں کیا، لاکھوں زن و مرد ایک کے پیچھے ایک پیدل رواں تھے۔ ...... وہ وہ شہزادیاں، امیرزادیاں جو گھر میں دو قدم بھی پیدل نہ چل سکتی تھیں .... بے مقنع و چادر روتی جاتی تھیں ..... کوئی بی بی کہیں تھک کر بیٹھ گئی، کوئی نازنین کہیں گر پڑی، کسی نازک اندام کے پاؤں میں کانٹا چبھا، کسی چاند سی صورت نے ٹھوکر کھائی .... اپنا ہوش نہیں، لڑکوں کو کون سنبھالے .... دوپٹے دلائیوں سے منہ چھپائے، جنگل جنگل کی خاک چھانتی ...... چلی جاتی تھیں .... بچے جدا بلبلاتے تھے، معصوموں کو بھوک پیاس سے غش پر غش آتے تھے ...... مرد بھی غریب اسی حال میں مبتلا تھے .... جب کسی قصبے یا قریے میں پہنچے، کسی قدر آرام ملا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا .... بڑن کے ڈر سے نیند نہ آتی تھی .... بعضی عورتوں کے وارث، بعضوں کے بچے چھوٹ گئے۔ بعض ناخدا ترس قصبے والوں نے یہ سلوک کیا، رات بھر گھر میں رکھا، صبح کو چلتے وقت لوٹ لیا۔ خلقت کے اژدحام سے جنگل میدانِ حشر کا نمونہ تھا ...... کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ .... اس کس مپرسی کے زمانے میں معلوم نہیں کون کس طرف، کون کدھر گیا۔ کسی کے جینے مرنے کا حال نہ کھلا۔

"جب لکھنؤ رعایا سے خالی ہوا، مکانوں کے کھدنے کا حکم ملا۔ لاکھوں گھر کھد کر زمین کے برابر ہو گئے۔ آبادی کا نشان کیسا، نام تک نہ رہا۔ لکھنؤ سنسان، ہو کا مکان ہو گیا ..... شب کا کیا ذکر، دن کو شہر میں جاتے خوف آتا تھا ..... اگر یہ داستان بھی تحریر کروں تو ایک طومار ہو جائے۔" [1]

"جب تک یہ شہر بیت السلطنت تھا، مخزنِ اہلِ کمال، ہر چیز میں ضرب المثل رہا۔ اب ویرانی

---

[1] "فسانۂ دلفریب"، ابتدائیہ

"دہلی والوں میں مشہور و نزدیک تر ہے . . . . . . جس نے اس زمانے میں اس کا عروج دیکھا تھا اس سے پوچھیے تیرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ آج تک آنکھوں میں وہ تصویر پھرتی ہے۔" ۱

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تباہی ریاست اودھ نے، باآں کہ بیگانہ محض ہوں، مجھ کو بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔" ۲

۱۸۵۷ء کے بعد سے انگریزوں کی اصل حکمرانی شروع ہوئی۔ اب ان کا اثر تہذیب و معاشرت کی رگوں میں بھی نفوذ کرنے لگا۔ لکھنؤ نے حاکموں کے طور طریقوں کو اعلیٰ زندگی کا معیار قرار دے کر ان کی تقلید شروع کی اور دھیرے دھیرے، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، مغربی تمدن کے زیرِ اثر اپنے اصل خدوخال سے محروم ہونے لگا۔ لکھنؤ کی ثقافت اور معاشرت کسی مستحکم بنیاد پر نہیں کھڑی تھی۔ وہ قدیم روایات، حوادث و تجربات، اور ماہ و سال کی وہ گرد نہیں جو کسی تہذیب کو دیرپائی بخشتی ہیں، لکھنؤ ان سے محروم تھا۔ صدیوں میں تشکیل پانے والی تہذیبیں صدیوں تک زندہ رہنے اور ناسازگار حالات کا سامنا کرنے کی سکت رکھتی ہیں اور ایک مدت تک ردِ عمل کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب پر سے ایک صدی کی چار دن چوتھائیاں بھی نہ گزری تھیں اور وہ اسی مدت میں ابتدا و ارتقا کی منزلوں سے گزر کر اور اپنے عروج کی بلندیوں کو سر کرتی ہوئی زوال کی پستیوں میں جا پڑی۔ اس یک لخت عروج و زوال کا سبب جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، لکھنؤ کی دولت مستعار تھی۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد دولت کے اس سرچشمے پر انگریز قابض ہو گئے۔ اب ہر کس و ناکس کے لیے سونے کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے مواقع نہیں رہے۔ علاوہ بریں لکھنؤ تحریک کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس لیے فتح یاب ہونے کے بعد انگریزوں نے یہاں دار و گیر کا بازار گرم کر دیا۔ پہلی بات کے نتیجے میں اہلِ کمال کا لکھنؤ آنا ختم ہوا اور دوسری کے نتیجے میں اہلِ شہر نے گرد و نواحِ لکھنؤ سے جانا شروع کیا۔ یوں ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ کی پھر وہی حالت ہو گئی جو اس کے تہذیبی ارتقا سے پہلے تھی۔ وہی اداسی، وہی ویرانی، وہی پس ماندگی اور وہی کس مپرسی ایک دفعہ پھر لکھنؤ کا مقدر ہو گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے یہ شہر پھوس کے چھپروں اور کچے مکانوں کے ساتھ ویران تھا اور اب فلک بوس عمارتوں اور عالی شان محل سراؤں کے ساتھ۔

اگرچہ یہ حالت بھی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی، امن و امان بحال ہونے کے بعد مہاجروں نے پھر لکھنؤ واپس آنا شروع کیا، شہر پھر آباد ہو گیا، اس کی گہما گہمی، رونق بھی ایک حد تک واپس آ گئی، لیکن اب ملک دوسرے کے تھے، دین و ملک دوسرا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ

---

۱ "فسانۂ دل فریب"، ابتدائیہ۔

۲ بنام شیخ لطیف احمد عثمانی بلگرامی

۳ شباب لکھنؤ، مقدمۂ مترجم

ے نظریات اور میلانات نے بھی حکمرانی اور عوام نے ان کی پیروی شروع کی۔ فدا علی عیش کے مسدس "انقلاب لکھنؤ" سے ان تہذیبی تبدیلیوں کا سراغ ملتا ہے۔ چند ایسے بند پیش کیے جاتے ہیں جن میں شاعر نے لکھنؤ کی گزشتہ اور موجودہ حالتوں کا موازنہ کیا ہے:

لکھنؤ میں نہ کسی شخص کو تھی فکرِ معاش — سارے ساماں تھے بہم تھی نہ کسی شے کی تلاش
تھی اسی شہر کی مشہور تراش اور خراش — عیب بھی کہتے تھے اس حسن سے بانکے اوباش

بات کرنے کا سلیقہ اسے آتا تھا
ان کی صحبت سے بشر آدمی کہلاتا تھا

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان — اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشان
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ نہ وہ لطفِ زبان — دیکھ لیں آنکھوں سے احباب عیاں را چہ بیان

اب یہ تہذیب کی یوں چال بشر چلتے ہیں
سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں جدھر چلتے ہیں

لال ٹوپی تو سرِ پاک پہ کترے ہوئے بال — تولیہ جیب میں جاکٹ کی بجائے رومال
گھڑی تو ہاتھوں میں رہتی ہے ڈبل بیٹ ہیں چپل — گوشتِ بریانِ ولایت کو سمجھتے ہیں حلال

کوئی کھانا ہو اٹھاتے ہیں چھری کانٹے سے
میز پہ بیٹھ کے کھاتے ہیں چھری کانٹے سے

ہے پسند آج گلاب اور چنبیلی کی زبان — شگفتہ قصۂ دلچسپ ہیں بے لطفِ بیاں
کوئی ناول جو لکھے ہے وہ فصیحِ دوراں — نثرِ رنگین و مقفیٰ کی نہیں قدر یہاں

جس میں انگریزی کے الفاظ ہوں تقریر وہ ہے
جس میں انگریزی کا پرداز ہو تحریر وہ ہے

عہدِ شاہی کے جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں — نیم وحشی وہی اس وقت میں کہلاتے ہیں
بعضوں سے غیر مہذب بھی سنے جاتے ہیں — پڑھے انگریزی مہذب کا لقب پاتے ہیں

جو زباں ان کی ہے عمدہ وہ زباں ہے اب تو
فعل انگریزوں کا مطبوعِ جہاں ہے اب تو

جابجا ڈیرہ مکانوں کے جو آتے ہیں نظر — کھینچ کر آہ بہ صد درد یہ کہتے ہیں بشر
تھا کسی وقت میں آبادیٔ شہر خوش تر — شام تھی شامِ اودھ صبحِ بنارس تھی سحر

پہلے آباد تھا یہ ملکِ سلیماں کی طرح
اب تو تاراج ہوا ہے خطۂ یوناں کی طرح

اس طرح لکھنؤ کی تہذیب دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کے پیرو وہ تھے جو قدیم وضع پر قائم رہنا چاہتے تھے اور انگریزیت سے متعلق ہر بات کو گمرہیِ زندگی کی نشانی سمجھتے تھے۔ دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا تھا جو زمانے کے ساتھ خود بھی بدل رہے تھے اور قدامت پسندی کو جہالت کی علامت سمجھتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" میں خوجی اور میاں آزاد لکھنؤ کی تہذیب کے انھیں دونوں متصادم عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غرض ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کی قدیم تہذیب بالکل تو نہیں مٹی لیکن اس کے نمائندے گھٹنے سے استثنا کی سرحد میں داخل ہو گئے اور یہ شخصیات آج بھی لکھنؤ میں مل جاتے ہیں۔

رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں

اکبر علی خاں

ادھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیرِ بحث آ رہا ہے جن کے ذریعے انھوں نے مختلف لکھنے والوں کی سہل پسندیوں اور بے پرواہیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد دی ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بےتوجہی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بلاشبہ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ محتاط ہو کر قلم اٹھائیں۔ خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احتیاط برتنا اور بھی ضروری ہے تاکہ کسی ایک کی غلطی آئندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے۔ لیکن اگر انتقاد کا مطمحِ نظر صرف عیب جوئی ہو جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بلکہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ ان کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کا معیار بلند ہو جائے۔ لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود ان کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائیکہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ ادھر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں ان میں پڑھنے والوں کو وہ روشنی نظر نہیں آئی جس کی توقع اُن سے کی جاتی تھی۔ ایسے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر ان مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردِعمل خوشگوار ہو ہی نہیں سکتا اور انھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں اُن معذرتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے کسی کتاب کے غلط نامے کو نظر انداز کر کے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لگا دیں چونکہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے اس لیے ان مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً ناممکن ہو گیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کام کرنا مشکل ہے اور اس پر اعتراض عاید کر دینا اتنا ہی سہل ہے جتنا سہل ہو سکتا ہے۔ کسی نمائش میں ایک مصور نے اپنی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگا دیا تھا کہ اگر کوئی صاحبِ نظر اس تصویر میں غلطی پائیں تو اس پر نشان لگا دیں۔ چنانچہ اتنے صاحبِ نظر پیدا ہو گئے کہ نشانات کی زد میں تصویر ہی غائب ہو گئی لیکن جب اسی مصور نے دوسری تصویر کے ساتھ یہ درخواست کی کہ غلطی کو درست کر دیا جائے تو کوئی بھی تصویر کی صحت پر انگشت نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال زبان و ادب کے معاملات میں

بھی ہے۔

میرے خیال سے بھی اعتراض کو مشورے کی شکل میں آنا چاہیے تاکہ دوستانہ فضا میں بات کو سنا بھی جا سکے۔ اور اس کے ذریعہ کوئی اچھا کوئی مثبت نتیجہ بھی نکل سکے۔ دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ معترض یا محتسب کو اعتراض وارد کرنے اور احتساب کرنے سے پہلے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس قسم کی غلطی پر وہ نہ صرف یہ کہ گرفت کر رہا ہے بلکہ اسے اس زبان میں طنز و تشنیع کے نشتر بھی چبھاتا جا رہا ہے کہیں اسی قسم کی غلطیاں خود اس کے کارناموں میں تو شامل نہیں ہیں اور کیا اس نے کوئی بے داغ کام بھی پیش کیا ہے۔

اس قسم کے احتسابات کرنے والوں کو بھی یہ نقصان ہوتا ہے اور زبان و ادب کو بھی کہ وہ پھر اپنے نام سے کوئی کتاب بازار میں لاتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اگر ان کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تو قیامت کی دراز دستی کا سارا بھرم نکل جائے گا۔ اور یوں وہ ساری کاوشیں جو تعمیری کاموں میں صرف ہونا چاہیے تھی منفی اور تخریبی کاموں میں ضائع ہوتی رہتی ہے۔

یہ کسی بھی زبان کی کم نصیبی ہے کہ اس کے با صلاحیت افراد یہ نہ طے کر پائے کہ آخر ان کے کرنے کا کام کیا ہے۔

رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصروں میں جن پر ان کی شہرت کا دار و مدار ہے منفی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔

اس معاملے کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں ان کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ مسئلہ ہے کہ جس تحریر کا خلوص مشکوک ہو وہ چاہے کتنی بھی کیوں نہ ہو علمی ہو، ذریعہ آرائش گفتگو تو کچھ مدت رہ سکتی ہے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

رشید حسن خاں کی نیت پر شک کرنے والے کہتے ہیں:

بے شک یہ اعلیٰ پایہ تبصرے تحقیق و تنقید میں پھیلی ہوئی بے راہروی اور بے توجہی کو دور کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن

(۱) پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ تبصرہ نگار کے لہجے میں ہمیشہ طنزیہ انداز ہی کیوں کارفرما ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس سلسلۂ نقد و نظر میں رشید حسن خاں نے اس ادارے اور اس ادارے سے متعلق مصنفین کی کتابوں کو کیوں شامل نہیں کیا جس ادارے سے وہ خود وابستہ ہیں یعنی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ اگر وہ اس ادارے کی مطبوعات اور اس سے متعلق حضرات کی کتابوں پر نہیں لکھتے تو اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ:

(الف) ان کے نزدیک وہ سارے کام معیاری ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہیں اور ان کے خیال میں ان کاموں پر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے

یا پھر یہ کہ:

(ب) رشید حسن خاں کے یہاں بھی مصلحتوں کو دخل ہے۔

ان حضرات کے مطالبوں میں سے شاید کوئی مطالبہ بھی بے جا نہیں اس لیے کہ اگر رشید حسن خاں کے نزدیک حکومت ہند پر شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کو امداد دینے سے غلط بخشی کا الزام آتا ہے تو دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے بھی تا حال حکومت ہند کی بڑی بڑی امدادوں کا کوئی ایسا مصرف نہیں کیا جو اتنی داد ہو جس سے یہ ثابت ہوتا کہ اس نے حکومت کی رقم کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔

کیا کوئی شخص اس بات کا منکر ہو گا کہ اصلاح اور احتساب کا کام اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا

کسی شخص کو محتسب اور مصحح پر شک کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عیب جوئی میں اپنا وقت برباد کرنے سے زیادہ افسوس ناک کیفیت اور کوئی نہیں ہو سکتی، آئندہ گفتگو میں جو مثالیں رشید حسن خاں کے صرف ایک مضمون سے پیش کرنے والا ہوں اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ رشید حسن خاں جو باشعور آدمی ہیں، معروضات کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید "فضول خرچ" ہونے سے بچائیں ——— اس مثال کو سامنے رکھ کر جو ان کے لکھے چند صفحات کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے پہلے دل سے غور فرمائیں۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

تاریخ لطیف اور رشید حسن خاں

رامپور رضا لائبریری میں تاریخ لطیف نام کا ایک مخطوطہ ہے جس میں مہدی علی خاں رامپوری مرتب کتاب نے مشاہیر شعراء، رؤسا، امرا، علما، اولیا اور رعایائے ملک کے قطعات تاریخ وفات جمع کر دیئے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے قابل قدر کتاب ہے کہ اس میں بہت سے مشاہیر بالخصوص شعرا کے بارے میں مستند مواد مل جاتا ہے۔ دلی کالج اُردو میگزین کے شمارہ ۱۹۶۳ء میں رشید حسن خاں نے اس کتاب کا تعارف کرایا اور اپنے نزدیک چند اہم ترین شعرا سے متعلق قطعات تاریخ کے وہ شعر بھی نقل کیے جن سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے اور ضرورتاً حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔

کسی قلمی کتاب پر کچھ لکھنا یا اس سے کچھ اخذ کرنا بڑی ذمے داری کا کام ہے اور بڑی احتیاط اور دیدہ ریزی کا متقاضی۔ اس کا سبب یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب عام طور پر لوگوں کی دسترس میں نہیں ہوتی اور پڑھنے والوں کو اسی شخص پر تمام و کمال بھروسہ کرنا پڑتا ہے جس نے اس قلمی کتاب سے اخذ و اشاعت کا کام لیا ہے۔

اس نزاکت کے باوجود بھی رشید حسن خاں نے اپنے اس تعارفی مضمون میں بے توجہی اور سہل پسندی برتی ہے۔

میرے معروضات میں انھیں سے پیدا ہونے والی صغیر و کبیر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(الف)

۱۔ سب سے پہلے رشید حسن خاں صاحب نے مؤلف کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اُن کے نام کے ساتھ ان کا تخلص "ممتاز" بتایا ہے لیکن یہ تعارف نامکمل ہے اس لیے کہ ان کا تخلص مہدیؔ اور آرامؔ بھی تھا ان میں سے آخرالذکر تو مذکورہ کتاب ہی کے صفحہ ۲۰۸ پر پایا جاتا ہے۔ مذکورہ صفحے پر مہدی علی خاں کا کہا ہوا عبدالہادی خاں وفا رامپوری کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے اس [illegible] کہ ان کا تخلص آرامؔ بھی تھا۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے۔

دُنیا سے گئے حکیم عبدالہادی　　ماتم ہوئی اہلِ علم کی محفل آج
آرامؔ کو دی سروش غیبی نے صدا　　جنت میں ہوئے جا کے وفا داخل آج

۱۳۲۴ھ

اس کے علاوہ کتب خانہ رامپور میں ان کا ایک مجموعہ رباعیات "ماتم" کے نام سے موجود ہے جو ان کے تخلص کی تصدیق کرتا ہے۔
رشید حسن خاں تاریخ لطیف میں یہ تخلص درج ہونے کے باوجود ناواقف ہیں۔

(ب)

۲۔ آگے چل کر رشید حسن صاحب نے کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۲۴ بتائی ہے۔ لیکن یہ صحیح درست نہیں۔ اس لیے کہ کتاب کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ آغاز کتاب میں ساٹھ شعرا کی فہرست ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد ۱۸۰ صفحات پر قطعات تاریخ درج ہیں اس طرح دونوں کی مجموعی تعداد ۲۰۰ ہوتی ہے۔

قلمی کتابوں کے حوالے میں عام طور پر صفحات کے بجائے اوراق لکھے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں کے بیان کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھوں نے اوراق کی جگہ سہواً صفحات کا لفظ لکھ دیا ہے مگر ۲۰۰ اوراق ہو جاتے ہیں لیکن میری یہ خوش گمانی بھی کام نہ آئی اس لیے کہ ۲۵۰ یا ۲۰۰ کی دو سے تقسیم کا حاصل ۱۲۵ اور ۱۰۰ ہوگا ۱۲۴ کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ کاتب کی غلطی ہو لیکن تحقیق سے پتہ چلا کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب خانہ رامپور کی فہرست مخطوطات اردو میں اس کتاب کے سہواً ۱۲۴ صفحات ہی بتائے گئے ہیں اور دراصل رشید حسن خاں کی بے توجہی اور سہل پسندی نے وہیں سے یہ غلطی اخذ کی ہے۔

(ج)

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ کتاب کے آغاز میں ۲۰ صفحات کی فہرست مندرجات ہے اس میں ساٹھ متوفیان کو تخلص کے لحاظ سے حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے کتاب کے مشمولات میں اس فہرست کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا حالانکہ اس سے بعض مفید معلومات اخذ کرنا چاہیے تھیں۔ مثال کے طور پر:

۳۔ فہرست کے ص ۰ پر مولانا عبدالرحمن مورخ کے نام کے ساتھ مؤلف کتاب نے ان کا رشتہ شاگردی مولوی محمد حسین فقیر سے بتایا ہے جبکہ رشید حسن صاحب نے خمخانہ جاوید کے حوالے سے ذوق کا شاگرد لکھا ہے یا تو انھیں محمد حسین فقیر کا نام بھی لکھنا چاہیے تھا یا اس سے اختلاف کرنا چاہیے تھا۔

(د)

۴۔ رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف کے مخطوطے کا احتیاط اور توجہ سے دیکھے بغیر ہی بعض مقامات پر حتمی دعوے کیے ہیں جو تحقیقی احتیاط کے منافی ہیں انھوں نے دعویٰ کیا ہے۔

"تاریخ لطیف میں ہر جگہ ایک سنہ لکھا ہوا ہے ہجری عیسوی یا فصلی"

لیکن ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ مخطوطے کے صفحہ ۸ کی طرف رجوع کریں جس پر منظر حسین علیانی کا کہا ہوا محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کا مصرع تاریخ وفات درج ہے اور مرتب نے تقویم عیسوی درج کی ہے اور اس کے ساتھ ہجری مطابقت بھی ظاہر کر دی گئی ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے

محبوب ملک داخل باغ جناں ہوئے

۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

تاریخ گو شعراء نے کہیں کہیں قطعات میں عیسوی اور ہجری دونوں سنین سے تاریخیں بتائی ہیں اس لیے بھی رشید حسن خاں کا بیان ایک حد تک محتاج اصلاح ہے۔

(۷)

۵۔ رشید حسن خاں نے تعارف میں فرمایا ہے کہ تاریخ عطیت میں بعض مقامات پر شمار کی غلطی سے غلط اعداد درج ہو گئے ہیں مگر میں یہ عرض کروں گا کہ رشید حسن خاں نے اپنے حواشی میں جہاں کہیں ایسی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خود رشید حسن خاں کا سہو ہے مخطوطہ کا نہیں ہے مثلاً:

تاریخ عطیت میں مندرج شاعر کے لکھے ہوئے راسخ عظیم آبادی کے قطعۂ وفات سے شعر مادہ کو رشید حسن خاں نے اس طرح نقل کیا ہے۔

سال فوت راسخ فخر جہاں
گفت ہاتف "راسخ شیوہ بیاں"

۱۲۴۱ھ

اور پھر حاشیے میں اعتراض کیا ہے کہ:

"مخطوطے میں مادۂ تاریخ کے نیچے ۱۲۳۰ھ درج ہے لیکن اس مادے سے ۱۲۴۱ھ نکلتے ہیں یہی درج کیے گئے لیکن اس کا صحیح سنہ وفات ۱۲۳۸ھ ہے۔"

یہاں رشید حسن خاں کا بیان غلط ہے مخطوطے میں مصرع کی تاریخ صورت یہ ہے۔

گفت ہاتف "راسخ شیوا زباں"

اور اس مادہ سے ۱۲۳۸ھ ہی نکلتے ہیں۔

۶۔ ضمیر کا مادۂ تاریخ مخطوطے میں مندرجہ ذیل ہے۔

بود سید ضمیر محمود نام

اور اس مادے سے ۱۱۷۲ھ نکلتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس پر حاشیے میں لکھا ہے کہ:

"مخطوطے میں ۱۱۷۰ لکھے ہوئے ہیں جو سہو قلم ہے یا شمار کی غلطی۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سہو قلم اور شمار کی غلطی رشید حسن خاں کی ہے مخطوطہ تاریخ عطیت کی نہیں اس لیے کہ وہاں ۱۱۷۲ھ ہی درج ہیں۔

۷۔ قسمت دلمیر کا مادۂ تاریخ وفات جو شاعر نے لکھا تھا۔ تاریخ عطیت میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

"داستانِ گلشنِ نعیم" مثنوی

۱۲۰۵ھ

لیکن رشید حسن خاں صاحب نے حاشیے میں بتایا ہے کہ مخطوطے میں مادۂ تاریخ کے نیچے ۱۲۰۵ھ لکھے ہوئے ہیں، جو غالباً سہو قلم ہے۔

یہاں بھی رشید حسن خاں کی اطلاع خود اُن کا سہو ہے مخطوطے کا نہیں۔ مخطوطے میں ۱۲۰۵ ہی درج ہے۔

(۵)

۸۔ حواشی لکھتے ہوئے رشید حسن صاحب نے غیر ضروری حوالوں کا اضافہ کیا ہے اور جو حوالے پہلے سے تاریخ لطیف میں موجود تھے اس کے لیے ثانوی حوالے درج کیے ہیں۔

مُفتی صدر الدین آزردہ کے مادۂ تاریخِ وفات "صدرِ اسلام دویم امامِ ہشتم" پر حاشیہ لکھتے ہوئے غلام علی شمس امتیاز کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ تذکرۂ علمائے ہند سے نقل کیا ہے یہ تلاش غیر ضروری تھی اس لیے کہ یہ قطعہ تاریخ لطیف صفحہ ۵ پر پہلے ہی موجود تھا اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں۔

بروزِ پنجشنبہ کرد رحلت — کہ این عالم نہ جائے جاوداں بود

ماہِ ربیع الاوّل و بست و چہارم — وداع او سوی دار الجناں بود

علیہ افسوس آن اُستادِ ذی قدر — پدر وارم ہمیشہ مہرباں بود

"چراغِ فضل" ہست تاریخِ ولادت — کنوں گفتم "چراغِ دو جہاں بود"

۱۲۸۵ھ

اس قطعے سے وفات کی تاریخ اور مہینہ اور سنہ وفات کے ساتھ سالِ ولادت بھی معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ آزردہ ظہور کے اُستاد تھے۔ رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف میں اس قطعے کا موجود ہونا نہیں بتایا جس سے اس کا اعتبار بڑھ جاتا۔

۹۔ اسیر کے لیے امانت لکھنوی کے قطعہ تاریخ وفات سے مادۂ تاریخ

"جان داد امانت بخدا بود امین"

نقل کرکے رشید حسن خاں نے حاشیے میں میر وزیر علی خاں شاگرد برق کا کہا ہوا قطعہ تاریخِ وفات بحوالہ دیوان خود موسومہ "جنہا نور" دیوانِ امانت اور قاضی عبد الودود صاحب کے مقالے مشمولہ سالنامہ نقوش سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء (یہاں قاضی صاحب کے مقالے کا عنوان درج نہیں کیا گیا) بھی نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قطعہ تاریخ لطیف (ص ۳۱-۳۲) میں بھی درج ہے اس طرح اس قطعے کے لیے بھی تلاشِ فضول سے کام لیا گیا ہے جس سے سوائے حوالوں کے اضافے کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

(۶)

حاشیہ آرائی میں رشید حسن خاں نے تفصیلات جمع کرنے کی خاطر مختلف کتابوں اور رسالوں کو سامنے رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ

ہوئے فراہم کیے ہیں لیکن اگر کسی کتاب کو سامنے نہیں رکھا تو وہ یہی تاریخ لطیف ہے۔ قطعاتِ تاریخ میں مادۂ تاریخ اکثر آخری شعر میں نظم کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی دیگر تفصیلات مرض موت، دن، مہینا اور تاریخ وغیرہ قطعے کے پہلے اشعار میں نظم کردی جاتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کی کسی اطلاع سے جو تاریخ لطیف کے قطعات میں پائی جاتی ہے۔ کوئی استفادہ نہیں کیا اور ادھر اُدھر دوسرے حوالوں کو جمع کرتے رہے۔

ہر تحقیقی کام کرنے والے کو اس بات کا احساس ہوگا کہ مرتب کو سب سے پہلے اُسی کتاب کی معلومات پیش کرنا چاہئیں جس پر وُہ کام کر رہا ہے اگر وہ صحیح ہیں تب غلط ہیں تب۔ اس کے بعد مرتب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مزید تلاش سے اگر ممکن ہو تو کسی اطلاع کی صحت یا عدم صحت کے لیے دلائل کا اضافہ کرے لیکن اصل کتاب کی اطلاعات سے صرفِ نظر کرنا سہل پسندی اور بے توجہی کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت میں ثانوی حوالوں سے غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور بہت سی ضروری معلومات پردے میں چھپی رہ جاتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف پر اپنے مضمون میں اس انداز کار کی ایک مثال پیش کی ہے اور کتاب کے مندرجات کی قریب قریب ساری ہی اطلاعات سے چشم پوشی کی ہے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل معروضات کو سامنے رکھیے:

۱۰۔ امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ وفات از نواب مرزا داغ (تاریخ لطیف صفحہ ۳۸) کا آخری شعر رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ لیکن امراضِ موت کی جو تفصیل داغ نے دی تھی اُس کا کوئی ذکر نہیں کیا متعلقہ اشعار یہ ہیں:

کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں　　کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیر
بے کلی، حدتِ صفرا و تپ　　درد آزار اسہال و زحیر

اس قطعے کے ایک شعر میں "مینائی" نسبت کی طرف اور امیر سے رشتۂ شاگردی کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے:

شاہ مینا سے تھا نسلی سلسلہ
شاعری میں خاص تلمیذ امیر

رشید حسن خاں نے اس سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۱۔ تاریخ لطیف صفحہ ۴۳-۴۴ میں امیر مینائی کا قطعۂ تاریخ وفات از کلیم لکھنوی بھی درج ہے جس سے وقتِ انتقال معلوم ہوتا ہے اور رشید حسن خاں نے جن حوالوں سے تاریخ وفات بتائی ہے ان سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

چو با ہفدہم بد ز جمادیٔ دوم　　بہ دو پاس یک شب شنبہ گذشتہ تقدیر
ہمچنیں سیزدہم از مہ اکتوبر بود　　نُہ صد و الف کنم سال مسیحی تحریر

رشید حسن خاں نے اس کے برخلاف ۱۹ جمادی الآخر تاریخ انتقال بتائی ہے اور وقتِ انتقال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

۱۲۔ میاں قیس کی تاریخ وفات کے لیے رشید حسن خاں نے 'امیر کا مادۂ تاریخ' انتخاب کیا ہے اور مزید معلومات کا اضافہ

یادگار انیس، خمخانۂ جاوید، تاریخ ادب اردو، آب بقا اور گل رعنا کی مدد سے کیا گیا ہے۔ لیکن تاریخ لطیف ہی کے ایک قطعے سے وقت انتقال مع یوم وفات کے ساتھ سنہ عیسوی برآمد ہوتے ہیں اور ان میں سے پہلی دو اطلاعات سے رشید حسن خاں بے خبر ہیں۔ اس قطعے کے کہنے والے سید حسن لطافت خلف سید آغا حسن ہیں۔ تاریخ لطیف کے صفحات ۴۸-۴۹ پر یہ قطعہ درج ہے۔ اس سے ضروری اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

قریب شام ہوئے آہ وہ کمال تمام | اخیر چاند تھا گزشتہ تھے تو دن انتیس
سنایا واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ | کہ جس میں مندرج ہیں کئی سلسلے سلیس
بیان مصرعۂ آخر کے اب صنائع ہوں | بفکر کہیں لطافت ہے حساب نویس
شروع مصرعۂ تاریخ جو کہ ہیں دو حرف | بینا ایک ہے اور دوسرا ہے عدد خمیس
سنین بھی ہیں عیاں اس سے عیسوی ہجری | جزئیات زبر ہوں رقم بطور نفیس
وہ مرثیہ وہ پڑھانا وہ بڑے مجمعے | اداس مجلس ماتم ہے سامعین ہیں بین

عجیب مصرعۂ تاریخ ہے لطافت
"یہ نہج تو کہا ہے زمرۂ انیس ملئے انیس"

۱۲۹۱ھ

۱۳۔ اردو کے مشہور شاعر سید ضامن علی جلال کا قطعۂ تاریخ وفات انھیں کے بیٹے میر مہدی کمال کا نتیجۂ فکر تاریخ لطیف (صفحہ ۹۹-۱۰۰) میں موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے اس قطعے کا آخری شعر نقل کیا ہے اور اپنے حاشیے میں آب بقا، خمخانۂ جاوید، تذکرہ کاملان رام پور، مقالۂ آرزو صاحب (یہاں بھی مقالے کا عنوان نہیں بتایا) بحوالہ جلال از محمد حسن اور انتخاب یادگار سے کام لیا ہے۔
مجھے یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود بھی صحیح تاریخ دریافت نہیں کر سکے حالانکہ کمال کے اس قطعے کے سامنے ہوتے ہوئے کہیں اور کہیں تلاش کے سفر پر جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کمال کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:

مہ شوال کی تاریخ چودھویں | وہ بدھ کا روز تھا آفت کا سماں
وہ شاعر اٹھ گیا بزم جہاں سے | کمال شاعری جس پر تھا نازاں
کمال آنکھوں سے پنہاں ہے جلال آہ | "چھپا ہے شاعری کا مہر تاباں"

لیکن رشید حسن خاں نے اپنی تحقیقات میں مندرجہ بالا قطعے کو نظر انداز کر کے خمخانۂ جاوید کی اس اطلاع کو بنیاد بنایا ہے۔

"جناب جلال نے بعمر ۷۶ سال بتاریخ ۲۰، اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال فرمایا۔"

اور اس کے بعد تقویم کے حساب سے ہجری تاریخ دریافت کر کے ۵، شوال ۱۳۲۷ھ بتائی ہے۔
ہجری سال مع تاریخ و روز پہلے ہی سے سامنے ہوتے ہوئے سنہ عیسوی کو بنیاد قرار دے کر ہجری تاریخ نکالنا کس منطق کے علاوہ کیا کہی جا سکتی ہے جبکہ اس سعی کاوش کے باوجود تیرہ غلط ہی رہا، صرف اس وجہ سے ہوا کہ رشید حسن خاں نے منقولہ بالا قطعۂ تاریخ ——

بے توجہی برتی ہے اس حالیکہ اسی قطعہ کا آخری شعر خود نقل بھی کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ رشید حسن خاں نے بیٹے کی بتائی تاریخ پر نہ صرف یہ کہ دُوسرے حوالوں کو ترجیح دی بلکہ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ معلوم نہیں تحقیق کے وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنیاد پر بیٹے کا بیان دیگر بیانات کے مقابلے میں غیر معتبر اور ناقابلِ ذکر قرار دیا گیا۔

بہرحال جلال کی صحیح تاریخ ۲۵ شوال نہیں جو رشید حسن خاں نے تحقیق کی ہے بلکہ ۴ شوال روز چہار شنبہ ۱۳۲۷ھ ہے جو جلال کے بیٹے کمال نے اپنے قطعہ میں نظم کر دی ہے۔

۱۴۔ داغ دہلوی کا مادۂ سال وفات جو احسن مارہروی نے نکالا تھا رشید حسن خاں نے نقل کیا ہے اور مہینہ اور اس کی تاریخ خمخانۂ جاوید کے حوالے سے۔ لیکن تاریخ لطیف کے کسی قطعات سے کوئی استفادہ نہیں کیا جن میں سے ایک حنیف جونپوری کا کہا ہوا ہے اس میں مہینہ اس کی تاریخ اور مرضِ موت کا تذکرہ موجود ہے اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

ہائے فالج نے کیا ستم ڈھایا   کیسی برپا ہوئی قیامت آہ
ماہ ذی حجہ کی نویں تاریخ   یا ہے عاشور کا یہ روزِ سیاہ
مر کے چپ ہو گیا فصیح الملک   یہ خبر منتشر ہوئی ناگاہ
ہائے وہ خوش نوائی بلبلِ ہند   ہائے اُستاد شاہ آصف جاہ
نہ مٹا تھا حنیفؔ امیر کا غم   کہ ہوا داغ کا غمِ جانکاہ

سالِ عمر پڑھ کے خون ناب بہا
شاعری داغ کے گئی ہمراہ

۱۹۰۵ء (ص ۹۶)

اس کے علاوہ ایک اور قطعہ میں جو آزاد شیخ پوری شاگرد امیر مینائی کا کہا ہوا ہے اور تاریخ لطیف ص ۹۲ پر درج ہے مرضِ موت کا ذکر آیا ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے:

ہائے فالج کا تھا وہ اک جھونکا   جس ہوا سے یہ گل چراغ ہوا

مرضِ موت کا ذکر اور بھی مختلف قطعات میں ہے لیکن رشید حسن خاں لاعلم ہیں۔

۱۵۔ داغ سے متعلق کئی اور قطعات بھی ہیں جن میں سے ایک قطعہ مصنفہ قاضی سید مقصود حسین حیرت شاہ جہان پوری سررشتہ دار عدالت جج خیفہ گوالیار شاگرد داغ میں یہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے داغ کے سات شاگردوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

اے مرے استاد کیا کہنا ترا   کر دیا استاد شاگردوں کو بھی
اللہ اللہ بیخود و بیباک و وجد   حیرت و مطلب جلال و واصفی
برق تمکین شوق و بیتاب و شرر   آفریں جادو نظیم انجم مُغنی
اختر و امید شیدا شوق و شاد   فوق و مضطر سید احسن لکھنوی

شمس و افسون و شوق محمود و عشق — طالب و محمود صاحب دہلوی
گوہر و عاشق و ضیا و سائل و طیباں — عیش و نادان و عیش و نوح ناروی
اشک و بسمل صاحب و شفق و فصیح — بلم و ثاقب احسن و اطہر دہلوی
مہر و باغ و رمز و توقیر و حسن — شاعر و درّ و سہا و نسیم عسکری
جس کے ایسے سیکڑوں شاگرد ہیں — ایسے اُستاد کی ستم کش کی تھی

ص ۹۲-۹۳

سائل دہلوی کے قطعہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کیے جانے کے لائق ہے۔

شد وفاتش بشام یوم الحج — دفن شد روز عید سائل ہند

(ص ۱۰۰)

رشید حسن خاں صاحب نے ان میں سے کسی ایک اطلاع سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۶۔ دبیر کا مادہ سال وفات از امیر نقل کر کے تاریخ کی تفصیل کے لیے شاد و دبیر، خمخانۂ جاوید، آبِ حیات کو پیش نظر رکھا ہے لیکن میر مہدی واقف کے قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

روز سہ شنبہ تھا اور تیسرا محرم وقت صبح — ماتم شہ میں جبکہ یہ آمادۂ سفر تھے

ان شعروں سے معلومات میں دن اور وقت کا اضافہ ہوتا ہے اور تاریخ کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھیے تاریخ لطیف ص ۱۲۹)

رشید حسن خاں نے ان سے کام نہیں لیا۔

۱۷۔ مولوی عبدالرحمن راسخ دہلوی کا مادۂ تاریخ وفات از آغا شاعر قزلباش نقل کر کے راسخ کی تاریخ وفات خمخانۂ جاوید کے حوالے سے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء بتائی ہے۔

تاریخ لطیف میں اس قطعے کے خاتمے پر حاشیے میں یہ عبارت بھی مؤلف کتاب ہی کے قلم سے درج ہے:

"۲۰ شعبان روز چہار شنبہ قبل از نصف النہار"

رشید حسن خاں نے اس حاشیے کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ اس سے استفادہ کیا۔ نہ یہ بتایا کہ عیسوی اور ہجری تاریخوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔

راسخ دہلوی ہی سے متعلق ایک اور قطعہ تاریخ منیر آفریں منیر دہلوی کا نتیجۂ فکر بھی تاریخ لطیف میں موجود ہے اور اس کے مصرعِ تاریخ سے مہینے اور سنہ دونوں کا علم ہوتا ہے۔ قطعے کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

منیر اب اُن کا سال فوت کہیے
"ہوئی شعبان میں بس اُن کی رحلت"

۱۳۲۵ھ (تاریخ لطیف ص ۱۳۵)

رشید حسن خاں نے اس مقطع سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۸۔ پیارے صاحب رشید کا مادۂ تاریخ از مشیر لکھنوی نقل کرکے گلزار رشید طبع ۱۹۰۱ء کے حوالے سے مزید معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں کو محروم توجہ رکھا ہے۔

ملال ضعف سے فارغ ہوئے مگر کر جنبش تھی　　گھر گئے سوئے اجداد جب کہ آئی قضا
سحر کا وقت تھا ذی قعدہ کی تھی بست و ششم　　کہ آفتاب کمالات زیر خاک چھپا
وہیں پہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے　　قدم نہ گوشۂ عزلت سے مرکے بھی نکلا

(ص ۱۴۲)

رشید حسن خاں نے اس قطعے سے وقت انتقال تو دیا ہی نہیں لیکن ایک دوسری اہم اطلاع سے بھی محروم رکھا اور وہ یہ کہ پیارے صاحب رشید اپنی خوابگاہ ہی میں مدفون ہوئے۔ اس کے برخلاف انھوں نے گلزار رشید کے حوالے سے باغ میر عشق قلعکاب گنج لکھنؤ مدفن بتایا ہے۔

۱۹۔ محمد جان شاد کے قطعۂ تاریخ گفتۂ تجمل حسین تجمل کو نقل کیا ہے مگر اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے صرف نظر کرکے آب بقا سے کام لیا۔

مہا از تحسین گفتی می توانم　　کہ عمرش زائد از ہشتاد شد وای
بہ فالج چوں بہ فرش مرگ افتاد　　مرض ہم فی المثل افتاد شد وای
مہیا او غرہ یکشنبہ ششم　　بہ مغرب دیدہ را جنباد شد وای
ہمیں دو چار ساعت ماند بر خود　　ز قید زندگی آزاد شد وای
مکان ویران شدہ تاریخ جستم　　لحد از معتد مش آباد شد وای

اس طرح مرض موت اور تاریخ دفن کی اطلاع رشید حسن خاں نے نہیں دی۔

(دیکھیے تاریخ لطیف ص ۱۵۱)

۲۰۔ رشید حسن خاں نے غلام امام شہید کے مادۂ تاریخ کے لیے مرزا سالک دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے جس سے ۱۲۹۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

آہ ارباب درد پر طاری　　پھر ہوا ماتم امام شہید

اور اس پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

"کلیات سالک نے فی الوقت میری دسترس سے باہر ہے کہ تحقیق کر سکوں۔ موجودہ صورت میں اس شعر سے مطلوبہ تاریخ نہیں نکلتی ہے۔"

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ انھیں الفاظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ رشید حسن خاں شعر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس شعر کو سمجھنے میں ناکام

ہے ہیں۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ارباب درد پر ماتم امام شہید کو طاری ہُوا۔ یعنی ارباب درد اور ماتم امام شہید کے اعداد جمع کر دیے جائیں۔ ارباب درد کے اعداد ۶۴۱ اور ماتم شہید کے ۶۵۸ ہوتے ہیں ان دونوں کا حاصل جمع ۱۲۹۹ ہے۔ تعجب ہے کہ رشید حسن خاں اتنے سیدھے سادے الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

پُر لطف بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں اپنی دسترس سے باہر کتابوں سے استفادے کی آرزو کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ ادبیات جلد کے زیرِ مطالعہ ہے اُس سے کوئی کام نہیں لیتے۔

۲۱۔ رشید حسن خاں نے شاہزادہ قادر بخش صابر کا مادۂ تاریخ وفات از محمد ناصر القلم

• شہ شاعراں زماں مُردہ ہے۔

۱۲۹۹ھ

نقل کرکے مختار قاضی عبدالودود نقوش سالنامہ ۶۲-۱۹۶۱ء کے حوالے سے مقامِ وفات کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اسی قطعے کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ نہیں کیا جس میں تاریخ، مہینا اور دن بتلائے گئے ہیں۔

ز شعبان سوم بود روز دو شنبہ   بایں شان و نام و نشاں مُردہ بے

۲۲۔ میر غلام علی عشرت بریلوی کے مادۂ تاریخ وفات کے لیے کرم رام پوری کے قطعے سے یہ شعر

بے خار کرم نے اس کی تاریخ   لکھی یہی ہائے میر عشرت

۱۲۳۶ھ

نقل کیا ہے اور مزید اطلاعات تذکرہ کاملان رام پور کا سہارا لیا ہے لیکن کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے عشرت کے ناتمام منظوم ترجمہ پدماوت کی تکمیل، قصۂ شہدائے کربلا اور ایک دوسری نثری کہانی کی تصنیف، انتقال کے مہینے اور تاریخ کا علم بھی ہو جاتا ہے ان میں سے کسی بات کا رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بیان نہیں کیا۔ اشعار یہ ہیں:

پدماوت ناتمام کی ختم   جس سے شاد ہُوئی روحِ عشرت
قصۂ شہدائے کربلا کا   لکھا خونِ جگر کھا بہ محنت
مجموع و عجیب اک کہانی   کی نثر بخوبی و فصاحت
شوال کی بست و ششمیں کو   وا اُس پہ ہُوا ہے بابِ جنت   (ص ۱۸۱)

۲۳۔ مندرجہ بالا قطعے کے کہنے والے کرم خاں رام پوری پر بھی انتخابِ یادگار کے حوالے سے یہ حاشیہ لکھا ہے:

"مرزا محمد اور عرف کرم خاں شاگرد قدرت اللہ شوق ۶۹ برس کی عمر پائی وفات

۱۰ ذی حجہ ۱۲۵۳ھ بروز دوشنبہ"

لیکن تاریخ ادبیات ہی میں منقول کرم خاں کا قطعۂ تاریخ وفات جو کرم خاں کے بھانجے احمد خاں غفلت اخوان زادہ کا کہا ہُوا

۱۹۲، ۲۲، ۱۹۵ پر درج ہے رشید حسن خاں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ٹھہرا جبکہ اس قطعے سے کرم خاں کا صحیح نام، مدت مرض موت، وقت انتقال اور صحیح دن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مزید اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں:

شاعر کامل و ذی حوصلہ نامور صاحب — جن کو استاد کرم خاں کہے اعلیٰ و ادنیٰ
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں — مجمع خوبی و اہلِ حکمت و شرم و حیا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال — شصت و یک سال تلک کھائی ہوائے دنیا
ہوئے اقلیم بقا ملک فنا سے جس دم — وہ سخن فہم جہاں رخت سفر باندھ اٹھا
ظہر یکشنبہ و ہفتم مہ ذی حجہ کی تھی — کتنے پیاگن تھے اسے ہندی میں پیرو برنا
طلب اس خسرو ثانی کے کیا سال وصال — آئی ہاتف کی یہ آواز کہ "خوش فکر موا"

۱۲۵۳ھ

۲۴۔ مادۂ تاریخ فدا علی عیش لکھنوی کے لیے شادؔ لکھنوی کے قطعہ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

شاد بزد چوں پای قضا شد سال وفاتش مضاف
غسل طوبیٰ، حلۂ جنت، حور بہشتی، عیش جناں

اور محمد علی خاں اثر رام پوری کے ایک مضمون سے یہ جملہ بحوالۂ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ نقل کیا ہے۔

"منشی فدا علی عیش لکھنوی بعمر ۷۲ سال بہ ہفتہ گزشتہ"

لیکن اسی تاریخ لطیف کے قطعے کا پہلا شعر نقل نہیں کیا جس سے دن کا علم ہوتا ہے اور اس کی مدد سے صحیح تاریخ بھی دریافت ہو سکتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

عیش سخنور روز دوشنبہ چوں بہ ذی قعدہ بمرد
جُل روحش گشت پدید و سوئے ارم زین دار جہاں — (تاریخ لطیف ۱۸۲)

میں عرض کروں گا کہ ۱۴ ذی قعدہ کو یکشنبہ تھا اس رعایت سے ہفتۂ گزشتہ میں دوشنبہ ۸ ذی قعدہ کو اور اس طرح عیش کا انتقال دوشنبہ ۸ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ کو ہوا۔ رشید حسن خاں مطلع کے پہلے شعر کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے تاریخ بتانے میں ناکام رہے۔

۲۵۔ قدر بلگرامی پر حاشیے میں دیباچۂ کلیاتِ قدر سے کام لیا ہے لیکن تاریخ لطیف ص ۸۸ پر درج شدہ قطعہ تاریخ گفتۂ غلام حیدر مرشد گرامی شاگرد قدر کے ان شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

روز یکشنبہ و بست و سوم ذی قعدہ
فوت کرد آں شے تسلیم سخن واہ دریغ

سنہ رحلت او ارشد معصوم نوشت

شد مدفن قمر بحسن آرام اللہ

۱۳۰۱ھ

۲۶۔ خود قدر ہی کے ایک شعر سے نکالا گیا مادہ تاریخ بھی تاریخ نبیلت ص ۱۸۹ پر درج، رشید حسن خاں نے اس کی حیثیت کی طرف توجہ نہیں کی۔ مادہ شعر یہ ہے:

بہار آئی ہوئی ہے قمر کی تربت پہ میلا ہے

یہاں پڑھ کر بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

۲۷۔ باقر علی خاں کامل کا قطعہ تاریخ از سالک تاریخ نبیلت ص ۱۹۱ پر درج ہے۔ مادے کا شعر جو رشید حسن خاں نے بھی نقل کیا ہے یہ ہے:

یہ ہی نوحہ ہے یہی تاریخ سن

نوجواں باقر علی خاں حیف ہے

مخطوطے میں اعداد ۱۲۳۳ھ درج ہیں جو اس مادے سے برآمد نہیں ہوتے۔ اس غلطی کی طرف عرشی صاحب نے مخطوطے کے صفحہ ۱۹۱ پر جہاں یہ قطعہ درج ہے ایک حاشیہ لکھ کر اشارہ کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ اعداد سہواً غلط درج ہوئے ہیں مصرع سے ۱۲۹۳ھ نکلتے ہیں اور یہی صحیح تاریخ وفات ہے۔ عرشی"

رشید حسن خاں نے اس غلطی اور تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جب کہ وہ تین بار صحیح اعداد کو غلط کہہ کر نوٹ لکھ چکے ہیں۔ ان مثالوں کے لیے رجوع کیجیے زیر نظر مضمون کا نمبر ۵، ۶، ۷۔

۲۸۔ حکیم سید مہدی کمال کا دن اور مہینہ دریافت کرنے کے لیے رشید حسن خاں نے تذکرہ کاملان رام پور سے کام لیا ہے حالانکہ تاریخ نبیلت (۱۹۵) کے درج ذیل قطعے سے اخذ کیا ہے جو جعفر علی خاں رئیس شمس آبادی نے کہا ہے۔

کرد تخلص کمال شاعر نازک خیال

سید مہدی علی جائے نشین جلال

رفت چو ز دنیا بیں گفت مورخ چنیں

ماہ صفر با دو دم گشتہ زوال کمال

۱۳۲۹ھ

۲۹۔ میر مونس لکھنوی کا مادہ تاریخ از منیر نقل کر کے حاشیے میں آب حیات کے حوالے سے لکھا ہے۔

"میر محمد نواب مونس خلف میر خلیق برادر انیس۔"

لیکن تاریخ نبیلت (ص ۲۱۹) پر نقل شدہ قطعہ تاریخ از لطافت کو کام میں نہیں لائے جب کہ اس قطعے سے مونس مرتضیٰ

اور تاریخ سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مزید اشعار یہ ہیں:

در مہ شوال کرد از درد دل عزرا وفات
درشب جمعہ دل احباب گشتہ دردمند
آہ قبل از نصف شب ثانی عشر از ماہ بود
کاں زباں داں جہاں را شد زباں یکبارہ بند
بہر سال اعداد مونس را بسفر صفر گیر
ماہ گن مقلوب میم و نوں بہم سیصد و چند

۱۲۹۲ھ

۳۰۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مادۂ تاریخ از قمر سندیلوی یوں نقل کیا ہے:

ہے سراپا ہیں علم و فضل و ہنر

اور اعداد ۱۳۳۰ھ بتلائے ہیں۔
لیکن ان الفاظ سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے دراصل یہاں رشید حسن خاں کا سہو ہے اور صحیح مادۂ تاریخ کے الفاظ اس طرح ہیں:

ہے و سراپا ہیں علم و فضل و اثر

۳۱۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور کا قطعہ تاریخ وفات جو امیر مینائی استاد دربار رام پور نے کہا تھا تاریخ لطیف اس (۱۳۶۱ - ۱۲۳۹) میں نقل ہوا ہے اس سے مادۂ تاریخ رشید حسن خاں نے انتخاب کیا اور کلب علی خاں پر حاشیہ لکھتے وقت اس قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار کی طرف رجوع نہیں کیا۔

شاغل ذکر و نماز و عامل حج و زکوٰۃ
پیرو شرع حبیب خاص رب العالمیں
زانکہ اندر عہد او شد رام پور آرام پور
مصطفےٰ آباد شد در عہد او ایں سرزمیں
در ہزار و دو صد و پنجاہ پیدا گشت شد
در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشیں
در ہزار و سہ صد و چار روز جمادی الآخرہ
بست و ہفتم چار شنبہ بہ ساعت چار میں

ناگہاں زد کوس رحلت سوئے دارالآخرہ
ذوق دیں می داشت اندر دنیا بر لفظ ماسبق
نقش کن از خامۂ حسرت سرا ح مزار
خوابگاہ حامی اسلام امیر المومنین

(۲) یا صرف غلو کی وجہ سے رشید حسن خاں وفات کا وقت، دن اور تاریخ نہیں بتا سکے نہ پابندی صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کا ذکر کر سکے۔

مندرجہ بالا مثالوں کے ذریعے رشید حسن خاں کی سہل پسندی کا اور موضوع سے بے توجہی پر گفتگو کرنے کا ناخوشگوار کام مجھے انجام دینا پڑا۔ یہ امر میرے لیے ناپسندیدہ تھا مگر میں نے اس کو اس لیے گوارا کیا کہ یہ ایسی تنقید کے خلاف جمہوری احتجاج کے طور پر ہے جو علم کے نام پر بیمار اور مضرت رساں نتائج پیدا کرتی ہے۔

مجھے اُمید بھی ہے اور میری یہ درخواست بھی ہے کہ رشید حسن خاں میرے اس اقدام پر صحت مند ذہن و فکر کے ساتھ یہ غور فرمائیں گے کہ اگر وہ اپنے ایک مضمون میں جو تبصرے موضوع پر لکھا گیا ہو اتنی فاحش غلطیاں کر سکتے ہیں تو انھیں دوسرے لکھنے والوں سے احتیاط اور توجہ کا اس حد تک مطالبہ کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ ایسی صورت میں جب کہ وہ خود بے توجہی سے کام کرتے ہیں اُنھیں کسی مطالبے کا حق پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔

عہد جدید کے شاعر کا ماڈل ۔ شاعر ندیم

طاہر ایم سید

ہر فنکار اپنی تخلیق سے پہلے اگر وہ کسی حد تک بھی اپنے فن کا وفادار ہے اُس خیال کو جسے وہ کاغذ یا پتھر کے سپرد کرنا چاہتا ہے، سالہا اپنے ذہن سے گزارتا ہے کوئی خیال اگر پہلی بار ہی ظہور میں آجائے تو وہ اپنے اندر اتنا حسن نہیں رکھ سکتا، جتنا ایک صبر و ضبط کی منزل سے گزر کر یہ خیال، لفظی پیکر تیار کر کے یا پتھروں پر نقش و نگار کی صورت میں اُبھر کر حاصل کر لیتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جو فنکار اپنے آپ کو اس دشوار گزار اور صبر آزما تخلیقی عمل کے حوالے نہیں کرتا، وہ ممکن ہے وقتی طور پر اپنی جانب دُنیا کو متوجہ کر لے مگر اُس کا کام اور نام مستقبل میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکتا۔

قطعۂ نوش بجانانہ تراود ز دے
کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

اس انتظار کی تاب بہت کم لوگ لا پاتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے آپ سے یہ شکایت اکثر و بیشتر رہی ہے کہ میں اپنے خیال کو جلد سے جلد شعر یا پتھر میں تشکیل پایا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے اپنے تصور کو جسم دینے سے پہلے برسوں سانس لیتی ہوئی دُنیا میں تلاش کیا ہے۔ کبھی میری تلاش مجھے مل بھی گئی ہے کبھی نہیں بھی ملی ہے، اس تلاش کا معاملہ ایسی صورت میں کچھ اور بھی نازک پہلو اختیار کر لیتا ہے جب فنکار اپنی تخلیق کے ذریعے کسی خاص تقسیم ([illegible]) یا کسی خاص عہد ( ) کو نمائندگی دینا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مواقع [illegible] سے عہدہ برآ ہو جانا فنکار کی صلاحیتوں سے زیادہ اتفاقات پر مبنی ہے۔ یہ دو آنکھیں بھٹکتی رہتی ہیں مگر وہ چہرہ نظر نہیں آتا جس کو دیکھ کر زمانہ پکار اُٹھے:

ہاں غور سے سُنتا یہ صدی بول رہی ہے

فنونِ لطیفہ کی تاریخ گواہ ہے کہ فنکار کی جستجو اس کی منزل کے نشانات کا کام دیتی رہی ہے اور ایک اچھے اور سچے فنکار کو ہمیشہ اپنی ناکامیوں میں کچھ کامیابیاں اور کامرانیوں کے اُفق نظر آتے ہیں۔ ہر دُھند سے روشنی کی ایک نئی لکیر پھوٹی ہے اور ہر آرزو ایک نہ ایک دن حقیقت کی ایک نہ ایک تصویر بن کر نمودار ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوتا ہے جب فنکار کے دل میں تمنا ایک پیاس کی طرح ہو، ایک یقین اور ایک ایمان کی طرح ہو۔ سچائی، یقین اور اُس کے ساتھ استقلال جیسے دُنیا کے ہر بڑے ادارے کی ضمانت ہے اسی طرح فنکار اور اُس کے فن کی بقا کی بھی ضامن ہے۔ تلاش کا یہ سفر کبھی منزلوں منزلوں ہوتا ہے اور راہی کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتا کہ کہیں اُس کے پاؤں تھک تو نہیں گئے، اس کی تمنا کمزور تو نہیں پڑ گئی۔ عمریں بیت جاتی ہیں امید تلاش

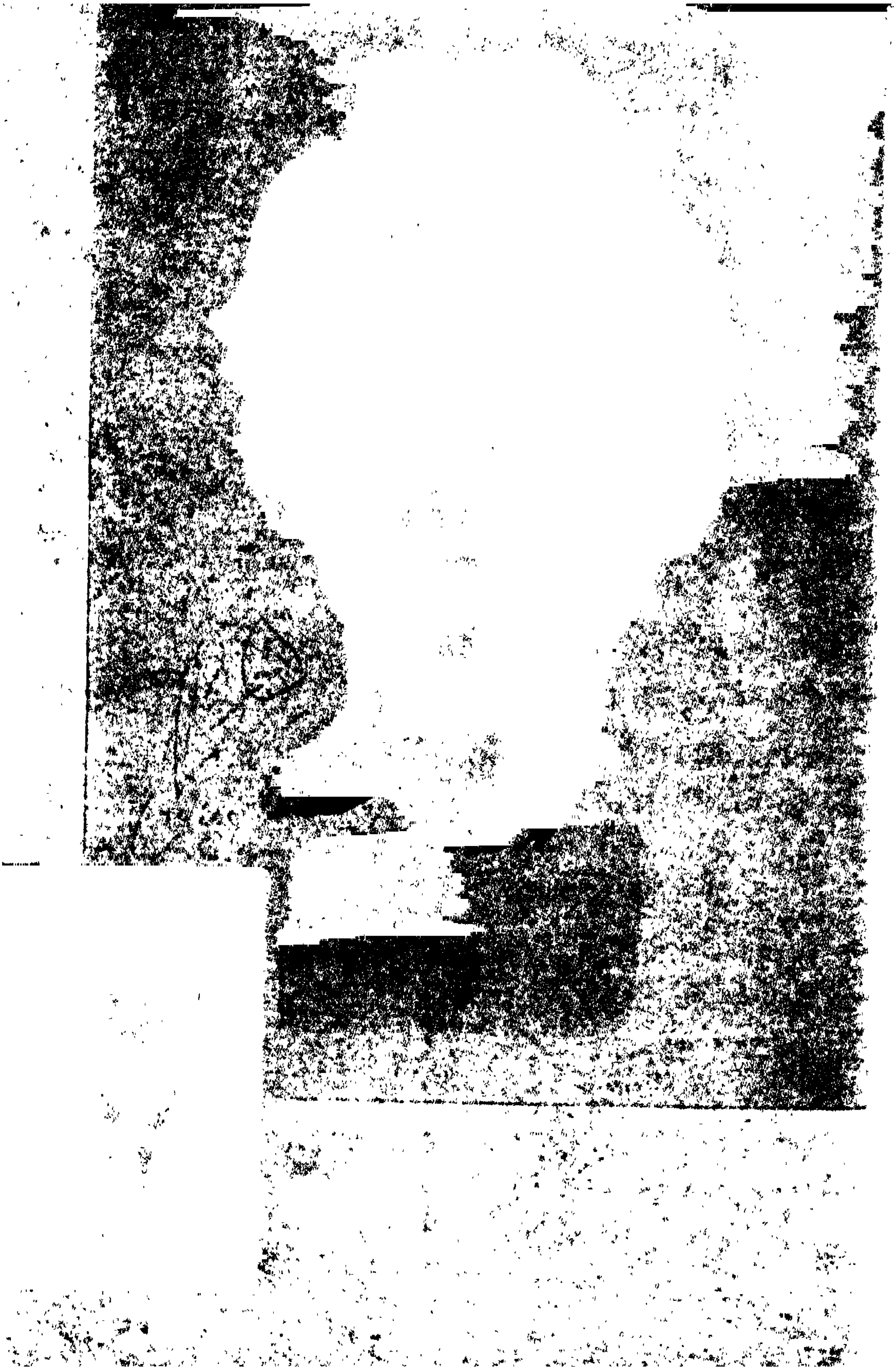
ایک [illegible] کے ذہن میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات فنکاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ کسی چیز کی تلاش اور اس کی تلاش کا ارتقا ہر وقت کتنا دردناک اور کتنا روح افزا ہوتا ہے، یہ بات شاید کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فنکار حسن کی تلاش کے لیے اپنی زندگی تج دیتا ہے اور جس حسن کی کھوج میں اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے وہ حسن خود اس کے اتنے نزدیک ہوتا ہے جیسے اس کی شہ رگ۔ کبھی کسی صحت مند آدمی نے اپنی شہ رگ کی آواز نہیں سنی، اس کی حرکت کو محسوس نہیں کیا جب تک اس کی انگلیاں تلاش کرتی ہوئی اس تک پہنچ گئی ہوں۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اگر اس کی آواز بند ہو جائے اور اس کی حرکت ختم ہو جائے تو یہ حقیقت بھی اور خوابوں کی طرح ایک خواب ہو جائے۔

یہاں حسن کو ذرا وسیع معنوں میں لیجیے یعنی ہر وہ چیز حسین ہے جو ایک فنکار کے فن کا موضوع ہو سکے۔ اس کے پھول میں بھی حسن ہے اور اس کانٹے میں بھی جو پھول کا محافظ ہوتا ہے اور مسافر کا امتحان بھی۔ اس کے بہتے ہوئے دریا کی روانی میں بھی حسن ہے اور پانی کی بے ترتیبی، ترتیب اور [illegible] ہوئی سطح میں بھی حسن ہے۔ اس کے بیابانوں کی پہنائیوں میں بھی حسن ہے جس میں گوری اپنے پیتم سے من کی آس کے گیت گاتی ہے اس کے بے [illegible] کی تڑپ میں بھی حسن ہے جس سے آشیانے جلتے ہیں اور گوری کا دل بھی دہل جاتا ہے۔ حسن اس کے نزدیک حقیقت کا دوسرا نام ہے اور حقیقت سیاہ اور سفید دونوں ہوتی ہے وہ نرم و سبک سیر بھی ہے اور تند و گراں سیل بھی۔

بڑی حسرت ہوتی ہے ایسے موقع پر جب فنکار کو یہ علم ہو جائے کہ جس حسن کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا وہ پہلے ہی سے اس کے پاس تھا۔ اس وقت اسے تھکن کا احساس، اگر وہ کچھ ہو بھی تو ختم ہو جاتا ہے اور پھر فنکاروں کے لیے اس غم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے آپ کو فنکار نہیں کہتا یہ بڑی جرأت کی بات ہے اور جرأت بھی جو گناہ کرنے والی ہو۔ کبھی کبھی کوئی نقش اس خیال کی میرے دماغ میں آ جاتی ہے تو میں مریم کے بیٹے کی طرح اپنے گناہ کا اقرار کر کے اپنے دل کے بوجھ کو کم کر لیتا ہوں اور اس کے بعد مجھے آگے کے لیے کام کرنے کا روشن اور صاف ستھرا راستہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں نے [illegible] سے کھیلنا شروع کیا ہے۔ اس کھیل میں عجیب عجیب شکلیں اور صورتیں بن جاتی ہیں جس سے میں خوش بھی ہو لیتا ہوں اور [illegible] بھی اور جنہیں سجا اور سنوار کر رکھ بھی جاتا ہوں اور ان پر میرا پیار ٹوٹا پڑتا ہے لیکن وقت کی ایک سوچ ایسی بھی آتی ہے جب میرے کھلونوں اور میری مخلوق کو مجھ سے شکایت ہوتی ہے کہ میں نے ان کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی ترتیب میں بے ترتیبی آ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آپس میں جھگڑ رہے ہیں یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ کل جو میری منزل تھے آج شاہراہ منزل ہو گئے ہیں۔

یوں تو سفر کا ہر قدم راہی اور راستے کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے جو ایک دفعہ قائم ہو گیا تو قائم ہو گیا لیکن پھر بھی ہر قدم راہرو کی کتاب پر کچھ نقش نہیں چھوڑتا [illegible] ان میں سے چند مقامات ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ماضی کے پردے میں چھپ جانے کے بعد بھی راہی کو یاد آتے رہتے ہیں [illegible] انہیں پڑھ [illegible] اس کی کامرانیاں ہیں، اس کی فتح مندیاں ہیں، اس کا ماحصل ہیں۔



میں بھی مٹی کے اس کھیل میں اپنے ہاتھ سامنے اپنے چہرے پر اگرچہ کم سہی پھر بھی ماہ و سال کی اُڑتی ہوئی گرد و غبار کی ہلکی سی پرت لیے بیٹھا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس مٹی اور پتھر کے کھیل میں کیا پایا۔ اور کیا کھویا ہے۔ کھونے کی تو ایک طویل داستان ہے۔ میں سناؤں تو کون سُنے گا اور کیوں سنے گا۔ پانے کی بات کروں تو مجھے خود شرم آتی ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں !

بہر حال بقدرِ ظرف اور بقدرِ شوق میں نے کوشش کی ہے کہ میں اگر فن کی دیوی کے سامنے سُرخرو ہو کر نہ جا سکوں تو بھی کم سے کم تہی دست و تہی دامن تو نہ جاؤں اور مجھے حجاب دامن گیر نہ رہے اور وقت یہ احساس ضرور ہے کہ میں نے اپنی توانائی کو فن کے لیے صرف کرنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

میں نے خیال سے حقیقت تک ہر قسم کے کھلونوں کو جسم دیا ہے۔ میں ان میں سے کئی کھلونوں سے آج بھی خوش ہوں جیسے بہت سے کھلونوں پر نادم ہوں کہ میں اُن کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ میں جسم سے لفظ معنی اور پیکر ہر شکل میں لطف لیتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے الفاظ پر کوئی قدرت نہ ہو مگر پھر بھی اس رشتے سے جو فن کو فن سے ہوتا ہے میں نے ہمیشہ الفاظ و معانی کے فنکاروں سے اُسی طرح پیار کیا ہے جیسے جسم اور صورت کے۔

شاعری اظہارِ فن کا ایک لفظی اور معنوی رُوپ ہے چونکہ ہر فن اپنے اظہار سے پہلے اور اظہار کے ساتھ ساتھ بھی اپنے خالق میں جلوہ گر ہوتا ہے اس لیے میں نے تخلیق کو خالق میں ڈھونڈنے پانے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی کا شعر بارُود کے دھوئیں، مارچ کرتی ہوئی فوجوں کے بھاری بھرکم قدموں کی دھمک، مضطرب دل و دماغ کی کشمکش اور جسم و رُوح کی ساری پاکیزگیوں اور علامتوں کا مظہر ہے۔ اس لیے اس کے خالق میں بھی ان سب کا سُراغ ملنا چاہیے۔ اس کے چہرے سے عظمتِ آدم اور اس کا فطری عزم و استقلال بھی ظاہر ہو، اس کے چہرے سے چاند کو چھونے کا قصہ بھی پڑھا جا سکے اور اس کی آنکھوں کے خمار کو دیکھ کر بھیگل پی جانے کی بات بھی یاد آ جائے۔ وہ جوانی اور حُسن کے تقاضوں اور مطالبوں سے دا بھی ہو اور جنگ و امن کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے وہ خطوط بھی اپنی پیشانی پر اُبھارے ہوئے ہو۔ جن سے نفرت اور محبت پیدا کر کے فردوسِ حیات کی آگ کو سہاگ کا سیندور دیا جا سکتا ہے۔ جسے اس کی خاموش مگر جلتی ہوئی عاشقی نے صبر و ضبط کے وہ حوصلے عطا کیے ہوں جن سے دُوسروں کی پکارتی ہوئی عاشقی کو تسلّی ملے۔ جس کے چہرے پر اضطراب خندہ تیغِ اصیل بن جائے اور جس کے چہرے کا اطمینان گریۂ بہار۔

کسی نے کہا تھا بہت سے ایسے شاعر ہوتے ہیں جو عمر بھر شعر کہتے رہتے ہیں مگر ان کے قبیلے سے شاعری کا دُور دُور پتہ نہیں چلتا اور کتنے ہی ایسے غیر شاعر ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرعہ موزوں نہیں کیا ہوتا لیکن انھیں دیکھ کر سوائے اس کے اور کوئی خیال آ ہی نہیں سکتا کہ وہ شاعر کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں ——— یہاں میں جس کی بات کرنے جا رہا ہوں وہ شاعر بھی ہے اور شاعر نظر بھی آتا ہے۔

[illegible] پہلے کے شاعر کا تصور ایک طلسمی بت کا سا ہے لیکن اس خلائی دور کے انسان کا شاعر طلسمی نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیا کی چوسٹھ بے چینیاں جیسا میں نے ابھی بیان کیا۔ کئی سالوں سے یہ ۲۶ سالہ نوجوان شاعر اپنے سے بیگانہ گردشوں کا آشنا، عہد حاضر کے افکار و آلام کے سمندر میں ڈوبا ہوا اپنے بشرے پر وقت کی ساری کرب ناکیوں کا سایہ لیے میرے ذہن کی خاموش پگڈنڈیوں پر ٹہل رہا تھا۔ ان چپ چاپ پگڈنڈیوں سے حقیقت کی شاہراہ پر آنے کو لڑکھڑانا مجھے آسان نہیں معلوم ہوا اور کئی بار مجھے شکست پر شکست اور پسپائی پر پسپائی اٹھانا پڑی۔ میں اپنے اس خیالی شاعر کو گوشت پوست کے پیکر میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ میری آنکھیں بھٹک رہی تھیں، میرے ہاتھ کئی بار مٹی کی طرف بڑھتے تھے، ایک خاکہ بناتے تھے اور بگاڑ دیتے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

جسے میں نے اتنا ڈھونڈا، تلاش کیا اور جس کی خاطر میں اتنا پریشان اور آوارہ رہا وہ خود میرا دوست شاعر ندیم تھا۔

عہد جدید کے شاعر کا جو نقشہ میرے خیالوں میں بسا ہوا تھا اس کو مٹی میں ڈھال دینا اگر میں اپنی انا (Ego) سے کام لوں تو کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے نمائندہ مجسموں کے لیے ماڈل ضرور ہونا چاہیے۔ دنیا کے سارے بڑے اسکلپچر یا پورٹریٹ جنہیں کوئی مقام ملا کسی نہ کسی ماڈل کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ لیونارڈو دا ونسی (Leonardo da Vinci) نے مونالیزا (Mona Lisa) کو، رافیل سانزیو (Raphael Sanzio) نے مریم کو بنانے کے لیے لاوانا (La - Valla) کی جیتی جاگتی مورت کا سہارا لیا۔ ڈوناٹیلو (Donatello) نے سینٹ جارج (St. George) کو بنانے کے وقت اپنے ایک دوست کو سامنے بٹھا لیا۔ اور ۵۰۰ قبل مسیح کے ایک یونانی بت تراش فیڈیاس (Phidias) نے تو خود اپنی ہی شکل کے نقوش اپنے اسکلپچر میں ابھار دیے جس پر وہ سزا کا مستحق بھی قرار دیا گیا اور اس کی محنت کا سارا ذخیرہ اس سے چھین لیا گیا۔ مائیکل انجلو (Michelangelo) پندرھویں صدی کا یہ نامور استاد مانا جاتا ہے اس نے بھی ڈیوڈ (DAVID) کو بناتے وقت اپنی تخلیق میں اپنے ایک شاگرد اور چند دوسری مورتیوں کے خدوخال کو اپنے ڈھنگ سے ترتیب دیا تھا۔ اس کا بنایا ہوا یہ مجسمہ آج بھی ہر لحاظ سے مکمل سمجھا جاتا ہے اور جوانی اور بہادری کا نشان بن گیا ہے۔ سترھویں صدی کے مشہور آرٹسٹ ریمبراں (Rembrandt) کی تصویروں میں اس کی بیوی ساسکی (Saskia) کے عکس کا پرتو ملتا ہے۔ اسی طرح رینوا (Renoir) گویا (Goya) کورٹ (Corot) ڈیگاس (Degas) وغیرہ کی تخلیقات کے آئینے میں ان کی محبوباؤں کے عکس پائے جاتے ہیں۔

حقیقت پسندانہ (Realistic) کام کرنے والے تو بغیر کسی ماڈل کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے بلکہ آپ کو [illegible] کہتے ہیں وہ بھی بہت سے حقیقی مناظر اور حقیقی تصویروں کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس قابل ہوتے ہیں مدہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو ماڈرن آرٹسٹوں میں شمار کرتے ہیں اور Impressionism ! — Expressionism

صورت محفوظ — کے علمبردار ہیں۔ اپنی تخلیقات میں ان چیزوں کا سایہ پڑنے سے نہیں روک سکتے جو کسی نہ کسی طور انھیں عزیز ہیں یا جن کا دخل ان کی زندگی میں ہے۔

انیسویں صدی کا مشہور آرٹسٹ وان گاف (Van - Gogh) جس کا نام آرٹ کی دنیا میں ایک انقلاب لانے کی حیثیت سے بے حد شہرت رکھتا ہے۔ ناکام محبت بھی تھا، ناکام دولت بھی اور اپنے جیتے جی ناکام شہرت بھی رہا اس نے بھی کئی جگہ اپنی محبوبہ اریلا (. ur e lmla) کی تصویر کشی کی ہے۔ آج بھی آرٹ کے ذریعے پیغام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے پاس اپنے گرد و پیش کے بارے میں گہری بصیرت اور تجربات کا ایک سلسلہ موجود ہو۔ آج کے دور کے فنکار کے لیے یہ گرد و پیش اور یہ تجربات دل ناکام دبے گئے۔ ہر ایک ایبسٹریکٹ خیال کی اصل اسی دنیا میں موجود ہوتی ہے ممکن ہے وہ سمجھ میں نہ آئے اور تحت الشعور کی کالی کوٹھڑی میں بند جیتی ہو مگر وہ ہوتی ضرور ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ خوشی اور غم جو بظاہر محسوسات اور واردات ہیں دراصل مادے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر ان کا مظہر نہ ہو تو احساس بھی آسان نہیں۔

آرٹسٹ کا موضوع اس کے دماغ کی نس نس میں بسا ہوتا ہے یا بسا ہونا چاہیے۔ وہ اس کا تجزیہ کر پائے یا نہ کر پائے یہ تو اس کی خوش نصیبی ہے کہ جس موضوع کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ اسے کہیں نہ کہیں بکھرا نظر آ جائے۔ کیا یہ میرے لیے مسرت، انبساط اور فخر کی بات نہیں ہے کہ مجھے وہ سارے اوصاف صورت کے اور معنی کے جو کہ میں عہد جدید کے شاعر کے بشرے میں دیکھنا چاہتا تھا ایک جا مل گئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے غیر شعوری طور پر شاعر ندیم کے چہرے کو اپنے تخیل کے تصویر خانے میں سجا رکھا ہو اور ایک مدت تک میں یہ شعور نہ پایا ہوں کہ یہ میرا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا چہرہ ہے لیکن اس مسرت کا احساس ایک فنکار ہی کر سکتا ہے جو مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے اس کے چہرے میں اپنے تصورات میں بسائی ہوئی ساری امانتوں کو ایک ایک کر کے محفوظ پایا۔

اپنی پہلی فنکارانہ پہچان کے بعد میں نے اسے بار بار دیکھا اور اسے یہ بتلائے بغیر کہ وہ میرا موضوع بننے والا ہے میں نے اس سے گھنٹوں باتیں کیں اس کے شعر سنے اس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا اس کے چہرے کو جی لگا کر دیکھا اور اس کتاب میں نئی صدی کے دُکھ، خوشیاں دیکھیں، حق اور ناحق دیکھیں۔ اس کے چہرے میں مجھے نزاکت نظر نہیں آئی مگر جلال ملا۔ اس میں آج کی تلخیوں کے ساتھ مستقبل کی بھیانک جنگ کا خوف و ہراس نظر آیا جو ہر دم ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اس کے چہرے میں مجھے اس جنگ کی کم وقتی کا بھی سراغ ملا، اس جنگ سے نپٹنے کا حوصلہ بھی ملا اور فتح کے یقین کی چمک بھی ملی۔ مجھے عزم و استقلال بھی ملے اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بہت سوں کے دکھوں کو سمیٹ کر پی گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اسکیچ کی سطح کھردری ہے۔ چہرے کے تاثر کو بنانے میں اس کی بڑی بڑی غلافی اور بے حد شاعرانہ آنکھوں کے گرد حلقوں کے حلقے اور گالوں کے گڑھے مددگار رہے ہیں۔ گھنے بالوں کی بے ترتیبی بھی اس عہد کی افراتفری کا اشاریہ بن گئی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ نئی صدی کے شاعر کے پاس خوشی ایک ہے غم ہزار ہیں۔

میں نے اپنے ماڈل کا تعارف کرا دیا۔ یہ تعارف ظاہر ہے کہ صورت کا زیادہ ہے معنی کا کم۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے صرف صورت کو سامنے رکھ کر۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس سے گھنٹوں باتیں کی ہیں اس کی تخلیقات کو سنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور اسے کہنے کا بے پناہ سلیقہ ہے۔ اس کے یہاں گہرائی اور گیرائی دونوں ہیں۔ اس کے باوجود وہ جب تک —

اپنے مسلک کے اصول کا بھی اسے بڑا علم نہیں ہے لیکن کچھ نہیں کہتا۔ اس پر خاموشی کے طویل دورے پڑتے ہیں اور ایک بار تو یہ خاموشی کئی سال تک مسلط رہی جس سے لوگ پریشان ہوئے کہ شاید اس کے اندر کا فن کار گم ہو گیا ہے یا مر گیا ہے لیکن اچانک اس کی آواز پھر اپنی ساری دلکشی کے ساتھ ابھر آئی۔ میرا گمان ہے (ممکن ہے وہ انکار کرے) کہ شاید کسی خاموش مسرت نے اسے اب دوبارہ شعر کہنے پر آمادہ کیا ہے ورنہ وہ کہا کرتا ہے کہ شعر بغیر کسی درد کے پیدا نہیں ہوتی۔

مجھے کہنے دیجیے کہ میں اسے بالکل نہیں جانتا، اجنبی میری واقفیت ہے مجھے تو صرف اپنے اندر کو جاننے کا دعویٰ ہے۔ وہ اس کی گفتار میں اسے تلاش کرنے کا کام وہ میرا کسی نقاد کے لیے چھوڑے دیتا ہوں۔ اب جب یہ سطریں لکھتے وقت مجھے اس کی ایک نظم کے ابتدائی مصرعے پکار پکار کر سنائی دے رہے ہیں۔

جسم کی پیاس تو ہر شہر میں بجھ سکتی ہے
ذہن آوارہ کو منزل کا پتہ دو کوئی

دیکھنا ہے اس طرح میں اس کا ساتھ کون دیتا ہے۔

سرشار بہ حیثیت انشائیہ نگار

ڈاکٹر احراز نقوی

انشائیہ نگاری پر قیامِ پاکستان کے بعد اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ تحقیقی انداز کا، تنقیدی نوعیت کا اور تخلیقی پیمانے پر بھی کام ہوا اور ادھر چند برسوں سے منطقی اور فکری انداز کے مذاکرے اور بحثیں بھی ہو چکی ہیں۔ ہندوستان سے دو پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ فنی حدود، ہستی قیود اور فکری نمونے کے سلسلے میں بے شمار نکتے باعثِ نزاع بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو تنقیدی سطح کی بات ہے۔ تحقیقی حساب کتاب میں جہاں یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ ہمارا پہلا انشائیہ نگار کون ہے؟ یا ہمارے ادب میں انشائیہ نگاری کا سلسلہ کب سے اور کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ وہاں ہمارے بہت سے انشائیہ نگاروں کے نام بھی فہرست سے مفقود نظر آتے ہیں۔

اُردو انشائیہ نویسی پر کسی نقاد اور محقق نے اپنی بحث میں غالباً سرشار کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہی سبب ہے کہ اُردو انشائیوں پر تمام انتخابات ہو چکے ہیں مگر سرشار کا کوئی بھی انشائیہ کسی بھی انتخاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ دراصل وجہ اس کی یہی رہی کہ سرشار کے انشائیوں کو دریافت ہی نہیں کیا گیا اور نہ اس تصور کو ہی روا رکھا گیا کہ سرشار انشائیہ نگار ہو بھی سکتے ہیں۔

سرشار کو ناول نگار کی حیثیت سے میں نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع بنایا اور مختلف تحقیقی مرحلوں کو سر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سرشار پر تحقیق ابھی کئی پہلوؤں سے باقی ہے۔ ہمارے یہاں سرشار پر کام کرنے والوں نے بڑی تن آسانی سے کام لیا ہے اور تحقیقی نوعیت سے تو کچھ کام ہی نہیں ہوا ہے اور جو کچھ تحقیقی سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ بہت کچھ مفروضوں پر استوار ہے۔ غلط — اور گمراہ کن ہے۔

ہمارے نقادوں نے ہمیشہ سرشار کو ایک ناول نگار سمجھا اور فسانۂ آزاد سے آگے ان کا قلم نہیں بڑھا۔ بہت کم ہمارے پاس ایسی تحریروں کا سرمایہ ہے جن میں اس کے علاوہ بھی کچھ ملے۔ مگر —

۱۔ سرشار بحیثیت انشائیہ نگار
۲۔ سرشار بحیثیت شاعر

۳۔ سرشار بحیثیت صحافی

۴۔ سرشار بحیثیت مترجم

۵۔ سرشار بحیثیت نقاد

۶۔ سرشار بحیثیت علمی اور معلوماتی مضمون نگار۔

ان موضوعات پر کہیں کوئی مضمون تو کجا ضمناً یا برسبیل تذکرہ بھی ذکر نہیں ملتا۔

سرشار بحیثیت انشائیہ نگار — یہ میرا تحقیقی دعویٰ تھا جو میں ہر وقت اس لٹریچر میں تلاش کرتا تھا کہ سرشار نے یقیناً انشائیے لکھے ہیں جب انہوں نے اپنے کسی مضمون میں ذرا دیر کر اس کا ذکر بھی کیا تھا اور یہ معاملہ ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ سرشار محض کچھ ترجموں اور ناول نگاری پر اکتفا کرتے۔ یہ ان کے زمانے کی روایت کے منافی تھی۔ ذرا ۱۹ویں صدی کی اخلاقی صحافت پر نظر کیجیے۔ اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ خیر خواہ ہند (۱۸۴۰) ماسٹر رام چندر سے لے کر ۱۹ویں صدی کے سب سے آخری ماہنامے پردہ عصمت (۱۸۹۹) عبدالحلیم شرر تک تمام ادبی پرچے دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ اول حصہ نظم اور دوم حصہ نثر۔ حصہ اول شاعری پر مشتمل اور حصہ دوم نثر پر محیط۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نثری تحریریں کیا ہوتی تھیں؟ ظاہر ہے کہ کل کی طرح افسانے، استاد، تحقیقی مقالوں کا رواج تو نہ تھا۔ علمی اور معلوماتی مضامین ہی سے جلدوں کی شکم پُری کی جاتی تھی۔ تنقیدی مضامین برائے نام لکھے جاتے تھے۔

اس عہد کے تمام صاحب قلم انہیں موضوعات کو ذریعۂ تحریر بناتے تھے۔ تصوف، الہیات، منطق اور فلسفے کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ہیئت اور نجوم وغیرہ موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جاتے تھے اور تمام صاحب قلم اس میں شریک تھے۔

سرشار نے اپنی تحریر کی بسم اللہ اسی طرح کی۔ ابتدا میں مراۃ الہند، کشمیر درپن، وکیل ہند، اودھ اخبار، اودھ پنچ اور اس کے علاوہ انگریزی کے کچھ اخبارات میں مضامین قلم بند کیے۔ ان مضامین کو میں ایک عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ تقریباً یہ تمام مضامین ہنوز دستیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ چیزیں بہت عرصہ بعد مجھے ملی ہیں۔ میرا اندازہ ہے سرشار کے یہ تمام مضامین نکالے جائیں تو مختلف نثری مضامین کا ایک بڑا متنوع گلدستہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام تحریریں سائنس، ہیئت، تہذیبی، معاشرتی، علمی، معلوماتی اور ادبی موضوعات پر محیط ہیں۔ اس نثری سرمائے کو سامنے رکھ کر ہم اردو انشائیوں کا بھی ایک خوبصورت گلدستہ مرتب کر سکتے ہیں۔

نقوش کے اس شمارے کے لیے میں نے چند انشائیے سرشار کی تحریر سے انتخاب کیے

ہیں۔ دو تنقیدی مضامین ہیں پہلا شاعری سے متعلق ایک چھوٹا سا نازک سا مضمون ہے۔ دُوسرا نثری صنف پر سیّد محمود کے فن پر تنقید ہے اس مضمون کو سامنے رکھ کر ہم ان کی فنی بصیرت اور ان کے ادبی ادراک کا ایک ہلکا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تیسرا عشق کے عنوان پر انشائیہ ہے جو ہلکے پھلکے انداز سے من کی موج میں بہہ کر لکھا گیا اور چوتھا مضمون بنی نوع انسان پر ہے جس میں اُردو انشائیہ کا انداز اور لطافت نظر آتا ہے۔

یہ تمام تحریریں میں نے دبدبۂ آصفی کے ذخیرے سے دریافت کی ہیں۔ دبدبۂ آصفی، سرکش پرشاد نے نکالا تھا۔ سرشار اس کے اڈیٹر تھے جس کا ضمناً ذکر میں نقوش ہی کے ایک پچھلے شمارے میں چہل نامہ کے ذیل میں کر چکا ہوں اور دبدبۂ آصفی پر تفصیلی اور تحقیقی مضمون نقوش کے آئندہ شمارے میں پیش کروں گا۔

عشق

ہائے اس عشق میں رونا ہی نہ آساں نکلا　　　جس کو ہم قطرہ سمجھتے تھے وہ طوفاں نکلا

عشق کس کو کہتے ہیں اس کا حال کسی چوٹ کھائے ہوئے دل سے پوچھیے وُہ دل جو مسلکِ عشق میں فنا ہو گیا ہو۔ وہ دل جو عشق کے صدمے اُٹھانے کا جگر رکھتا ہو۔ وُہ دل جو عشق کی کڑی منزل میں تھک کے بیٹھ گیا ہو مگر ہمت نہ ہارا ہو، وہ دل جو راہِ عشق سرد و گرم چشیدہ ہو۔ وہ دل جو عشق کی بھول بھلیاں بھٹک بھٹک کر کعبۃ اللہ جاتے جاتے ترکستان کا راستہ پکڑے اور بحرِ اوقیانوس ہو کر خاندِ مینیچے ابیعار استہ سمجھے۔ وہ دل جس کی رنجیدہ نشتر ستم کی خوگر ہوں۔ وُہ دل جو زنجیر پُر حوادث ہو کر صیاد جفا پیشہ کو لاکھوں دُعائیں دے۔ وہ دل جو زخمِ پیکاں کے اندمال کے لیے مرہم کے عوض نمک کا طالب ہو۔ وہ دل جو طبیب کو اجل اور اجل کو مسیحا سمجھے۔ وہ دل جس میں کسی ظالم کا درد آ بیٹھے کے ٹھکانا بنا ہو کہ اس مقام پر چوٹ لگی تو تڑپنے کا مزہ آئے۔ وہ دل جس پر عشق کا زخمِ کاری پڑا ہو۔ وُہ دل جو داس دار کی لذت اُٹھا کر دہیں، زخم سے قاتل کو پکارے۔ وہ دل جو کسی عشق کے دریائے ناپیدا کنار کے منجدھار میں ہو اور ناخدا ساحل جس کا خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو۔ وُہ دل جو عشق کے مارگزیدہ کے زہرِ ہلاہل کو تریاقِ فاروقی و عراقی پر ترجیح دے وہ دل جو حنظلِ عشق کو اصلِ پر فوقیت دے۔ وہ دل جو کوچۂ عشق کا نشیب و فراز دیکھا بھالا ہو، بچپنے ہی سے دایۂ عشق کو دیوں کھلایا۔ ناز و نعم سے پالا ہو۔ وُہ دل جس کی ترکیب عشق سے ہو وہ دل جس کی رگ رگ میں عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔

روکھی پھیکی طبیعت والے بھلا عشق کا حال کیا جانیں۔ اس نعمت عظمیٰ اور اس دولتِ لازوال سے ان کو کیا سروکار۔ وہ عشق کو عین جنون خیال کرتے ہیں اور عاشقانہ کلام، عاشقانہ خیالات کو مجذوب کی بڑ سے بڑھ کے سمجھتے ہیں۔ یہ عقل و دانش بیہودہ ہے۔ یہ کچھ فرض نہیں ہے کہ کل بنی نوعِ انسان میں ہر فرد بشر کو ایک ہی قسم کا عشق ہو۔ یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ عشق کے لفظ کا معنی زیادہ تر عورت اور مرد کے عشق پر کیا جاتا ہے بلکہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد کا عورت پر عاشق ہو جانا اور عورت کا مرد پر جان دینا بس اسی کا

نام عشق ہے علاوہ ازیں یہ مرض کی علامت ہے۔ عشق ایک جامع چیز ہے۔ اس کا اس طرح پر شمار کرنا بیکار ہے۔ جتنی انسان کی جستجو سے ہو سکتا ہے۔ کسی کو گھوڑوں کا شوق ہے، اپنی حیثیت کے موافق گھوڑے خریدے جاتے ہیں۔ اگر امیر ہے تو ایک طرف کبھی گھوڑے بندھے ہیں جن کی چمک میں انسان آنکھ بند کر جائے۔ کسی جانب عرب کے نایاب گھوڑے، کہیں کاٹھیاواڑ کے عمدہ جانور ہنہناتے ہیں ایک سمت کیپ کے اونچے اونچے و لمبے گھوڑوں کی قطار ہے۔ بیگو کے ٹانگن میں دم ہے کہ سواری کرے اور قدرتی چوڑی کا کام دے رہے ہیں۔ پہاڑی اور ایک ایک سدھائے ترکی مضبوط گھوڑوں کی کمی نہیں۔ معلوم ہوا کہ عرب کے گھوڑے کی اپنی آپ ہی نظیر ہیں مگر تختہ گردن ہوتی ہیں یہ ان میں عیب ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لیے کاٹھیاواڑ کی پری جیسی ہونی جہاں جوان گھوڑیاں منگوائیں اور عرب کے خوبصورت بچھیرے ان کا میل ملا کر تیار کر کے ان گھوڑیوں سے ملایا تو جو بچے پیدا ہوئے ساری خدائی کے گھوڑوں میں فرد۔ غرضیکہ ان کی اصطبل میں ہر طرح کے ترکی، عربی، تازی، کیپ، پیگو، کاٹھیاواڑ، دکنی، پہاڑی، چینی ہر قسم کے راہوار اور رفتار موجود اور

قدم کا وا ایڑ نہ میٹھی پوئی دوڑا جمنا
یہ سب راہوں میں ترکی اور تازی تیری لاثانی

وہ مات اصطبل میں۔ اسکی سواری و سیر کا شوق ہی نہیں۔ نادری حکم کبھی آتی ہے یا بیدکبھی نہیں یہاں کی اٹھائی گئی۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑا کرنے اور کھریرا کرنے کو خود تیار۔ سالوتری کی نوکر۔ خود مویشی خصوصاً گھوڑوں کے علاج سے واقف، غرضیکہ ان مات اسی میں فانی ہو اصطبل۔

بعض آدمیوں کو اپنے بچوں سے عشق ہوتا ہے۔ یوں تو اپنے بچوں سے کس کو عشق نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اصحاب کو اولاد کی نسبت اپنے بچوں سے زیادہ عشق ہوتا ہے۔ شب و روز انھیں کی فکر، انھیں کا خیال، انھیں کے غرور پر داخت۔ عورتوں کی طرح خود پالنا نہلانا دھلانا، اپنے پاس سلانا، اگر ذرا چھینک بھی آئی تو گویا ان کے دل پر تیر لگا۔ یوں ہی سا بدن گرم ہوا اور گھر گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ڈاکٹر پہ ڈاکٹر، طبیب پہ طبیب آ رہے ہیں۔ تیمارداریوں اور کیفیت کا یہ کہ نسخہ ذرا احتیاط کامل سے باندھا۔ کوئی دوا خراب یا وزن کم و بیش نہ پڑے۔ جس چیز پر بچے نے ذرا رغبت کی فوراً مول لے دی۔ جو اس نے کہا وہی ہو۔ بالکل ہٹ کو کبھی ٹالا نہیں۔

خیر یہاں تک تو خیریت ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اس عشق کے ساتھ بچوں کی آئندہ بہبودی کا خیال رکھا تو عشق کو عشقِ کامل کہیں گے۔ علم و فن کے زیور سے ان کو آراستہ کیا۔ پڑھایا، لکھایا، بہت بہت بچایا۔ لائق لائق اتالیق ان کے لیے مقرر کیا۔ یہ متقضا عشق ہے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ہر پیشے کا آدمی لڑکے کو پڑھانے لکھانے بیٹھے۔ ضروری معمولی تعلیم کے بعد کوئی پیشہ سکھائے۔ بڑھئی اپنے بیٹے کو نجاری کا کام سکھائے۔ سنار سناری کے پیشے میں اس کو غرق کر دے۔ کسان کا لڑکا زراعت کے اصول سے واقفیت حاصل کرے اور اگر اس کے برعکس والدین لڑکے کو کوئی کار آمد زبان علم یا پیشہ نہ سکھایا تو لاڈ کا پالا ہو کے گر گنوار کا گنوار نکلے گا اور سب یہ ہے کہ اس کی باپ ماں نے لاڈ میں اس کو خراب کر دیا ہے اور دنیا میں کسی کام کا نہ رکھا۔ اس قسم کے عشق پر تین حرف۔

بر سر لوح او نوشتہ بزر — جور استاد بہ ز مہر پدر

بعض شوق اس قسم کے ہیں کہ عشق کے درجے کو رفتہ رفتہ پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان سے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ بالکل بیکار شوق

وہ کون شوق۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ پتنگ بازی، مینڈھے لڑانا۔ ہم کو اس قسم کے شوق سے نفرت ہے۔ کبوتر پالنے پر تو شا ے پر ایا مال۔ دوپہر کو جلتی جلتی دھوپ میں چیل انڈا چھوڑ رہی ہے اور آپ کو۔ کو کر رہے ہیں۔ کٹی دکھا رہے ہیں۔ مرغ بازی اس سے بھی بدتر ہے۔ ایسا ظالمانہ شوق دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ مرغ بیچاروں کی جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔ دو دو پہر گھستے پڑے ہیں جن ں اس شغل پر دنیا و مافیہا کے کل اشغال کو فوق دیتے ہیں اور خرچ کرتے کرتے ان کے دھرے اڑ جاتے ہیں۔ پتنگ بازی کار بیکاراں ڑیوں کو پالنے کا شوق بھی انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتا۔ بشرطیکہ چڑیوں کے ساتھ عشق کا درجہ ہو۔ اور نتیجہ اس کا کیا۔ لہٰذا ایک نہ دیناؤ۔ اں اگر شوق ہے یہ۔ سر پا پنجرہ، خوش نوا، خوش نغمہ، خوش رنگ طیور کے ہونے تو مضائقہ ندارد۔

عورت کا عشق مرد اور مرد کا عشق عورت کے ساتھ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس سے مطلب اس عشق سے نہیں ہے جو بعض مرتبہ یوں کو نان بازاری سے ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی عشق میں عشق ہے۔ یہ عشق کا نام بدنام کرنا ہے۔ یہ عشق نہیں ہے فجور و فسق ہے۔ اس شہوت بھی کو اگر واقعی عشق کہتے ہیں تو ایسے عشق کو عقلاً کا سلام۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فہمیدہ آدمی زنان بازاری، ہرجائی، بدکار، وضع عورتوں پر کیوں کر فدا ہو سکتے ہیں۔ آج ایک کی، کل دوسرے کی، پرسوں تیسرے کی۔ اس وقت زید کی بغل میں دو دن بعد بکر سے ملکت۔

شاید ہوس بانستن با گلے　　　کرمے با ماوش شود بلبلے

عشق سے اس بیہودہ بات کو کوئی سروکار نہیں۔

ممکن ہے کہ کسی مرد کو کسی عورت کا عشق ہو اور وہ عشق پاک ہو اس کو بعض کوتہ اندیش حالات سے سمجھتے ہیں مگر یہ ان کی خامیٔ عقل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پختہ مغز نہیں ہیں۔ چھوٹے خیالات کے آدمی ہیں اور ان کی طبیعت بدی اور فسق و فجور کے دلدل میں ایسی دھنسی اور پھنسی ہوئی ہے کہ ابھر نہیں سکتے۔ اگر کوئی شاعر غرا جلپٹ رنگ میں ڈوبا ہوا ہو کسی شاعرہ سحر بیان کا ایسا کلام سنے کہ اس کے دل پر نشتر کا کام کرے تو بیشک اس کی روح وجد کرنے لگے گی اور عشق کا درجہ ہو جائے گا۔ عام اس سے کہ شاعرہ جوان ہو یا بڑھی حسین ہو یا کریہہ منظر۔ حسنِ ظاہری کا وہ عاشق نہیں۔ وہ تو حسنِ باطنی کا عاشق ہے۔ وہ جادو بھری آنکھوں پہ فریفتہ نہیں ہے۔ وہ بیان کے جادو کا دلدادہ ہے یعنی اور فصاحت وہ جادو ہے کہ اس کی قدر وہی جانتے ہیں جو جانتے ہیں اور اس کی منزلت کو وہی پہچانتے ہیں جو پہچانتے ہیں۔ یہ کچھ فرض نہیں ہے کہ انسان کسی عورت کو دل سے چاہے۔ بدی کا خیال ضرور دل میں لائے ہرگز نہیں۔

بہ مجنوں گفت روزے ساربانے　　　چہ سا بیہودہ وشت اندر مکانے
اگر با لیلیٰ ات باشد سروکار　　　بود آں بیوفا را حیلہ بسیار
لب معشق بکام دیگراں ست　　　ترا بیہودہ در سر امتحاں ست
ز حرف ساربان مجنوں برنجید　　　جواب ایں داد و زیر لب بخندید
میان عاشق و معشوق رمزیست　　　کرام کاتبیں را ہم خبر نیست

رموزِ عاشق و معشوق بداند
چہ داند آنکہ اشتر می چراند

مجنوں سے کسی ساربان نے کہا کہ میاں تم وحشت نوردی کیوں کرتے ہو لیلیٰ تمھاری حبشے چڑھے ہے۔ ع

ایں خیالست و محالست و جنوں

مجنوں نے ہنس کر کہا تو اس پیر میں نہ پڑ تجھے معشوقوں کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار تو شترِ غمزے کا عادی ہے جا اپنے اونٹ چرا۔

دردِ عالم عشق زلیخا کاملیست   خواہش وصل زنا انصافیست

اس بند سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اگر نفس یہ چاہتا ہے کہ فلاں عورت سے ہم بستر ہوں تو آتش پیدا ہو ہے کہ یہ حقیقی کا نام عشق نہیں یہ تو صرف خواہش حیوانی ہے۔ جس کو شہوت پرستی کہتے ہیں۔ اگر وہی عورت علیل ہو کر بدقطع ہو جائے یا چیچک نکلے اور داغ ہو جائے۔ پھر دیکھیں معنوی عاشق صاحب کیونکر محبوبہ دلکش بر سابق پر مرتے اور جان دیتے ہیں۔ مان سے بڑھ کر عشق کسی کو نہیں ہوتا۔ ان کی ماں کا مشہور ہے۔ اگر لڑکا مجذوم بھی ہو جائے تو ان کو نچے سے وہی محبت رہے گی جو پہلے تھی عشق اس کو کہتے ہیں۔
اکابر عشاق کے زمرے میں عاشق اللہ کا بہت بڑا درجہ سمجھا جاتا ہے اور ہماری ایک غزل کا مقطع اسی مضمون کا ہے۔

چھوڑ کر عشقِ حسینانِ جہاں اے سرشارؔ   عاشقِ اللہ کا ہو عشقِ بشر کچھ بھی نہیں

مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ باتیں کچھ حقانی آدمیوں ہی کو پسند آتی ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم نے خدا اللہ والے لوگوں کو عشقِ حقیقی میں گم پایا۔ بحرِ عرفاں میں غرق فنا فی اللہ لیکن زاہدانِ خشک سے ڈر کر کہتا ہوں کہ ہمارے نزدیک دنیا دار آدمیوں کے لیے جو عشق سب عشقوں سے بڑھا ہوا ہے وہ اور ہی عشق ہے دنیا دار کے لفظ کو یاد رکھیے گا۔ گرہستوں کا ذکر ہے۔

جو بہت پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

ان کے نام پر وہ وہ ٹپیے ان کا درجہ ہم جاہل لوگ کہاں سے پائیں۔

خیر وہ عشق کیا ہے اسے وہ عشق ایسا ہے کہ اس سے بڑھ کر عشق ہو ہی نہیں سکتا بشرطیکہ دل ملے ہوئے ہوں جس عشق کا ہم اب ذکر کرنے والے ہیں وہ عشق انسان کو چوندھیا دیتا ہے۔ جان کی کوئی حقیقت نہیں مال کیا چیز ہے یعنی میاں بی بی کا عشق بی بی میاں پر پروانہ۔ میاں بلبل کی طرح شیدا میاں کی دلی آرزو کہ یا اللہ میں چاہے ایک دن فاقہ کیا کروں مگر میری پیاری بی بی آرام سے رہے۔ بی بی روز صبح شام دعا مانگتی ہے کہ یا خدا پاک زندگی کی کوئی اور تمنا نہیں ہے رہے تو یہ ہے کہ میرا سہاگ ہمیشہ قائم رہے میاں نے بی بی کو دیکھا اور غم غلط ہو گیا۔ بی بی نے میاں کی صورت دیکھی تو باچھیں کھل گئیں۔ گویا تمام دنیا کی نعمتیں مل گئیں۔ اگر میاں کے پاؤں پر کانٹا چبھے تو بی بی کے گویا رونگٹے رونگٹے پر کسی نے نشتر پر نشتر چبھو دیے اور اگر بی بی کا پنڈا پھیکا ہوا تو میاں کی بے کلی کی کوئی حد نہیں۔

بی بی چاہے بہشت میں نہ ہو مگر عشق کے یہ معنی ہیں کہ میاں ہر حالت میں خوش ہیں۔

انسان چاہے جس قدر تھکا ماندہ شل دن بھر اپنے پیشے کے مطابق محنت شاقہ کر کے شام کو گھر آئے اور بی بی کے گورے گورے پیارے گالوں کو ادھر ادھر چوم لے تو ان گرما گرم بوسوں سے سب تھکاوٹ دور ہو جائے۔

سپیکر ز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی حیدر آباد دکن
۹ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ۔ جلد نمبر ا شمارہ نمبر ا

بنی نوع انسان

یہ آدمی ہے کہ برسوں بحال رہتا ہے — وگرنہ ماہ کوکب شب کسال رہتا ہے

حضرت انسان نے اپنے لیے اشرف المخلوقات کا خطاب فضیلت انتساب تجویز فرمایا ہے۔ دیدۂ انصاف وا کر کے دیکھیے تو یہ خالی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن بیٹھے بلکہ واقعی خلعت اشرف المخلوقات کو خالق کارساز نے ان کے قد پر راست کیا ہے۔ اللہ اللہ زمین کے رہنے والے اور آسمان کی خبر لائیں۔ شمس جیسی منور کرے کی باتیں بتائیں جس کو انسان بے خبر کی نگاہ دیکھ نہیں سکتا۔ قمر کے پہاڑوں کی بلندی دریافت کریں دریائے ذخار کا بند کرنا ہوا مٹھی میں تھامنا ہے۔ آگ اور پانی کے ذریعہ سے ریل کا چلانا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ مگر عقل کے صدقے جو زور کر دکھایا۔ دنیا میں جتنے مخلوق ہیں سب ان کا لوہا مانتے ہیں۔ سب کو انھوں نے نیچا دکھایا۔ ایسی زبردست کہ سب کو زیر کیا ان کے آگے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ یہ مشت خاک کا پتلا ہے۔ غبارہ وہ ایجاد کیا کہ کائنات اثیر کی ہوا کھانے لگے۔ جہاں پرندوں کے پر جلیں وہاں جانے لگے۔ جدھر جاؤ ان ہی کی دھوم ہے۔ جہاں دیکھو ان ہی کا سکہ بیٹھا ہے۔ کوئی ملک کوئی جزیرہ۔ کوئی سمندر۔ کوئی جنگل الغرض کوئی مقام ایسا نہیں جہاں یہ نہ پہونچے ہوں۔ اپنے قدوم میمنت لزوم سے جنگل کو گلزار اور بن کو فرخار بنا دیا۔ جہاں کتے بھی نہیں لوٹتے تھے وہاں وہ وہ صورتیں نظر آتی ہیں کہ انسان عش عش کر جائے۔ انسان ہر قسم کی آب و ہوا کو برداشت کر لیتا ہے۔ ہر قسم کی سرزمین میں رہتا ہے۔ قریب قریب ہر قسم کی غذا استعمال میں لاتا ہے۔ دریائے بنگال کے کناروں پر آفتاب عالمتاب کی تمازت اس غضب کی ہوتی ہے کہ شربت ابلنے لگتا ہے۔ وہاں بھی انسان بآرام تمام زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرمی کو اصلاً نہیں مانتے۔ برعکس اس کے براعظم ایشیا کے شمال و مشرق میں اس درجہ سردی ہوتی ہے کہ پارہ تک تھم جاتا ہے۔ لیکن یہ وہاں بھی چین سے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیلی کا یہ قول بجا اور بہت ٹھیک ہے کہ تمام روئے زمین پر صرف انسان ہی اس قسم کی ذی روح ہے جو برہنہ ہے مگر ہنر اور صنعت اور دستکاری کے باعث ہر طرح کی آب و ہوا کے لائق اپنے جسم کی حفاظت کے لیے کپڑا بنا لیتا ہے۔ سردی کے لیے اس قدر گرم کپڑا تیار کرتا ہے کہ اس کے پہنتے ہی سردی کی عقل بھی سرد ہو جائے۔ جو موسم گرما میں ایسی پوشاک پہنتا ہے کہ گرمی کی گرم بازاری پر اوس پڑ جائے۔ بارش کے لیے ایسا جامہ ایجاد کیا ہے کہ چاہے کیسا ہی موسلا دھار برسے بدن پر ایک بوند اثر نہ کرے۔ ان ہی اسباب سے وہ ہر موسم اور ہر فصل میں رہ سکتا ہے مگر اور جانوروں کی طرح اس کے جسم پر اون یا کسی قسم کی پوشش ہوتی تو گرم ملکوں میں وبال جان ہو جاتی۔

حکمائے بنی نوع انسان کو مختلف اقسام پر منقسم کیا ہے جس سے خط و خال، آنکھ اور بال، کھوپڑی اور کھال میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر پیشچارڈ نے کل مخلوق کو تین جنسوں پر منقسم کیا ہے۔ اول ملینک یعنی سیاہ وہ لوگ جن کے بالوں کا رنگ سیاہ ہے۔ دوم زینتھس یعنی وہ لوگ جن کے بال زرد یا سرخ یا بھورے ہیں۔ ثالث لیوکس یعنی سپید جن کے بال بالکل سفید ہیں اور آنکھیں سرخ۔ بڑا

صاحب سے اسی بارہ میں خوب کہا ہے اور اکثر محققین نے ان کی رائے صائب سے اتفاق ہی کیا ہے ان صاحب نے انسان کے پانچ فرقے تجویز کیے ہیں جو یہ ہیں سب سے پہلے فرقے کو کہ جس کا نفس عنصر کہ ہے یعنی کاکیشن ۔ منگولین ۔ ایتھیوپک ۔ امریکن ۔ ملے (۱) کاکیشن (۲) (۱) کا سر قریب قریب گول ہوتا ہے ۔ پیشانی نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی ۔ چہرہ بیضاوی استخوان رخسار نکلے ہوئے نہیں ہوتے ۔ دونوں جبڑوں میں آگے کے دانت بصورت عمود ۔ چہرہ بیضاوی ۔ ناک محراب دار ۔ دہن چھوٹا نیچے کا ہونٹ کسی قدر نکلا ہوا ۔ زنخدان مدور ۔ اس فرقے کے لوگ ہر ایک رنگ کے ہوتے ہیں ۔ اصلی رنگ ان کا سفید ہے مگر آب و ہوا اور عادات آفتاب وغیرہ وغیرہ کے سبب گندم گوں سیاہ فام اور سرخ سفید بھی ہو جاتے ہیں ۔ اہل اسیریا اہل بابل ۔ اہل میڈیا ۔ فارس ۔ یہودی ۔ عرب ۔ ترک ۔ تاتاری افغان ہندو ۔ فرانسیسی ڈچ ۔ اہل یونان ۔ جرمن ۔ پروس ۔ آسٹریا ۔ کوہ قاف ۔ اسی گروہ میں شامل ہیں ۔ افریقہ میں جو لوگ بحر شمالی پر شمیم کے قریب رہتے ہیں ۔ وہ اور مصری اور اہل ابی سینیا فرقہ کاکیشن سے ہیں ۔ اہل منگولین ان کے سر قریب قریب مربع ہوتے ہیں ۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے ۔ چہرہ چپٹا ۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں ۔ ناک چپٹی ۔ اس فرقے کے لوگ سرخ و سفید یعنی صبیح نہیں ہوتے ۔ بلکہ رنگ کسی قدر مائل بہ زردی ہے ۔ بال سیدھے ۔ کالے اور مضبوط ہوتے ہیں مگر بہت ہی کم ۔ داڑھی سو میں دس کے ہوئی بھی تو بالکل ذرا سی ۔ چینی ۔ جاپانی ۔ بھوٹیے ۔ اہل تبت ۔ منگول ۔ اسکوئی مو ۔ اس گروہ سے علاقہ رکھتے ہیں (۳) انتھیوپک ۔ سر دراز و کم وا ہوتا ہے ۔ پیشانی بہ شکل گنبد ۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے نیچے کے جبڑے بڑے اور مضبوط آنکھیں ابھری ہوئی ۔ اوپر کا ہونٹ موٹا ۔ رنگ بالکل سیاہ اور گھونگھریالے بال ۔ جنوب صحرائے اعظم اور والی سینا ۔ آسٹریلیا ۔ تیونس ۔ پتیا ۔ نیوگنا ۔ جزیرہ وسمان فیجی وغیرہ کے باشندے فرقہ ایتھیوپک سے متعلق ہیں (۴) امریکن ۔ یہ لوگ منگولین سے کسی قدر مشابہت رکھتے ہیں ۔ استخوان رخسار محراب دار کھوپڑی بھی چہرہ چپٹا ۔ پیشانی تنگ ۔ ناک کسی قدر چپٹی ۔ رنگ سرخی مائل یا کسی قدر سیاہ بال منگولین سے ۔ داڑھی بالکل ندارد ۔ امریکا کے اصلی باشندے اسی گروہ سے ہیں ۔ (۵) ملے ۔ ان لوگوں کی پیشانی کچھ یوں ہی سی محرابدار ہوتی ہے ۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے ناک موٹی اور چوڑی رنگ گیہواں ۔ بال سیاہ ۔

یکم رجب المرجب ۱۳۱۶ھ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۵

ناول نگاری

مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری

اول بہ فسونگر کرد طواف حرم ما

تعلق اور لن ترانی اور دوں کی لینا اور شیخی بگھارنا میری وضع کے خلاف ہے اور ایک مجھ پر کیا فرض ہے کل اہل آبرو کی وضع کے خلاف ہے یہ شعر جو چیپر نے زیب عنوان کیا ہے اس کو تعلی پر محمول کرنا انصاف پیچلے کی گردن کو گندہ چھری سے سنا کی کے تا رہتا ہے ہیں آپ تعریف اپنے ناولوں کی کروں تو جو چور کی سزا وہ میری ۔ ہاں مگر ہر حق کا اظہار تعلی اور پاک ہونا دل کی پیاہو تو مجھ سے بڑھ کے ڈھیٹ کوئی نہیں ہے ۔ اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ فسانۂ آزاد نے قدر دانوں کی قدر دانی سے وہ قبولیت پائی کہ لندن ۱۱، پیرس اور شکاگو تک اس کی شہرت ہوئی اور اسی کو دیکھا دیکھی لوگوں کے دلوں میں ناول لکھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ گو قصوں کی کتابیں ہوا

افسانے اُردو میں بیشتر بلکہ کہیں پیشتر سے موجود ہیں لیکن بالکل انگریزی اصول اور یورپین طرز پر کوئی ناول مثل فسانۂ آزاد کے اودھ اخبار سے مشہور اخبار کے ساتھ روزانہ شائع نہیں ہوا تھا۔ جن صاحبوں نے اس کے بعد ناول لکھا۔ ان میں سے انصاف پسند بزرگواروں نے قبل اشاعت خود اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ گورکھپور سے حضرت ریاض نے لکھا تھا کہ ہمارا ناول اُسی طرز یورپین پر ہوگا۔ جس میں فسانۂ آزاد والے کچھ شہرت پا چکے ہیں۔ بہار کے رئیس بابو بسنت لال پرشاد صاحب نے بھی اپنے ناول میں فسانۂ آزاد کو تعریف کے کلمات سے عزت بخشی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھ سے بڑھ کر ناولسٹ دُنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تو اس کی تعلی کی مجھ سے شکایت کرنا بیجا ہے۔ اس کی شکایت ڈاکٹر سعید الدین صاحب تقشل یاب جنگ سے کرنی چاہیے کہ مجھ مجنوں کی ضد نہ کھلائی۔

پھر آمدم بر سر مطلب۔ اُردو زبان میں جو کتب قصص بیشتر کی ہیں وہ پرانی وہمی جزا لیے اور اکثر دقیانوسی خیالات اور اُن امور پر مبنی ہیں جن کا عدم وجود یکساں ہے اور حسب عادت محال اور حسب عقل غیر ممکن ہیں تب اُردو کی سرزمین پر نئی تہذیب کا آفتاب اچھی طرح نہیں چمکا تھا۔ سب کے پہلے انڈیا میں انگریزی اصول پر اہل بنگالہ نے اپنی بنگلہ زبان میں ناول لکھے اور رائے بنکم چندر چیٹرجی نے اس فن کی گھوڑ دوڑ میں بازی جیت لی۔ ہندوستان میں ابھی تو کل کی بات ہے کہ ناول تھے ہی نہیں۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا کا یہاں ذکر نہیں ہے اردو کے ناول نہ تھے اور جو تھے وہ پرانے فیشن کے۔ ہاں ڈراما جس کا نام ہے۔ اس کے ترجمے ہندو ہیں۔ بڑے بڑے مبصروں کی رائے ہے۔ جو ہفت زبان تھے اور ہیں کہ ڈراما سنسکرت سے بڑھ کر لاطینی میں ہیں نہ یونانی میں۔ تا بہ افسانۂ دیگر چہ رسد۔

اُردو کے ناول یعنی افسانے پرانے زمانے کے لکھے ہوئے حال کے تربیت یافتہ پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ عموماً پوچ یادر ہوا خیالات سے مملو ہیں۔ اب لوگ واقعات ڈھونڈتے ہیں۔

اب ہم پرانے قصص کے مہمات کی چند مثالیں دیتے ہیں:

۱۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو جادو کے ایک گڑھے میں دھکیل دیا تو وہ بیچارے دس کروڑ دس لاکھ دس ہزار برس تک اس گڑھے میں گرتے گرتے کہیں خدا خدا کر کے تہ پہنچے۔ جل جلالہ۔ اب کوئی اس جانگلو مصنف سے پوچھے کہ اگر کوئی انسان بفرض محال سطح ارض سے قعر کرۂ زمین تک دھنستا ہوا جانے تب بھی تو علم طبیعیات کی رو سے کتنے عرصہ میں منتہائے قعر تک پہونچ جائے گا اور زمین کا قطر کتنا ہے؟

۲۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو سمندر کے اس کنارے سے اس کنارے تک چشم زدن میں پہنچا دیا۔ یہ کیونکہ۔ ریل بھی ایسی سریع الرفتار نہیں ہے۔ تار بھی نہیں ہے مگر مصنف نے بزور دعا ہیرو کو سمندر پار کرا دیا۔ ادھر آنکھ بند ہوئی اُدھر ایک ساحل سے دوسرے ساحل پر نمودار ہے ہیں۔

۳۔ ایک ناولسٹ فرماتے ہیں کہ جو ہوں نے جیل کے نیچے نیچے سرنگ لگائی اور ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ اور ماہی مراتب اور علم اور نشانوں کے ساتھ برسوں کا راستہ چھیکوں میں طے کیا اور غنیم کو مارا اور جادو کے زور سے سرنگ کی ہر منزل میں بیناروں میں کھانا کھایا۔

۴۔ ایک صاحب نے کئی دن گھوڑے پر پرستان کی ایک پری کو ہوا پر اڑا دیا اور وہ ایک پر عاشق ہو گئی۔ عین نوم کی حالت میں ان کو

آٹھوں گھڑی پرچھا کر پرستان کی راہ لی یہ بادہ جا

اب دنیا بہت کر دنیا میں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں کہ مضحکہ خیز ہے خدا نے کچھ بھی سمجھا دیا ہو کہ کبھی ان مزخرف خیالات کو تسلیم کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ یہ پُرانے ایشیائی خیالات کی کہانیاں ہیں جن کا نہ سر نہ پاؤں۔ پچھلے زمانے کی نوجوانوں کی اور آخر یہ قوت باور کرنے تو بڑھ جس۔ بلکہ

کہ سارا پر شد و کلاہ نشد

آج کل کے ناول قصے واقعات پر مبنی ہیں تاریخی امور پر مبنی ہیں اخلاقی باتیں ان سے پیدا کی جاتی ہیں۔ اور نتائج نکلتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ پڑھا لکھا انسان ان کو پڑھے اور انتہا سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوں۔ مگر ان بہت ہی پرانے فیشن کے آدمی دیکھیں تو پسند نہ کریں اور کہیں کہ ان میں تو وہ باتیں لکھی ہیں جو ہم روزمرہ دیکھتے اور سنتے اور کرتے ہیں:

دندان تو جملہ در دہانند
چشمان تو زیر ابروانند

وہ تو اس بات کے پڑھنے کے مشتاق ہوتے ہیں کہ [فلاں یا تو تا ہمیں کہ فلاں زن تھا کہ فلاں بادشاہزادی کے حسن پر آتا ہے۔ و عل وہ تو کہ

تو نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

کوہ قاف کے ملک بنارس میں فلستان نامی شہر ہے اُس پار ایک بادشاہ رہتا ہے وہاں اس کی لڑکی حسن فلستان نامے رہتی ہے جس کے رُخ کا یہ حال ہے کہ رات اس ملک میں ہوتی ہی نہیں۔

بس (اس اول جلول سے) سنتے ہی اون کو چھوڑ چھاڑ کر ادن کے عاشق نے فلستان کی راہ لی چل جلا۔ اب ذرا دھند چلے جاتے ہیں جہاں سانپ سامنے کھڑے ہیں مزدور۔ اب جو عجب شد پریتا و ڑیل اور دیو سب سے مڈبھیر ہوئی اور جا کے اس کو بیاہ سے آئے۔ [ہ بار کہاوت کے ہم بھی سنتے ہیں] ایک نو تی کسی ہیرو کو ایسی ملی کہ وہ سب کو دیکھیں اور باقی سب اندھے۔

ذرا حال کے اردو ناول نویسوں کو اس امر کا خیال چاہیے کہ ملک کے خیالات جدید کو اس خوبصورتی سے قلمبند کریں کہ تصویر کھینچ دیں۔ جیسی قلم سے بھیں۔ پس یہ معلوم ہو کہ مصنف کوئی چشم دیدہ واقعہ بیان کرتا ہے جیسے کسی شکل پر کوئی چابکدست کامل فن اکبر کا بل اپنے سیمرے گھوڑے کی باگ کو یوں قابو میں رکھے جیسے استاد شہسوار اصیل گھوڑے کی باگ جہاں جی چاہے وہاں موڑے۔

دیباچہ فصل اور ابواب کو برابر میں ملحوظ ہو مگر ناول میں تو سخت سے سخت عیب سمجھا جاتا ہے جہاں تک ممکن ہو سکے ہر پارٹ یعنی چیپٹر یا فصل کو قریب قریب مساوی رکھے۔ ہاں یہ ذرا مشکل ضرور ہے لیکن جہاں تک ہو سکے ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک حصہ پچاس صفحے کا ہو اور ایک آٹھ صفحے کا۔ اس کا بھی خیال ضروری ہے کہ اس کا مکالمہ سب پیچیدہ ہو اور دلکش ہو۔ مگر فضول مکالمہ خواہ مخواہ ٹھونس دیا جانا بڑا عیب ہے۔ لوگ پڑھتے پڑھتے عاجز ہو جاتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھ کر ختم کر دیتے ہیں۔

اس طرح کی مسلسل کہانی یا بات نہ چھیڑ دے کہ دفتر کا دفتر ہو جائے اور ایک کسی ذکر کو جو شیطان کی آنت ہو جائے کوئی پسے

ذرے کا نہ

ناول کا ایک عیب ہے کہ جب ایک باب ختم کر دیں تو پھر ناظرین بڑے دلی شوق سے دوسرے باب کے مطالب جاننے کے منتظر رہیں اس کا لکھنا مشکل ہے کہ ایک نہایت ضروری اور تعجب خیز بات ختم کر کے ناظرین اس کے چھوڑے ہوئے ٹکڑے کو جب تک دریافت نہ کر لیں تب تک کھانا پینا حرام ہو جائے۔

رومانٹک ناول اور فکشن جو اصلی واقعات پر مبنی ہوں ان کا اُردو ناولوں میں کم چرچا ہے اور جو ہیں وہ دقیانوسی خیالات سے مملو، بہذا وہ کوڑی کے۔ ٹریجڈی کو ہمارے اُردو خواں بھائی کم پسند کرتے ہیں حالانکہ ایشیائی خیالات غم کے قصص سے خالی نہیں۔ عاشق و معشوق کے دائمی ہجر کا حال لیلیٰ و مجنوں۔ فرہاد و شیریں، وامق و عذرا، نل دمن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ابھی اُردو خوانوں کے طبائع ٹریجڈی کی طرف مائل نہیں ہیں حالانکہ ٹریجڈی کا لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اُردو ناولوں کے مطالعہ کا شوق ہم لوگوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ اللّٰھم زد فزد اسی سبب سے ان کی اشاعت بھی زیادہ ہونے لگی اور ہو گی۔ اور اسی باعث سے اب اچھے بُرے ناولوں میں ہم تمیز بھی کرنے لگے۔

ہیمپرز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا شمیری
یکم جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱

شعر و شاعری کی بحث

عالیجناب مہاراجہ پیشکار بہادر وزیر فوج آصفی نے ایک قصیدہ شکریہ حضرت نسیم حیدرآبادی کے مشاعرے کے لیے بتقریب سعید سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ طرح کے مصرع پر سرکار ممدوح الشان نے تصنیف فرمایا تھا۔ اس قصیدہ کے ایک شعر پر کسی صاحب نے گمنام خط رامپور سے بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

(میں حیدرآبادی ہوں اور ملکی ہونے کی سبب سے میرا جی خوش ہوتا ہے جب میں کسی حیدرآبادی کو قابل اور لائق پاتا ہوں مگر تعجب ہے کہ اتنے بڑے اور عالم پیشکار صاحب بہادر نے ایک بڑی غلطی کی وہ یہ ہے ؎

یہ غضب ہے کہ حسانِ معانی تھا سمیٰ
میر محبوب علی شہ سا تھا کب بانل

"باذل" کو "بانل" لکھا ہے۔ غیاث اللغات میں بحوالہ منتخب لکھا ہے (باذل بکسر ذال معجمہ بمعنی بخشندہ و سخی)

لہٰذا یہ اعتراض چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اٹھایا جاتا ہے اور یہ شعر مثل ماہ منیر ہو کر چاند کی طرح خسوف سے صاف نکل آتا ہے۔ واضح ہو کہ جب شاعر عمداً کوئی غلطی کرتا ہے تو اسی شعر میں خود اپنی غلطی کا خوبصورتی کے ساتھ اعتراف کر لیتا ہے۔ عیب عین حسن ہو جاتا ہے حافظ شیرازی کی غزل کا مطلع کتنا جواب ہے :

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مصرع اولیٰ میں خراب بمعنی اسی مرد ہے اور مصرع ثانی میں تا بہ کجا ہی۔ مگر حافظ نے تو غضب کر دیا کہ صلاح کار کجا و من خراب کجا، اب صلاح چہ سرکار اور پھر لکھتا ہے۔ دیکھو تفاوت راہ کس قدر ہے کہ کجا اور تا بہ کجا قافیہ لایا ہے۔ اسی طرح غالب مرحوم نے ایک قصیدہ میں معشوق کے رخساروں کو سیب سے تشبیہ دی ہے مگر خود کہہ دیا کہ — غلط کردم کہ گفتم ...... نگاہ یار را سیب۔

پیچیز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی
یکم جمادی الاوّل [illegible] جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱

موسیقی اور ہماری ثقافت کی ترجمانی

سید عابد علی عابد

فنون لطیفہ میں شاید ہر فن اس ملک میں بادشاہوں کے سایہ میں اپنی جگہ پیدا کر گیا۔ تاثیر اور تحریک کے اعتبار سے موسیقی کو بعض اعتبارات سے شعر پر بھی تفوق حاصل ہے۔ امیر خسروؒ نے جو ان دونوں فنون کے کشور کشا اور محرم اسرار ہیں ایک مناظرہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں آخرکار موسیقی کو ہی شعر پر ترجیح دی ہے اور دوسرے دلائل سے قطع نظر ایک دلیل یہ بھی دی ہے (جو خاصی وزن دار ہے) کہ شعر کم از کم الفاظ کا محتاج تو ضرور ہے۔ اس کے برخلاف موسیقی لفظوں کے پیرہن سے بھی بے نیاز ہے اور صرف صوت مجرد سے کام لے کر وہ طلسمات کی فضا پیدا کرتی ہے کہ خواص اور عوام دونوں مسحور ہوتے ہیں بشرطیکہ تاثیر سے خالی نہ ہو اور موسیقار لحن خوش سے بے نیاز ہو کر صرف موسیقی کی گرامر یا صرف و نحو کی مشق ہی نہ کر رہا ہو۔

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ موسیقی صوت مجرد یا صوت خالص سے کام لیتی ہے البتہ یہ صوت منظم اور مربوط ہونی چاہیے تاکہ شور محض میں اور صدائے موسیقی میں تمیز ممکن ہو۔ شور میں آوازیں منظم نہیں ہوتیں۔ نسبے شدہ وقفوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ الفاظ کی ترکیب اور ساخت میں شور یعنی صدائے محض کس حد تک دخیل ہے اور کیا فریضہ ادا کرتا ہے۔

یہ باتیں مد نظر رکھی جائیں تو واضح ہو جائے گا کہ موسیقی کی حرمت و حلت کے متعلق کس حد تک اختلاف کیوں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی جو کچھ سُروں کی ایک خاص ترتیب اور ترکیب کا نام ہے بجنسہ بغیر کسی اور خارجی عنصر کے گناہ کے ارتکاب میں یا کسی خلاف شرع امر کے وقوع میں ممد نہیں ہو سکتی۔ سُر تو محض آوازیں ہیں۔ مجرد اور خالص اور معصوم۔ ان کو حلال و حرام سے کیا تعلق؟ ہاں غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم موسیقی کو ایک خاص تناظر میں سنتے ہیں۔ مثلاً یہ صورت کہ غزل سنی تو بعض الفاظ تہذیب یا فحش نکل آئے یا پھر یہ صورت پیدا ہوئی کہ گانے والی نے اپنے حسن ادا اور اصطلاحاً بھاؤ سے کام لے کر دل میں ایسا ہیجان پیدا کر دیا جو نامناسب ہے یا گانے والے نے ہیجان انگیز اور اپنی دلبری کم سنی اور خوش وضعی سے ایسے احساسات کو برانگیختہ کیا جنہیں شرعاً مذموم بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ غلط فہمی دُور کر دیتے ہیں اور موسیقی کو اپنے صحیح رنگ میں دیکھتے ہیں تو اسے معصوم پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تو سُنا گیا ہے کہ فلاں صاحب نے ایک مرتبہ بیہودہ نازیبا نغمہ کا اشارہ تو ویسے ہی ٹوٹ پڑے کہ ناروا باتیں کرنے لگے یا کسی امرد سے کہ خوش وضع بھی تھا قوالی سنی یا گیت سنا اور فساد پیدا ہوا لیکن یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ صاحب ساز کی موسیقی سن کر لوگ اپنے آپے ہی سے باہر ہو گئے ہوں کہ خلاف شرع باتوں کا ارتکاب کرنے لگے ہوں۔ یہ تو ہم سنتے ہیں کہ فلاں کو وہ بالے ڈومنی لیکن یہ نہیں سُنتے کہ صاحب کرنے کی لے نے دیوانہ و آشفتہ کر دیا اور وہ دین و دُنیا سے جاتے رہے۔

سماع کو جو بعض صوفیوں نے جائز قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صوت مجرد کو معصوم سمجھتے ہیں اور محرکات ہیجان کو رفع کرنے کے لیے یہ قیود بھی عاید کر دیتے ہیں کہ سماع کی صحبت تیار ہو۔ سُننے والے اپنے آپے میں رہیں تواجد اور حال کی ایسی کیفیت کا اظہار نہ کریں جو خلاف وضع ہو۔ خوش وضع امردوں کو قوالوں میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے اور قوال بھی عموماً نیک خصلت ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان

حالت میں [illegible] بھی بیان کیا جا سکتا ہے نہ ہوگا۔ اسلئے استعمال ہوں گے کہ تو مضمون [illegible] اور
حالتوں میں [illegible] اور [illegible] روح کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ موسیقی میں خاص طور پر [illegible] کی ثقافتی رنگ و ڈھنگ [illegible]
مسلم مسائل کا ایک [illegible] مجموعہ ہوتی ہے۔ البتہ جو بات موسیقی کے ثقافتی اور تمدنی مزاج کا تعین کرتی ہے وہ راگوں مثلاً
غزل، گیت، ٹھمری، کجری [illegible] اور اس طرح کے دوسرے اصناف غنا کے سلسلے میں [illegible] ہوتی ہے۔

ہندوستان کے کلاسیکی سنگیت میں اپنے بولوں کے اعتبار سے [illegible] بہت سا اور صرف دیوی دیوتاؤں کی خدمت [illegible] زیادہ
عقیدت ہوتی ہے۔ انسان بے بسی، مجبوری، [illegible] سرگشتہ، پریشان اور [illegible] قوتوں کے آگے سر نیاز خم کرتا ہے اور ان قوتوں کو اپنے سنگیت سے
رجھاتا ہے جو اس کی خوشحالی، ثروت اور مسرت کی ضامن ہیں۔ مشہور دیوی [illegible] میں [illegible] انگریزی میں ([illegible])
کہتے ہیں [illegible] منسوب ہیں کہ وہ بیک وقت تخلیق، محبت، بارآوری، زرخیزی اور خوشحالی کی دیوی ہے۔ اس دیوی کے متعلق
بے شمار افسانے موجود ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت نہ صرف اس دیوی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش
کرتی ہے بلکہ خاص طور پر اس دیوتا کو [illegible] اور [illegible] مختلف ناموں اور القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ شنکر
شیو، نٹ راج اور بعض اوقات شنکر کے ساتھ بھی اس کا نام لیتے ہیں۔ مشہور بول ہیں۔

ــ شنکر ہر ہر

شام کے وقت موسیقار اس دیوتا سے جو رقص اور غنا کی علامت ہے۔ امانت کے طالب ہوتے ہیں اور بھوپالی کا وہ مشہور خیال
گاتے ہیں جس کے شروع کے بول ہیں۔

بے [illegible] دیو

[illegible] شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج اصلاً مذہبی ہے اور یہ سنگیت کم و بیش اپنے
ہر روپ میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی [illegible] کے [illegible] آتی ہے۔ جب سنگیت کا گمبھیر خیال اپنے غنائی [illegible] میں ظاہر ہوتا
ہے تو بھی [illegible] مذہبی عقیدت کا عنصر صاف نظر آتا ہے کہ کرشن [illegible] کی علامت [illegible] دیا [illegible]
کی رمز [illegible] ہے۔ چنانچہ [illegible] کی تصویر [illegible] مذہبی [illegible] سنگیت کے ثقافتی مزاج کا تعین کرتی
ہے۔ مثال کے طور پر [illegible] کے مشہور بول ہیں۔

البیلی رے [illegible] وہ ذکر ت کرشن سے [illegible]

البیلی رے [illegible]

[illegible] کے مشہور بول ہیں۔

رس بھری انکھیاں [illegible]

[illegible] کرکے [illegible] رس بھری انکھیاں [illegible]

توجیہہ خیال میں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ موسیقی کا ثقافتی، تمدنی اور معاشرتی مزاج بولوں سے متعین ہوتا ہے اور ہندو
کلاکاروں نے عقیدت و محبت کے جذبے کا اظہار کیا ہے۔

امیر خسرو نے سب سے پہلے اس نکتے کو سمجھا کہ سنگیت کا ثقافتی مزاج بولوں سے بنتا ہے اور سُر بے معصوم ہوتے ہیں اور راگ راگنیوں کے
ہم عصر بے معنی ہیں اور وہ امیر خسرو ہی ہیں جن کو خدا نے ایسی ذہانت و بصیرت عطا فرمائی تھی کہ میں دیگر کا ہمنوا ہو کر (جس نے مہاتما بُدھ کو
سراہا ہے) یہ کہہ سکتا ہوں کہ بصیرت کی اتنی گیرائی اور گہرائی اور کسی شخص میں نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ پرانے راگوں
اور راگنیوں کے لیے نئے بول لکھیں جن میں مسلمانوں کی مذہبی عقیدت کا رنگ جھلکتا ہو اور ایسی تخلیقات پیش کریں جو مدح نعت اور منقبت کی
طرح بیان اثر اور عرفان سے معمور ہوں اسے حسن اتفاق کہیے یا ایک قدرتی معجزہ جو اپنے ماحول کے مطابق وجود میں آیا کہ وہ خواجہ نظام الدین
اولیاءؒ کے مرید تھے۔ نہ صرف مرید بلکہ ان کی عقیدت میں سرشار اور ان کی محبت میں لاچار ——

پہلے تو امیر نے غالباً انھی کی منقبت میں اپنی مشہور چیزیں لکھیں مثلاً بہار میں (امیر خسرو کی ایجاد کردہ مشہور راگنی کا نام ہے)
ان کے یہ بول آج اونچے سے اونچے ہندو کلاکار کی زبان پر ہیں:

حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال
پیش خواجہ تم بن سکھن آئے
حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال

میں نے ہر شب کے میلے میں بڑے اونچے درجے کے ہندو کلاکاروں کو یہ بول گاتے سنا ہے۔ بول چونکہ ہندی میں ہیں اس لیے
کلاکار اپنی طبیعت کے رس اور گداز کو بڑی اچھی طرح ظاہر کر سکتا تھا۔

یہ محفل گھنٹوں جاری رہی اور یہی بول گائے جاتے رہے۔ ہر کلاکار نے اپنی انفرادیت کا جوہر دکھایا اور ایسا سماں باندھ کے دکھلایا
کہ سننے والے گویا عالم وجد میں جھوم رہے تھے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے تو امیر نے یہ نئے بول اپنے پیر کی مدح میں لکھے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان اُنھوں نے
شعوری کوشش کی کہ کلاسیکی سنگیت کے ثقافتی مزاج کو یوں بدل ڈالیں کہ وہ نمایاں طور پر ہندو مت اور اسلامی عقیدت کے کوائف کا
اظہار کرے۔ ان کی مختلف چیزوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بتدریج یہ کام کرنا چاہا تھا کہ پرانے ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت
کو ایک نیا رنگ روپ دیں۔ اس سلسلہ میں پہلے تو اُنھوں نے ایرانی دُھنوں اور ہندوستانی دُھنوں کی مختلف سروں کے امتزاج سے نئی راگنیاں
مرتب کیں اور ان میں زیلف — فرغنا — بہار اور ایمن کلیان بہت مشہور ہیں۔ ایمن کلیان کا کرل یہ کلاکاروں کو ایسا بھایا کہ اُنھوں نے ان
کے لیے بہت سے نئے بول لکھے جو مذہبی عقیدت کے آئینہ دار تھے مثلاً:

آلِ نبیؐ اولادِ علیؓ

اسی طرح بہار راگنی کی چلت خوبصورتی اور اس کے مزاج کی یہ خصوصیت کہ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ کلاکاروں کو بہت بھائی

اور مختلف راگوں کی بندشوں کے لیے بول لکھے گئے شعر ہیں کو بعد۔ بعیدوں کو بعد۔ پھر یہ نہیں بلکہ ہمارا نغمہ کے نام کی خصوصیت کے اعتبار سے کلاکاروں نے ٹھیک رنگ کرکے ادا کیا اور موسم بہار کے متاثر ہو اور اس موقع کے لیے بھی تصویریں بھی بول لکھ لکھیں شعر مشہور بول ہیں۔

علیہ سنگ کرت رنگ رہیں

افسوس ہے کہ امیر خسرو کی شعوری کوششیں پوری طرح بار آور نہ ہو سکیں البتہ ٹھمریوں کے سلسلے میں ہمارے فنکاروں نے اپنی ذہنی پیچ اور جودت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خیال کے گمبیرتا کو فنائی رنگ دیا اور رادھا کرشن کے ناز و نیاز کے نقشوں کی بجائے عام چلنے والوں اور چاہنے والوں کی بے قراریوں اور نازنینوں کی بھی تصویریں کھینچیں۔ جب واجد علی شاہ اودھ کے دربار میں اردو اور موسیقی کے نخیے گئے تو نہ صرف ان کے شہر کے کلاکار میدان میں آئے جنھوں نے انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں کھینچ کر سنگیت سے ثقافتی مزاج کو اور بھی بدل دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا ان کی یہ کوششیں شعوری تھیں یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر خسرو نے راگ اور راگنیوں کے جو بول باندھے ہیں وہ زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ ہم سنگیت میں ایک نیا عنصر ہو کر داخل ہوئے ہیں اور ہمارا منشا یہ ہے کہ کلاسیکی سنگیت کو شعوری طور پر ہم اپنے دائرہ حقیقت سے نکال کر اسلامی تصورات و افکار کے دائرہ میں لے جائیں تاکہ سماع خوانوں کی سنگیت اپنی پرانی زبان ہی بولے لیکن نیا مطلب ادا کرے۔ یہ بات بہت ضروری تھی۔ ہندی کی زبان میں جتنی مٹھاس، لوچ، سوز و گداز ہے کہ اگر بول اردو یا فارسی میں لکھے جاتے تو اس وقت کے کلاکاروں میں نہ مقبول ہوتے نہ عوام الناس تک پہنچتے اور امیر خسرو کی کوششوں کا مطلب بھی فوت ہو جاتا۔

خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی نے اپنی تصنیف "حیات حضرت امیر خسرو" میں صرف اس بات کی تشریح کی ہے کہ خسرو نے ایرانی راگ راگنیوں اور پردوں کو ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت میں کس طرح سمویا بلکہ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو نئے راگ امیر نے ایجاد کیے ہیں ان کی ہیئت ترکیبی اور کوائف کیا ہیں؟ انھوں نے سید آغا صاحب کے حوالے سے بتایا ہے کہ امیر کے نئے راگوں اور تالوں کے کوائف کیا ہیں؟ مثال کے طور پر انھوں نے مجیر۔ ساز گری۔ ایمن۔ زیلف۔ فرغانہ۔ سرپردہ۔ عشاق۔ زنگولہ کے کوائف تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ میں صرف ایک دو مثالیں پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر امیر خسرو کی طرح دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح پرانی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تو آج ہمارے اس گراں پایہ دولت کی شکل مختلف ہوتی اور ہمیں یہ سوچنا نہ پڑتا کہ پرانے راگ اور راگنیوں کے بول کس سے اور کس طرح لکھوائے جائیں کہ وہ ہمارے مذہب، ہماری ثقافت، تمدن، معاشرت، رہن سہن اور طور طریق زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کریں۔

بھیرویں میں امیر نے یہ بول لکھے ہیں:

حضرت نظام الدین اولیاء
پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار ستارے

خسرو پر کرپا ہو براسے انبیاءؑ
پیر مشائخ نور

اس کی آروہی سارے ما پا دھانی سا ہے۔ اس کی امروہی ہے سا نی دھا پا ما گا رے سا۔ یہ راگ کافی ٹھاٹ کا ہے۔ آروہی میں گا ورجت ہے تان کی صورت ایسی ہے کہ طار کے رنگ کا شبہ ہوتا ہے اس میں دھیوت وادی اور گندھار سمادی سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن کو گانا چاہیے۔ استھائی کے بیے اور پورے کو انفت کے لیے دیکھیے کتاب مذکور صفحہ [illegible]

اسی طرح ایمن خالص فارسی راگ ہے۔ اس کا الاپ بہت خوبصورت ہوتا ہے کہ سمپورن ہے۔ آروہی۔ امروہی شدھ ہیں اس لیے گانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس کی خاص تان مارے گا رے سا ہے۔ یہ تان ایمن سے مخصوص ہے اور بہت لطف دیتی ہے۔ اس راگ میں بھی امیر نے بول لکھے ہیں جو یوں شروع ہوتے ہیں:

علی علی علی علی علی
خدا بن کون جگت میں اپنا
نبی کے پیارے حسنؓ حسینؓ کے پتا
زہراؓ کے پتی

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر نے ہمارے سامنے ثقافتی مزاج بدلنے کی ایک ترکیب پیش کر دی ہے لیکن اس ترکیب پر عمل کرنا مشکل کام ہے۔ جو شخص پرانے راگ اور راگنیوں کے لیے نئے بول لکھنا چاہے اس میں ان خصائص کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ سنگیت ودیا میں کم و بیش پنڈت کا رتبہ رکھتا ہو۔
۲۔ راگ راگنیوں کی مختلف شکلوں اور متبادل سروں کے استعمال سے واقف ہو۔
۳۔ اپنی ثقافت، تمدن اور معاشرت کی نہج اس کے امکانات اور اس کے رخ سے واقف ہو۔
۴۔ ہر لفظ کو ایک تنائی اکائی سمجھ کر ایک طرف تو اس کی فصاحت اور روانی سے آگاہ ہو، دوسری طرف موسیقی کے سلسلہ میں اس کی کیفیت سے کما حقہٗ واقف ہو۔
۵۔ تال پر عبور کامل ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک شخص کے کرنے کا نہیں اس لیے ضروری ہے کہ میل جول سے کام کیا جائے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا پہلے برہن گیتوں، ٹھپوں اور دوہوں کو ہاتھ میں لیں جو ستھن ہیں لیکن جن کی بنیاد کلاسیکی سنگیت پر صحیح طریقے سے قائم نہیں ہے۔ بعض علاقائی بولیاں ہماری معاشرت کی بہت اچھی ترجمانی کرتی ہیں ان کو کلاسیکی سنگیت کا روپ دینا چاہیے اور تبدیلی ان میں لطافت خیال اور لطافت حسن پیدا کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ حکومت اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائے گی مگر ہر کام میں حکومت ہی کی طرف دیکھنا ٹھیک نہیں۔ سنگیت کے متوالوں

کرا دیے ہوئے گیلیاں با فیو پائیں۔ ہم نے ماہرین کے بارے جو ہمارے معاشرت کے معاملات میں بھی کسے نہ چاہئیں۔ تحقیقات علمی سے لینا چاہیے۔ مسلمان کالالادوں نے جو نظریات اور خیال لکھے ہیں سب کو یکجا کرلینے چاہئیں (جہاں تک ممکن ہو سکے) مختلف گروہوں کا تجربوں سے ہر طرح مدد لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی باہمی رقابتیں دور کرکے ایک مشترک مقصد ان کے سامنے رکھنا چاہیے۔

وحدت قومی کی تنظیم جو لوگوں کے ذمے ہے۔ انھیں آگے بڑھنا چاہیے اور قوم کو دعوت دے کر یہ کام کرنا چاہیے کہ جو ہمارا ایک ورثہ محفوظ ہے اسے اور ہم اس سے کام لے کر نئے اہل علم پیدا کرنے کی بنیاد رکھ سکیں۔ کوشش، استقلال اور قومی شعور ہی ایسی چیزیں کامیابی کی ضامن ہیں۔

ہماری کلاسیکل موسیقی

شاہد احمد دہلوی

ہماری کلاسیکل موسیقی کی کوئی مکمل تاریخ وجود میں نہیں ہے تاہم ان شاستروں اور کتابوں سے اس سلسلے میں کچھ مدد لی جا سکتی ہے جو دست برد زمانہ سے بچ رہی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم شام وید ہے اور اس کے بعد چند گرنتھ' جن میں سب سے مشہور رتناکر ہے۔ پہلی صدی کی بعد کتابیں اور صدیوں میں جب کمیاب اور نایاب ہو چکی ہیں۔ شاستروں اور گرنتھوں کی موسیقی صدیاں بیتیں کسی پُراسرار طریقے پر گم ہو گئی اور اب زمانے میں کہیں نہیں ہے۔ جو موسیقی آج کل رائج ہے اور جسے عرف عام میں پکا گانا کہا جاتا ہے ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد اس کا ظہور ہوا۔

عرب و ایران کی موسیقی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اور یہاں آ کر مسلمانوں کی تہذیب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح یہ یوں رس بس گھل مل کر یہیں کی چیز ہو گئی۔ ہندوستان کی قدیم موسیقی شلوک اور کبت پڑھنے کے ایک مخصوص لحن پر موقوف تھی۔ فن کی حیثیت اس نے مسلمان فرماں رواؤں کے زیر سایہ اختیار کی۔ مسلمان حکمران موسیقی کے حد درجہ دلدادہ اور نہایت قدردان تھے۔ انھوں نے جنوبی ہند میں اور شمالی ہند میں دونوں جگہ موسیقی کو فروغ دیا اور بعض نے اس حد تک موسیقی سے شیفتگی ظاہر کی کہ پورے پورے شہر ہزاروں فنکاروں سے آباد کیے۔

سندھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کی موسیقی نے قدم جمائے اور سندھی موسیقی نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ جنوبی ہند میں مغربی ساحل سے عرب تاجروں کا صدیوں تک گہرا تعلق رہا۔ یہاں تک کہ اکثر عرب تاجر یہیں آباد ہو گئے اور ان کی نسلیں اب تک وہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جنوبی ہند کی موسیقی کو غور سے سنیے، عربی گانے کی جھلک اس میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ دھیما زیر و بم جو عربی موسیقی میں پایا جاتا ہے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ کرناٹکی موسیقی میں ڈھل گیا ہے۔

آب و ہوا کے فرق سے نغمے کی ساخت میں فرق ضرور آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کی موسیقی جداگانہ خصائص رکھتی ہے۔ ہندوستان تو بجائے خود ایک برِ عظیم ہے جس کے چاروں کھونٹ آب و ہوا کے اعتبار سے الگ الگ خاصیتیں رکھتے ہیں چنانچہ جنوبی ہند کی موسیقی اور شمالی ہند کی موسیقی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرقی ہند کی موسیقی مغربی ہند کی موسیقی سے یکسر جدا ہے۔ لیکن ان سب میں ایک جزو مشترک ہے، اور وہ ہے راگ۔ راگ ہی کی وجہ سے ان سب میں وحدت ہے اور کل ہند موسیقی میں ایک طرح

ـ سرزمین پاک و ہند

کی شان بہت بالا ہو گئی ہے۔ جغرافیائی اور طبعی حالات کی وجہ سے ہر علاقے میں جو ترقی آمیز رہی ہے اس سے تقریباً ہر صوبے کی ایک
مخصوص جداگانہ موسیقی بھی ہے جو کلاسیکی موسیقی یا کل ہند موسیقی سے متاثر ہو معلوم ہوتی ہے علاقے متاثر ہو کر گئے ہیں چنانچہ جو
صوبائی یا مقامی موسیقی کے ڈھنگ کلاسیکی موسیقی کے مستقل اور سکہ بند طریقے یا اسلوب ہو گئے مثلاً پنجاب کا ٹپہ اور پورب کی
ٹھمری اور دادرا۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جیسے جیسے زمانے کی مانگیں پھیلتی گئیں انہیں جو حیثیت حاصل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انہیں
قبولِ عام کی سند مل گئی۔

موجودہ موسیقی کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے ہوئی۔ باہمی اثر و تاثر سے ایک نئی موسیقی نے جنم لیا۔ بعض محققین ہندوستانی عنصر
ہونے ترقی کر کے راگوں کے روپ دھارے ہیں۔ اس فن کو عملی شکل مسلمان بادشاہوں اور مسلمان فنکاروں نے دی ہے۔ موجود
کلاسیکی موسیقی کے جنم داتا حضرت امیر خسرو ہیں جنہوں نے عربی و عجمی راگوں کی مدد و آمیزش سے نئے نئے راگ بنائے۔ ہندی
راگوں میں مسلم ممالک کے راگوں کے پیوند لگائے، گنے نئے اسلوب وضع کیے، بین کو بدل کر ستار بنایا، پکھاوج کو بیچ میں کاٹ کر
دایاں بایاں طبلہ بنایا۔ قوالی کے لیے مردنگ کو بدل کر ڈھولک بنائی، خیال ترنگ بنایا۔ مجلت گرو گوپال نایک کو علاؤالدین خلجی کے
دربار میں نیچا دکھایا۔ عجب جامع الصفات بزرگ گزرے ہیں حضرت امیر خسرو۔ پانچ لاکھ شعر فارسی میں کہے اور طوطیٔ ہند کہلائے
اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا کئی کے وزیر و مشیر رہے۔ موسیقی میں نایک کہلائے۔ صوفیا میں اعلیٰ
مرتبہ پایا۔ فوج میں شریک ہو کر سپہ گری کے جوہر دکھائے۔ ان کا کوئی مثیل آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کے بعد آسمان موسیقی کا
کے درخشندہ ستارے نظام الدین محمد نایک ہیں، دہلی جونپور سلطان حسین شرقی ہیں، دربار اکبری کے رتن میاں تان سین ہیں ان
کے بعد ایک طویل سلسلہ مغل درباروں کے گائیکوں کا ہے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ آتا ہے کہ جسے فنِ موسیقی کا نشاتِ عروج کہا جا
سکتا ہے۔ موسیقی پرست تھے اور بادشاہ "رنگیلے" کہلانے لگتے ہیں۔ ان کے دربار کے دو اُستادوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے
خیال کی گائیکی کو چار چاند لگائے۔ آخری مغل تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر شاعری میں اور موسیقی کی چیزوں میں "شوق رنگ" تخلص کرتے
ان کے دربار کے گائیک تان رس خاں کی اُستادی کو شمالی ہند کے تمام گھرانوں نے تسلیم کیا، یہاں تک کہ پٹیالہ کے علیا فتو (علی بخش اور
فتح علی خاں) نے بھی جو موسیقی کے کرنیل اور جرنیل کہلاتے تھے۔ شاہانِ اودھ میں آخری بادشاہ واجد علی شاہ موسیقی کے سرپرست اور
دلدادہ تھے اور موسیقی کی چیزوں میں "اختر پیا" تخلص کرتے تھے۔ اس صدی میں کرانا پور والے اللہ دیے خاں، جے پور والے
فیاض خاں، کیرانے والے عبدالکریم خاں اور عبدالوحید خاں، پٹیالے والے عاشق علی خاں، لاہور والے بڑے غلام علی خاں، دلی کے
چاند خاں، امراؤ خاں، اور نصیر خاں، اندور والے نصیر الدین خاں ڈاگر اور امیر خاں، دہلی والے رجب علی خاں، رامپور والے
مشتاق حسین خاں، آگرے والے ولایت حسین خاں، امیٹھی والے نثار حسین خاں —— کہاں تک ان کے نام گنائے جائیں؟ ان کی تعداد
سیکڑوں پر نہیں ہزاروں لاکھوں پر ہے۔ چند نام جو اس وقت یاد آئے اور جنہیں میں نے سنا بھی ہے قلم برداشتہ لکھ دیئے۔ بہت
سے اعلیٰ درجے کے گائیکوں کے نام حافظے سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ساز بجانے والوں کی فہرست بھی ان سے کم طویل نہیں ہے
وہ گانے والی عورتیں بھی ہیں جنہوں نے استادی موسیقی میں نام پیدا کیا۔ صرف دو نام بطور نمونہ پیش کرتا ہوں: پٹیالے والی گوکی بائی

جس نے کرشنا جی بنسی کی دھُن تیار کی۔ اور آگرے والی زہرہ بائی جس نے بڑے بڑے گویوں کا پانی اُتار رکھا تھا۔ اس زمانے میں روشن آرا بیگم ہیں جو باطور پر ملکۂ موسیقی کہلانے لگی ہیں۔ یہ سب مسلمان فنکاروں نے موسیقی کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔

مگر یہ کلاسیکی موسیقی یا پکا گانا آخر ہے کیا جسے ہزاروں لاکھوں فنکاروں نے صدیوں کی جد و جہد کے بعد اس درجے تک پہنچایا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب چند الفاظ میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسے بیان کرنے کے لیے ضخیم جلدیں لکھی گئیں ہیں۔ تاہم کوشش کی جائے گی کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی عام فہم تشریح کی جائے۔

موسیقی کی سب سے پہلی اکائی سُر ہے۔ سُر ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ ارتعاشات میں جس قدر کمی ہوگی سُر اُتنا ہی اُترتا چلا جائے گا، اور ارتعاشات میں جس قدر اضافہ ہوگا سُر چڑھتا چلا جائے گا۔ اب اگر ایک سُر کو قائم کرکے اُسے بُنیاد تصوّر کیا جائے اور ارتعاشات میں اضافہ کر دیا جائے تو دُوسرا سُر پیدا ہوگا جو پہلے سُر سے اُونچا ہوگا۔ اس طرح اگر ہم ارتعاشات کو بڑھاتے چلے جائیں تو چڑھتے سُر پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پھر ایک سُر ایسا پیدا ہو جائے گا جو بُنیادی سُر یا قائم کردہ پہلے سُر سے ہم آہنگ ہوگا، اور اس سے آگے بڑھنے پر پھر وُہی تمام سُر دُہرائے جائیں گے جنہیں پہلے سُنا جا چکا ہے۔

پہلے بُنیادی سُر اور بُنیادی سُر سے ہم آہنگ دُوسرے سُر کے درمیان بے شمار سُر ہوتے ہیں اس فصل کو سپتک کہتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک اکائی ہوتی ہے، اور ہمارا سارا گانا بجانا اسی سپتک سے نکلا ہے۔ اس کے انگنت سُروں میں سے ایسے سُر چھانٹ لیے گئے ہیں جنہیں بآسانی سے ایک دُوسرے سے تمیز کر سکتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اگلے ماہروں نے ۲۲ مانی ہے، اور ان کو سُرتیاں یعنی چھوٹے سُر کہا ہے لیکن ان سُرتیوں میں امتیاز کرنے کے لیے بڑی مشق و مزاولت کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایک سپتک میں سات شُدھ سُر پہلے قائم کیے گئے اور ان کے نام کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد رکھے گئے، جنہیں مخفف کرکے سا، رے، گا، ما، پا، دھا اور نی کہا جاتا ہے اور ان کے مجموعے کو "سرگم" ان کے بعد کھرج اور پنچم کو اچل یا قائم سُر قرار دیا گیا۔ پانچ سُروں کا ایک ایک رُوپ اور قائم کیا گیا اس طرح ایک سپتک میں کُل بارہ سُر قائم، تیور (چڑھے) اور کومل (اُترے) اس ترتیب سے ہوئے:

(۱) کھرج۔ قائم (۲) کومل رکھب (۳) تیور رکھب (۴) کومل گندھار (۵) تیور گندھار (۶) کومل مدھم (۷) تیور مدھم (۸) پنچم قائم (۹) کومل دھیوت (۱۰) تیور دھیوت (۱۱) کومل نکھاد اور (۱۲) تیور نکھاد۔

عام رواں اور برتے میں یہی بارہ سُر آتے ہیں اور انہی کی جداگانہ ترتیبوں سے ہزاروں راگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی راگ ہماری کلاسیکی موسیقی اور پکا گانا کہلاتا ہے۔

راگ کا تعلق انسانی نفسیات سے بہت قریب ہے۔ یہ جذبات و احساسات کی موسیقی ہوتی ہے۔ راگوں کے سُر کچھ اس ترکیب و ترتیب سے رکھے جاتے ہیں کہ ان سے سننے والوں میں غم و اندوہ، مسرت و بہجت، خوف و ہراس، مجبوری و دوری وغیرہ کے اثرات پیدا کیے جاتے ہیں۔ موسیقی کا جادو تو جانوروں پر بھی چل جاتا ہے نغمۂ حُدی سُن کر اونٹوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ طبلِ جنگ کی گرج پر گھوڑے نوتیاں دیکر دُشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ سپیرے کی بین پر زہریلا ناگ جھومنے لگتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے، بھلا موسیقی سے کیسے متاثر نہیں ہوگا؟ جالینوس اور اطبائے قدیم نے مختلف نغموں سے مختلف امراض کا علاج تجویز کیا۔ آج کل بھی دماغی امراض کا علاج نغموں۔

کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں مزاج کی کیفیت کے سوال پر [illegible]
راگ کیا ہے؟ ایک مغربی نقاد سے اس کا جواب سنیے:

It is an arrangement of notes producing definite spiritual, psychological and physical effects —As a magical formula, or let us say, a very mathematical and scientific one, the Raga takes hold of the laws of vibration, and applies them, through the art of music, to the growth and developement of the soul. The Raga is not arrived at hap-hazard, but is the expression of a supra-mundane urge in close conformity with divine nature, and this is what give it its magical form, its powers and beauty."

راگ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہی نفسیاتی کیفیات کو قدیم ہند کے پنڈتوں نے رس کے نظریے کی اساس بنایا۔ وہ احساسات جو جذبات کو جنم دیتے ہیں ان کی تعداد ۹ بتائی ہے:

۱۔ رتی (RATI) پیار۔ محبت۔ جنسی مسرت۔
۲۔ ہاسیہ (HASA) ہنسی۔ دل لگی۔ تمسخر۔
۳۔ شوکا (SHOKA) غم۔ اندوہ۔ ترس۔
۴۔ کرودھا (KRODHA) غصہ۔ غیظ و غضب۔
۵۔ اُتساہا (UTSAHA) کوشش۔ محنت۔ استقلال۔ ہمت۔
۶۔ بھےیا (BHAYA) خوف و ہراس۔ وحشت۔
۷۔ جگپسا (JUGPUSA) ناپسندیدگی۔ نفرت۔ حقارت۔
۸۔ وسمایا (VISMAYA) استعجاب۔ حیرت۔
اور ۹۔ شاما (SHAMA) سکون۔ راحت۔ بے کیفی۔ بے حسی۔

ان سے جو نو رس بنتے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ شرنگار ۔ ۲۔ ہاسیا ۔ ۳۔ کرونا ۔ ۴۔ رُودرا ۔ ۵۔ ویرا ۔ ۶۔ بھیانکا ۔ ۷۔ بیبھتسا ۔ ۸۔ ادبھت
اور ۹۔ شانتا

بعض پنڈتوں نے دو رس اور بھی مانے ہیں:

۱۔ واتسلیہ ——— ماتا

۱۱ ۔ ۲۔ جمالیتی ——— عبادت پرستش۔

پھر فن رسوں کی مزید تفصیل میں جانے کا بیان یہاں غیر ضروری ہے۔

فنکار کسی ایک رس کو تمام و کمال پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر مناسب الفاظ کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ مصور رنگوں کی زبان ے بولتا ہے اور موسیقار سُروں سے فضا میں جذبے کی تصویر بناتا ہے۔ شاعر کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس سے دشوار مصور اور بُت سا کام ہے۔ موسیقار کا کام سب سے دشوار ہوتا ہے۔ شاعر اور مصور کے الفاظ اور رنگوں کی طرح موسیقار کے سُر آنکھوں کے سامنے قائم نہیں ہتے۔ سُروں کا قیام لمحاتی ہوتا ہے۔ انھیں آنکھوں سے نہیں کانوں سے دیکھنا ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں نے اسی خصوصیت کو اپنے اس شعر یں پیش کیا ہے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پنڈتوں نے ہر راگ سے ایک داخلی کیفیت کو وابستہ کیا ہے۔ راگوں کی ترتیب انھی سُرتیوں سے ہوتی ہے اور چونکہ ہر مزاجی کیفیت کا ایک رنگ بھی مقرر ہے مثلاً غم کا سیاہ، خوشی کا گلابی، فراق کا زرد، حسد کا سبز اس لیے کیفیات کے ساتھ تخیل میں رنگ بھی بدلتے جاتے ہیں اور گھلتے ملتے ہیں کہ اچھے سننے والوں کے ذہن میں راگ کی ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے اسی سے راگوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں گویا موسیقی کو مصوری میں ڈھالا گیا ہے۔

راگ راگنیوں کے لیے وقت بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسانی مزاج آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی ایک سا نہیں رہتا۔ راگ کا تعلق چونکہ مزاج یا نفسیاتی کیفیت سے ہوتا ہے اس لیے راگ کے لیے بھی وقت کا تعین ضروری ہوا۔ راگ اسی وقت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے جب فنکار اور سامعین کی مزاجی کیفیت ہم آہنگ ہو۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱۔ تڑکے سے دوپہر تک۔ ۲۔ دوپہر سے غروب آفتاب تک۔
۳۔ شام سے آدھی رات تک اور ۴۔ رات ڈھلے سے طلوع آفتاب تک۔

دوپہر سے شام تک کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان عموماً کسل اور تھکن محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس رات ڈھلے سے صبح تک کے وقفے میں طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے۔ راگوں کے سُروں کو اس لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وقت کے مطابق چلتے چلے جائیں۔ سُر تیز بھی ہوتے ہیں اور ملائم بھی۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی جاتی ہے اس وقفے کے راگوں میں تیز سُر کم ہوتے جاتے ہیں اور ملائم سُر بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بھیرویں میں جو صبح کو گائی جاتی ہے پورے سُر ملائم ہو جاتے ہیں۔

علم موسیقی سراپا ایک عملی فن ہے جسے نظریوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے صرف سُروں ہی کا علم دفن نہیں ہے سننے اور تانوں کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ یہاں موسیقی کے اس پہلو کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

صدیوں میں جا کر راگوں کے اصول و قواعد بنے ہیں اور یہ اتنے مکمل ہیں کہ ان سے ذرا سا بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ہر راگ کے سُر مقرر ہیں اور ان کی ادائیگی کا ایک خاص ڈھنگ ہے۔ جب تک مقررہ اصولوں کی پوری پوری پابندی نہ کی جائے، راگ کا روپ

سب کا علم نہیں [illegible] راگ کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ کسی راگ کا مقصد اگر سکون پیدا کرنا ہے تو اس کے ادا کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس راگ کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں سے پوری طرح واقف ہو اور اس کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتا ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سننے والوں میں بھی سکون پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ سعادت بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوتی ہے اور ہر فن میں اچھے فن کار کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ اچھے فن کار وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے عطیۂ خداوندی کی اس طرح قدر کی ہے کہ آٹھوں پہر عبادت کی طرح اس میں ساری عمر جٹے رہے ہیں اور اس علم کو ایسا سوچا سمجھا کہ انہیں اس کا عرفان حاصل ہو گیا۔ اسی عرفان اور اسی قدرت کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ عجب نہیں اگلی روایتیں صحیح واقعات ہی ہوں اور ان کا حکم آب، آتش، باد، خاک پر بھی چلتا ہو۔

فن کے انتہائی انحطاط کے بعد بھی راگوں میں تاثیریں تو اب بھی باقی ہیں، حالانکہ خاص فن کی طرف نہ تو کسی کی توجہ ہے اور نہ فن کار کی کی پرسش۔ راگوں کا علم ایک نہایت دشوار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے واسطے بڑی جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے برتنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے، اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر ختم ہو جاتی ہے اور فن کار فن پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔

موسیقی کو سننے اور سمجھنے کے لیے ایک خاص ذوق بنانا پڑتا ہے اور اپنے اندر ایک مخصوص صلاحیت اور قابلیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ اصول کچھ موسیقی ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ جو فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص درجے کی بصیرت درکار ہوتی ہے، اور موسیقی میں اس کی احتیاج اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دوسرے فنون لطیفہ کی طرح ہمیں دیکھنے اور اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

فن اور فن کاروں کی ناقدری اور سننے والوں کی سہل پسندی کے ہاتھوں راگوں کی شکلیں مسخ ہو گئی ہیں، اس لیے اب راگوں میں وہ اگلی سی تاثیر کہاں؟ اگلے وقتوں میں فنکاروں کو ہر طرح کی فراغت حاصل تھی اور کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ ایسی ہی قدردانیاں بھی تھیں کہ موتیوں سے منہ بھر دیے جاتے تھے اور جاگیریں انعام میں دی جاتی تھیں۔ کیا تعجب کہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد فنکاروں نے اس درجہ کمال حاصل کر لیا ہو کہ راگ کی تاثیر سے انہونی باتیں ہونے لگی ہوں۔ قوت ارادی کی کرشمہ سازیاں کس نے نہیں دیکھیں؟ فنکار بھی کسی راگ کے ذریعے ایک جذبے یا ملے جلے جذبوں مثلاً غصہ اور نفرت یا خوشی اور ہنسی وغیرہ کی تصویریں سروں سے بناتا ہے۔ خود اس کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر کے نقل افکار کے ذریعے سننے والوں میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ جذبات یوں بھی متعدی ہوتے ہیں۔ کسی کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسی آ جاتی ہے، اور غم زدہ انسان کو دیکھ کر رونا آ جاتا ہے۔ بس جس طرح کہ

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اسی طرح اگر واقعی جذبہ صادق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اس سے متاثر نہ ہوں۔ زمانۂ حال کے ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ فضا میں سروں کے زیر و بم سے تموج پیدا ہوتا ہے اور کچھ ایسی برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے آلے بن جائیں یا بن چکے ہوں جن کے ذریعے ان برقی لہروں کی قوت کو ناپا جا سکے۔ دوسری ناممکن نظر آنے والی باتوں کی طرح ممکن ہے کہ سائنس اس بات کو بھی ممکن کر دکھائے۔ آج کل موسیقی کے وہ اعجاز دکھائی نہیں دیتے جن کا ذکر کتابوں اور روایتوں میں ہوتا ہے تو کیا اگر

ابیریں اُڑ گئی ہیں، راگ تو موجود ہیں لیکن ان سے اثر آفرینی کرنا ہمارے فنکاروں کا کام ہے۔ فنکاروں میں اتنی صلاحیت ہی اب نہیں کہ راگوں سے اثرات مرتب کر سکیں۔ پندرہ سترہ اٹھارہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ سردار پٹیل عارضہ قلب میں مبتلا تھے تو انھیں ان کے معالج نے مشورہ دیا کہ کسی اعلیٰ درجے کے فنکار سے نرم و نازک موسیقی سنیں۔ سردار پٹیل اس زمانے میں نشریات کے بھی وزیر تھے۔ انھوں نے ریڈیو والوں سے کہا اور ریڈیو والوں نے سارنگی کے جادوگر استاد بندو خاں کو بھیج دیا۔ خاں صاحب گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ ان کی کوٹھی پر جاتے اور انھیں طرح طرح کے سکون بخش راگ سناتے۔ اللہ کی شان کہ سردار کو دل کے دورے پڑنے ملتوی ہو گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد استاد کو بڑی بڑی رقمیں ریڈیو سے دلوانے کا لالچ دے کر دلی میں روک لیا گیا مگر جیسے ہی استاد کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملا استاد چپکے سے نکل آئے اور کچھ عرصے بعد سنا کہ سردار پٹیل ہارٹ اٹیک میں چل بسے۔ اور یہ تو خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک صاحب اپنے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر آئے اور بولے کہ انھیں مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی نے کبھی ان سے کہا تھا کہ اسے گانا سکھواؤ تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ لہٰذا ہم نے اس لڑکے کو گانا سکھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا۔ جب تک یہ لڑکا سیکھتا اور گاتا رہا اسے دورہ نہیں پڑا۔ پھر بعض وجوہ سے اس نے گانا چھوڑ دیا تو اسے دورے پڑنے لگے۔ اس نے پھر گانا شروع کر دیا، دورے ملتوی ہو گئے جو پھر شروع ہو گئے۔ اب تک یہی تواتر کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

فن اور فنکاروں کے تنزل کے اسباب پر بھی ہمیں دھیان دینا چاہیے۔

اوّل قدیم راگوں کی صداقت مشتبہ ہو گئی کیونکہ متون اور گھرانوں میں اختلاف ہو گیا اور ہر ایک کو اپنی روایت کی صحت پر اصرار ہے۔ ہم نے ایک ہی راگ کو تین سے چار طرح سے سنا ہے۔ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ صحیح کون ہے اور غلط کون؟ دوسرے فنکاروں کی ناقدری نے اُن کو فن کی صحیح تحصیل سے محروم کر دیا۔ تیسرے پیٹ پالنے کے تفکرات اور غم دوراں کی کشاکش سے انھیں اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ فن کو اعلیٰ پیمانے پر پہنچائیں۔ چوتھے جہالت کی وجہ سے فن کی علمی شان ختم ہوتی چلی گئی۔ پانچویں قدامت پرستی نے فن کو جامد کر دیا جس کی وجہ سے ترقی تو یکسر موقوف ہو گئی اور فن گھٹتے گھٹتے تنزل کی آخری حد میں پہنچ گیا۔ چھٹے اس فن کو ہر دلعزیز بنانے اور عام کرنے کے بجائے اسے میراث بنا کر محدود کر دیا اور راگ کے بتانے میں اتنے بخل سے کام لیا گیا کہ بعض صورتوں میں شاگردوں کا ذکر ہی کیا باپ نے بیٹے کو بھی فن کے گُر نہیں بتائے اور جب اس فن کو سمجھنے والے ہی نہ رہے تو اس کی قدر کون کرتا؟ پیشہ ور فن کاروں نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری نتیجہ یہ کہ فن مٹتا چلا گیا اور بہت کچھ ان ہی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ ساتویں ہمارے فن کاروں نے راگوں کی روح کو تو چھوڑ دیا اور صرف ہیئت کی تکمیل پر قناعت کر لی جس کی وجہ سے راگ کا رس غارت ہو گیا۔ آٹھویں فنکاروں کی جہالت کے باعث معاشرے میں فنکاروں کو پست ترین درجہ دے دیا گیا اور انھیں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ یہاں تک انھیں گرا ہوا پایا گیا کہ ان کا شمار کمینوں میں ہونے لگا اور ان کے ساتھ چھوت چھات کیا جانے لگا۔ نویں افلاس کی وجہ سے خصلت میں جو برائیاں بالعموم در آتی ہیں وہ سب ان فنکاروں میں جگہ پا گئیں اور فنکاروں نے زر پرستی شروع کر دی اور پیسے کے لالچ میں ہر طرح کی پست مذاق کر اپنے قدر دانوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند کی موسیقی کو اپنا شعار بنا لیا اور ہر شکل کی موسیقی میں ایسے ایسے اضافے کیے جن سے راگ مسخ ہو گئے۔ فن کی جگہ بازاری پن نے لے لی اور ہماری موسیقی کا وہ سب کچھ لغویات کا ایک پشتارہ بن گئی۔ اس کی روحانیت ختم ہو گئی اور اس میں شہوانیت نے جگہ پا لی۔ دسویں حکومت نے دیس کے سنگیت کی سرپرستی نہیں کی اور اس علم کی تعلیم و تعلم سے ادارے

تم نہیں کیے اور ہم نے اس فن کی بقا و ترقی کے لیے کچھ کیا۔ لہٰذا اس کا بتدریج ختم ہونا ہی تھا۔

ہم تمام وجوہ کی بنا پر ہندو موسیقی کا علم و فن پست سے پست ہوتا چلا گیا۔ وہ روحانیت اور وہ تاثیر جس کے لیے ہماری موسیقی کسی زمانے میں مشہور تھی باقی رہ جانی ممکن نہ تھی۔ تذکروں میں کتابوں میں ملتے ہیں کہ دیپک گانے سے آگ لگ جاتی تھی اور میگھ ملہار سے مینہ برسنے لگتا تھا۔ آج کل ان روایات کی حیثیت کہانیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جس زمانے میں فنکار موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور فن کو حاصل کرنے کے لیے ایسی ریاضت کیا کرتے تھے تو کیا عجب کہ ان کو خصوصی روحانیت کے باعث ایسے اعجاز کو ظہور میں لاتے ہوں۔ آخر صوفیائے کرام نے موسیقی کو (قوالی بھی موسیقی میں شامل ہے) تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اگر ہمارے فنکار بھی اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیتے تو آج ان کی یہ درگت نہ ہوتی۔ اور فن کا بھی بول بالا ہوتا۔

فن اور فنکار کے اس درجہ برباد ہو جانے پر بھی بہت سے راگ ایسے ہیں جن کی تاثیر اب بھی باقی ہیں۔ اور اگر ماہرینِ موسیقی چاہیں اور سائنٹیفک مشاہدہ کرنے کی کوشش کریں تو عین ممکن ہو کوئی تعجب نہیں کہ موسیقی کی ناقابلِ یقین روایات کی صحت حیرت انگیز انکشاف ہو جائے اور سنسنی خیز کہانیاں اسی طرح سچی حقیقتیں ثابت ہو جائیں جیسے ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے سنسنی خیز نظریے آج ہماری روزمرہ کی زندگی کی مسلمہ حقیقتیں ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کے اس عظیم ورثے کو مٹ جانے سے بچانے کے لیے تعلیم یافتہ حضرات کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو بھی اس کی سرپرستی پر مائل ہونا چاہیے اور آرٹس کونسل اور میوزک کونسل جیسے سرکاری امداد پانے والے اداروں کو اس علم و فن کی بقا و ترقی کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کیونکہ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کلاسیکل موسیقی سے ہمسری

سجاد سرور نیازی

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

مجھے آپ کی خدمت میں اس امر کی وضاحت کرنی ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جنھوں نے ہماری کلاسیکی موسیقی کو فنکار اور
ترقی اور ترویج کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ اس کے لیے ہمیں اس فن کی تاریخ کے کچھ پرانے ورق اُلٹنے پڑیں گے۔ یہ تو سب
ہے کہ صدیوں پہلے کلاسیکی موسیقی کی بنیاد یں عوامی دُھنوں پر رکھی گئی تھیں۔ عوامی دُھنیں عوام کے دلوں سے اُبھریں اور ان
سے سادہ نغموں کی صورت میں پیدا ہوئیں۔ انسان تجربے اور اجتہاد سے زیادہ عقلمند ہوتا گیا اور فنونِ لطیفہ جو انسان کی
طبع کا نتیجہ تھے انسانوں کی عقل و بصیرت کے ساتھ ترقی کرتے گئے۔ شہری پیشہ ور اور شوقین موسیقاروں نے دیہاتی دُھنوں
خوش قطع صورتیں تعمیر کیں۔ آواز اور نغمے کے قواعد مرتب کیے اور کلاسیکی موسیقی کی بنیاد رکھ دی۔ دیہاتیوں کی رُوح اور جذبات
دینے کے لیے دیہاتی دُھنیں کافی تھیں۔ گو عوامی گیت زمانے کے ساتھ شکل و صورت بدلتے رہے لیکن بنیادی طور پر وہ
بیت ہی رہے ان میں ان کی خصوصی خوبیاں بدستور قائم رہیں لیکن شہری موسیقاروں کی ضروریات عوامی دُھنوں سے پوری نہ ہو
۔ اُنھوں نے اپنے وقت کے تقاضے کے مطابق عوامی دُھنوں کے نقش پر موسیقی کے مختلف اسلوب تیار کیے اور سامعین
کے سُننے اور پسند کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ مذہبی جنگی رُومانی اور دیومالائی بولوں کو مختلف راگوں میں پیش کر کے ایک کثیر تعداد
کی پیدا کرلی۔ الاپ دھرپد، ہوری، ترانہ، ٹپہ اور خیال آگے پیچھے معرضِ وجود میں آئے اور خوب مقبول ہوئے جس کی
وجہ یہ بھی کہ ان وقتوں کی سوسائٹی کو دیکھ کر اس موسیقی کو تیار کیا گیا تھا۔ فن اور سوسائٹی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے
سوسائٹی کی وجہ سے شبیت نے یہ صورتیں اختیار کیں اور ان صورتوں نے سوسائٹی کو اپنے رنگ میں رنگا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک نہایت
اور طمانیت بخش فن پرورش پا گیا۔

دیہاتی عوامی گیتوں اور ساگوں سے جی بہلاتے رہے۔ شہری دھرپد اور خیال سے من للچاتے رہے۔ بادشاہوں، مہاراجوں
نے گویوں کو ملازم رکھا۔ جہاں مال و دولت، فوجیں اور سامان ضروری تھا وہاں ثقافتی میدان میں بھی ایک دُوسرے سے
بازی لے جانا شاہانہ طمطراق اور شان و شکوہ کے لیے لازمی تھا۔ نامی گرامی اور قابل شاعروں، مصوروں اور موسیقاروں کو دربار کی زینت
رقیب ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے گانے کے نئے اسلوب پیدا کرنے کی دُھن میں لگ گئے اور مشکل تانیں
اختراع کرنا شروع کر دیں۔ اُنھوں نے جان توڑ کر اپنے فن میں خوبیاں اور دلکشیاں ڈالیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ قدردان بادشاہ
محنت کے ہر طرح طرح کی نوازشوں اور جاگیروں سے مالا مال کر دیتے۔

اب اودھ کے تاجداروں کا زمانہ آیا۔ واجد علی شاہ نے ٹھمری کو التفات کی نظروں سے دیکھا۔ طوائفوں کے کوٹھوں سے ٹھمری
دادرے اور رسیلے لوگوں کے دلوں اور مذاق پر اثر انداز ہونے لگے۔ کلاسیکی موسیقی خاصی ٹھنڈی پڑ گئی۔ ناٹک اور اوپیرا کے
زمانے میں اندر سبھا کا تجربہ کامیاب ہوا تو تھیٹروں نے بھی سر نکالا۔ پارسیوں نے سیکڑوں ناٹک لکھوائے۔ ہارمونیم ماسٹروں نے اس
زمانے کے میوزک ڈائرکٹروں کی جماعت وجود میں آئی اور کمپوزڈ میوزک کی داغ بیل پڑی۔ میوزک ڈائرکٹر ناٹک کی طرزیں بنانے لگے۔
طرزیں جو کہ ناٹک کے کرداروں سے گوائی جاتی تھیں اس لیے ان کو عموماً آسان اور ہلکی پھلکی موسیقی میں تیار کیا جاتا تھا۔ اور اس کے سننے
میں یہ طرزیں لوگوں کو بہت بھائیں اور ان میں سے کئی ایک زبان زد عام ہو گئیں۔ اتنے میں گراموفون کمپنی کا زمانہ آ گیا۔ چونکہ یہ کمرشل ادارہ
تھا، کمپنیوں نے شہروں میں ریکارڈنگ کے روم کھول کر معیار کا خیال بالکل نہ رکھتے ہوئے ہر وہ گانا ریکارڈ کر ڈالا جو بک سکتا تھا
شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ کمپنی نے اپنی گراموفون مشینیں بیچیں۔ کلاسیکی موسیقی کے چیدہ چیدہ اور مستند گویوں کے ریکارڈ
بیچے موسیقی کی باقی صنفوں میں کسی ایک کو بھی حصول منفعت کی خاطر ریکارڈ کرنے سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ عامیانہ سطح کی سیٹھنیاں
مبتذل گانے جو رسیلوں سے بھی باز نہ رہے گئے تھے ریکارڈ کر ڈالے۔ بھجنوں اور قوالیوں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ آپ خود خیال فرمائیں
جب لوگوں کو آسان فہم اور ان کے مذاق کے مطابق گانے سستے داموں مہیا ہونے لگیں تو کلاسیکی موسیقی ان کو رفتہ رفتہ کیوں نہ گراں
گزرنے لگے اور ایسا ہی ہوا۔

اب کلاسیکی موسیقی کے پرستاروں اور گویوں کو اور ان میں بالخصوص ہندوؤں کو جو راگ ودیا کو مذہب کا ایک ضروری انگ
سمجھتے تھے بڑا خطرہ لاحق ہوا۔ گھر گھر خدشات کا اظہار ہونے لگا۔ کانفرنسیں بلائی گئیں۔ گندھروا مہاودیالے میوزک سکول اور
کھولے گئے غرض راگ ودیا کا سبھاؤں جلسوں اور میلوں میں زور شور سے پرچار کیا گیا۔

جو بہت اچھے اور نامی گائک تھے ان کے سننے والے تو پھر بھی کئی تھے جیسی بھدی آواز والے مصنوعی قسم
گویوں کو سننے پر ناٹک دیکھنے یا گراموفون ریکارڈ سننے کو ترجیح دی جانے لگی۔

اندریں حالات کلاسیکی موسیقی کی ساکھ کو بچانے کی کوششیں شد و مد سے جاری تھیں کہ متکلم فلموں کا زمانہ آ گیا۔
کے لیے یہ ایک نہایت دلآویز اور نیا مشغلہ تھا۔ فلموں میں درجنوں گانے رکھے جاتے اور سینما گھروں پر تماشائیوں کی وہ بھیڑ لگتی
کہ ٹکٹ دستیاب ہونا دشوار ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ دیسی متکلم فلموں نے شائقین کی ایک بہت بڑی جماعت کو کلاسیکی موسیقی کے
سے نکال کر اپنی طرف راغب کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور غضب ہوا کہ مغربی فلمیں بھی اپنی موسیقی اور رقص لے کر
سے پیش ہونے لگیں کہ متمول اور متوسط گھرانوں کے بے شمار نوجوان مغربی موسیقی سے متاثر ہونے لگے۔ وہ کان جو دھرپد
اور ٹھمری کی نغمہ سرائی کے لیے وقف تھے۔ جینز کی تال اور مغربی موسیقی سن کر خوش ہونے لگے۔ نئی پود راگ ودیا
نفرت کرنے لگی۔

عوام اگرچہ اس میں شہری حصہ نہیں لیتے لیکن جب سے انہیں مغرب کے استادوں سے معلوم ہوا ہے کہ کسی
ثقافتی سرگرمیوں میں عوامی موسیقی اور رقص کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے تو کلچرل شوز میں اپنی ثقافتی فوقیت اور ودیا

کے لیے ہیرا نچا، مستی پیچوں جیسے فرسودہ بیلے اور دیہاتی ناچوں کی نقل کرکے دیہاتیوں کی عزت افزائی کرتے رہے۔ اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ رقصوں کا شمار کلاسیکی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جن میں بھارت ناٹیم کتھا کلی، منی پوری، کتھک ناچ مشہور اور مقبول ہیں ان میں مسلمانوں نے کتھک کو زیادہ عروج دیا لیکن یہ ناچ اب طوائفوں نے اپنا لیا ہے۔ بیشتر گھرانوں میں رقص و سرود کا شمار خرافات میں ہے اور شرفا اپنی اولاد کو اس کے کسب یا اکتساب سے منع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیسی ناچ کے لیے طبلہ سارنگی وغیرہ کی سنگت لازمی ہے۔ لیکن راک اینڈ رول، ٹوسٹ، یا بال روم ڈانس کے لیے مغرب نے بے شمار ریکارڈ تیار کیے ہیں جن کو بجا کر ان کی لے کے ساتھ ہمارا نوجوان طبقہ ناچنے کی حسرت پوری کر لیتا ہے۔ گویا یہ ایک اور وجہ ہے ہمارے نوجوانوں کے مغربی موسیقی سے لگاؤ کی۔ انسان کی توجہ کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف لگن زیادہ ہو جائے تو دوسری طرف سے میلان کم ہو جاتا ہے۔

دیسی کلاسیکی موسیقی کو حاصل کرنے اور اس پر قادر ہونے کے لیے تو ایک عمر چاہیے لیکن انسان اس سے کما حقہ لطف اندوز اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اس کی تکنیک سے واقفیت ہو۔ یہ درجہ پانے کے لیے بھی کافی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو راگ رنگ کو کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر فضول اور مخرب اخلاق سمجھتے ہوئے اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلوانا گوارا نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے بچوں کے آوارہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ان قدغنوں کے ہوتے ہوئے ایک قوم کس طرح موسیقی میں مناسب دلچسپی لے سکتی ہے۔ چہ جائیکہ اپنے آپ کو کلاسیکی موسیقی کا دلدادہ بنا سکے۔ اور فرض کیجیے کہ کچھ لوگ کلاسیکی موسیقی کے رسیا کسی نہ کسی طرح بن بھی گئے تو موجودہ دور میں ان کے پاس وقت کہاں کہ کسی گانے والے یا اس کی ولمبت اور درت لیکاری اور تان پلٹوں کا ورد گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھ کر کریں یا سن کر لطف اندوز ہو سکیں ہاں کبھی کبھار جب موسیقی کی خاص مجلس ہو اور اس میں گراں پایہ گائیک اور بجائیک اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہوں یا نامور رقاص اپنے شاہکار پیش کر رہے ہوں تو کئی شائقین گھنٹوں ایسے خوشگوار لمحے خوشی سے گزار دیں۔ لیکن یہ تو کبھی کبھار کی بات ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے طلبے پر اب کئی ([illegible]) ایسی پیدا ہو چکی ہیں جن پر وقت بھی تھوڑا صرف ہوتا ہے اور آدمی اس سے پوری طرح متمتع بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص مجلسوں کو چھوڑ کر عام موقعوں پر گویا مشکل تانوں پلٹوں سے بھرپور لمبا خیال گائے گا تو سننے والوں میں بے چینی اور اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ دوبارہ ایسی مجلس میں بیٹھنے سے گریز کریں گے۔

اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان اور اس محکمے کے دیگر اصحاب اقتدار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ریڈیو پاکستان ہر نام نہاد کلاسیکی موسیقار کو پروگرام دے کر ان کی معاشی زندگی کو سہارا دینے کا نیک کام کر رہا ہے لیکن ہر وہ گویا جو جمالیاتی ذہنی اور فنی لحاظ سے گانے کو نہیں نباہ سکتا۔ سننے والوں کو کلاسیکی موسیقی سے متنفر کر دیتا ہے۔ جس کا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ ریڈیو کی سوئی کلاسیکی موسیقی کے پروگرام سے ہٹ کر فلمی نشریات کی طرف گھوم جاتی ہے۔

ایک بھاری بھرکم یا عمر رسیدہ ضعیف موسیقار جس کے گلے میں صحیح سُر لگانے یا تان پلٹے کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی طاقت نہ ہو، ریڈیو پر گا کر کلاسیکی موسیقی کی ترویج یا قدر شناسی کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ریڈیو پر صرف بہترین گانے والے

گا جن کو بہت خوبصورت طریقے سے گانے کی قدر ہو۔ جگہ جگہ یہ سب گانے کے قابل نہیں سب ہے یا ان کا گانا نشر کرنے سے سُننے والوں کی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں ان کی مالی امداد کرنی اگر بہت ضروری ہو تو ان کے لیے کوئی اور مناسب انتظام کیا جائے کلاسیکی موسیقی کو ریڈیو پر زیادہ وقت دے کر اور ہر کس و ناکس گویے کو نادر ہ کے لیے بھرتی کرنے کے متعلق ہو جانا اس سے کلاسیکی موسیقی کی توقیر یا اس کی جاذبیت میں اضافہ ہو جائے گا میری رائے میں کوئی تسلی بخش اقدام نہیں۔ اچھے گانے والے بھی کسی پلین (PLAN) کے تحت گانے نشر کریں۔ گراں پایہ گویوں کی قابلیت کے ہم معترف ہیں اور ان کی دل سے عزت کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر گراں بہا فن کے مالک ہونے کے باوجود اس کو کامیابی سے سُننے والوں کے سامنے موثر طریقے سے پیش نہیں کر سکتے اس کام میں شو مین شپ (SHOW MAN SHIP) اور سیلز مین شپ (SALES MAN SHIP) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی نشریات کو کوئی صاحب نظر و فن پیش کرے نشر کیے والے راگ ان کی ہوبون کی شانِ نزول، گانے والے کی ترجمت اور گائیکی کا انداز نسے کے آثار چڑھاؤ، جلے کے ٹھیکے اور بول وغیرہ، گانے کو سامعین سے متعارف کرواتے وقت بتائے جائیں۔ مگر اس کام کو پیشہ ور اناؤنسروں پر نہ چھوڑا جائے جن کا کام صرف لکھی ہوئی اناؤنسمنٹ کو پڑھ دینا ہے۔

سب سے آخر میں چاہتا ہوں اس مدِمقابل کا ذکر کروں گا جس نے کلاسیکی موسیقی کے ساتھ سب سے زیادہ مقابلہ کیا ہے اور اس کی ہر دلعزیزی میں کافی کمی پیدا کر دی ہے۔ میرا اشارہ فلمی موسیقی کی طرف ہے۔ یوں تو اس پر دفتر لکھے جا سکتے ہیں لیکن میں مختصراً فلمی موسیقی کی دو قسموں کا ذکر کروں گا۔

پہلی قسم جو بہت زیادہ مقدار میں کمپوز کی گئی ہے۔ اس کو کوئی خاص نام نہیں دیا جا سکتا۔ آپ اسے بازاری فلمی موسیقی کہہ لیجیے۔ اس کے کمپوز کرنے والے بے شمار ہیں۔ کوئی بھی معمولی درجے کا ساز بجانے والا بہت قلیل معاوضے پر فلمیں بنانے والے کے ہاں ملازم ہو جاتا ہے۔ ایسا پروڈیوسر کہانی بھی سستے داموں خریدتا ہے یا کم تعلیم کے باوجود خود کہانی لکھتا ہے گانے بھی کوڑیوں کے دام لکھواتا ہے جس کے بول بہت کمزور اور ناقص ہوتے ہیں۔ سینسر ہوتے وقت ابتذال کے الزام سے بال بال بچتے ہیں۔ ایسی موسیقی کو خوش ذوق لوگ تو کبھی پسند نہیں کرتے لیکن اس کا عوام کے دلوں اور ذہنوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس قسم کے گانے کو سُننے والے کلاسیکی موسیقی کی طرف کبھی راغب نہیں ہو سکتے۔

دوسری قسم اعلیٰ درجے کی فلمی موسیقی ہے۔ یہ موسیقی ہمارے ملک کے قابل اور ہونہار کمپوزر تیار کرتے ہیں۔ چونکہ ان موسیقاروں کو موسیقی کے ہر شعبے سے مکمل واقفیت ہوتی ہے اور خود صاحب ذوق اور صاحب دل ہوتے ہیں اس لیے ان کی تیار کردہ موسیقی پُرکشش ہوتی ہے۔ یہ لوگ نت آئے دن نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی موسیقی ایک طرف ہماری کلاسیکی موسیقی کی مرہونِ منت ہوتی ہے تو دوسری طرف ہماری عوامی موسیقی کی دلآویزیوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہ لوگ بعض اوقات مشرقی اور مغربی پاکستان کی موسیقی کے خصوصی رنگ کو آپس میں بڑی خوبصورتی سے ملاتے ہیں۔ ان لوگوں نے دُنیا کے دیگر ممالک کی موسیقی سے بھی اقتباس کیا ہے اور جہاں جہاں خوبصورتی نظر آئی ہے اسے اپنا لیا ہے۔ یہ لوگ گویا ہماری موجود

آئندہ کی پُر وقار ہلکی پھلکی موسیقی پیدا کر رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ اس موسیقی کو میں اچھی موسیقی میں شمار کرتا ہوں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ بسا اوقات اس موسیقی نے سیکی موسیقی کا رنگ پھیکا کر دیا ہے۔ چونکہ میں کلاسیکی موسیقی کا بذاتِ خود بہت مداح ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں میں نے ملک کے کلاسیکی موسیقاروں سے گزارش کروں گا کہ وہ ان خطرات کو جن سے میں نے اُن کو آگاہ کیا ہے مدنظر رکھتے ہوئے اپنی موسیقی کے انگ اور ڈھنگ میں نئی اور خوش آئند تبدیلیاں پیدا کریں۔ پرانی روش سے بھی سامعین کا دل خوش رہی اور ان کو اپنا گرویدہ بنائے رکھیں۔

امیر خسرو اور اصنافِ موسیقی

مسعود پرویز

اس مقالے میں امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت کے صرف اس فنی کمال کو اجاگر کرنا مقصود ہے جس کا تعلق اصناف موسیقی سے ہے۔ امیر کے ایجاد کردہ راگوں، تالوں اور سازوں پر بحث و تمحیص اس مقالے کا موضوع نہیں۔ اس سلسلے میں جو مواد ہماری رہنمائی کر سکتا ہے وہ یا تو خود ان کی اپنی تصانیف ہیں یا تاریخی تذکرے اور شعیت جو وقتاً فوقتاً مرتب ہوتے رہے۔ یا پھر وہ روایات ہیں جو موسیقاروں میں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر نے ۹۹ کتابیں تصنیف کیں۔ امین رازی ہفت اقلیم میں ان کی تعداد ۹۹ بتلاتے ہیں لیکن ان میں سے آج بیس سے زیادہ کا سراغ نہیں ملتا۔ دولت شاہ کے مطابق امیر نے ایک رسالہ فن موسیقی پر بھی لکھا (شعر العجم ص ۱۴۲) اور وحید مرزا اپنی فاضلانہ کتاب "لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو" میں لکھتے ہیں:

"بظاہر اس موضوع پر اگر شاعر نے کچھ لکھا بھی ہو تو وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی (ترجمہ ص ۱۴۶)

اس کے ثبوت میں وحید مرزا امیر کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

نظم را کردم سہ دفتر ور بہ تحریر آمدے
علم موسیقی سہ دیگر بود ار باور بود

حیرت ہے کہ نقی محمد خان خورجوی اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں اسی شعر سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"گویا موسیقی کا بیش بہا ذخیرہ انہی کی زندگی میں ضائع ہوگیا تھا" (ص ۱۹)

اور شاہد احمد دہلوی اسی کتاب کے ذیلی صفحہ پر لکھتے ہیں:

"خود امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے جو تلف ہوگئے۔"

اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"میری شاعری کے تین دفتر ہوگئے اور اگر میں تحریر کرتا تو یقین کرو علم موسیقی کے بھی تین دفتر ہو جاتے۔"

یہ شعر امیر کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال میں شامل ہے اور اس کے بعد امیر نے فن موسیقی پر کوئی کتاب نہ لکھی کیونکہ ہو سکتا ہے بعد میں لکھی ہو۔ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انہیں ایسی کتاب لکھنے کی خواہش ضرور تھی۔

اب اس بنیاد پر کہ اس تصنیف کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی۔ اعجاز خسروی

ں موسیقی پر ایک باب ہے جس کا عنوان امیر نے یوں باندھا ہے :

" در انشعاب اصول و فروغ موسیقی مصرع ہست این ہمہ حرف نسبت موسیقی "

باب کے سترہ صفحے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ باب الگ رسالے کی صورت میں بھی مروّج رہا اور فنِ موسیقی پر جس رسالے کی طرف تذکرہ ۔دوں نے اشارہ کیا ہے وہ یہی ہو۔ وحید مرزا نے اپنی کتاب میں اس باب سے استفادہ کیا ہے لیکن یہ بات نہیں ۔ بظاہر اس میں تصنع زیادہ ہے اور مضمون کم لیکن اس کی ہر سطر موسیقی کی مصطلحات سے بھری ہوئی ہے اور تمام صنائع و بدائع موسیقی کے کسی ی پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایرانی راگوں کے متعلق لکھتے ہیں:

" کہ اصول چرا منحصر بر چہار است و پردہ بر دوازدہ و ابریشم بر شش و مابقی فروعیت کہ ہم

از ینجا شاخ میزند۔" (ص ۲۸۷)

ں قران السعدین میں سات صفحے سازوں اور پردوں کی صفت میں ملتے ہیں (ص ۱۷۷ تا ۱۸۳) موسیقی سے متعلق امیر کی ان یروں کے مستند ترجمے اور قابلِ اعتماد تشریح کے لیے کسی ایسے ماہرِ زبان کی توجہ چاہیے جو ایرانی اور عربی موسیقی کے رموز سے سا ہو۔

اب میں آپ کی توجہ امیر کی بسیار نویسی کے ایسے میدان کی طرف دلاتا ہوں جس کا بظاہر موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ دولت شاہ ے مطابق امیر نے خود اپنی تحریروں میں تصریح کی ہے کہ ان کے ابیات کی تعداد پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہے اور اسی دولت میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے (شعر العجم ص ۱۲۸) لیکن ان کے ہندی ۔دو میں سے گنتی کے چند اشعار پہیلیوں، مکرنیوں، دوہروں اور دو سخنوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ باقی ہندی کلام کیا ہوا؟ ۔ید مرزا کی رائے میں امیر اپنے ہندی کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور امیر کا اس وقت کی کتابی ۔ہ پر کم تر بولی کو ترجیح دینا بھی وحید مرزا کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ وہ :

" ہندی شعر صرف اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے کہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس مقصد کے لیے وہی عام روزمرہ کی زبان موزوں تھی جو اس وقت بولی جاتی تھی۔" (ترجمہ لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۱)

میری رائے میں امیر خسرو کی عظمت متقاضی ہے کہ اس مسئلے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جائے۔ امیر ایک درباری فنکار ضرور تے اور علم و فضل میں یگانۂ روزگار، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عوامی فنکار بھی تھے۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت اس امر کی دلیل ہے ۔کی اور فارسی زبانیں انہیں باپ کی طرف سے ورثے میں ملیں لیکن ہندی (یا ہندوی) لغوی معنوں میں ان کی مادری زبان تھی۔ ا ۔ہ کلام محض ایک محدود مشغلہ یا دل بہلاوا نہ تھا بلکہ ان کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم جزو۔ اس کلام میں وہ ہمہ گیری اور خلوص تھا ۔عوام دوستی فنکار کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے تو اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ امیر کا بیشتر ہندی کلام کیا ہوا۔ اس کلام نے اپنی ہمہ گیر مقبولیت کے باعث لوک گیتوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہ شاعری جو موسیقی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی

دنگی کے اس قدر قریب تھی کہ عوامی ادب اور فن میں جذب ہوگئی۔ کچھ اس طرح جیسے یہ عوام کی اپنی تخلیق ہو۔ گیتوں کے چند
گیت ہیں جن کے مصنف کا نام عوام کو سب کو یاد ہے۔ مثلاً:

"چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے"
یا
"کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے"
یا
"امّاں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا" وغیرہ

ان لوک گیتوں کے علاوہ امیر کی وہ بے شمار بندشیں بھی ہیں جنہوں نے قدیم ہندوستانی موسیقی کی روش تبدیل کر کے رکھ دی
شیت کی روایات میں ایسا عظیم انقلاب برپا کر دیا کہ موسیقی کی تاریخ میں اس دور کو خسروی دور کہنا بجا ہوگا۔ اس دور کی اہ
اندازہ اس بات سے کیجیے کہ بھارت میں امیر خسرو کے نام سے ایک مستقل اکیڈیمی قائم ہو چکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان
تک ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں۔ اسکالر اور اس عظیم فن کار کی تصانیف و اختراعات کے متعلق تدوین و تحقیق کا دروازہ ابھی تک
بند ہے۔

اس مختصر تمہید سے آپ کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ جس فردوس گوش کی تخلیق امیر کے ہاتھوں ہوئی وہ یا تو وقت کے د
میں مستور ہے یا اس کی بازگشت عوامی ادب اور فن میں سنائی دیتی ہے یا ان موسیقاروں کے حلقوں میں جنہیں امیر کی نغماتی اختر
سینہ بسینہ ورثے میں ملیں یا پھر اس کی جھلک امیر کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہیں۔ ان حالات میں اس
پر سیر حاصل بحث ناممکن ہے۔ بقول کسی شاعر کے:

حریم ناز کی خلوت میں دسترس ہے کسے
نظارہ ہائے سر رہگذر کی بات کرو

تو اس مقالے کی حقیقت "نظارہ ہائے سر رہگذر" سے زیادہ نہیں۔

اس فردوس گوش کا پہلا طلسم خانہ الفاظ سے مرتب ہوا۔ امیر کا ذوقِ سخن اس درجہ حساس اور ذوقِ سماع اتنا ہمہ گیر تھا
معنی دونوں میں ملتے ہیں:

ہرچہ درپردہ چہ ساز کنی ساختند
قابلی از بہر سخن ما ساختند

ومنادہ صرف اشارات (   ) کی حیثیت سے خالی معنی کا وسیلہ ہیں لیکن ان کی محض صوتی کیفیت ایک
کے لیے ہمارے نغمہ و حدت کی تکمیل ہے۔ لفظوں کی آواز کا آہنگ ہیں سازوں کے ٹھاٹھ پر گونج رہا ہے:

دلبرا بے دل نشستم بہ تبسم او
کردی دلی او دیکھ او دیکھ او

متعدد ابیات کی صورت میں وضع کر کر سنائی دیں۔

نان کہ خوردی خانہ برد ۔ نان کہ خوردی خانہ برد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد

نان کہ خوردی خانہ برد ۔ زکہ بدست تو کردم خانہ گرد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد

خیال گائکی میں بول بڑھت آپ نے سُنی ہوگی۔ بعض الفاظ میں اس کا بدل بھی سُن لیجیے ۔ ڈھینے سے روئی دُھنکنے کا صوتی
ثر یوں با معنی ہے۔

دپئے جاناں جان ہم رفت ۔ جان ہم رفت ۔ جاں ہم رفت ۔ رفت ۔ رفت ۔ رفت جاں ہم رفت
ایں ہم رفت و آں ہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ ایں ہم رفت ۔ آنہم ۔ اینہم ۔ آنہم ۔ آنہم رفت ۔
رفتن ۔ رفتن ۔ رفتن دہ ۔ دہ ۔ دہ ۔ رفتن دہ ۔ رف ۔ رف ۔ رفتن دہ ۔ رفتن دہ ۔

'آج کل' کے موسیقی نمبر میں ڈاکٹر سید رغیب حسن نے امیر کی ایک رباعی یوں دی ہے

آں روز کہ رُوحِ پاک آدم بہ بدن
گفتند در آئی نشد از ترس بدن
خواندند ملائک بہ لحن داؤد
در تن در تن در آ در آ در تن در تن (اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۸)

اس رباعی کے پہلے مصرع میں غالباً کتابت کی غلطی ہو گئی کیونکہ پہلے دو مصرعوں میں مقابلات کے اعادے سے ایطا واقع ہوتا ہے
ل رباعی مجھے امیر کے کلام میں نہ مل سکی۔ بہر حال میرے موضوع کے اعتبار سے اہم صرف آخری مصرع ہے۔ الفاظ کا طلسم دیکھیے جیسے
... سے پھر گئے۔

جب امیر نے الفاظ کی صوت کو ان کے معانی سے ہم آہنگ کیا تو وہ شاعر تھے اور جب صوتی کیفیت معانی پر حاوی ہو گئی تو وہ موسیقار تھے۔ لیکن ان کی تحریر میں سوائے ایک استثنا کے غالباً ایسا کبھی نہ ہوا کہ معانی صوت پر حاوی ہو گئے ہوں۔ یہ استثنا ان کی تصنیف افضل الفوائد ہے جو فارسی نثر میں لکھی گئی اور امیر کے مرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے اقوال پر مبنی ہے۔ یہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روحانی عقیدت اور تصوف کے قیود نے امیر کے قلم کو ادب اور احتیاط کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس کے برعکس ان کی ... اعجاز خسروی' جو بظاہر نثر لکھنے کے اصول و قواعد مرتب کرنے کی غرض سے رقم کی گئی۔ الفاظ کے معنوی گورکھ دھندوں کے ساتھ ... صوتی کیفیات کا بھی بے مثال مرقع ہے۔ تاریخ علائی اور خزائن الفتوح میں بھی ان کی فارسی نثر کا یہی عالم ہے۔ شبلی افسوس کا ... رتے ہیں کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا۔ (شعر العجم ص ۱۴۲) لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نثر کا وسیع میدان ان ... جنت طرازیوں کے لیے ایک تجربہ گاہ تھا جس میں وہ بحیثیت ایک شاعر اور موسیقار کے الفاظ کی معنوی خشکی اور صوتی ریاضی کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صنائع و بدائع کا جوہر تو ان کی شاعری میں موجود ہے لیکن تصنع غائب ہے۔ چنانچہ اس پر شبلی نے خوشی کا اظہار کیا ہے ... یہ نہایت ... ڈر تھا کہ صنائع و بدائع کا جو جال انھوں نے بچھایا اس میں خود بھی نہ پھنس جائیں۔ (شعر العجم ص ۱۹۰) یہاں الفاظ کے صوتی ... ات کا جائزہ مقصود نہیں لیکن اس کی طرف اشارہ ناگزیر تھا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری کی سرحد موسیقی سے جا ملتی ہے۔ اس

موضوعات شروع کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس ضمن میں نظامی کا ایک شعر بھی گوش گزار کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں:

زنقاره آواز آمد برون
که دولت ست دولت گردون دون

یہ نظامی ہی ہیں جن کے خمسے کے جواب میں امیر نے پانچ عظیم الشان مثنویاں لکھیں۔ امیر مثنوی قران السعدین میں لکھتے ہیں:

آنکه به بینم به هنر پیشتر
کوشش آن راه کنم بیشتر
آنچه هنر هست بگیرم اگر
وانچه جز آن نیست بگیرم اندو (ص ۲۳۸)

یہی وہ غیر متعصب اور ہمہ گیر اصول تھا جس میں امیر کی فنی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ اسی اصول کی بنا پر انھوں نے ہندوستانی و ایرانی ادب اور موسیقی کے امتزاج سے سرتال لے کر اور الفاظ کا ایک فلک بوس قصر تعمیر کر ڈالا۔

عام طور سے الفاظ سے مل کر ہم حیرت کدۂ موسیقی میں داخل ہوتے ہیں۔ جس طرح شاعری کی مختلف اصناف ہیں مثلاً غزل، مثنوی، مسدس، رباعی وغیرہ، اسی طرح موسیقی کی بھی مختلف شکلیں ہیں لیکن بعض مروجہ کتابوں میں ان اصناف یا شکلوں کو راگوں یا دھنوں سے خلط ملط کر دیا گیا ہے مثلاً وحید مرزا نے امیر کی صنفی اختراعات قول، ترانہ اور خیال کو ان کے ایجاد کردہ نغموں میں شمار کیا ہے۔ (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۲۸) اور انہی کے حوالے سے ڈاکٹر سید حبیب نے بھی ان صنفی اختراعات کو راگوں کی فہرست میں شامل کر دیا (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۰) قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی بھی قول اور ترانہ کو امیر کے ایجاد کردہ راگوں میں گنتے ہیں۔ (ہماری موسیقی ص ۱۴۳) غالباً یہ غلط فہمی شبلی کی ایک عبارت سے پیدا ہوئی۔ شبلی لکھتے ہیں:

"قول، ترانہ، خیال، نقش و نگار، بسیط، تلانہ، سوہلا، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔" (شعر العجم ص ۱۳۰)

لیکن انھوں نے انہیں راگوں میں شامل نہیں کیا اور راگوں کی فہرست الگ دی ہے۔ اسی طرح شاہ احمد دہلوی اور شیخ اکرام نے بھی ان کو اصناف موسیقی میں شمار کیا ہے (راگ دریا ص ۹ اور ثقافت پاکستان ص ۱۰۰) حالانکہ ہمارا رام پور والے مشتاق حسین خاں کے نزدیک بھی ایک راگ تھا (آجکل اگست ۱۹۵۰ء ص ۳۲) اور امیر خسرو خود مثنوی قران السعدین میں صفت پردہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

آن شده کنجشک بجاه نوا
مرغ در آورده ز روی هوا

اس شعر میں نوا اور ہوا دونوں راگ ہیں۔

موسیقی کے باب میں امیر کی جن تحریروں کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امیر ہندوستانی و ایرانی دونوں موسیقی سے پوری طرح آشنا تھے۔ مرزا افضل بیگ امیر ایک معیار سے بحث کے دوران یہ دعوے کرتے ہیں کہ انہیں شاعری کی طرح موسیقی پر بھی پورا عبور حاصل تھا اور وہ اس کے اسرار و رموز سے عملی طور پر بھی واقف تھے (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۶) اصناف موسیقی

ے اجتہاد کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس زمانے میں مروجہ گائیکی کی صورت کیا تھی؟ یہ مسئلہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے اور
سے میں سنسکرت کے قدیم سنگیت ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ان نایاب سنگیتوں کی تدوین اور تراجم کا کام بھارت میں کئی ادارے بڑے اہتمام
کر رہے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان میں ایسا ایک بھی ادارہ نہیں جو کم از کم موسیقی سے متعلق موجودہ ادبی ذخیرے کو کسی کتب خانے کی صورت
یکجا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہو۔

سارنگ دیو کی تصنیف سنگیت رتناکر تیرھویں صدی کی رائج الوقت موسیقی پر ایک جامع کتاب ہے۔ سارنگ دیو نے ۱۲۴۷ء میں وفات
اور امیر خسرو ان کی وفات کے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ اس سنگیت کے چوتھے باب میں موسیقی کی ایک صنف پربندھ کی تشریح یوں کی
ہے۔

"پربندھ گانے کی وہ قسم ہے جس میں یہ التزام ہو کہ اس میں کتنے دھاتو یا حصے ہوں گے .....
..... اور اس میں کتنے اور قسم کے انگ ہوں گے پربندھ میں دو یا دو سے زیادہ انگ ہو سکتے ہیں
اور ان کی مندرجہ ذیل چھ قسمیں ہیں۔

۱۔ سُر ۔ جو آج کل کے سرگم کے مترادف ہے۔

۲۔ برود ۔ کالا یا دھات سے بنے ہوئے اور پیر تک سے بجانے جانے والے سازوں کے بول
اہو وغیرہ (یہ بول ان آوازوں سے مشابہ ہیں جو افسوس، حیرت، خوشی، ڈر وغیرہ
کے زیر اثر بے اختیار انسان کے منہ سے نکلتی ہیں)

۳۔ پد ۔ یعنی عام الفاظ خواہ وہ نثر کی صورت میں ہوں یا شعر کی صورت میں۔

۴۔ تینک ۔ یعنی لفظ تن یا تنا کی تکرار (اس کا مادہ لفظ تت ہے جس کے معنی برہم کے ہیں اور
تت ست تو سمی میں تت انہی معنوں میں آتا ہے)

۵۔ پاٹا ۔ وہ بول جو ان آوازوں کی ترجمانی کریں جو تال کے سازوں کے ساتھ مخصوص ہیں (مثلاً
منمل، مردنگ، کھڑتال وغیرہ)

۶۔ تال ۔ لیکن پربندھ کی ایک قسم بغیر تال کے بھی گائی جا سکتی ہے۔ پربندھ کے زیادہ سے
زیادہ چار حصے یا دھاتو ہو سکتے ہیں یعنی ادگراہ، ملاپک، دھرو اور ابھوگ (انہیں
دھرپد کے چار حصوں کے مترادف سمجھیں) اور کم از کم دو حصے یعنی ادگراہ اور دھرو"

(ترجمہ اور اقتباس از شرح (انگریزی) سنگیت رتناکر کرشن دھن بنرجی کلکتہ ۱۹۶۱ء ص ۲۸ تا ۲۹)

ان چار حصوں اور چھ انگوں کی ترکیب، تدوین اور کمی بیشی سے اس صنف موسیقی کی اتنی مختلف شکلیں بنتی ہیں کہ پربندھ کو صنف کی
[illegible] قوم کہنا چاہیے۔ امیر خسرو نے اپنے اس بے نظیر اصول کے مطابق کہ:

آنچہ ہنر ہست بگیرم ہمہ   و آنچہ جدا نیست بگیرم ازو

پربندھ کی بعض صورتوں کو اس انداز سے اپنایا کہ انھیں چار چاند لگ گئے۔ آئیے اب ان اصنافِ موسیقی سے متعلق امیر کے اجتہادات واختراعات کا جائزہ لیں۔

۱۔ غزل (اور دیگر اصنافِ شاعری) موسیقی پر امیر کا ایک عام احسان یہ ہے کہ انھوں نے قدیم موسیقی کے سرمائے کو جو بیشتر سنسکرت زبان میں تھا ہندی اور فارسی زبانوں کے سانچوں میں ڈھالا اور فارسی شاعری کی بحور کو اصنافِ موسیقی میں رائج کیا۔ چنانچہ غزل سرائی ہماری موسیقی کا مستقل جزو بن چکی ہے۔

۲۔ ترانہ: یہ رُباعی کو گا کر ادا کرنے کا ایرانی انداز تھا۔ حامد علی خاں صاحب قابوس کا حوالہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"سلاجقہ کے زمانے میں ترانہ ایجاد ہوا۔ رُباعی کو ایک خاص دُھن میں گاتے تھے۔ تو اسے ترانہ کہتے تھے۔" (ہماری موسیقی ص ۲۷)

رُباعی کے چوبیس اوزان ہیں اور ان میں زحافات کی کثرت اسی لیے گوارا کی گئی کہ رُباعی شاعری کے علاوہ موسیقی کی بھی ایک صنف تھی۔ بعد میں غلط العام ہو کر لفظ ترانے کا اطلاق ایک دُوسری صنفِ موسیقی پر ہونے لگا جس کا اصل نام تلانہ تھا۔ حامد علی خاں رمز سے آشنا ہیں کہ "ترانہ آج کل کے اصطلاحی معانی میں اس ترانے سے مختلف ہے جو رُباعی سے مخصوص تھا" لیکن ان کی تحریر میں تلانے کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ جو شبلی نے امیر کی اختراعات میں ترانہ اور تلانہ دونوں کا الگ الگ نام لیا ہے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ تلانہ: (جسے اب ترانہ کہتے ہیں) ہیز ہی کے نزدیک لفظ تلانہ کا مخرج تلنگ ہے جو پربندھ کا چوتھا انگ ہے اور جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ (شری کرشن سوتنسار ص ۹۶) اس انگ میں صرف لفظ یعنی تن یا تنانا کی تکرار ہوا کرتی تھی اور اسے پرستش کا غنائی اسلوب سمجھنا چاہیے۔ اس لفظ کی اصلی کیفیت میں برہما کا تصور تھا لیکن زمانوں کے گزرنے اور اصولوں کی بندش میں صدیوں جکڑے رہنے کے باعث اس لفظ کی تکرار نا بنانے کیف ہو چکی تھی۔ پجاری یہ لفظ دہراتے تھے لیکن صرف اس حالت تک جادوگر کسی طلسماتی لفظ کا ورد کرے۔ پرستش کا یہ غنائی اسلوب محض جنتر یا منتر بن چکا تھا اور تن یا تنانا کی معنوی اور جذباتی ... غائب ہو چکی تھی۔ لفظ تن یا تنا کی رعایت سے لفظ تنتر بھی غور طلب ہے۔

امیر خسرو کی طبیعت نے جب تصوف کا رنگ پکڑا تو انھوں نے پرستش کے اس غنائی اسلوب پر فارسی اور ہندی کا جامہ چڑھا کر اس کے بے جان پیکر میں جذبات کی رُوح پھونک دی۔ امیر کی ایک رُباعی پہلے دی جا چکی ہے جس میں روزِ ازل کی واردات کا بیان ہے:

رُوحِ پاک آدم کے جسدِ خاکی میں داخل ہونے سے گھبرائی تو

خواندند ملائکاں بہ لحنِ داؤد
در تن در تن درآ در تن در تن

ظاہر ہے کہ تنک سے تن کی صوتی مناسبت اور فارسی کے تن کی معنوی رعایت سے امیر نے اس آخری مصرع کے الفاظ پر تلانے کی بنیاد ... لفظ تن کو امیر تصوف کے ایک دُوسرے پیرائے میں یوں باندھتے ہیں:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اب ترانے میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو:

در آ آ ۔ در آ آ

در تنم در آ جان من ۔ در آ ۔ در آ

جنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم (حیات امیر خسرو ص ۲۰۱)

اس بندش میں ایک شعر بھی شامل ہے۔ گویا اس میں پر بندھ کے تیسرے انگ کی بھی آمیزش ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ستار کے بائی کے بیے جو بول وضع کیے گئے ہیں وہ بھی در آ اور تن سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ستار غالباً امیر ہی کی ایجاد ہے۔ اس دعوے کی تردید میں وحید مرزا ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ ستار کا لفظ امیر کی تحریروں میں انہیں کہیں نہ مل سکا (لالف اینڈ ورکس آف خسرو ص ۲۲۹) اور عابد علی عابد کو بھی یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ امیر اس ساز کے موجد ہوں اور اپنے اشعار میں اس ساز کا ذکر نہ کریں (ہماری موسیقی ص ۷) جواہر خسروی مرتبہ مولانا رشید احمد کے صفحہ ۱۳ پر امیر کا ایک دو سخنہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں ستار کا ذکر موجود ہے۔ دو سخنہ یوں ہے:

ستار کیوں نہ بجا، عورت کیوں نہ نہائی؟ جواب ۔ پردہ نہ تھا۔

امیر نے ترانے کی بندشوں میں در تن در آ کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا ہے مثلاً دانی تو م نوم دیمے نا تا بلالے اور دانی وغیرہ کل ترانے میں عموماً اسی قسم کے بول ہوتے ہیں اور شعر نہیں ہوتا۔ یہ الفاظ غالباً شروع میں با معنی تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی صورت بدلتی گئی اور لغوی معنی عرفانی اشاریت میں کھو گئے۔ الفاظ کے ماخذ کی حقیقت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ اور اس سلسلے میں ہندی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۴۔ قول: اس صنف میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو۔

استھائی من کنت مولا فعلی مولا

انترہ امیر خسرو بل بل جائیں

حضرت نظام الدین کے دربار کا میں

غالباً قول کا ماخذ یہی قول ہے اور اس کا اطلاق اس صنف موسیقی پر ہوتا ہے جس میں قرآن حکیم کی کوئی آیت یا رسول کریم کا کوئی قول عربی میں پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی وجدانی تفسیر بھی ہو۔ مذکورہ بندش میں ترانے کے بول شامل نہیں ہیں۔

۵۔ قلبانہ: قول اور قلبانے میں کیا فرق ہے؟ اس کی تصریح کسی مروجہ کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بعض کہتے ہیں کہ قول میں صرف قوالی کا ٹھیکہ بجنا چاہیے اور قلبانے میں مختلف تالیں ہو سکتی ہیں۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ قلبانہ جب بنتا ہے کہ قول میں ترانے کی آمیزش ہو۔ جواہر خسروی میں قلبانہ کے عنوان سے امیر کی مندرجہ ذیل بندش ملتی ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

درتیلے ۔ درتیلے ۔ در دانی ۔ ہم تم تنانا تنانا اے

یلی ۔ یلی ۔ یلا یالے

من کنت مولاہ . . . . . .

اس میں رسول کریم کی ایک مشہور حدیث کو اس کی وجدانی تفسیر کے ساتھ قلبانے کے انداز میں پیش کیا ہے ۔ اس صنف موسیقی میں ان کی ایک اور بندش بھی ملاحظہ ہو۔

استھائی ۔ ہی یا درد ر تالالا اے

من و نظام الدین اولیا دیم دیم در دردرے تنے

تنانا نا نا نا نا

انترہ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

در تم در تم توم توم تنانا نا نا

در رے تے تلے درا جانم

دیم دیم در در در در تیلے ۔ تنے نانا (حیات امیر خسرو ص ۱۹۹)

اس قلبانے میں امیر خسرو نے مرحلوں میں سے نکلتے ہوئے قرآن حکیم کی ایک آیت کا وجدانی چراغ جلا کے خودی کی منزل کی حد باندھی ہیں ۔ قلبانے کے مختلف حصوں میں تال اور سرکے حال کا اہتمام سمجھنا چاہیے ۔ لفظ قلبانہ کا مخرج قلب بھی ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ اس صنف موسیقی میں ارباب تصوف کی اصطلاح میں قلب پر ضرب پڑتی ہے ۔

۶ ۔ قوالی : گانے کے اس اسلوب کا عام نام ہے جس کی سنگت میں طبلے پر قوالی کا ٹھیکہ بجتا ہے اور الفاظ کی تکرار اور الحاق ترانہ اور قلبانے کے انداز میں کی جاتی ہے ۔ اشعار میں عام طور پر حمدیہ یا نعتیہ مضامین ہوتے ہیں یا تصوف کی واردات کا بیان یا ان میں سے کسی بزرگ سے عقیدت کا اظہار اس اسلوب غنا میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو ۔ اکثر عرسوں میں آخری روز آخر محفل سماع اسی پر ختم کی جاتی ہے اور گانے کے انداز کو رنگ کہتے ہیں :

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے

اپو پیر پایو نظام الدین اولیاء

جگ اجیارو میں تو ایو رنگ اور نہیں دیکھوری

دیس بدیس میں تو ڈھونڈ پھری ہوں

تو را رنگ نہیں پایو رے نظام الدین اولیا

آج رنگ ہے . . .

۷۔ **تروٹ**۔ شبلی نے اس صنف کا امیر کی اختراعات میں ذکر نہیں کیا لیکن نغمات الہند اور معارف النغمات میں اسے بھی امیر سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ پربندھ کی ایک شکل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں اور اسی لیے تروٹ کہتے ہیں۔ پہلے حصے میں الفاظ سے مضمون آفرینی کی جاتی ہے دُوسرے حصے میں ترانے کے بول ہوتے ہیں اور آخری حصے میں طبلے کے بول۔ غالباً پربندھ کی اس قدیم شکل میں دوسرا حصہ تنک پر مبنی تھا اور آخری حصے میں مندل یا مردنگ کے بول تھے۔ جب امیر نے ترانہ اور طبلہ ایجاد کیا تو تنک کی جگہ ترانے نے لی اور مندل اور مردنگ کے بولوں کی بجائے طبلے کے بول آگئے۔

۸۔ **سہیلا**۔ (سوہلہ یا سہیلہ) اس صنف کی تشریح بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ ہو سکتا ہے اس سے مراد ڈھولک کے وہ گیت ہوں جو سہیلیاں مل کر گاتی تھیں۔ مثلاً:

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

۹۔ **بسیط**۔ اس صنف کی تشریح بھی کہیں نہ ملی۔ اس کے لغوی معنی کشادہ یا وسیع کے ہیں یعنی گانے کا وہ اسلوب جس میں پھیلاؤ ہو ممکن ہے کہ یہ اصطلاح الاپ کے لیے وضع کی ہو۔

۱۰۔ **نقش گل**۔ ولرڈ ( ) نے ۱۸۸۶ء میں ہندوستانی موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ایک صنفی موسیقی کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام پھول بند تھا۔ لکھتے ہیں:

"ایسے دھرپد جن میں پھولوں کے نام ذومعنی انداز میں باندھے جائیں۔ پھول بند کہلاتے ہیں۔" (ہندو میوزک (انگریزی) راجہ ٹیگور کلکتہ ۱۸۸۶ء ص ۱۰۲)

دھرپد پربندھ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور پھول بند ، پربندھ ہی کی ایک قسم سمجھیے۔ ہو سکتا ہے نقش گل سے مراد یہی صنف ہو۔ معارف النغمات میں راگ زیلف کا ایک ترانہ یوں درج ہے:

استھائی۔ تانانا۔ تانانا دیرے نا دیم دیم
انترہ۔ دست صبا چو ناگاہ فتد بر رُخ تو
گوئی گرفتہ بار صبا گل بہ گل

راگ زیلف کی اختراع امیر سے منسوب ہے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بندش بھی امیر کی ہو۔ لیکن صاحب معارف النغمات نے وضاحت نہیں کی۔ اس بندش کا آخری ٹکڑا گل بہ گل کہیں یہ اشارہ تو نہیں کرتا کہ یہ بندش نقش گل کی ذیل میں آتی ہے؟

۱۱۔ **نقش ونگار**۔ شبلی نے نقش گل کا ذکر نہیں کیا لیکن "نقش ونگار" دو لفظ ساتھ ساتھ لکھے ہیں (شعرالعجم ص ۱۳۰) نواب واجد علی شاہ کی تصنیف صوت المبارک میں "نقش اور گل" امیر سے منسوب ہیں لیکن نگار کا کوئی ذکر نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نقش ونگار امیر کے غنائی اسلوب کی ایک جامع شکل تھی جس کی ایک خاص قسم نقش گل ہے۔ ہو سکتا ہے نقش ونگار پربندھ کی وہ بدلی ہوئی صورت ہو جس پر خیال گائیکی کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۲۔ **خیال**۔ نواب واجد علی شاہ صوت المبارک میں امیر خسرو کو خیال گائیکی کا موجد گردانتے ہیں اور عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامے میں خیال

کی اختراع امیر سے منسوب کرتے ہیں (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۱۰۲) راگ درپن کے حوالے سے شبلی نے بھی امیر کو خیال کا موجد قرار دیا ہے۔ لیکن امیر کی اپنی تحریروں میں خیال کا کوئی ذکر نہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس صنف کے موجد حسین شرقی تھے۔ (معارف النغمات ص ۱۱۸)

اس مسئلے کا حل غالباً یہ ہے کہ حسین شرقی نے امیر کی ایجاد کردہ صنف موسیقی نقش و نگار کے لیے عام فہم لفظ خیال کی اصطلاح وضع کی اور اس صنف کو دیگر اصناف موسیقی پر ترجیح دی لیکن یہ محض میرا قیاس ہے اور اسے قیاس کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ خیال گائیکی کا بنیادی اصول جل ترنگ سے ملتا ہے کا ذریعہ اختراعات اور بہ بہ نغمہ سرائی ہے۔ خیال گائیکی میں گویا الفاظ کو دقیق جذبات کے زیر اثر اور راگ کے لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سروں کے تت نے سانچوں میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ گائیکی کا یہ انداز امیر کی دیگر اصناف موسیقی یعنی قول قلبانہ اور قوالی میں بھی کسی حد تک موجود ہے مگر ان میں راگ کا ذریعہ اختراعات مقصود نہیں ہوتا اور مختلف سروں میں الفاظ کی تکرار سے وجدانی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ ترانے میں راگ کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی سرحد خیال سے جا ملتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ خیال امیر کی ایجاد ہے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہوں کہ ستار کے تاروں میں خالی اور بھری کا امتیاز نہیں جو خیال گائیکی کے لیے نہایت اہم ہے۔ بہ بہ نغمہ سرائی میں گویے کو پتہ چلنا چاہیے کہ سم کب آنے کا تاکہ وہ مناسب مقام پر بول پکڑ سکے۔ خالی کی اختراع اسی مقصد کے لیے ہوگی اور یہ اختراع بھی امیر سے منسوب ہے۔

اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امیر کے بعد راجہ مان سنگھ تنوار نے پندرھویں صدی میں دھرپد ایجاد کیا۔ میری رائے میں اسے خیال گائیکی کے خلاف ہندوؤں کا رد عمل سمجھنا چاہیے۔ دھرپد پربندھ کی ایک قسم ہے لیکن اس اصطلاح میں زور لفظ دھرو پر تھا جس کے معنی قائم یا اٹل کے ہیں۔ گویا یہ خیال گائکی کی بے راہ روی اور آزادی کے بارے میں برہمنوں کا حرف تنبیہ تھا۔ یہی وہ صدی ہے جس میں سلطان حسین شرقی جونپوری نے خیال گائکی کو خیال کی اصطلاح سے نوازا اور دھرپدیوں کے خلاف خیالیوں کا محاذ قائم کیا۔

شیخ اکرام اس روایت کو کہ خیال امیر کی ایجاد ہے شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مگر لوگوں سے خیال کبھی نہیں سنا۔" (ثقافت پاکستان ص ۱۰۰)

اس سلسلے میں نبی محمد خان خورجوی نے قابل قدر کام سرانجام دیا ہے اور اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں بہت سی بندشیں مع نوٹیشن یکجا کر دی ہیں۔ ان بندشوں میں کچھ خیال بھی ہیں۔ راگ سنم میں آنتائے کا ایک خیال ہے: بول ملاحظہ ہوں:

استھائی ۔ اندھیری گھٹا کالی من چراغ

انترہ ۔ علاج دل ناکن خسرو کچھ باغ

اصناف موسیقی کے بارے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ممکن ہے امیر نے دھرپد کے اسلوب میں بندشیں مرتب کی ہوں کیونکہ دھرپدیوں کے سرتاج تان سین امیر کو نائک تسلیم کرتے ہیں۔ تان سین کے ایک دھرپد کی سنچاری کے بول یہ ہیں:

تان سین کے تم ہو نائک خسرو کرت استتی گن گاورے

اصناف موسیقی کے سلسلے میں جن میں امیر خسرو کی چند ایجادات اور اختراعات کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے یہ "فہرست" نہایت

پاکل اور تشنہ ہے کیونکہ جیسا میں نے عرض کیا امیر رحمۃ اللہ علیہ کے تخلیقی اور فنی کمالات پر بڑے پیمانے پر تحقیق و تفتیش ہونی ضروری ہے اور یہ کام کے لیے ادب اور فنی تاریخ کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہماری موسیقی کی تاریخ اس کے ارتقائی مدارج اور اس کی قدیم و جدید اصناف کے موضوع پر بھی ضروری ہے یا ان کی مروجہ تصانیف اور ان کی نادر تصانیف کی فراہمی (اگر ممکن ہو) اور ان کا تحقیقی اور تحلیلی مطالعہ اس کے علاوہ سے وہ بہت زیادہ اس کام سے مختلف علوم کے ماہروں کی ایک ہمہ وقت اکیڈیمی ہی عمدہ برآ ہو سکتی ہے ۔

حضرت امیر خسرو سے منسوب جو اصناف موسیقی میں نے بیان کی ہیں۔ خود ان کی نوعیت نہج اور اسلوب دادا پر تحقیق کے لیے وسیع میدان موجود ہیں کیونکہ ان میں سے جو اصناف دور جدید تک پہنچی ہیں ان کی نوعیت اور ان کا اسلوب حضرت امیر کے اجتہادی اور ایجادی قالب سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔

موسیقی — آواز، اس کی لرزشوں، ان کی کیفیات اور ان کے رد عمل کی گوناگوں دنیاؤں کا نام ہے۔ صوت و صدا کی بے پایاں وسعتوں کو خاص نظم و ضبط دے کر جس شخصیت نے اصناف میں حلقہ بند کیا اس کا کمال فن صوت و صدا کی دنیاؤں کی طرح وسیع و عظیم ہے۔ اس وسعت اور عظمت کا احاطہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ:

ہر کے بستہ ام — از خاک — بخون شہدا
تا دل در دیدہ خونابہ نشانم دانہ را

؟

کیا آپ کے پاس نقوش کے یہ نمبر موجود ہیں ؟

- غزل نمبر
- طنز و مزاح نمبر
- آپ بیتی نمبر
- پطرس نمبر
- شوکت نمبر

اگر ان میں سے کوئی نمبر نہیں ہے تو آج ہی خرید لیجئے !

قیمت علی الترتیب

۸ روپے ۱۰ روپے ۳۰ روپے ۷ روپے ۷ روپے




metro
MICROFILTER
LONG SIZE
میٹرو سگریٹ
ورجینیا تمباکو اور بے مثال مائیکرو فلٹر کا مجموعہ ہے۔ اس کا فلیور سگریٹ نوشی کے ذوق کو مکمل
تسکین دیتا ہے۔ اور مائیکرو فلٹر ٹار اور نکوٹین کے اثرات کو روکتا ہے۔
مغل ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
اعلیٰ معیار اور ذائقہ کا امتیازی نشان

جنگ اور بیمۂ زندگی

اپنی دیرینہ روایات کے عین مطابق "مسلم انشورنس" ہندوپاک کی حالیہ جنگ کے آغاز سے فیاضانہ رعائتیں دے رہی ہے :

دفاعی سروسز کے لئے

(۱) بغیر زائد پریمیم کے تمام پالیسیوں پر جنگ کے خطرات کا تحفظ دیا گیا ہے۔
(۲) ہنگامی حالات کے نفاذ تک ان پالیسیوں کے ایام مہلت میں توسیع کردی گئی ہے جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر ۶۵ء یا اس کے بعد ہے۔ اس عرصہ میں یہ پالیسیاں بحال رہیں گی۔ بقایاجات آسان قسطوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔

شہری آبادی کے لئے

(۱) پالیسی ہولڈر کوئی بھی پیشہ یا ملازمت اختیار کرسکتے ہیں بشمول دفاعی سروسز کے۔
(۲) جو پالیسی ہولڈر براہ راست بھارتی جارحیت کا شکار ہوئے اور جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر یا اس کے بعد ہے، ہنگامی حالات کے دوران انہیں تین ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔ بقایاجات آسان قسطوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔

مسلم انشورنس



ایک یاد اور صدہا پہلو

جوش ملیح آبادی

قریبِ شام، جب اک سوگ واری، دل پہ چھاتی ہے
سسکتے کُنج کو، الجھی ہوا، نوحے سناتی ہے
شفق، دھندلی فضا میں، خون کے آنسو بہاتی ہے
میانِ گلستاں، بادِ خزاں کی، رُت جب آتی ہے
اور اس کی روش میں جب ہر اک پتی کھڑکھڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تھکے سے جھٹپٹے میں، اونگھنے لگتے ہیں جب منظر
فضائی سوگ واری، اوڑھ لیتی ہے سیہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک ذرا سا، شہر سے ہٹ کر
کماں کی طرح بل کھائے ہوئے، خوابیدہ ساحل پر
مرے دل کے سمندر میں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نظر آتا نہیں اک پھول بھی جس وقت دامن میں
کوئی تنہا پرندہ، شب کو، بول اٹھتا ہے جب بن میں
سسکتی ہے دھندلی سی چاندنی جب صحنِ گلشن میں
اور اک ویران عشرت گاہ کے خوابیدہ روزن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

سُبک سارنگیاں جب گونجتی ہیں بزمِ یاراں میں
گھنی زلفوں کی مہکیں، تیرتی پھرتی ہیں ایواں میں
نگاہوں کے سفینے ڈوب جاتے ہیں جب افشاں میں
اور اس موقع پہ، مجھ آشفتہ قسمت کی رگِ جاں میں
مچلتی راگنی، جب آنچ بن کر سنسناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

انگیٹھی کے کنارے، جب بفیضِ جامِ زرافشاں
وہ باتیں بولتی ہیں، جو کبھی تھیں قلزمِ امکاں
پرانی داستانیں، جب پہنتی ہیں نئے عنواں
اور اس موقع پہ گھبرا کر بیادِ وعدۂ جاناں
نظر جب ایک عاشق کی، گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اُفق پر پھوٹتا ہے، صبح کا جس وقت فوارا
بھڑکتا ہے، سنہری وادیوں میں سُرمئی دھارا
شفق کا دھوپ چھاؤں کا پہن لیتا ہے اندھیارا
نظر آتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا
اور اپنی سیج کو جب آرزو ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فلک کی رنگ باری سے فضا کی مسکراہٹ سے
افق کی مُرتعش انگڑائی سے شبنم کی گھلاوٹ سے
چمن کی خاکِ گل پرور کی ٹھنڈی گنگناہٹ سے
نسیمِ صبح کے متواتر بوسوں کی چپاچپ سے
کلی میں جب چٹکنے کی تمنّا تلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ہوا سے سرد چھوتی ہے لٹیں جب گیسوئے ترکاں کی
جگر میں چٹکی لیتی ہے مہک انفاسِ خوباں کی
گلابی روشنی سے، آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی
اور اس کے ساتھ ہی، پہلی کرن صبحِ بہاراں کی
جب اس اُجڑے ہوئے سینے میں چبھ کر ٹوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مچلتی ہے سرِ دوشِ صبا جب شکریں سردی
لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دلوں کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی
مسک جاتی ہے جب دوشِ فضا کی مخملی وردی
نویلی صبح جب آہستہ سے کنگن گھماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

طرب کا رنگ اُڑا کر، جشن کی دھوموں کو مرجھا کر
ربابوں کو بجھا کر راگ کے شعلوں کو بجھلا کر
فضا کو پیلا کر چمپئی مکھڑوں کو سنولا کر
صبا کی تھپکیاں کھا کھا کر آئینوں کو دھندلا کر
قریبِ صبح جب شمعِ شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوش نواؤں پر
برستی ہے نکیلی کج کلاہی دل رُباؤں پر
اترتی ہے مٹھاس آئینہ پیکر مہ لقاؤں پر
نداسی راگنی، گھنگھرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی بھیرویں مکھڑے سے جب گھونگٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مسلسل دو گھڑیوں سے ایک ہو جاتے ہیں جب جل تھل
پہاڑوں دروں سے پھوٹتی ہے جب ہری کونپل
اڑا دیتی ہے ذہن سے کائی جوشِ مے سے جب آنچل
پپوٹے گم سُموں کے نیند سے جھکتے ہیں جب بوجھل
چھنکتی چوڑیوں میں ہولی جب نئی ہلچل مچاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بھری برسات میں جب ناچتے ہیں دھوم سے جگنو
محیطِ رنگ میں جب تیرتا ہے نشترِ پی ہو
ہوا پر جب بدلتی ہیں پھواریں دم بدم پہلو
کھنکتی بوندیوں میں تیر برساتی ہے جب لُو
رخِ جاناں میں ڈھل کر بجلی جب قہر ڈھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں
لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شبِ غم کے دہکتے کھولتے ٹھنڈے سفینے میں
تمنا سے سحر جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
حیات اپنی امیدوں کے جنازے جب اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اچھلتا ڈوبتا ہے چاند جب ابرِ گریزاں میں
ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں سنگم کے شبستاں میں
کبھی ہلکا کبھی لرزاں دھواں ہوتا ہے میداں میں
وہ اک اندازِ نو سے ڈوب کر شوقِ فراواں میں
تھکی جمنا کو گنگا جب گلے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لرزتے ہیں در و دیوار پہ یادوں کے جب سائے
نظر آتی ہیں جب گم کردہ گھڑیاں بال بکھرائے
چمک اٹھتے ہیں جب وہ چاند کب کے تھے جو گہنائے
ہوا آتی ہے جب بکھرے ہوئے لمحوں کو مہکائے
فضا جب گھپ اندھیرے میں بھی راتیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نفس کی آمد و شد کو گھنی زلفوں میں الجھا کر
اصولِ پختگی و خوفِ رسوائی کو ٹھکرا کر
بھرے جلسوں میں رازِ عاشقی کا عود سلگا کر
کھنکتے ساز پر آواز کی پازیب جھنکا کر
جب اس ناپختہ پن کی خام کاری گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مرا یہ چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا
متاعِ مہ وشاں تھا دولتِ محفل نشیناں تھا
کلیسائے نگاراں کعبۂ اصنامِ دوراں تھا
جو کل کی بات ہے بت خانۂ قومِ حسیناں تھا
جب اس چہرے سے خود میری بہار منہ چھپاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی ملاقاتیں
ملاقاتیں دعائیں شکریئے شکوے مناجاتیں
بھرے چاندی کی تھالی میں دہکتی کندنی باتیں
مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
اور ان کی آب شبنم آگ دل میں جب لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں [illegible] اداؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں
جہاں کل رت جگوں نے ساز پر راتیں بجائی تھیں
گھنی زلفوں کے سائے میں جہاں نیندیں جگائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پر مدتوں قسمیں لگائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ گلی آنکھیں جھکاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حیا سے کانپ کر جھک کر ہجوم شرمساری سے
کلائی میں سبک کنگن گھما کر بے قراری سے
ذرا سا لڑکھڑا کر اک ادائے بادہ خواری سے
دھنک کی سی حسیں انگڑائی لے کر طرحداری سے
کوئی کم سن کسی کو دیکھ کر جب مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کوئی الھڑ گلی میں رات کو کیا کیا جتن کرتی !
بھٹکتی ڈولتی تھمتی ٹھہر جاتی نہ دم دھرتی
لرزتی ہانپتی رکتی بدکتی جھولتی مرتی
سمٹتی کانپتی مڑتی جھجکتی جھینپتی ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آکر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چمن کو غرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھونرا
نیاز عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھونرا
خموشی کو لطیف آواز کر جاتا ہے جب بھونرا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھونرا
اور اس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جفائے تاج داری سے تنگ آ کر بھنگ آ کر
سزاؤں ذلتوں پابندیوں فاقوں سے گھبرا کر
بھڑکتے جذبۂ ناموسِ انسانی کی شہ پا کر
پھپھورے حاکموں کی ناز برداری سے اُکتا کر
غرورِ آسماں کو جب زمیں نیچا دکھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں لیلیٰ کے عشوے سرنگوں رہتے ہیں محمل میں
گھٹی رہتی ہیں دُکھیاروں کی فریادیں جہاں دل میں
جہاں جھنکار دم سادھے پڑی رہتی ہے پائل میں
جہاں سرگوشیاں تک جرم ہیں اس قصرِ باطل میں
گرجتے سورماؤں کی زباں جب الالاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چھٹ جاتا ہے جب مظلوم کے سینے کا انگارا
فضائے ظلم پر باقی نہیں رہتا کوئی تارا
مذاقِ سرفروشی کا ابل پڑتا ہے فوارا
مچلتا ہے شہیدوں کے لہو کا دُور تک دھارا
اُبلی تلوار مقتولوں کو جب دُولہا بناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کڑکتی ہے کمانِ بے کساں جب فرقِ سلطاں پر
کروروں ہات پڑتے ہیں حکومت کے گریباں پر
چھُری مجبور کی چلتی ہے جابر کی رگِ جاں پر
سلگتے جھونپڑوں کی آگ منڈلاتی ہے ایواں پر
گدا کے خون میں جب شہریاری ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بہتے ظلم کا پانی سروں سے جب گزرتا ہے
جوانوں کے دلوں میں جذبۂ غیرت ابھرتا ہے
سرِ میداں پئے اظہارِ انسانی جو مرتا ہے
بجائے غم پدر مرگِ پسر پر ناز کرتا ہے
بموجِ فخر ماں جب لاش بیٹے کی اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں کج اہلِ وحشت کی جبیں پر تاج ہوتا ہے
جہاں شہرِ حقوقِ زندگی تاراج ہوتا ہے
جہاں ہر آن سولی پر نیا معراج ہوتا ہے
جہاں ننگے سروں پر روز ناحق چارج ہوتا ہے
وہاں بارود ایوانوں کو جھلسے جب اڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جو مظلوموں کی ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑ دیتی ہے
جو عفریتِ حکومت کی کلائی موڑ دیتی ہے
جو شاہیں چشم فرعونوں کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے
جو قلعوں کو فقط ضربِ نظر سے توڑ دیتی ہے
کسی جاں باز میں جب وہ بغاوت گڑگڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حفیظ جالندھری

○

(شاعری کا دورِ رفتہ)

دورِ رفتہ دیکھ لیتا ہوں گلستاں دیکھ کر
گل کو خنداں دیکھ کر بلبل کو گریاں دیکھ کر

ناخدا پر مطمئن تھے بندگانِ ناخدا
اب خدا یاد آ رہا ہے موجِ طوفاں دیکھ کر

سنگدل سمجھا برہمن، شیخ سمجھے بدمذاق
ہنس پڑے دونوں مجھے اب تک مسلماں دیکھ کر

شکوہ فرماتے ہی اُلٹی منتیں کرنی پڑیں
دل پشیماں ہو گیا اُن کو پشیماں دیکھ کر

شانِ رحمت کو بھی اپنا جائزہ لینا پڑا
آ پڑی مشکل مرا طومارِ عصیاں دیکھ کر

اس مشقت گاہ میں راحت کا یہ گوشہ حفیظؔ!
دیکھ لو۔ اور خوش رہو گورِ غریباں دیکھ کر

احمد ندیم قاسمی

○

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں — ندیمؔ! کاش یہی ایک کام کر جاؤں
یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس — جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں
مرا وجود مری روح کو پکارتا ہے — تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں
ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر — کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں، کدھر کدھر جاؤں
میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو — جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں
جراحتوں پہ جمی جا رہی ہے وقت کی گرد — ذرا لہو میں نہالوں تو پھر سنور جاؤں
ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو — میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں
خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند — میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں
یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا — تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں
کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا — کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آئی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

حکیم احمد شجاع ساحر

○

وفا کا مدعی غارت گرِ جنسِ وفا نکلا
جسے ہم آشنا سمجھے وہی نا آشنا نکلا

تلاشِ جاہ میں اس کو بھی پھرتے در بدر دیکھا
سمجھتے تھے جسے مُنعم گدائے بے نوا نکلا

عبث اس شیخ کے کہنے میں آکر دیر کو چھوڑا
جو دیکھا تو وہی زُنّار زیرِ بوریا نکلا

وہ زاہد دھوم تھی گھر گھر میں جس کی پارسائی کی
چھپا تو لاکھ پردوں میں مگر کافر کھلا نکلا

متاعِ سجدہ ریزی بر جبیں، بت در بغل واعظ
خدا کے گھر میں جب داخل ہوا گھر سے خدا نکلا

اسیروں کی اسیری کا تماشا دیکھنے والے!
کہیں چھپ جا رسن کو توڑ کر دستِ دعا نکلا

جو آیا میکدے میں شیخ اک محشر ہوا برپا
کہاں دیوانوں کی محفل میں یہ بدبخت آنکلا

بلا سے گر ہوئی برباد ہستی ہم غریبوں کی
تمھارے دل کا ارماں تو بہت کافر ادا نکلا

تعجب سا تعجب ہے ہوئے حج پیری میں
مگر ساحر کو کیا کہیے صنم خانے میں جا نکلا۔

حکیم احمد شجاع ساحر

○

کہتا ہے کون درد کے درماں کی بات کر
تو میری جان خنجر و پیکاں کی بات کر

کب تجھ سے دل کو چارہ گری کی امید تھی
مرہم کا ذکر چھوڑ نمکداں کی بات کر

رکھا ہی کیا ہے حجرۂ زاہد میں جشن دیا
قدحِ شراب و محفلِ رنداں کی بات کر

صیاد کے کرم کی حکایت سے فائدہ
کچھ بے وفائیِ چمنستاں کی بات کر

پھر شورِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دستِ جنوں و چاکِ گریباں کی بات کر

کب تک خیالِ عافیتِ گوشۂ چمن
زنجیر و طوق و روزنِ زنداں کی بات کر

ذکرِ بہارِ حُسنِ عروساں تو نہ چھیڑ
رنگِ حنائے خونِ شہیداں کی بات کر

فکرِ سکون و عیش ہے اک مرگِ خانہ زاد
گرداب و موج و صرصر و طوفاں کی بات کر

ساحر کو پند و وعظ و نصیحت سے کیا غرض
زلفِ سیاہ و کاکلِ پیچاں کی بات کر

فضل احمد کریم فضلی

○

تعلق تو نہیں اُن کو رہا مجھ سے۔ مگر اب بھی
ادھر گزروں تو روشن پھر وہ چلمن ہو ہی جاتی ہے

نظر نیچی کیے یوں تو گزر جاتے ہیں ہم دونوں
مگر کچھ تیز پھر بھی دل کی دھڑکن ہو ہی جاتی ہے

بہت راہِ طلب کی دھوپ ہوتی ہے کڑی لیکن
بالآخر زلفِ جاناں سایہ افگن ہو ہی جاتی ہے

نگاہیں جب ملا کرتی ہیں لب کچھ سِل سے جاتے ہیں
مگر قندیل سی آنکھوں میں روشن ہو ہی جاتی ہے

انھیں اللہ نے بخشی ہے صورت ایسی پاکیزہ
نگاہ بوالہوس بھی پاکدامن ہو ہی جاتی ہے

بگڑ بیٹھو ہو تم مجھ سے تو بگڑو شوق سے بگڑو
محبت کرنے والوں میں تو اَن بن ہو ہی جاتی ہے

ترے خونِ جگر سے اور کچھ ہو یا نہ ہو فضلی
مگر تھوڑی بہت زیبائشِ فن ہو ہی جاتی ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

کاش پھر شانِ نسیمِ سحری تو آئے
پھر مہک جائے فضا، پھر تری خوشبو آئے

یوں تو ہر سانس میں آتی ہے تری یاد مگر
آج کیا جانئے کیوں آنکھ میں آنسو آئے

رشکِ مشکِ ختن کی ملک بنائے تیرے سر کی قسم
زلفِ شبگیر جو تری شانۂ صبا چھو آئے

ہیں کھلے پھول مگر جیسے ہوں سب کاغذ کے
تو جو آ جائے گلستاں میں تو خوشبو آئے

آئینہ خانۂ حیرت سے بنے عشق کہیں
وہ نظر آئے مجھے اور ہر اک سو آئے

یہ خبر گرم ہی شہر میں چلتی ہے سموم
در زنداں تو کھلے آتی ہے گر تو آئے

گفتگو کے جو کئی آپ نے بدلے پہلو
سامنے حسنِ غزل کے کئی پہلو آئے

تیرے شعروں نے تو دل موہ لیا ہے فضلی
ایسا لگتا ہے کہ جیسے تجھے جادو آئے

سرورِ کائنات

پروفیسر منظور حسین شور

صبحوں کے سنہرے طاقوں میں ظلمات کی شمعیں جلتی تھیں
دوزخ کو چھپا کر سینے میں جنت کی ہوائیں چلتی تھیں

سنگین بتوں کی پیشانی آدم کے لہو سے ڈھلتی تھی
اوہام کی خونیں تاریکی معبد کی سحر پر ملتی تھی

خورشیدِ سحر کے سینے میں ظلمات کے بھالے ہوتے تھے
اصنام کے سنگیں جبڑوں میں انساں کے نوالے ہوتے تھے

نسل اور نجابت کا قشقہ ماتھوں پہ لگایا جاتا تھا
رنگ اور نسب کے پردے میں ہر کوڑھ چھپایا جاتا تھا

اس وقت وہ آیا راتوں کو پیغامِ سحر دینے والا
آفاق کی ڈوبی کشتی کو ساحل کی طرف کھینچنے والا

مرہم دے کر زخموں کے تحفے لینے والا صحرائی
آنکھوں کو نظر سینوں کو اجالے دینے والا صحرائی

وہ ابر کہ جس کے سائے نے روحوں پہ سکوں برسایا ہے
وہ سیل جو کبر و نخوت کے کہساروں سے ٹکرایا ہے

باطل کے گھنے اندھیروں سے جو بادل ہنستا گزرا ہے
تاجوں پہ گرجتا آیا ہے کاسوں پہ برستا گزرا ہے

جو بطنِ صحرا سے اٹھ کر دنیا کے افق پر چھایا ہے
جس کا پرچم ماچین سے لے کر چین تلک لہرایا ہے

سینے میں صفا ہونٹوں پہ دعا آنکھوں میں تقدس کا عالم
قدموں میں وقارِ قیصر و جم ماتھے پہ غبارِ کرب و الم

اے وہ کہ جس نے بخشی ہے خاروں کو گلوں کی رعنائی
آفاق کو کب تک روندے گا تلووں سے غرورِ دارائی

جمہور کی زندہ لاشوں پہ ناچے گی کہاں تک سلطانی
اس خون میں کب تک تر ہوگی تاریخِ امم کی پیشانی

تقدیس کے پردے میں کب تک انساں کو انساں کھائے گا
یہ ابر کہاں تھم سکے گا یہ سیل کہاں تک جائے گا

تہذیب کی سرحد سے کب تک قوموں کے لٹیرے اتریں گے
سونے سے کہاں تک آدم کے معبود تراشے جائیں گے

بیچیں گے غلاموں کو کب تک مغرب کے خدا بازاروں میں
آواز رہے گی گم کب تک زنجیروں کی جھنکاروں میں

الزام کہاں تک آئے گا صدیوں کے چمکتے سورج پر
ابنائے زمیں کی نیت سے لرزیں گے کہاں تک بحر و بر

مغرب کی سیاہی مشرق کے سورج کو کہاں تک کھائے گی
انساں کے لہو میں انساں کو کب تک یہ گھٹا نہلائے گی

تاریک افق کے ماتھے سے کب رات کی ظلمت چھوٹے گی
صبحوں کا اجالا کب ہوگا سورج کی کرن کب پھوٹے گی

سن میری فغاں اے میرا سلام اے ارض و سما کے پیغمبر
خورشید کا ماتھا پھر دھو دے پھر نور سے بھر دے جیبِ سحر

مختار صدیقی

○

یہ بحر بھی زمیں تھی، جو غیرت سے شق ہوئی
ہم سنگ بن گئے، تو سراپا عرق ہوئی

بے کار حادثے ہیں، کہ احساس، گُند ہے
عبرت، جو یادِ ماضی کا بھولا ورق ہوئی

دن بھر ہر ایک سایہ گریزاں تھا نُور سے
دونوں ملے۔ تو مہر کی رنگت بھی فق ہوئی

آگ اور لہو سے جو مرا بستی ہو، بے شرح
اب کائنات، شاملِ حالِ شفق ہوئی

خود سے کبھی کبھی کا وہ ملنا بھی کیا ضرور!
سب کی رسائی، اب تو اُفق تا اُفق ہوئی

ِجاں

: مجید

ی زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
روں کی تہوں میں، عجیب اندیشے!
ہیں، انھی لہروں کی گونج میں ہم نے
آنے والے تموّج کی سیٹیاں بھی سنیں،
مگر یہ کس کو خبر، کیا ہے اک وہ ربطِ عمیق،
وہ گھور اندھیروں کا ڈنک چلتے ذہنوں میں
وہ ایک بس بھری جس — جو ہوائیں بنتے گئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو جانپ لیتی ہے!
کسے خبر ہے کہ اس جان و تن کی گستی میں،
لہو کی گھیل سلاخوں کے اس جھمیلے میں
کوئی وہ کونسی ہے، اُلجھے سلسلوں کی کڑی
کہ جس کی دل میں یہ ترسی اک جھنک پھر آئی
میرے لیے کوئی سنگم سی بات لائی ہے!
میں ڈر گیا ہوں — پُراسرار واسطوں کے تمام
یہ خوف ہی تو ہے اک وہ حصارِ بے دیوار،
جو میرے دل کو تری ہیبتوں نے بخشا ہے
تری ہی دین، یہ سانحوں کو سونگھتی حِس،
ترا ہی خوف، اس اَن بوجھے رابطے کا اثر،
میں ایک ریزۂ جاں ان عجب قرینوں میں!
تجھے ہی خوف کی زد میں — تری گرفت میں ہوں!
تجھے ہی ربط کی حد میں — تری پناہ میں ہوں!

عدم

○

آپ کی آنکھ اگر آج گلابی ہوگی
مری سرکار بڑی سخت خرابی ہوگی

پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ رُت بیت گئی
کیا خبر تھی کہ تمہیں اتنی شتابی ہوگی

محتسب ہی نے پڑھا ہوگا مقدر پہلے
میری تقدیر بہر حال جوابی ہوگی!

یا مصوّر کے بھروسے کا کرشمہ ہوگا
یا سرشتاً مری تصویر شرابی ہوگی

جرم تو میرا تھا وجدان کا مرہونِ قلم
حاکمِ وقت کی تاویل کتابی ہوگی

پھر وہی رات

ظہیر کاشمیری

اَن گنت حسرتوں میں ایک اُمید
جیسے عصرِ کہن کی لاشوں پر
تھرتھراتی ہو تابشِ خورشید

بحر کے مسنی کناروں پر
موتیوں کے چراغ جلتے ہیں
موج اِن کو مگر بجھا دے گی
تندئ سیل میں بہاتے ہوئے
ظلمتِ بحر میں چھپا دے گی

اسی انداز سے شعاعِ امید
دیر تک ٹمٹما نہیں سکتی
ایک طوفانِ سرد آئے گا،
پھر وہی رات، پھر وہی آہیں،
کلفتوں کا غبار چھائے گا،

عبدالعزیز خالد

حکایتِ نے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند
(رومی)

تو سے و بہار کی خوشبو سے لے چمن آرا!
مشام جاں کو معطر کرے نگارِ صبـ

میں سوہنی تو مہینوال لے کے دلدار!
میں صاحباں تو مرزا، میں ہیر تو رانجھا

میں مومل اور تو رانا، میں ماروی تو کھیت
ہے تو چنیسر و مجنوں و تو ہے میں لیـ

پکاریں مجھ کو جہانگیر مجھ کو نورجہاں
ہے تو اڈونس و مریخ اور میں زہـ

نہیں میں ملکۂ جم کی پہ ہوں تری شیریں
تو کوہکن نہیں فرہاد ہے مگر میـ

میں تیری بھاگ متی ہوں تو میرا قطب علی
جنوں کو جادۂ ہموار ہے تکلب د

تو میرا باز بہادر میں تیری روپ متی
جلالِ اکبرِ اعظم پڑھے قصیدہ

میں سانگی ہوں تو کیہ چند، تو شیو میں پاربتی
تو نند لال میں رادھا، تو کرشن میں میـ

تو بے نظیر ہے میرا میں تیری بدر منیر
میں ہوں بکاولی، تاج الملوک نام

پری نہیں پہ بدیع الجمال ہوں تیری
تو دلربا مرا سیف الملوک شہزادہ

تو کامروپ، کلا کام کنیز تری
مری متاع تری آرزو، ترا سود

تو ستیہ وان ہے میرا میں تیری ساوتری
میں موہنی ہوں تو طالب میں ماہ تو

میں چاند رات سی سنجوگتا تو پرتھوی راج
تو کام دیو، رتی میں، میں چکوی تو چکوا

تو تار سیپی ہا نرگس نگاہ میں ...
تری تلاش میں صحرا نوردوں کو

ترا بہرام گل میں رومن میں عنبرہ تو شرن
گلا سٹیا محل میں جمیلیں منقب

تو جام ہے میں ایلا، میں ہیلنہ تو پیرس
میں زبیدہ، تو امین غضنفر

اگر وہ صبا ہو کر لنکا کو جو تیر کوٹ کا بن
ہمیشہ جاپ کرے رام نام کا سیتا

میں چنپئی تو پتی میں کیتکی تو اودھے بھان
تو تیرتھ رام تری میں حسینہ الکا

میں پی ہوں تو ہے پپیہا میں عندلیب تو گل
تو بن کلی ہے میں ڈیا ہوں دختر تہمینی

میں شہر عاج کی ہوں گلعذار زریں تاج
تو میرا مست مولا، مسافر البیلا

ہے رشتہ ہم میں عزیز و عزیزہ کا جانی
نگاہ عشق میں تو جان شاہ میں شمسہ

میں تیرے ساتھوں کی شب قبا حسینہ ہوں
تو شیکسپیئر روش رواں و نغمہ نوا

براؤننگ ہے تو میں ایلزبتھ بیرٹ
چکور چاند کا عاشق ہے میں تری شیدا

میں مہ جبین تری تو مرا اسد غازی
ہے سرگزشت ہماری طلسم ہوش ربا

تو شاہزادہ سلیم اور میں انارکلی
ہے تیری دید مجھے صبح عید کا مژدہ

میں تیری جنت گم گشتہ تا تیری شاخ نبات
تو میرا ہنس سرمست و حافظ شیدا

تو زمیں دار میں رستا ولی تو تلسی داس
میں تیری چندر بدن ہوں تو ماہیار مرا

تو نیلکنٹھ میں گوری تو شیام میں گوپی
ہے دیوتا تو مرے من کے شوخ سندر کا

کنک تاسی میں داسودتہ تو ادین
تجھے مدن کے دنیا سبے مدھو بالا

ہے تو مرید میں حالی میں رودت تو بوعز
تو معتمد میں تری دلربا رمیکیہ

میں مست گل کمی، تو دیر مرسی عنان
میں شہربانو تو یوسف، حسین کا بیٹا

ہوں میں سوات کی درخانی تو آدم خان
ہے تو جلال تو میں شاہزادی محبوبہ

تو شاہ جام تماچی ہے اور میں نوری
تو مینہ ہرا ہے میں مومل میں ماہی تو دیا

میں وہ دنام گل اندام اور تو بہرام
سنہرے دیس کا تو دیپ چاند، میں مہوا

زبیدہ محمودیہ میں اور تو علاء الدین
قصے نلان ہوں میں تو ہے کان مالان

تو چاند نیلے گگن کا میں موج دجلہ کی
میں شہزادہ ہوں تو شہریار بزم آرا

میں تیری سبز پری اور تو مرا گلفام
کنوئیں جھنکا سے میں تیرے یوگ نے کیا کیا

وہ پدمنی ہوں جو خلجی پہ جان دیتی ہے
تو سیدی ابو جعفر میں شاعرہ حفصہ

تو دیو داس میں پارو میں صابرہ تو رشید
میں باسی پھول تو گویدہ باسی پھولوں کا

نہ ہو یہ عاشق و معشوق کی خوشی میں شریک
حسد زمانے کی عادت ہے کیا گلہ اس کا

جو میرے دل میں ہے ان میں وہ التہاب نہیں
نظر سے گزرے مکاتیب اختر و سلمیٰ

سنا ہے قصۂ زیب النساء و عاقل خاں
پڑھا ہے تذکرہ بھی یوسف و زلیخا کا

تو میرا عشق ہے تری باقی بتان وہم و گماں
ہیں اہل آرزو و اہل جہاں سے بے پروا

بقدر رتبۂ عشق، حسن ناز کرے
تو باغ گل، و چمن یاسمن تر بوتۂ سرو

تو سرو در اس کی کایا، میں سبز بستی کا ٹپ
میں ہوں کہ تو کہ کار سفر کا متوالا

تو سرو ہیں میں آشنا چمن، میں ہستی تو چمن
کسی سکے کبھی میں تو آتش اور میں چشمہ

تو ہے عشق و محبت میں حسن کی دیوی
ہیں دونوں اپنی جگہ بے مثل و بے ہمتا

شبا تیرے شعروں کی مست شباب شہزادی
تو میرے خوابوں کا شہزادہ شوخ شرمیلا

رباب ہجر پہ گاتی ہوں - نغمۂ نغمات
میں شاعریت ہوں تو جانشین سلیماں کا

ہو اتفاق ہی سے حسن و عشق کا سنگم
ازل سے دشمن ارباب شوق ہے دنیا

بھٹک رہی ہے دیار وفا کی راہوں میں
یروشلم کا پتہ پوچھتی ہے ملکۂ سبا

بکھیرتی میں ہوں جہاں گلاب کے پھول
وہیں ہے تاج محل میری آرزوؤں کا

ادھر کہیں انھیں فرخندہ رہگزاروں کو
دو عاشقوں نے جہاں زیست کا مزہ پایا

ترا خیال سم زندگی کا ہے تریاق
سیاہ بھیگی راتوں میں جل رہا ہے دیا

خمار عشق تری تابناک آنکھوں میں
تو کردگار اساطیر حسن و درماں کا

ہنسوڑ، وعدے کا پابند، صابر و ضابط
قلندرانہ طبیعت مزاج شاہوں سا

تری زباں میں لسان ضمیر کی لکنت
ترے سخن میں شفا بخشی دم عیسیٰ

ہر ذرا ان میں نمو و نیز معانی کی
جونہی تو لفظوں کو دے حکم، قم باذنی کا

دماغ، روشن و فکر سلیم دے کے تجھے
خدائے پاک نے قلب گداختہ بخشا

کتاب داں بھی ہے تو صاحب کتاب بھی ہے
خودی کا سر نہاں تجھ پہ آشکار ہوا

تو نور کہکشاں کا، میں دھول دھرتی کی
پہ میساں زمیں اسے فلک پہ رہا

مری نند، تری یادیں مری شراب آنسو
فضاں ہے میری غزل، مرثیہ مرا نغمہ

ہے داستاں مری ایک لمبی گہری آہ
بنے گا کتبہ مری قبر کا: شہید وفا

اثر پذیر نہ سے کی فریاد، گہری سے ہیں
گماں ہے میری وفا پہ حکایت سنے گا

بڑی کی آس میں جیتی ہوں کل نہیں پڑتی
غم فراق نے صبر و قرار لوٹ لیا

نجات بات ہے میرے لیے نرواں ہے
سکون قلب ہے اک جاگتا ہوا سایہ

اب اشک و آہ مری زندگی کے ساتھی ہیں
انھیں تو بھول نہ جاتا بہ عذرِ کارِ جہاں
پریت پیا سے کے دُکھ جھیلنے نہیں آساں
سب جو یک دل و یک جاں بنے وہ پردیسی
ترے ہی شہر میں تیرے لیے ترستی ہے
خوشی حرام ہوئی مجھ پہ تیرے جانے کے بعد
مدادِ خونِ جگر سے بیاضِ حسرت پر
معاملاتِ محبت نہ رہ سکیں مخفی
دل اختیار سے باہر، نگاہ بے قابو
مثالِ اُستنِ حنانہ ہوں میں گریہ کناں
چھپا بروگ کے بادل میں اس کا مہتاب
کہاں وہ ساعتِ سرخوشی و ہم آغوشی؟
وہ الف لیلہ کی سی پرفسوں جواں راتیں
زباں چوستے صہبائے ناب لب پیتے
کے وہ پینے سے وہ یادگار، جگرا سے
نکال کر قفسِ تنگنا سے لذت سے
سکھی! پیا کو منا کیوں وہ مجھ سے روٹھ گئے
زباں سے گر نہیں آنکھوں سے گفتگو کرتے
نوائے راز کو لفظوں کی احتیاج نہیں
سفیرِ سوزِ نہانی ہے حرفِ زیرِ لبی
ہے بے نیازیِ خوباں ادائے محبوبی
چھڑا کے ہاتھ چلے دل سے جاؤ تو جانوں
تو میرے دل میں تو رہتا ہے خدا کے گھر میں!
میں دل کی آگ کو لفظوں میں کس طرح ڈھالوں؟
نہ بدگماں ہو تجھے میری جان کی سوگند

ہے سوتے جاگتے ماتم نشاطِ رفتہ کا
بندھے جو راتوں کی تنہائیوں میں عہدِ وفا
دیے کی لاٹ کی مانند دل جلے میرا
جو اپنے بس میں نہ ہو اس سے عہد و پیماں کیا؟
تری سلومی و شیفو، تری قلوپطرہ
قرار پھر نہ دلِ بے قرار کو آیا
شبِ فراق میں لکھتی ہوں نسخہ ہائے وفا
نظر سے لوگ لگا لیں سراغ باطن کا
نہیں ہے کھیل چھپانا کشاکشِ دل کا
کھلا کھلا کے محبت نے دل گداز کیا
ہجومِ درد میں گم ہو گئی شبِ وعدہ
وہ ہیچ عشوہ و غمزہ و دشنامِ ناز و ادا؟
ابو الحسن کو رہا تا حیات جن کا نشہ؟
نشے میں جھومتے کرتے سپاس و حمدِ خدا
جنھوں نے حوصلۂ "ترکِ ترک" ہم کو دیا
براہِ عزم ابدیت سے ہمکنار کیا؟
کیا جو غیر نے اغوا تو میری اس میں خطا؟
ترس نہ درد رسیدہ پہ کچھ انھیں آیا
زبانِ دل کی سرشک و تبسم و ایما
ہے ترجمانِ محبت نگاہِ دزدیدہ،
ہے رمزِ ربطِ نہاں، سرسری سلام دعا
تو مجھ سے بھاگ کے آخر کہاں پنہ لے گا؟
مرے سکوت سے ناحق تو خشمناک ہوا
مجھے فسانہ و افسوں کا فن نہیں آتا
سن اے سرورِ دل و روشنائی دیدہ:

محال ترکِ محبت مجھے! محالِ جنوں
میں بھول جاؤں تجھے کس طرح یہ ممکن ہے
یہی سنا ہے یہی تجربہ ہے خود کا کبھی
نہ روٹھ مجھ سے مری جاں پاؤں پڑتی ہوں
کہ اس طرح نہ عتاب نہ گفتگو مجھ سے
سمجھ نہ مجھ کو پرائی میں ہوں تری پابند
تو میرے جسم ہی جان کا مالک و مختار
دکھائی دیتی ہوں گر خوش تو محض مجبوراً
سکھائی مجھ کو غمِ عشق نے اداکاری
ترے بغیر جہنم ہے مجھ کو جنت بھی
ترے بغیر خزاں رنگ ہے بہارِ شباب
جنم جنم کی میں داسی کہوں نہ کیوں خود کو
ترا خیال ہے یا شب چراغ لو بر ہے
بفیضِ جلوۂ جاناں بپاسِ خاطرِ دوست
حق ادبی جو بنا ہر دو ضمیر ماند نظر
خیالِ خانۂ خورشید رخ سے روشن ہے
ہوں مال مال نشاطِ امر کی دولت سے
بے شعورِ غمِ زندگی عطا کر کے
خدا نے عرش پہ باندھا ہے خود دوران کا کلاہ
ہمارے نام جلال و ستارہ کی مانند
رہیں گے شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید

خیالِ ترکِ محبت — اجل کا ہرکارا
بچن ہے میرا اٹل، اعتقادِ عہدِ وفا
محبت ایک مقدس امانت و جذبہ
نہ دے خدا کے لیے طعنۂ بے وفائی کا
خفا ہو تو تو کسی شے میں جی نہیں لگتا
پرستا میں تری، تو پران ناتھ مرا
تو زندگی ہے مری موت ہے فراق ترا
مجھ کے فرض نبھاتی ہوں کاروبارِ وفا
جنسی مذاق ہے میرا نمائشی سارا
نسیم صبح گلستاں ہے صرصرِ صحرا
ترے بغیر بیاباں ہے قصرِ الحمرا
ہے نقشِ دل کے نگیں پر ازل سے نام ترا
بجھا کے دل کا کنول داغِ سینہ تاب دیا
بنا ہے جامِ ہلاہل، پیالہ امرت کا
بغیر کچھ کہے سب حال کہہ گئی دل کا
رواقِ تیرہ و تارِ عزالِ غم دیدہ
نفس نفس ہے ثنا خواں تری کریمی کا
سرادِ سرمدی کیفِ جاوداں بخشا
نہ مل سکے اگر آپس میں جسم، کیا پروا!
رہیں گے تا ابد روحِ سخن پہ رخشندہ
مثالِ ویسہ و رامین و وامق و عذرا

یہی دعا ہے کہ رشتہ و جوانیاں مانگے!
ہمیشہ سرخوش و دلشاد رکھے تجھ کو خدا!

ادا جعفری

دل زدوں کے بس میں کیا تھا بے بسی بڑھتی گئی
بے رخی بڑھتی رہی، وارفتگی بڑھتی گئی

دل کے چھالے ہیں نہیں ہیں پاؤں کے یہ آبلے
منزلیں ہٹتی گئیں، وابستگی بڑھتی گئی

اُلجھنیں سی اُلجھنیں تھیں زندگی میں ہر نفس
ہر نفس اس زلف کی ژولیدگی بڑھتی گئی

اک تبسم، اک کلی کافی تھی ساری عمر کو
کیا کریں ہر گھونٹ اپنی تشنگی بڑھتی گئی

جتنا جتنا بے ثباتی کا یقیں آتا گیا
اتنی اتنی زندگی میں دلکشی بڑھتی گئی

ہاتھ میں جو شمع تھی گھٹتی گئی گھلتی رہی
نقشِ پائے رہرواں کی روشنی بڑھتی گئی

سرکشی کا بھی نتیجہ چلتے چلتے دیکھ لیں
جتنا جتنا سر جھکایا بے رخی بڑھتی گئی

ارتباطِ نور و ظلمت سے مفر ممکن نہ تھا
روشنی کلیوں میں، دل میں تیرگی بڑھتی گئی

چند ہی لمحے تھے لیکن کیا گراں گزرے ادا
اور وہ سمجھے لذتِ بے چارگی بڑھتی گئی

خانم مستان مرزا

○

ہمارا رازداں کوئی نہیں ہے
محبت کی زباں کوئی نہیں ہے

ہر اک غنچہ ہے مرجھایا ہوا سا
چمن میں باغباں کوئی نہیں ہے

قفس سے چھوٹ کر جائیں کہاں ہم
ہمارا آشیاں کوئی نہیں ہے

اندھیرے راستے، رہ کے لٹیرے ہیں
چراغ کارواں کوئی نہیں ہے

ہیں پژمردہ تیری یادوں کی کلیاں
بہار جاوداں کوئی نہیں ہے

عبارت ہے حیات و مرگ تم سے
ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

یہاں ہر جنس بک جاتی ہے مستانؔ
فن کا قدرداں کوئی نہیں ہے

خانم ممتاز مرزا

○

وہ کبھی سامنے جو آئے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھرائے ہیں
دُور پھر بھی ہوئی نہ تاریکی
ہم نے لاکھوں دئے جلائے ہیں
پھر دلِ لالہ، داغ داغ ہے آج
پھر صبا کے پیام آئے ہیں
ہار گوندھے ہیں پھر امیدوں نے
شوق نے پھر دئے جلائے ہیں
ہائے مجبوریاں محبت کی
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
رہگزر ہے نہ کوئی منزل ہے
ہاں مگر منزلوں کے سائے ہیں
ہم نے ٹھکرا دیے ہیں دیر و حرم
جب ترے راستے میں آئے ہیں
دشمنوں کی تو دشمنی معلوم
ہم پہ اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں
اپنا سرمایۂ حیات ہی کیا
کچھ لرزتے بجھے سے سائے ہیں

خیا: مستان مرزا

○

ہمارا رازداں کوئی نہیں ہے
محبت کی زباں کوئی نہیں ہے

ہر اک غنچہ ہے مرجھایا ہوا سا
چمن میں باغباں کوئی نہیں ہے

قفس سے چھوٹ کر جائیں کہاں ہم
ہمارا آشیاں کوئی نہیں ہے

اندھیرے راستے، روکے کھڑے ہیں
چراغ کارواں کوئی نہیں ہے

ہیں پژمردہ تیری یادوں کی کلیاں
بہار جاوداں کوئی نہیں ہے

عبارت ہے حیات و مرگ تم سے
ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

یہاں ہر جنس بک جاتی ہے مستاںؔ
سخن کا قدرداں کوئی نہیں ہے

خانم ممتاز مرزا

○

وہ کبھی سامنے جو آتے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں
دُور پھر بھی ہوئی نہ تاریکی
ہم نے لاکھوں دیے جلائے ہیں
پھر دلِ لالہ، داغ داغ ہے آج
پھر صبا کے پیام آئے ہیں

ہار گوندھے ہیں پھر امیدوں نے

شوق نے پھر دیے جلائے ہیں
ہائے مجبوریاں محبت کی
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
رہگزر ہے نہ کوئی منزل ہے
ہاں مگر منزلوں کے سائے ہیں
ہم نے ٹھکرا دیے ہیں دیر و حرم
جب ترے راستے میں آئے ہیں
دشمنوں کی تو دشمنی معلوم
ہم پہ اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں
اپنا سرمایۂ حیات ہی کیا
کچھ لرزتے ہوئے سے سائے ہیں

شفقت کاظمی

○

لالہ و گل سے پیار کیا کرتے ہم یقینِ بہار کیا کرتے
رہ گئی اپنی حسرتوں کی رمق حسرتوں کا شمار کیا کرتے
بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا ہم سرِ شاخسار کیا کرتے
جام اپنا تھا جب نہ مے اپنی احترامِ بہار کیا کرتے
اپنے شکووں پہ خود تھے نادم ہم تجھے شرمسار کیا کرتے
چل دیئے تیری راہ ویراں سے وقت کا انتظار کیا کرتے
تجھ میں گم ہو کے خود کو بھول گئے دل اسے یادِ یار کیا کرتے
اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا فرقِ لیل و نہار کیا کرتے
آ گیا یاد عہدِ بجاد کوئی ہو گئے اشکبار کیا کرتے
کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

شاعر لکھنوی

○

جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح
بس گیا دل میں تمنا کی طرح

دیدۂ منتظرِ سنگ ہیں ہم
میکدے میں سرِ مینا کی طرح

اُس کی معصوم نظر کے احساں
دل پہ ہیں تہمتِ بے جا کی طرح

تُم سے منسوب ہے اک طرزِ ستم
تم نہ دیکھو مجھے دنیا کی طرح

زندگی ایک چمن تھی جس میں
ہم سلگتے رہے صحرا کی طرح

دیکھ لیتے ہیں تماشا اپنا
ہم بھی ہیں چشمِ تماشا کی طرح

چند اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
غم بھی پایاب ہے دریا کی طرح

جان دینے کا ہنر جانتے ہیں
وہ جو ملتے ہیں مسیحا کی طرح

اُن کا پیمانِ وفا ہے شاعر
مستقل وعدۂ فردا کی طرح

شاعر لکھنوی

○

لب پہ آتا تھا نہ آنکھوں سے رواں ہوتا تھا
آپ کے غم کو تو آرائشِ جاں ہوتا تھا

شوخیٔ گل کی طرح تجھ کو عیاں ہوتا تھا
رنگ کو شرح تو خوشبو کو بیاں ہوتا تھا

چھو گئے وہ جسم عرق ہو گئی شبنم کی طرح
نکہتِ گل کو نہ اتنا بھی گراں ہوتا تھا

ہم بھی بیٹھے تھے کسی پھول کی خوشبو کے لیے
اس طرف بھی تو نسیمِ گزراں ہوتا تھا

جانے کیا ہے کہ پشیماں سی گزر جاتی ہے
وہ نظر جس کو حریفِ دل و جاں ہوتا تھا

بڑھ گیا ہی کے دوراں فاصلۂ ہجر و وصال
اس قدر آپ کو نزدیک کہاں ہوتا تھا

میں اگر چپ تھا تو کھلتا ترے رخسار کا رنگ
کچھ نہ کچھ معرکۂ شرح و بیاں ہوتا تھا

زیست دشواریٔ منزل کا ہے نام اے شاعر
راہ میں ایک نہ اک سنگِ گراں ہوتا تھا

فرصت

ابوسعید قریشی

یز کدہ ہے یہ دنیا خدایا
نہیں ہے یہاں
وئی فرصت کی آسودگی کی، مسرت کی ساعت
یہاں طفلِ نوزاد کی سانس اک چیخ ہے ٹوٹتے تارے کی مانند
ان سسکیوں کا دھواں
نتھنوں کا گلا گھونٹتا ہے
یہاں حسن خانے کا مرہونِ منت ہے
جوب ہے
ہوشوں، گلعذاروں کی خاطر
یہاں ناچتی چھریاں جال بنتی ہیں چپ چاپ میٹھی
کھلنے سے پہلے ہی غنچے نگوں سار ہیں — یاں
سرِ شام ہی سے سہاگن کے جوڑے کی کلیاں ہیں باسی
شام حنا اور کافور میں فرق مشکل ہے
اں شادیانوں میں نوحوں کے سُر گونجتے ہیں — یہاں
یہاں زندگی موت کی جیبی ہے
یہاں سانس لینے کی مہلت نہیں ہے
یہاں سفر کی کوکھ میں تیرگی کے بسیرے ہیں
بلوں میں پھولوں کے کانٹوں کے ڈیرے

خلا واہمہ یاں بہاروں کے ماتھے کا ٹیکا ہے
یاں کشت لالہ زاروں ہے خونِ جگر سے
ترقی — تنزل کی منزل کی یاں پیش رو ہے
گناہوں کے نیچے یہاں کچھ نہیں ہے
معابد کے آگے بھکاری کھڑے ہیں — پجاری
یہاں آدمی — آدمی کا خدا ہے
مگر وہ سمجھتے ہیں — دنیا
یہ دنیا خدایا — مصیبت نہیں ہے
اذیت نہیں ہے۔ یہ نعمت ہے
لیکن —
نہیں
مجھ کو یہ سوچنے کی بھی مہلت کہاں
اتنی فرصت کہاں دی ہے تو نے خدایا
بس اک سانس ہے زندگی آتی جاتی — یہاں
اتنی فرصت کہاں
اتنی مہلت کہاں
مجھ کو فرصت نہیں
مہر و مہ کے اشارے سمجھنے
ستاروں کے جھرنے
افق کے جھروکوں
شفق کے نشیمن میں رنگیں نگاروں کے جلووں سے چشمک کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
کہکشاں کی روش پر بہاروں کی نظارگی

آبشاروں
پھواروں
ہواؤں
فلک کی بلندی پہ رقصاں شراروں
درختوں کی شاخوں میں سرگوشیوں کے ترنم
تخیل بیاباں پہ باران رحمت کی رم جھم
شبستاں کے سایوں میں ہونٹوں کے ملنے
دھڑکتے دلوں کے
تنفس کے نغموں کو سننے کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
محبت کی
ہنس بول لینے
کہیں دل لگانے
خیابان حیرت میں آہو خصالوں کی رم خوردگی کے تماشے کی فرصت –
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
چاک گل کے رفو
اشک جبیں پہ آنسو بہانے کی حسرت کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
صید و صیاد کے ربط باہم پہ غم خوردگی کی — تجزیے — حیرت کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
جور و بیدادِ خواہش
آلِ وفا پر
جفا پر حسینوں کے دل خون کرنے
ستم پر تمنائی رونے
خرابِ محبت کے ارمان کی بے چارگی ۔ بے بسی کا تماشا دکھانے
فسانہ سنانے کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
سخن گستری کی
ستائش کی خواہش کی
عرضِ ہنر کی
شکایت کی ۔ شکوے کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
مگر سوچتا ہوں کہ شاید اسی میں کوئی مصلحت ہو
یہ فرصت کا ہونا نہ ہونا
اندھیرے اُجالے کی مانند احساس ہے اک اضافی
خوشی اور غم کی طرح
اور وجود ایک کا دوسرے کی بدولت ہے
ورنہ
وہ کیا ہیں کہ جن کو شکایت ہے فرصت نہ ہونے کی
اس کو ——— مجھ کو

مجھے یاد ہے وہ زمانہ
وہ شب پھیل کر سیکڑوں سال پر جو مسلط تھی،
حاوی تھی
جس کا بنا تھا فسانہ
وہ شب جس کی اک ایک ساعت
فقط ایک بے مہر عورت کے در پہ جدائی میں کوہِ گراں بن گئی تھی
مگر مجھ کو اس وقت فرصت کی خواہش کہاں تھی
مجھے یاد ہے
اور — مجھے یاد ہے
بندگی کا غلامی کا وہ دورِ سنگین
شب و روز کا وہ تواتر
ہمالہ کے سایوں میں زنجیرِ جنباں
مرا پائے کوباں
مگر سوچتا ہوں
وہ فرصت کی گھڑیاں اذیت تھیں
اس وقت فرصت کی خواہش کسے تھی
مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے وہ سحر
جو سلاسل کے کٹنے کا اعلان تھی
اک نئی زندگی کا علم لے کے ابھری تھی
لیکن —
مرے تن کے لہو سے منور رہی تھی
اس وقت سوچا تھا میں نے
اسی کے لیے۔ کیا اسی کے لیے مجھ کو فرصت کی خواہش تھی

اے کاش فرصت نہ ہوتی مجھے
مجھ کو فرصت نہ ہوتی

مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے
اُس فرصت کی ساعت
جب تمام تر وقت
اک قفل مکتب کے سامنے کی صورت
سمٹ کر
تو بڑے انساں کے اس کی فطانت سے ڈر کر
تحیر زدہ
یہ وحشت کے بازار میں نقش دیوار تھا — ٹھٹھر گیا تھا
مگر اس کے چاروں طرف
آگ کی آندھیاں تھیں
بگولے تھے
سمندر تھے
دریا تھے
طوفان تھے
اور فوجیں بیاباں کے تھے
تباہ کاریاں اس کی
سب ہیچ تھیں جن کے آگے
مگر آہ وہ نقش دیوار فرصت کی وہ نابکاری کی — وہ مستقل جانکنی کی اذیت کی ساعت
تصور سے اس کے مجھے آج بھی ہول آتا ہے
تو یہ ہے میری
تمدن کو تہذیب سے
آدمیت کو انسانیت سے بچانے کی اس فرصت حشر ساماں سے

تصوّر مرا
مجھ کو ان جنگلوں میں لیے جا رہا ہے
جہاں روشنی جیسے بھٹکے ہوئے جگنوؤں کی طرح اک ذرا سی فضا جگمگا کر کہیں
سرد غلطاں سایوں میں فرصت کی اک ساعتِ مضمحل کی صدا بن کے
سارے میں پھیلی ہوئی ہے
انھیں تیرہ و تار وحشت کدوں کے کنارے کہیں زندگی کے بسیرے ہیں

اور

ابنِ آدم یہاں برگِ انجیر سے بھی معرّا ہے،
یاں آگ اور ناگ معبود ہیں
اور وقت ایک رفتارِ معکوس،
قابوس بن کر معلّق ہے
نوحہ کناں، پا بجولاں گراں بار لمحے یہاں آدمی کے لیے سینہ زن ہیں،
یہاں ریگِ صحرا سی پھیلی ہوئی ساعتیں پا بریدہ
بھٹکتی ہیں رفتار کی
کتنی فرصت ہے یاں
کتنی فرصت ہے یاں — اُف — خدایا
نہیں مجھ کو فرصت کی خواہش نہیں ہے!

رفعت سلطان

○

نصف شب یہ ہوا کا جھونکا ہے   یا دبے پاؤں کوئی آیا ہے
ایک مدت کے بعد میری طرف   غور سے آج اس نے دیکھا ہے
بے خیالی میں یہ خیال کہاں   کب کسی نے مجھے پکارا ہے
کوئی میرا نہیں رفیق سفر   میرے ہمراہ میرا سایا ہے
کس زباں سے تجھے یہ سمجھاؤں   تو مری آخری تمنا ہے
خندۂ گل بھی، اشک شبنم بھی   زندگی کیا ہے اک تماشا ہے
ایسی دنیا کو کیا کہیں کہ جہاں   ہر حسیں آرزو بھی رسوا ہے
تشنہ لب ہیں جہاں تمنائیں   آہ، وہ میرے دل کا صحرا ہے
آ رہی ہے ترے بدن کی مہک   حسن اعجاز یہ صبا کا ہے

اب تو اس بزم میں بھی اے رفعت
میری خاموشیوں کا چرچا ہے

رفعت سلطان

○

حسنِ فطرت کی جستجو ہے مجھے
زندہ رہنے کی آرزو ہے مجھے

میں کہ ہوں تشنۂ ازل ، پھر بھی
حسرتِ ساغر و سبو ہے مجھے

پھر ترے پاس آگیا ہوں میں
پھر تمنائے گفتگو ہے مجھے

میں فدائے گل و گلستاں ہوں
کیا کروں ذوقِ رنگ و بُو ہے مجھے

بیٹھ کر باادب سنیں شاعر
پڑھ رہا ہوں غزل وضو ہے مجھے

میری دیوانگی پہ طنز نہ کر
کیا خبر کس کی جستجو ہے مجھے

جاؤں اُس کی گلی میں کیسے رفعت
پاسِ ناموس و آبرو ہے مجھے

بشیر بدر

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پرونے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوئے ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

بشیر بدر

○

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا۔ روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اُترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

پوچھنے والوں نے آکر حالِ دل پوچھا مگر
درد جس پہلو سے ہوتا تھا جہاں ہوتا رہا

اک ہوائے بے تکاں سے آخرش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
وہ تمام عمر جاگا تھا پڑا سوتا رہا

بند دروازوں، دریچوں پر گرا کر پردوں کو
ایک خط پڑھ پڑھ کے ساون کی طرح روتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح سوتا رہا

"روشنی" کو "رنگ" کرکے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

شکیب جلالی

○

حرف جو اس زبان سے نکلا　　نکہتِ گل کی شان سے نکلا
چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں　　کوئی سایہ مکان سے نکلا
ایک شعلہ پھر اک دھوئیں کی لکیر　　اور کیا خاکدان سے نکلا
چاند جس آسمان میں ڈوبا　　کب اسی آسمان سے نکلا
اس کے سائے سے کیوں گریزاں ہے　　کام جس مہربان سے نکلا
یہ گہر جس کو آفتاب کہیں　　کس اندھیرے کی کان سے نکلا
آنسوؤں کی تراش کر چادر　　پتھروں کے جہان سے نکلا
جب بھی نکلا ستارۂ امید　　کہر کے درمیان سے نکلا
پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے　　پھر دھواں گلستان سے نکلا
شکر ہے اس نے بے وفائی کی　　میں کڑے امتحان سے نکلا

دھیرے دھیرے شکیب یاد کا شہر
دھند کے سائبان سے نکلا

سوز و فن

صدیق کلیم

عرفان : یہ ہر اک سمت گھنی تیرگیاں
روشنی لہر بنے تیرتی ہے ڈوبتی ہے
اس اک چاند کا ہو جائے طلوع
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ یہ منور لہریں
کاش پھر کوئی کلیم
کوہِ سینا پہ رگِ جاں ہو جائے
مشعلِ راہ فروزاں ہو جائے

شمسہ : اُف یہ سوچ !
اس قدر گہری گھنیری سوچیں !
پھیلتی کانپتی راہوں کا سفر
دور بھی نزدیک بھی برفاب چناروں کا ہجوم
وہ حیا غاروں کے پُر ہول قطار
اُف یہ خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت

عرفان : کیسے خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت !
تو نے دیکھا کیا ہے ؟

کوہ کی سطح سے ٹکراتے ہوئے بھاری بادل
پھیلتے ناچتے ہر سمت گرجتے بادل
وحشت انگیز ہواؤں میں کڑکتے بادل
سنسناتی ہوئی وحشی لہریں

ہر نفس ناچتی ہیں ڈانٹتی ہیں چیختی ہیں
بجلیاں کوندتی ہیں ڈوبتی ہیں کوندتی ہیں

شمسہ : پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے !
تم شاعر ہو
تم دانشور ہو
تم سب کچھ ہو پر تم دنیا کے رسیا بھی ہو
تم کو دنیا کا علم نہیں ہے
تم دنیا کو بدلو گے ؟
تم پاگل ہو
یا اس فکر کی ایندھن سے آگ جلاؤ
یا اس کو نیچے غاروں میں پھینکو
انسان بنو
پاگل نہ بنو
میں سچ کہتی ہوں
تم پاگل —

عرفان : اس درد کو سینے سے لگنے پھر سے کیا حاصل ہے ؟
جس درد کو اظہار میسر ہی نہیں
اس درد سے کیا حاصل ہے ؟
پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے !
سننے والوں کے دلوں میں جب تک نہ اترے

گیتوں کی آگ سسک کر بجھ جاتی ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟
یہ درد سسک کر مر جاتا ہے
انسانوں کا درد امر ہو جاتا ہے
بے کار امر ہو جاتا ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟

فیاض: ہیلو! عرفان!
او ہو تم تو کھوئے بیٹھے ہو۔ اپنے سے ہی روٹھے بیٹھے ہو
رات ایک نہیں دو نظمیں لکھی ہیں
وہ بھی سنو:

(۱)

مری پیاری مری جان
پھر چھیڑو خوب چھیڑ
بے کراں رقص کی لے تیز کرو
سلگتے ہوئے ہونٹوں کی بہار
یہی سب کچھ یہی امرت رس ہے
مری پیاری مری جان
نغمۂ لے تیز کرو
بھول جاؤ مری آغوش میں آؤ
کہ ذرا پیار کریں
یہ مرے گیت یہی دولت ہیں
مری پیاری مری جان
مجھ کو محروم نہ کر
"تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ"
نغمۂ زیست سنا
دل بھرا ساز بجا
گا ابھی اور بھی گا
ناچ کی لہر اٹھا
زیست کا ساز بجا
مری پیاری مری جان!

(۲)

اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
آخر وہ مجھ کو نہ بھی ملی تو کیا
جو سینے کے زنداں میں سلگتا ہے
اس درد کو راہ نہ بھی ملی تو کیا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
چاند ستاروں کی اوٹ وہ رہتی ہے
سب سے اونچا محل ہے اس کا گھر
وہ پیت نگر کی ایک ہی رانی ہے
مجھ کو ہے پیت نگر کا پیش سفر
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اس کا ایک سنہری پیارا مجسمہ
یہ سارا جیون دے کے بناؤں گا
وہ مجھ کو بے شک نہ بھی اپنائے
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا

عرفان: پھر وہی گیت۔ وہی پیار کی سطحی بات
کبھی اونچی کبھی نیچی کبھی سطحی بات
تم کبھی اپنے سے باہر آؤ — دیکھو
ان دمکتے ہوئے بازاروں کی رونق دیکھو
ان مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو

میں تمہیں شعر سناتا ہوں ۔ مرے دوست ۔
بغور سنو ۔
زندگی درد بنے گی مجھے معلوم نہ تھا
زہر بسے جو ٹلے گی مجھے معلوم نہ تھا
میرے خوں کے تاروں سے سلگتی ہوئی آگ
روشنی ایسے بنے گی مجھے معلوم نہ تھا
صبح کے پیار کی سندر متحرک کرنو!
اس طرح شام ڈھلے گی مجھے معلوم نہ تھا
زندگی درد بنے گی مجھے معلوم نہ تھا"
میں تو پھر آپ کے اشعار سے محروم رہی
اک درخواست ۔ مکرر ارشاد"
: تم ہمیں شعر سناؤ نظم

تم ہمیں شعر سناؤ نظم

وہ تو ایک رسالے میں چھپی ہے
یہ پسند آئی تھی لکھ رکھی ہے

ارشاد!

سانس کا سلسلہ جاوداں
… نور میں حرارت رواں
… مری دھڑکنوں کا امیں
… مہکتی بہاروں کا رس
… فضا میں نئی زندگی ہے
… قدم پہ یہاں تازگی ہے

نغمہ خواں جسم کی راگنی
سر سے پاؤں تلک آگ سے
پھول سے چاند کی دلکشی،
شاہراہوں کی یہ رونقیں
یہ بسیں برجستہ موٹریں،
یہ دکانیں ۔ یہ سب رستوراں
درد و لذت کی آمیزشیں
ہر نفس خوں کی گردشیں
سنگتراشوں نے پتھر میں دیکھا جسے
شاعروں نے زباں میں پرویا جسے
فارمولوں میں سائنس نے لکھا جسے
دو صدی سے مشینوں نے ڈھالا جسے
حسن ہی تھا صداقت بنایا جسے
آج یہ زندگی کا نیا روپ ہے
اک نیا فن ہمیشہ حقیقت نئی
یہی زندگی ہے ۔ یہی زندگی
زندگی اے نئی زندگی!
تیرے بیٹے، تری بیٹیاں
اس جہاں میں جہاں پر بھی ہیں
وہ ملوں میں ہوں کھیتوں میں ہوں
در بسر ہو کہ ہو زندگی،
تیری خاطر کسی کام پہ
جی رہے ہیں ترے نام پہ
ہر نفس ہے تیری بندگی
زندگی اے مری زندگی!

مضطر اکبر آبادی

٥

نکل کر چلے ہیں راہ میں ہر نقشِ پا سے ہم
آگے رہے ہیں چار قدم رہنما سے ہم

سانسوں کی بھیک مانگ کے آنکھیں تو کس لیے
کیوں ہیں وفا کا عہد کسی بے وفا سے ہم

اک مستقل سکوت ہے دل سے زباں تک
محروم ہو گئے ہیں اب اپنی صدا سے ہم

جرمِ وفا کیا ہے کریں گے ہزار بار
ڈرتے نہیں جہاں کی کسی بھی سزا سے ہم

حائل ہیں اپنی راہ میں کوتاہ دستیاں
کس طرح چھین لیں تری خوشبو صبا سے ہم

بجھتے ہوئے چراغ سے لیتے ہیں روشنی
بڑھتے ہیں ابتدا کی طرف انتہا سے ہم

کچھ غیر مطمئن بھی ہیں کچھ مطمئن بھی ہیں
مضطر سکوتِ ساز و شکستِ صدا سے ہم

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں طویل نظم کا ایک حصہ)

ریاض انور

میں اک مسافر شکستہ دل، پا بہ گِل
نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل
سکونِ قلبِ حزیں کی خاطر مثالِ بسمل
نہ جانے کب سے تڑپ رہا ہوں
چمن چمن، دشت دشت گھوما
مگر کہیں بھی ملی نہ مجھ کو

وہ اک کرن جو حریفِ شب ہو
روش روش، کنج کنج ڈھونڈا
وہ گیت جو کہ متاعِ لب ہو
میں اک مسافر شکستہ دل، پا بہ گِل
گئے زمانوں کے نقش ہائے قدم کی شمعوں کی جستجو میں
خلیجِ دریا کی شوخ لہروں سے بات کرنے کی آرزو میں
ازل کی محرومیوں کا عفریت ساتھ لے کر
بہ قلبِ ویراں، بہ دیدہ تر
کھڑا ہوا ہوں صلیب بن کر
کنارِ دریا
خموش، تنہا!

خلیج لہرو، خلیج لہروں کی ہمسفیرو ٹھہر بھی جاؤ
مجھے کچھ اس سرزمینِ نغمات و رقص کی داستاں سناؤ

یہ سرزمیں جس کے گیت جھرنوں کی نغمگی سے بھی دلنشیں ہیں
یہ سرزمیں جس کے رقص قوسِ قزح کے رنگوں سے بھی حسیں ہیں
یہ سرزمیں جس کے دکھ حسین تر ہیں شعر و نغمہ کی چاندنی سے
یہ سرزمیں جس میں موت چلتی ہے اک قدم ہٹ کے زندگی سے
عظیم مرد، عظیم عورتوں کی ہمسفیرو
تمہارے لطف و کرم سے شاداب کھیتیوں میں یہ دلکشی ہے
تمہارے حسنِ نظر سے روشن ہیں قریہ قریہ چراغ کتنے
تمہارے دم سے چمن چمن پھول مسکراتے ہیں سرخوشی سے
یہ صندلی گیت جوٹ کے، بھنڈ ڈاب کے، ناریل کی خوشبو
یہ صف بہ صف باغ آم کے اور دھان کی لہلہاتی فصلیں
ندی ندی تیرتے کنول مسکراہٹوں کی بہار ہر سو
تمہارا خون ہی ہر ایک پتے کے ریشے ریشے میں گھومتا ہے
تمہاری آواز ہی کے سنگیت پر یہ سنسار جھومتا ہے
عظیم مرد، عظیم عورتوں کے ہمسفیرو
کبھی تو وجہ حیات ہو تم کبھی ہو پیغامِ نیستی کا
تمہارے دستِ جفا سے اکثر بجھا ہے مہتاب زندگی کا
وہ بستیاں جن کو تم نے پالا ہے اپنی آغوشِ جاں فزا میں
تمہارے شوقِ فنا کے ہاتھوں کی زد میں آ کر کھنڈر بنی ہیں
پہلی آواز : افق پر یہ کیسا اندھیرا ہے، کیسا دھواں ہے
سنو غور سے یہ ہواؤں کی آواز جیسے کوئی رو رہا ہو
دوسری آواز : یہ طوفاں کی آمد کا پہلا نشاں ہے
پہلی آواز : یہاں دل تو پہلے ہی محرومیوں کے بگولوں کا مسکن بنے ہیں
یہاں آنسوؤں کی جھڑی دیدنی ہے
یہاں تو ہر اک آنکھ پہلے ہی مرتی ہوئی آرزوؤں کا مرگھٹ بنی ہے

یہاں تو ہر اک گام پہ موت کی ایک چادر تنی ہے
برس ہا برس سے فلاکت کے طوفاں، فاقوں کے جھکڑ یہاں خیمہ زن ہیں
یہاں کیسا طوفاں؟

دوسری آواز: یہی زیست اور موت کی کشمکش
ارضِ بنگال کے رقص و نغمہ کی جاں ہے

درخت کے پتوں کی آواز چیخوں میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے
یہ دریا کی لہریں ہیں یا کوئی دیوار بڑھتی ہوئی آ رہی ہے
مکاں اس طرح گرتے جاتے ہیں جیسے
کوئی بلبلہ آب کا پھوٹ جائے
یا جیسے گھروندا کوئی ریت کا
بادِ صرصر کی یلغار سے ٹوٹ جائے
چھتیں ٹین کی اس طرح اڑ رہی ہیں
ہواؤں کے ریلے میں جیسے کوئی خشک پتا رواں ہو
یہی کھڑکھڑاتی چھتیں تیغ بن کر سروں کو بدن سے جدا کر رہی ہیں
ہر اک سمت چیخوں کا شورِ قیامت
سسکتے، بلکتے ہوئے آدمی
موت کے دستِ بے رحم سے بچ نکلنے کی خاطر
تناور درختوں سے چمٹے ہوئے ہیں
مگر تند دریا کی بے مہر لہریں
سروں سے گزرتی
نگاہوں کی شمعوں کو بے نور کرتی
مجسم اجل بن کے آثارِ ہستی مٹاتی چلی جا رہی ہیں

ان [illegible] ڈھل گئی ہے، ہوا تھم گئی ہے
کراں تا کراں سنسناتی ہوئی خامشی نوحہ خواں ہے
نہ کوئی مکیں ہے نہ کوئی مکاں ہے
یہ اُجڑے ہوئے کھیت، ٹوٹی ہوئی کشتیاں گزرے لمحات کی داستاں ہیں
دھڑکتے ہوئے دل، مہکتے ہوئے ہونٹ، شاداب چہروں کے گلشن کہاں ہیں؟

عظیم لہرو، عظیم لمحوں کی ہمسفیرو
کھڑا ہوا ہوں تمہارے پہلو میں اپنے خوابوں کی راکھ لے کر
شکستہ دل، پا بہ گِل
بہ قلبِ ویراں، بہ دیدۂ تر
تمہاری آغوش کاش بن سکتی میری منزل

اختر ہوشیارپوری

میں نے یوں دیکھا اُسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا
اور جب دیکھا تو آنکھوں پر یقیں آتا نہ تھا

ریگِ ساحل تھا ہمارا ساحلِ دریا نہ تھا
پھر بھی قدموں میں رہی ہے موج میں پیاسا نہ تھا

بام و در سے سخت بارش میں بھی اُٹھے گا دھواں
یوں بھی ہوتا ہے محبت میں کبھی سوچا نہ تھا

آندھیوں کو روزنِ زنداں سے ہم دیکھا کیے
دُور تک پھیلا ہوا صحرا تھا نقشِ پا نہ تھا

لوگ لائے ہیں کہاں سے شب کو مرمر کے چراغ
ان چٹانوں میں تو دن کو راستہ پیدا نہ تھا

شہر کی ہنگامہ آرائی میں کھو کر رہ گیا
میں کہ اپنے گھر میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہ تھا

تم سے پہلے راستوں میں قمقمے روشن نہ تھے
شہر کی دیوار سے صحرا نظر آتا نہ تھا

نت نئے انداز سے رہتی تھی اُن سے گفتگو
دوستوں میں جب مرا رنگِ سخن رُسوا نہ تھا

برف اپنے آپ گُھل جاتی ہے سورج ہو نہ ہو
شام سے پہلے یہ جانا تھا مگر سمجھا نہ تھا

اُن دنوں بھی شہر میں سیلاب آتے تھے بہت
وادیوں پر جب کہیں بادل ابھی برسا نہ تھا

دامنِ محمل تلک نہ تھا محفوظ گردِ راہ سے
ہاں مگر تیرے شہیدوں کا کفن میلا نہ تھا

رات کی تنہائیوں میں جس سے چونک اُٹھے تھے ہم
اپنی ہی آواز تھی شعلہ کوئی چمکا نہ تھا

وہ بھی سچ کہتے ہیں اختر لوگ بیگانے ہوئے
ہم بھی سچے ہیں کہ دنیا کا چلن ایسا نہ تھا

بشیر منذر

○

بات ہے تب کی وہ جب دیکھیں گے
چاند نکلے گا تو سب دیکھیں گے

کیا ہے جینے کا سبب دیکھیں گے
ہم بھی وہ پھولوں سے لب دیکھیں گے

ہونے والا ہے چراغاں دل میں
آپ بھی جشنِ طرب دیکھیں گے

حسرتیں اپنی جو یکجا کر لوں!
لوگ اک شہرِ عجب دیکھیں گے

جب وہ گزریں گے ادھر سے تو ہمیں
باملاحظہ، بہ ادب دیکھیں گے

دیکھنا شانِ کریمی منذر
وہ مرا ظرفِ طلب دیکھیں گے

بشیر منذر

○

دامان تار تار ہے دل لخت لخت ہے
تعزیرِ عشق زہرہ وشاں کتنی سخت ہے

ہونٹوں کی تازگی ہے بہاروں کا زادِ راہ
آنکھوں کا حُسن چاند ستاروں کا رخت ہے

سایہ نہ کوئی، شاخ ثمردار ہے کہیں
کتنا عجیب تیری وفا کا درخت ہے

پنبہ بگوش کس لیے رہتی ہے مرگ بھی
آوازِ سازِ زیست کی شاید کرخت ہے

مرنے کے بعد بھی نہ سکوں مل سکا کہیں
جاں دادگانِ عشق کا اتنا ہی بخت ہے

اختر لکھنوی

○

ہر رنگ میں جو ان کے وفادار رہے ہیں
اختر وہ خطاکار سزاوار رہے ہیں

جب تک نہیں واقف تھے تری راہگزر سے
ہر راہ میں ہم صورتِ دیوار رہے ہیں

ہنگامِ جنوں میں بھی تری چاہ کی حد تک
دیوانے ہمیشہ ترے ہشیار رہے ہیں

مہتاب کی منزل میں ہیں اب قافلے ان کے
جو لوگ ترے محرمِ اسرار رہے ہیں

وہ چشمِ غضب ہو یا نگاہِ کرم ان کی
ہم لوگ بہر حال سرِ دار رہے ہیں

چاہیں تجھے چھپ چھپ کے یہ ہم سے نہیں ہوتا
ہم چاک گریباں سرِ بازار رہے ہیں

اعتراف

شاعر ندیم

آج تجدیدِ وفا کا دن ہے
آج کے دن کو تری یاد سے نسبت دی ہے

آج پھر اپنے ارادوں کی اُٹھے گی تمہید
آج پھر ہوگی نگاہوں کو ادب کی تاکید
آج پھر تجھ سے محبت کی رہے گی تائید

آج پھر حرفِ محبت پہ نکھار آئے گا
آج پھر تذکرۂ رقصِ بہار آئے گا
تجھ پہ پیار آئے گا اور ٹوٹ کے پیار آئے گا

پھر ترے دستِ حنائی پہ بندھیں گے پیماں
پھر سے کھل جائے گی ترسی ہوئی باہوں کی کماں
پھر سے جھوم اُٹھیں گی ارمانوں کی ہر رگِ جاں

تیرے گیسو کی سیاہی میں گزارا ہوگا
تیری معصوم نگاہوں کا سہارا ہوگا
غمِ ایام کی وحشت سے کنارا ہوگا

جلوۂ حسن سے بام ہمیں پہ ہوگا
تیری چاہت کا ہر الزام ہمیں پہ ہوگا
تیرے انعام کا اکرام ہمیں پہ ہوگا

آج آئے ہیں تو ہم دادِ وفا لے لیں گے
ایک ساعت کی تمنا کا صلہ لے لیں گے
جتنی تقدیر ہے کچھ اُس سے سوا لے لیں گے

لب شناسا ہوئے جن سے وہی شوق کی بات
زندگی جس سے عبارت ہے وہ غم کی سوغات
کتنے چاندی کے حسیں خوابوں کی جھلمل بارات

تیرے پہلو میں سلسل بن کے اتر جائے گی
میرے معصوم پہ نادیدہ اثر لائے گی
بیاہنے تجھ کو ترے روپ نگر آئے گی

سوچتے تھے کہ ترے در کو بھلا دیں گے
اب اُٹھے ہیں تو کہیں دور نکل جائیں گے
اب چلے ہیں تو ترے پاس نہیں آئیں گے

تجھ سے روٹھے تو زمانے میں کہیں بھی نہ گئے
تجھ سے بچھڑے تو رہے دل میں تری یاد لیے
تجھ سے چھوٹے تو ترے اور قریب آ بیٹھے

آج کے دن تو تری یاد نے فرصت دی ہے
آج تجدیدِ وفا کا دن ہے

رخصت

شاعر ندیم

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
دل سے مٹنا مرے انگشتِ حنائی کا خیال
میں کہیں دور کہیں دور چلا جاؤں گا
کتنا اندوہ فزا ہے یہ جدائی کا خیال

مجھ سے منہ موڑ کے ایک ایک چلے جاتے ہیں
یہ مہکتے ہوئے دن اور یہ تاروں بھری رات
چند یادوں کے دیے چند خیالوں کے نجوم
یہی واماندہ مسافر کو ملے گی سوغات
چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
ان میں کھو جائے گا اک شاعرِ سادہ کا ثبات

نئے مہرے نئے شاطر نئی چالیں لے کر
پھر ایام بچھانے لگا فریبوں کی بساط
سب حسیں نقش بکھر جائیں گے پتوں کی طرح
ذہن و افکار سے مٹ جائے گی تصویرِ نشاط

اک نگہ اور سہی اور سہی اور سہی!

یہ مہکتی ہوئی زلفیں یہ غزالیں آنکھیں
کون آئے گا پلٹ کر یہ خیال آتا ہے
کہیں حسرت کوئی رہ جائے نہ باقی دل میں
جب کرم رخصتِ گستاخی و بیباکی ہے
اک نظر اور ابھی اور ابھی اور ابھی!

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں

شاعر ندیم

جب چراغوں کی لویں چپ ہو جائیں — روشنی سوتی ہے دھرتی میں کہیں
جب ستاروں کے دیے بجھتے ہیں — رقص کرتی نہیں چاندنی کی زمیں
چاند جب روٹھ کے چھپ جاتا ہے — رنگ اور روپ کا انبار کہاں
ساز کے تار بکھر جاتے ہیں جب — راگ ہو جاتے ہیں مایوس و گراں
آشنا ہو چلے جب نغموں سے — اپنے لب، پھر کوئی جھنکار نہیں
بھول جاتے ہیں محبت کے رسوم — جیسے اب کچھ بھی سروکار نہیں

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں
درد کی راتیں بہت روتی ہیں

اب نہیں جاگیں گے بیتے ایام — اب نہ ٹوٹے گا سحر یا سنگیت
اب چراغاں نہیں ہوگا ہرگز — اب نہ تڑپیں گے فضا میں نئے گیت
کسی آواز کا خاموش طلسم — اب بہاروں کو نہیں لائے گا
کسی تقدیر کا رخشاں انداز — چاند تاروں کو نہیں لائے گا
دل کی دھڑکن میں نہ ہوگی کوئی گونج — اب نہ مہکیں گی سہانی راتیں
اب تو ہے درد خیالات کے ساتھ — غمزہ و آلام کی ہوں گی باتیں

اب نہیں جائیں گے بیتے اوقات
اب نہیں نکلے گی ارماں کی بات

پہرے

شاعر ندیم

احساسِ عجز و شدتِ جذبات پہ پہرے
خود ہم نے لگائے تھے ہر اک بات پہ پہرے

پہلے ہی سے محتاط تھا جو رندِ خرابات
بڑھتے گئے اس رندِ خرابات پہ پہرے

جو بات ابھی وہم و گماں میں بھی نہیں تھی
کیا خوب لگاتے ہو اسی بات پہ پہرے

اچھی یہ عنایت ہے کہ اپنوں پہ بھی شک ہے
گر ہے یہ عنایت تو عنایات پہ پہرے

ہم ہی سو اٹھائیں گے یہ اک بارِ ندامت
ورنہ رکھے ہم سے خوش اوقات پہ پہرے

خاموش خیالات پہ بس کس کا چلا ہے
کس طرح بٹھاؤ گے خیالات پہ پہرے

وہ تیری ہی یادوں کے لیے وقف رہیں گے
ہم نے بھی لگا رکھے ہیں کچھ اوقات پہ پہرے

اب کس کی شکایت کریں اے دوست کہ ہم کو
منظور ہوں جب خود ہی ہمی ذات پہ پہرے

قتیل شفائی

○

پیار کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں
صرف آنسو جہاں انسان کے کام آتے ہیں

اُن کی آنکھوں سے رکھے کیا کوئی امیدِ کرم
پیاس مٹ جائے تو گردش میں وہ جام آتے ہیں

زندگی بن کے وہ چلتے ہیں مری سانس کے ساتھ
اُن کو ایسے کئی اندازِ خرام آتے ہیں

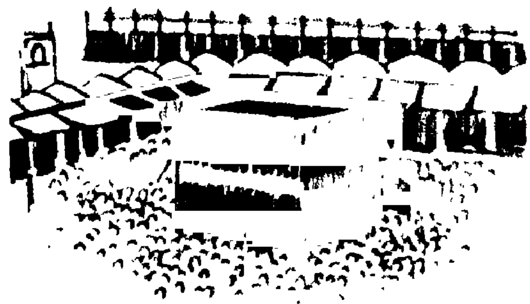
ہم نہ چاہیں تو کبھی شام کے سائے نہ ڈھلیں
ہم تڑپتے ہیں تو صبحوں کے سلام آتے ہیں

قوتِ دستِ طلب کا نہیں جن کو ادراک
تیرے در سے وہی بے نیلِ مرام آتے ہیں

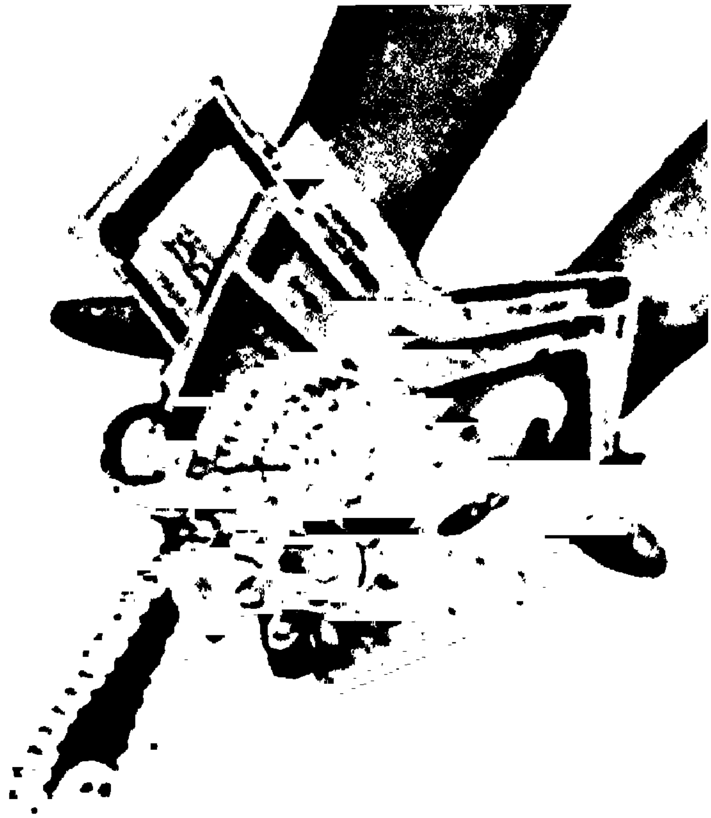
منہ چھپا لیتے ہیں غم حضرتِ ناصح کی طرح
جب بھی میخانے میں رندانِ کرام آتے ہیں

ہم اچھے ہو جائیں نہ کچھ اور بھی راتیں بھاری
یاد اکثر وہ ہمیں اب سرِ شام آتے ہیں

چھن گئے ہم سے جو حالات کی راہوں میں قتیل
اُن حسینوں کے ہمیں اب بھی پیام آتے ہیں



وطن پر
سب کچھ
نثار



دفاعی با

۱۹۷۰ء

میں زیادہ سے ز
سرمایہ لگائیے

۵٪ فیصد شرح منا

یہ بانڈ ۰ روپے [illegible]
فروخت کئے جائیں گے۔
[illegible]

بانڈوں پر ۵ فیصد سالانہ منافع دیا جائے گا جس کی تقسیم ششماہی ۰ مئی اور ۰ نومبر کو کی جائے گی۔
اپنے بانڈوں پر منافع لینے کے خواہاں نہ ہوں وہ درخواست کے اوپر دائیں کونے میں نمایاں طور پر
[illegible] اور اس کے نیچے دستخط کر دیں۔ بانڈوں کے لئے درخواستیں ایک صد روپیہ یا اس کے حاصل ضرب
ہونی چاہئیں ۔ بانڈ اسٹاک سرٹیفکیٹ یا پرامیسری نوٹ کی صورتوں میں جاری ہونگے۔
رقومات کی واپسی ۰ نومبر ۱۹۷۰ کو عمل میں آئے گی۔
درخواستوں کے ہمراہ مطلوبہ رقومات نقد یا چیک کی صورت میں مندرجہ ذیل مقامات پر ادا ہونی

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر
واقع کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی
[illegible] ڈھاکہ، چاٹگام۔
[illegible]

ایسے مقامات جہاں اسٹیٹ بینک آف
پاکستان کے دفاتر نہیں ہیں درخواستیں
نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخوں
میں وصول کی جائیں گی

جہاں اسٹیٹ بینک آف پاک
نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخ
نہیں ہیں وہاں سرکاری خزانے
درخواستیں وصول کی جائیں گی

جاری کردہ:- وزارت مالیات ۔ حکومت پاکستا





اِستعفا

ڈاکٹر محمد باقر

حضور! آپ باور نہیں فرمائیں گے لیکن میں واقعی اپنی ملازمت سے استعفا دے رہا ہوں اور باور نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں جبکہ یہ تحریر میرے ہاتھوں سے لکھی ہوئی آپ کے سامنے ہے۔ البتہ آپ کو تعجب ضرور ہوگا کہ اس بیروزگاری کے زمانہ میں میں نے یہ جسارت کیوں کی، خصوصاً ان حالات میں جبکہ میرا کوئی اور ذریعۂ معاش بھی نہیں۔ میرے پاس آپ کی طرح زمین بھی نہیں۔ بینک والا خانہ خالی ہے۔ میں نے آپ کی طرح ایک درجن ٹیکسیاں بھی نہیں بنائیں جو سے ہر شام کو پچاس روپے فی ٹیکسی وصول کروں۔ میرا اس کارخانے میں بھی کوئی حصہ نہیں جس کو امپورٹ لائسنس میری ہی وساطت سے آپ نے اس شرط پر دیا تھا کہ کارخانہ دار دس فیصد حصے کا مالک آپ کی محترمہ بیگم صاحبہ کو قرار دے۔

لیکن سرکار! میں اب اس ملازمت کی زندگی سے اس قدر اکتا گیا ہوں اور تھک گیا ہوں کہ میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ میں قبر میں پہنچنے سے پہلے ایک دفعہ کم از کم پھر اس زندگی کو شروع کروں جس سے مجھے ذہنی آسودگی کے ساتھ حلال کی روٹی ملے۔

عالیجاہ! آپ میری اس جسارت کو دیکھ کر تیوری چڑھا رہے ہیں۔ میں اپنی چشمِ تصور سے آپ کی اس پیشانی کو دیکھ رہا ہوں جس پر بل پڑ رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بل بلا وجہ بھی پڑتے تھے۔ اور میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جب کاغذ آپ کے سامنے میز پر رکھتا آپ عالمِ غیظ و غضب میں ہوتے تو میں گردن نیچی کر کے اپنے آپ کو اس قدر سکیڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ آپ یہ محسوس کریں کہ آپ کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی مجھ سے کئی فٹ اونچے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا قد آپ سے لمبا ہے۔ آپ جب کمرے میں مسکرا رہا ہوتا اور یہ ظاہر کرتا کہ آپ ایک ایسے شیر ہیں جس کے سامنے میری حقیقت بلی کی بھی نہیں تھی بلکہ جو بیا کی سی تھی۔ آپ کس طرح جب میرا کاغذ میرے منہ پر دے مارتے (حالانکہ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ آپ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو کس آدمی نے برافروختہ کیا ہے) تو میں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے یہ ظاہر کرتا جیسے آپ نے مجھے کوئی بہت بڑا تحفۂ محبت عطا فرمایا ہے۔ اور میں میز سے گرا کاغذ جھک کے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آتا۔

لیکن حضور! اب میں آپ کی دسترس سے باہر ہوں۔ آپ میرا کیا [illegible] ختہ ہوں یا اس کاغذ سے پہلا کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں یا یہ دونوں کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں، اس کا مجھ پر کوئی [illegible] اب حلال کی روٹی کمانے اور کھانے کا تہیہ کر چکا ہوں اس لیے یہ استعفا داخل کر رہا ہوں۔

* ماہنامہ "حسیبہ" کراچی، سے معذرت کے ساتھ۔

معاشرہ! آپ جانتے ہیں کہ ... نے یہ فیصلہ اتنی دیر سے کیوں کیا ہے۔ پچیس سال ...
اور پچیس سال ... تقریباً ... ہیں اور میں ...
ایسے ... سے ہر ایک ... کے اعتبار سے ... کے لحاظ سے ... تقریباً تین مہینے ...
... بہت ... میں ...
کر کے ... سے پیشتر ... میرے ساتھ والی میز پر بیٹھا دیا گیا تھا ...
... ہونے سے ... آپ کو یاد ہوگا ... شروع ... میں آپ کے ...
... آپ کے ... یا میرے ... کے پاس جاتے تو وہ آپ کے ... اور آپ کے سامنے ...
... کیا اور بے معنی ہے۔

حضور! آپ نے اپنے ... کی روایت ... خوبصورتی اور ... سے ترمیم کی وہ ... تھا کیونکہ
میں ... تھا ... آپ کو ...
اپنے ... میرے ... پر ایک ... کر کے ... کیا ہے؟ اب میں کیا جواب دیتا۔ مجھے کیا
... کیا ہے! ... اور آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ نے ... میری نظروں میں اپنے لیے
... کر لیا ہے ... سادی ... کہ آپ کی ... کے ... سے ...
... کے بعد ... آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تو آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ نے اپنی قابلیت کا ...
... اس ... کو قبول کر کے ... اب ٹھیک ہے نا۔ ... کوشش کرتے ... کام نہیں کرتے:
"میں ... کہ ... آپ کے ... باہر ... گا۔"

لیکن ... تو ... تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ... آپ کو ... پر ... اور اس کی وجہ؛
یہ کہ اس وقت پہلے آپ کے ... سے ... پھر جب آپ کی شادی ہو گئی اور آپ ... کلب میں اپنی بیگم کے ساتھ
... اور ان کے ریٹائر ہونے سے پہلے اس کے جانشین ... آپ کے ... کلب میں آپ کی
... کو پارٹنر نہیں بناتے تھے اور جب ... وہ کلب نہیں ... وہ آپ کا ... کی ...
... آپ کی ... پر ... تھے۔ ... سال ... اور آپ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کہ
اس زمانے میں ... اپنی میز سے اگلی میز پر پہنچنے کے لیے کئی سال لگے۔ ... میں ...
ساتھ والی میز سے ... سے کئی سال زیادہ ...
اور اس میں ... — ... ہیں۔ ... آپ کے سب ...
... ہیں ... استعمال کرتے ہیں ... آپ کی ... بیگم ...
کرتی ہیں۔

حضور! مجھے آپ کی پہلی بیگم سے بہت ہمدردی ہے۔ وہ آپ کی ماموں زاد بہن بھی تھیں اور آپ کے مناسب کی تھیں

بن جب آپ [illegible] ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں پہنچے اور آپ کو یہ سیکرٹری ملی جو بعد میں آپ کی بیگم بنی تو آپ نے ماموں زاد بہن پر [illegible]

ا احساس سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ وہ بدستور کلب جاتی تھی۔ برج کھیلتی تھی۔ بڑے بڑے شرفاء بھی پیتی تھی۔ لیکن ایئرکنڈیشنڈ

ے میں بیٹھ کر آپ کو یہ احساس ہوا کہ اگر عورت اپ ٹو ڈیٹ نہ ہو تو ملازمت کے سب نکتے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی آپ کی

سیکرٹری میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ آپ نے ازدواج محبت کو ضرورتاً ازدواج میں تبدیل کر لیا۔

پھر یہ آپ کا نجی مسئلہ ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اب حلال کی روٹی کماؤں گا اور کھاؤں گا۔
پ غالباً یہ جاننے کے لیے بیقرار ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ مجھے یہ تلقین کیا کرتے ہیں کہ اس ملک میں ملازمت کر کے
ال کی روٹی کمانا اور کھانا ناممکن ہے۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کا دعویٰ درست نہیں۔ آپ کی تائید کیا کرتا تھا اور یہیں سے میری
[illegible] کی کہانی شروع ہوتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں یقین تھا کہ آپ اس قسم کی غلط باتیں اکثر کرتے ہیں اور ایسے فیصلے صادر فرماتے ہیں جن سے
[illegible] وقت کے مفاد کو ضرر پہنچتا ہے لیکن میں آپ کے احکام کی تعمیل اس لیے کرتا تھا کہ اگر نوکری نہ کروں تو کماؤں کہاں سے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جس دن آپ نے فائل پر لکھا تھا کہ کئی سال سے سٹاک میں پڑا ہوا پچاس ہزار گز کپڑا رائٹ آف کر کے دریا برد
دیا جائے کیونکہ اس نے بیکار جگہ گھیر رکھی ہے تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ کپڑا نہ اس قدر گل گیا ہے کہ اسے دریا برد کر
یا جائے اور نہ کسی پکیجے کی اس قدر [illegible] ہے کہ ہم پچاس ہزار گز کپڑا یونہی پھینک دیں ——————
میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم اس کپڑے کو یتیم خانوں میں بھجوا دیں۔ لیکن آپ تو اپنی مصلحت اندیشی میں تھے۔ آپ نے ڈانٹ کے
ب دیا کہ جب کپڑا پھینکا جانے لگے تو اس وقت اپنے ملازموں کے لیے کپڑا تم بھی لے لینا اور پھر میں بھی خاموش ہو گیا۔ یہاں سے
[illegible] آپ کی مصلحت کوشی کے نقش پا پر چلنے کا آغاز ہوتی تھی یہاں تک کہ وہ بے ضمیری کی ان انتہا گہرائیوں میں اتر جاتی تھی جہاں
[illegible] احساس کے بس کی بات نہ ہوتی۔

لیکن سر! کیا کیا جائے۔ آپ فلسفے میں مجبور تھا۔ اور آپ بھی کسی سے فنا [illegible] تھے آپ کو بھی تو ترقی [illegible] کے لیے مصلحت بینی
ایک میلا دھبہ حکم کرنا پڑتا ہے جس میں آپ کی حیثیت صرف ایک حقیر پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اگر آپ یہ پرزہ بن کر نہ چلیں تو سرکار
[illegible] ام ہو کر جائے۔ وہ دن تو آپ کو یاد ہو گا جب ایک آدمی محکمے کے سربراہ سے ایک آدمی خود آپ کے نام لایا تھا۔ اس کی سفارش
نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے جب مجھے تفتیش کرنے پر مامور کیا تو چپراسی آپ کے سامنے ہی [illegible] کر لیتے تھے۔ ابھی میں اس آدمی کو اب
دفتر میں داخل نہیں ہونے دوں گا جب تک یہ میرا حصہ مجھے نہیں دے گا۔ مجھے تو اپنے حصے سے آپ کے محکمے کے سربراہ کی
[illegible] بروز شیرینی پہنچانا ہوتی ہے۔ سربراہ کو کیا معلوم ہے کہ میں دوسروں کو روزانہ دفتر میں [illegible] تو شام کو صاحب کو بیگم صاحبہ کا
نہیں دیں اور پھر آپ چپ ہو گئے تھے اور آپ نے شکایت کرنے والے کو نہایت خاموشی سے کہہ دیا تھا کہ یہ
[illegible] ہیں۔ ان کے منہ میں بڑی دے دیا کرو۔ تو کام میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

حضور آپ ان یادداشتوں سے یہ خیال نہ کریں کہ میں آپ کی عبدیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میری حلال کی روٹی

مراسلوں کا فائدہ آپ کے [illegible] متعلق کرنے کے ساتھ ہوتا تھا اور [illegible] کے لیے [illegible]
تھے اس لیے میں [illegible] بعد میں اس امر پر [illegible] میرے پاس [illegible] کے ساتھ [illegible]
کرتے تھے تو میں [illegible] نے بعد میں [illegible] کرنے کو [illegible] دیا۔

[illegible] تو میں نے اپنی [illegible] میں [illegible] کے نہیں پہنچنے دیا۔ یہ جو میرا لڑکا [illegible]
تو [illegible] ہے۔ میں نے اس کی شادی ایک [illegible] لڑکی سے کی تھی [illegible] میں [illegible] کا ایک [illegible]
[illegible] میرا لڑکا اب [illegible] کرتا ہے۔ [illegible] بڑی [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] حاصل کرتا ہے۔ [illegible] کا انتظام [illegible] بیٹے سے [illegible]
کمانے کے بعد [illegible] بیٹھے [illegible] کی شکست پر [illegible] ہو گیا ہے۔ [illegible]
باقی ہیں۔ [illegible] سال میں [illegible] ہو گیا [illegible] تو وہ خود کو آپ کو بتا سکتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے کبھی آپ کو [illegible]
یا نہیں

اور [illegible]! یہ کیا [illegible] میرا لڑکا اپنے آپ کو [illegible] پاس اور خدا جانے کیا کیا پاس کر لے [illegible]
[illegible] نہیں۔ میں نے تقسیم ملک سے پہلے [illegible] فیس [illegible] دفتر میں جمع کرائی تھی [illegible]
امتحان کے [illegible] قریب [illegible] اس نے اس وقت کے ہندوستان کی ایک [illegible]
کی شکست [illegible] دوسرے [illegible] شریک ہوتے ہیں اور [illegible] میرے بیٹے نے اس [illegible]
[illegible] نہیں دیکھی۔ اس نے اپنے [illegible] امتحان میں بیٹھ گیا اور کامیاب ہو گیا۔ تقسیم سے پہلے
میرا لڑکا [illegible] کی قسمت چمک اٹھی۔ اس نے ایک [illegible] سے کا انتظام اپنے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کر دیا [illegible] اب [illegible] اس کے پاس کیا بچا تھا۔ [illegible] ہوں۔ پھر
[illegible] کو خوش کرنے کا [illegible] دیا گیا۔ وہ جب کبھی [illegible] سے [illegible] تو اپنے [illegible] انگریز سکرٹری [illegible]
[illegible] سیکرٹری جب [illegible] سے باہر نکلتا [illegible] کیس [illegible] آتا۔ یہ تو حضور [illegible] سکتے ہیں کہ
کیس [illegible] ہوتا تھا [illegible] ایک بات معلوم ہے کہ [illegible] کیس [illegible] سیکرٹری کو خرید کر دیا

میرا سب سے چھوٹا لڑکا [illegible] پاؤں چلنے لگا ہے۔ وہ بڑی دلچسپ [illegible] کیا کرتا ہے۔ میرا ایک
[illegible] ہے۔ [illegible] تعلیم [illegible] ہے۔ [illegible] خیال [illegible]
[illegible] وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھا۔ لیکن میں نے اس کتاب
اپنے [illegible] ۔ آپ [illegible] ہوں۔ حضور [illegible]
[illegible] دوسروں [illegible] لیا تھا
کمال [illegible] ہے

دیکھیے مجھے پچیس سال ڈرافٹ درست کرتے گزری ہے۔ میں نے سیکڑوں خط مُفت اور بیکار لکھے ہیں۔ مجھے ایک خط
نے یا لکھنے کی اُجرت کسی والے نے بھی نہیں دی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بڑا کمال کیا جو پروف پڑھ کر فی صفحہ چار آنے
لیے۔ آخر میں ایم۔ اے پاس تھا۔ فرسٹ کلاس۔ بہرحال عرض میں یہ کر رہا تھا کہ میں نے پروف پڑھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ کتاب
ہے۔ بکنے کی تو میرا روپیہ لگا جائیگا۔ جیوں لڑکے نے کتاب چھاپ کر نہایت اطمینان سے ایک الماری میں بند کر دی۔ وہ کچھ دیر
حیرت میں رہا۔ اُس نے تیس کی سربراہ اور اُس کے زہد و تقا کا بھی مجھ سے ذکر کیا۔ میں اپنی آنکھوں کے موٹے موٹے شیشوں والے
چشمے سے صرف گھور گھور کر اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن اُس نے مجھے آکر بتایا " ساری کتاب بک گئی۔"
الماری میں پڑی ہوئی کتاب ایک ہی دن میں کیسے ساری بک گئی؟ لڑکے نے بتایا ابّا! تجارت بھی ایک ڈھنگ ہے۔ آپ
کے دوست بڑے پکے نمازی ہیں۔ وہ ایک پائی کی رشوت نہیں لیتے۔ اسی لیے سفارش بھی نہیں مانتے۔ شہر میں سیلاب آیا ہوا تھا
شہر میں سبزی، پھل، انڈوں کا قحط پڑ گیا۔ باہر سے چیزیں آنی جانی بند ہو گئیں۔ میں انڈوں کا ایک ٹوکرا لے کر آپ کے دوست کی خدمت
میں لے کر حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یہ انڈے بیچنے لایا ہوں۔ میرے مزارع پانی چیر کر یہ انڈے لے کر مجھ تک پہنچے ہیں۔ چونکہ سیلاب
سے مجبور ہو رہے ہیں اس لیے صرف دو پیسے ایک انڈے کی قیمت مانگتے ہیں (یہ کئی سال کی بات ہے بازار میں اس وقت دو
آنے کا بھی انڈا نہیں مل رہا تھا) کم لیجیے دس درجن ہیں۔ میں نے سوچا آپ والد صاحب کے دوست ہیں۔ اس لیے آپ تک پہنچا دوں
انھوں نے خانسامے سے اٹھوا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تین روپے بارہ آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ میں نے کہا۔ جناب مزارع غریب
لوگ ہیں۔ ان کا ٹوکرا واپس کر دیں۔ اُنھوں نے کہا۔ ابھی آپ کو واپس ملتا ہے۔ وہ اندر گئے۔ میں باہر نکل آیا۔ جو آدمی بیگم صاحب کی طرف
سے ٹوکرا دینے آیا۔ اُس نے کہا بیگم صاحبہ فرماتی ہیں۔ ایک دو ہفتوں کے بعد زمینوں سے اور انڈے منگوا دیں۔ میں " اچھا جناب "
کہہ کر چلا آیا اور ٹوکرا میں نے سڑک پر جا کر ایک طرف پھینک دیا۔ میری کتاب بک چکی تھی۔

حضور میں آپ کو اب زیادہ درد سر نہیں دینا چاہتا۔ آپ صرف یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے حلال کی کمائی پیدا کر کے
اور اپنا مستقبل تیار کرنے کا منصوبہ کیسے بنایا جس نے مجھے یہ استعفا پیش کرنے کی جرأت دلائی۔ میں تفصیل سے آپ کو پریشان نہیں
کروں گا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ میں پہلا اوس حیات صاحب کا مُرید بن گیا تھا۔ اور یہ انھی کی نظر کرم کا کرشمہ ہے کہ میں اپنی ملازمت سے
مستعفی ہو رہا ہوں اور اس چیز سے بے نیاز ہوں کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نہ صرف دفتر میں
یہ سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں بلکہ گھر آکر بھی صرف یہی سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ اور بعض
دفعہ میں سوچتے سوچتے کچھ ایسی حرکتیں کرنے لگتا جن کو دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوتا کہ میں قتل کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں اس قسم کا آدمی
نہیں کہ مچھر کو بھی ایذا پہنچا سکتا۔ کیونکہ آپ نے میری محبت، دہشت اور نفاست کو گذشتہ پچیس سالوں میں اس سانچے میں ڈھال دیا؟
کہ اب میں نے صرف ہمدردی اور تعلق کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ قوت تخیلیہ بھی عجیب شے ہے۔ یہ ایسی چیزوں کو ایجاد کرتی ہے
کئی دفعہ میرے چہرے پر کبھی کبھار ایسی کچھ کیفیتیں پیدا کر دیتی کہ میں قتل کرتے کرتے بچ جاتا۔ لیکن حقیقت کی زندگی اس سے بالکل مختلف
تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے ایک دوست نے کبھی کبھی مادر وحشت کو ناچتے دیکھا تو اس نے مشورہ دیا کہ تم اپنے کرب و اضطراب سے

نجات پانے کے لیے پیر سائیں حیات کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔ اگر انھوں نے کمال شفقت سے جو نیاز قبول فرما لیا تو بچا رہے ہیں۔

آپ جانتے ہی ہیں میں پیروں کا قائل نہ تھا۔ میں صوفی بابا و فریدہ کی عزت ضرور کرتا تھا مگر آپ جیسے سرپھرے اور صوفی مزاج سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ میری زندگی کے تجربے اور مطالعہ نے مجھے یہ سکھایا ہے۔ اب تاثر ہوتی تھی اسلام عیسائیت کی تعلیمات۔ میں نے ان کی بدولت نہ جانے کتنے پہاڑ سر سے گزار دیے ہیں۔ میری خلافت، میری نجابت، میری صحبت صرف انھی سادھوؤں سے تعلق رہا لیکن انسان تنہا ہوتا ہے۔ اسے کوئی آسمان ماننا پڑتا ہے تو راہ راست کو ترک کیا کرتا ہے۔ خدا کو گھٹے میں ... لیکن پیر سیّد ... میرے دوست خواجہ نظام خان نے مجھے بھی بتایا تھا۔ وہ کئی دفعہ میرے پاس آتا رہا اور بالآخر مجھے پیر سائیں حیات کے پاس لے گیا۔

جس وقت میں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند معصوم اور مخلص چہرے انھیں گھیرے بیٹھے تھے۔ کمرے میں کامل سکوت تھا۔ پھر چند منٹ کے بعد ایک معصوم چہرہ پیر صاحب کو ایک گلاس پیش کیا۔ میرے دوست نے کہا کہ ان کی طرف دیکھتے رہنا۔ یہ ابھی دودھ کا گلاس پی جائیں گے۔ کمرے میں کچھ تاریکی سی تھی۔ معلوم نہیں صاف پانی تھا یا دودھ بنایا نہیں۔ میں دیکھتا رہا اور پھر پیر صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میرے بدن پر ایک کپکپی طاری ہو گئی۔ ان کی سرخ سرخ حسین آنکھیں میرے جسم کو بھید دیتی تھیں۔ دفعتاً انھوں نے کہا "آگے آؤ نا" میرے منہ سے نکلا "جی حضور" اور میں نے یہ دو لفظ اس خشوع و خضوع سے کہے کہ آج تک کبھی آپ سے بھی نہیں کہے۔ پیر صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور وہاں بیٹھے ہوئے سب مریدوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پیر صاحب نے حکم دیا "دودھ دے دو بابا ان کو بھی دودھ دے دو!!" اور میں دودھ پینے کے بعد لیٹ گیا۔

آپ نے بھی پیر سائیں حیات کا نام سن رکھا ہوگا۔ یہ تیس چالیس سال ادھر لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کر کے آئے تھے۔ ایک انگریز بیوی اور ایک دو برس کا لڑکا بھی ساتھ لائے تھے۔ انھوں نے امرتسر میں آکر اپنے وکیل باپ کی جگہ پریکٹس شروع کی۔ لیکن بیشتر وقت اپنی بیوی کے ساتھ اور موٹر کار میں سیر و تفریح میں گزارتے تھے۔ اس لیے باپ کی جگہ نہ لے سکے۔ بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کی زندگی میں وقت اچھا کٹ گیا۔ وکالت سے طبعاً متنفر تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اس میں جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے اور پھر بھی انصاف نہیں ملتا۔ والد کی وفات کے بعد یہ نفرت اور زیادہ ہو گئی اور جب انھوں نے قانونی پیشہ ترک کر کے ... کا ارادہ ظاہر کیا تو بیوی چپ چاپ ... واپس ولایت چلی گئی۔ اس صدمے سے انھوں نے عورت کی شکل نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ جب معصوم چہرے انھیں ... آتے ہیں یہ اپنے منہ پر دوپٹہ ڈال لیتے ہیں۔ ہر عورت کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اطلاع دینا پڑتی ہے تاکہ وہ منہ پر نقاب ڈال لیں یا روشنی گل کر دیں۔ آپ نے بیرسٹری ترک کرنے کے بعد ... ان کی کہانی ... ہر طرف سے لوگ آ آکر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان میں کئی کئی قسم کے سربراہوں سے ... بیسیوں آدمی بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے۔

بہر صورت یہ عرض یہ کر رہا تھا کہ میں خود دھوکا کر بیٹھا ہی تھا کہ خواجہ غلام خان نے یہ کہہ کر اُٹھا دیا " ان سے ملو یہ ضمیر جان ہیں۔ یہ علم کے آدمی ہیں۔ میں تو حیران ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے بالکل میرے جیسا انسان کھڑا تھا۔ وہی قد و قامت، وہی جُثہ، وہی خدوخال، یہاں تک کہ جب بولتا تو مجھے اپنی آواز سنائی دیتی۔ وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اُس سے مصافحہ کیا۔ غلام نے کہا " ضمیر جان کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں سیر کرائیں گے۔" ضمیر جان آگے آگے ہو لیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم ایک لق و دق صحرا سے گزرتے ہوئے ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ اس جھیل کا پانی گہرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس میں سے ہیبت ناک سُوں سُوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ضمیر جان میری طرف دیکھ کر ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بولا " یہ دریائے رہائی ہے۔ ڈرو مت! میں تمہیں اس کے پار لے چلوں گا۔" اور پھر جیسے اُس نے مجھے ایک ہاتھ پر اٹھایا اور نہایت اطمینان سے جھیل کے پانی میں سے گزرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے مجھے پھر خشکی پر رکھ دیا۔ لیکن یہ عجیب قسم کی وحشت ناک خشکی تھی۔ اس کا رنگ جلے ہوئے گھاس کی مانند تھا اور مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ اس خشکی زمین پر بہت سے سانپ رینگ رہے ہیں۔ میں سہم کر ضمیر جان سے چمٹ گیا۔ ضمیر جان نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا " گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہارا انتظام کرتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر اُس نے انگلی سے زمین میں شگاف کیا جس میں یہ شگاف اتنا بڑا تھا کہ میں کھڑا کھڑا ہی اس میں دھنس گیا۔ مجھے شگاف میں سے اوپر سب کچھ نظر آتا تھا لیکن میں دیکھتے ہوئے سانپوں کی زد سے باہر ہو گیا۔ وہ سب بھی اٹکھیلیاں کر رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ بڑے بڑے بچھو بھی شامل ہو گئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے عجیب الخلقت جانور جمع ہونے شروع ہو گئے ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ہزاروں نہیں کروڑوں تک پہنچ گئی۔ یہ عجیب عجیب آوازیں نکالتے۔ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر لپٹتے اور جب ایک دُوسرے سے ٹکراتے تو شہاب ثاقب کی طرح آگ کی لکیریں، چنگاریاں ڈالتی تھیں اور پھر یکایک گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی اور ساری فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ جانوروں نے اپنا منہ بند کر دیا اور ان کا سانس جہاں کا تہاں رُک گیا۔ دفعتاً ایک کراہتی ہوئی آواز جلی ہوئی زمین کے ماحول پر چیخیں کھینچتی ہوئی بلند ہوئی:

" کہو تم نے انسان کو راہِ ضلالت دکھلانے کے بدلے کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں؟"

اور پھر جیسے ہوا بھی چلنے سے رُک گئی تھی۔ کہیں سرسراہٹ کا بھی نشان نہ تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی آواز گونجی۔

" جواب دینے کے لیے آگے بڑھتے کیوں نہیں؟ میں تم سے مخاطب ہوں۔"

ایک جانور مٹکتا ہوا آگے بڑھا اور بولا " حضور میں نے ابنِ آدم کو جُوا کھیلنا سکھلایا۔ یہ دیکھیے یہ میرا تازہ ترین شکار ہے۔ اس نے اپنے سب سے بڑے قمار خانے مانٹی کارلو میں اپنی پشتینی جائیداد ہار کر خودکشی کر لی تھی۔" جانور نے ایک طرف سے ایک آدمی کا سر اوپر کھینچا جس کی پیشانی سے گولی لگنے سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ ایک مہیب قہقہے کے ساتھ اس طرح گونجی کہ مقتول کا سر جانور کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر سوراخ میں جا گرا۔ جانور لرز رہا تھا اور آواز آ رہی تھی۔

" تم بڑے کام کے ہو کتنے انسان مانٹی کارلو تک پہنچ کر خودکشی کر سکتے ہیں اور کتنے آدمیوں کے پاس اتنا وافر روپیہ ہوتا ہے کہ وہ جوا کھیل سکیں۔ بہت سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔ دُور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" جا

جس سے ایک تیز دھار کی سیاہ تلوار بننے کو کاٹتی چلی گئی اور اس کے مقابل جو لوگ زمین پر بکھر کر تڑپنے لگے۔

مہیب آواز پھر گونجی۔ "ہے کوئی میرا شاگرد جس نے ظلم ابن آدم کو درہم برہم کرنے کا موثر طریقہ ایجاد کیا؟"

ایک اور بونا گڑگڑاتا ہوا بولا۔ "حضور میں نے انسان کو شراب نوشی کی عادی اور تمام معاملات میں پہلے سے سے کر کے سب سے نکما انسان بد مست ہو کر ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سیاہ کاری کی ترویج سے انسانی معاشرہ پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان ملکوں میں جہاں اس کی کثرت ہے وہاں ایک انسان کا شرم کی حد اور ایک اپنی وصول کرنے کے بجائے ایک دوسرے انسانوں کو شراب کے نشے مستقل کے لیے دے دیتا ہے۔"

مہیب آواز پھر بلند ہوئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم سے زیادہ شاگردوں نے مجھے ابن آدم کے سامنے ذلیل کیا ہے شراب ہم سب جانتے ہیں انسان ابھی تک اصل مقصد کے چوری چھپے اس میں مشغول ہوتا ہے۔ کلبوں کی بات چھوڑو۔ وہ ہر ملک میں وہ ایسے پینے والوں کی کثرت و صوبائی مرکز ہی پیتے ہیں اور منہ چھپا کر پیتا ہے۔ اس سے وہ اعصاب انسان بھی تو گروہ نہیں ہوتے بلکہ بھی آوارہ کمال ہوتے ہیں۔ وہ وقتی اور سل میں گرفتار ہو کر بہت جلد اپنے معاشرے سے رخصت ہو جاتے ہیں پھر اس سے انسانی معاشرہ میں فتنہ کیسے جاری و ساری ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی بات اور ایسا عمل بتاؤ جس سے تمہارے شاگرد انسان مستقل طور پر فساد اور فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔"

سب بونے حیران اور چپ تھے۔ میں نے دیکھا ضمیر جان مسکرا رہا تھا۔ اب اس نے بھی ایک بونے کا روپ دھار لیا تھا وہ آگے بڑھا اور بولا۔ "استاد! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"بولو۔" فضا میں سیاہی بکھیرنے والی آواز سنائی دی۔

ضمیر جان نے کہا۔ "حضور میں نے پیر سالوس حیات کو تربیت دی ہے۔ جب وہ بیرسٹری اور علم و فضل کے خدا ... اپنی زندگی میں ناکام رہا تو میں نے اسے شش راہ دکھائی اور اس پر یہ واضح کر دیا کہ وہ انسانوں کو اس امر کی تلقین کرے کہ علم و زر کی کوئی اصل حیات ہے اور مرا لمزری صرف ذہین انسان کر سکتا ہے جسے ایسا عہدہ یا مرتبہ دے دیا جائے جس کے فرائض منصبی کو سر انجام دینے کی وہ بالکل اہلیت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً حبیب کو پولیس کا افسر بنا دیا جائے یا استاد کو گھوڑے ہانکنے پر لگا دیا جائے تو اس سے انسانی معاشرہ میں وہ ابتری پیدا ہوتی ہے کہ اسے دور کرنے کا اصل طریقہ سے بڑے انسان کو بھی نہیں سوجھتا۔ خود پیر سالوس حیات کا مرید ہو کر ہے اور اپنے مریدوں کو بھی یہی تلقین کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب ملک کے مزے میں ہیں لیکن انھوں نے انسانی معاشرہ میں وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ یہ دیکھیے پیر سالوس حیات کا آلۂ شکار۔"

اور یہ کہہ کر ضمیر جان نے مجھے سوراخ سے نکال کر اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تاریک سائے کے سامنے پیش کر دیا۔

پھر ایک مہیب قہقہہ سنائی دیا۔ "شاباش! شاباش!! میرے عزیز شاگرد تم نے نہایت صحیح راستہ دریافت کیا ہے۔ انسانی معاشرہ میں ابتری پھیلانے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں کہ عہدے اور منصب نااہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔ شاباش۔" سب بونوں نے ضمیر جان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور ضمیر جان اسی طرح ... کر کے میں اس کو

جیسے جتا کھا کر چھپنے گرتا۔

میں نے عہد کیا کہ خواجہ غلام خان میرے سر پر لشکر لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، ” اُٹھو تم تو دُودھ پی کر یُوں پڑے ہو جیسے قیامت تک نہیں جاگو گے۔ پیر سلاس حیات کی خدمت میں حاضر رہنا ہے تو شب بیداری کی عادت ڈالو کیونکہ قبری دقت ہو آب جب وہ چھوٹے سے لب فیض کرتے ہیں۔“

حضور میں آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اب میں نہ آپ کے فخر میں آؤں گا، نہ غلام خان یا پیر سلاس حیات کے قریب جاؤں گا۔ یہ میرا آخری ڈرافٹ ہے جو تصویب کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں بیانوں سے چندہ کر کے بھوری کی منڈی میں بیچا کروں گا۔ آپ کی دُعا سے مال روٹی کے لیے پیسے مل جایا کریں گے۔ اس آخری عمر میں یہی اللہ کیا چاہیے۔

نیکا

جیلانی بانو

نیکا، تم اتنی بوڑھی کیسے ہو گئیں ——؟

آج مجھ سے رہا نہ گیا تھا —— اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی میں سوچ رہی تھی کہ میں اتنی بوڑھی کیسے ہو گئی۔
میری جوانی، بچپن، کب بیت گئی —— بڑھاپا کیسے آ گیا ——؟
مجھے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

ابر زدہ دن کا [illegible] ہے۔ میرے پڑوس میں رہنے والی لڑکی اپنی کھڑکی میں کھڑی کب سے گنگنا رہی ہے —— میں نے
[illegible] کے [illegible] سے [illegible] :

[illegible] دن [illegible] سے پتہ چلے گا [illegible] ساون رات ہی نہیں [illegible] [illegible] کبھی [illegible] [illegible] ہیں۔ اس [illegible]
جو کبھی [illegible] نہیں ہوتا۔

ابر کتنا شور ہو رہا ہے۔ بالکل [illegible] کتنی کے [illegible] ہیں۔ کتنی کو [illegible] اپنے [illegible] سے ڈر رہی ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ جب
وقت وہ [illegible] سے [illegible] بات کرے گا تو [illegible] پانسہ [illegible] بھول جائے گی۔ دنیا کا ہر [illegible] اسے [illegible] کرے گا۔ دنیا کی ہر [illegible] قسمت
[illegible] اپنے [illegible] کی۔ جانے کیوں سے جانے والوں میں یہ چیز کیوں ہوتی ہے —— ! میں اس بات پر کتنا [illegible] ہے کہ [illegible]
ماں باپ کی [illegible] ہیں۔ اپنے بچوں کا فرض ہیں۔ اپنے بچوں کے [illegible] ہیں۔ سب شاستروں میں عورت کا [illegible] [illegible]
ہے۔ کیا [illegible] [illegible] [illegible] کر [illegible] سکے اور میں نے [illegible] حالت کی [illegible] —— [illegible] گئی —— عورت
سب سے [illegible] ناک [illegible] ہے۔ لوگ ان عورتوں پر ترس کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں ان کی ماؤں [illegible] پر جو وقت پڑ گیا تھا اسے بھول جاؤ۔ ان [illegible]
کرو اور انہیں اپنے گھروں میں جگہ دے کر ان کا قصور بھلا دو —— کیوں —— کیوں بھلا دو —— [illegible] دیتی [illegible]
کہ کر میری طرح زندگی کے دو راہے میں جلتی رہیں: ایسی باتیں سوچ کر میں لرز جاتی ہوں۔ جانے کیوں میرا پاپی من ہمیشہ ادھر ہی
سوچا کرتا ہے۔ اب تو میں اپنی رحمتی [illegible] بیٹھی ہوں۔ ساٹھ برس کی ہو گئی —— [illegible] اپنی زندگی پر [illegible] چاہیے۔ اپنے [illegible]
قربانی پر۔ مگر جانے کیوں، اب [illegible] سے [illegible] مجھے [illegible] [illegible] ہے۔ اس نے میرے من کو پھر [illegible] کر دیا۔

آج مجھے بہت سی پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

مینہ کتنا تیز ہو گیا ہے۔ پچھلا [illegible] جانے کی [illegible] گھر میں شور ہو رہا ہے ہیں۔ کہتے ہیں [illegible] ہو [illegible] تو [illegible] کے [illegible]
[illegible] یاد آتے ہیں۔ یاد آتے ہوں گے۔ مجھے تو کبھی نہ معلوم ہوا کہ [illegible] کیا چیز ہوتی ہے۔ [illegible] کی صورت کو یاد [illegible]

منی بنا دیتا ہے۔ ایسی کہاں پہنچ جاتی اپنی زندگی بیچنے لگتا ہے۔ ساری کہانیوں میں اور نظموں میں یہی باتیں دوہرائی جاتی ہیں —— لیکن یہ کوئی صورت کیوں نہ ہو؟ — کوئی تو مجھا بستر پر مرتے سے میں یاد کرتی کہ اس نے مجھے چاہا۔ سنسار کی ہر چیز سے زیادہ مجھ سے پیار کیا ——— مگر ہمارے تو نصیب میں ماؤں کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی بیٹی ماں باپ کے گھر جوان نہ ہو۔ بیٹی کے سے جاتے وقت اس کے دل میں کسی اور کی صورت نہ بیٹھ جائے۔ میرے ماں باپ نے بھی ایسی ہی جلدی کی چاہی تھی۔ جبھی تو بیس برس رہا ہو تیرے دل میں کوئی جھلک نہیں رہتی ——— میں پپیہے کو یاد کرنے لگتی ہوں۔ جب سے گاؤں چھوڑ کر میں ان کے ساتھ شہر آئی ہوں مجھے برسات میں پپیہا بہت یاد آتا ہے۔ شہر والوں کے لیے تو برسات ایک عذاب ہے۔ بارش کی قدر تو ان گاؤں والوں سے پوچھو جو زندگی ابر دوا بھی فصلوں پر لگاتے ہیں۔

میرے پیکے کا گھر کتنا بڑا تھا۔ پورے گاؤں میں اس سے اونچا گھر اور کوئی نہ تھا۔ لیکن جب مشیر چاچا گاؤں میں ایک کبھی بابا کو مٹی تو انھوں نے ہمارے گھر کے سامنے ایک بہت اونچا مکان بنوایا۔ اتنا بڑا کہ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ ہمارے چاچا بڑے پیسے والے تھے۔ ان کے پاس بہت سے تاڑ کے باغ تھے۔ کھیت تھے۔ بیل تھے۔ اس لیے گاؤں کے بڑے بڑے بھی ان سے کچھ نہ کہہ سکے اور وہ بڑی ڈھٹائی سے چار بچوں والی بیوی کو گھر میں چھوڑ کر وہاں جا بسے۔

میں اس وقت گیارہ بارہ برس کی ہوں گی۔ بس ایسی لگتی کہ کبھی کے نام پر سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی تھی اور اپنے دولہا کے ذکر پر جانے کیوں سارے بدن کا خون دوڑ کر میرے چہرے پر آ جاتا تھا۔

بیوپاری خاندانوں میں کوئی اتنی سیانی بیٹی کو گھر میں نہیں بٹھاتا۔ مگر میرے نانا (باپ ابھی کیا کرتے؟) اس سے پہلے وہ بیس بیس ہزار کے کرو بیٹیوں کے دولہوں کا سوال کر چکے تھے۔ میرے لیے ایک اچھا سا دولہا لانے کو پیسہ جمع ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں میری ماں اور باپ دونوں روز دیول میں جا کر دعائیں مانگتے کہ فصلیں اچھی ہوں۔ بیڑی کے پتوں کی تجارت میں خوب نفع ہو تاکہ میرا بیاہ ہو سکے ——— میں صبح سے شام گھر میں کتاب کھولے بیٹھی رہتی تھی۔ مگر میرا من پھلواری سے کھیلتا ——— جانے کیوں مجھے اپنے بیاہ کا بڑا ارمان تھا۔ بڑی جلدی کی تھی۔ شاید میں اتنی جلدی نہ چاہتی اگر مجھے پڑھنے کے بہانے ماں بار بار کمرے پر نہ بھیجا کرتی۔ میں ہزار باتیں بچنے پر بھی یہ بات سمجھنے کی کوشش نہ کرتی کہ جب نانا تے ہیں تو ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ میں اب ان کے کمرے میں نہ آؤں!

اور کوئی کیا جانے کہ کمرے پر پڑھتے پڑھتے میں کیا دیکھتی تھی ——— ؟

مشیر چاچا کا مکان بالکل سامنے تھا۔ ہمارے کمرے کے سامنے والے کمرے میں وہ دونوں رہتے تھے۔ وہاں سے چاچا اور ماما کے پر نچلے دیکھ کر میں ربڑ کی طرح تپنے لگتی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ ذرا سا دھکا بھی لگا تو میں چٹان سے پھٹ جاؤں گی۔

پھر کتاب ایک طرف ڈال کر میں اپنے دولہا کے انتظار میں کھو جاتی تھی۔ دل ہی دل میں ماما کی طرح بننے سنورنے کے ہزار منصوبے میں نے بنا لیے تھے۔ میں نے تصویروں کے رنگ تک ایسے سوچ رکھے تھے جیسی ساڑیاں ماما پہنتی تھی ——— وہ کتنی خوبصورت تھی۔ وہ جب پہنے آتی۔ کھلکھلاتی جاتی۔ میں نے اپنے گھر میں کسی عورت کو اتنا ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا میرے

[illegible] والی تھیں تو سمجھتی ہیں۔ سنتا کا قصہ تو تمہیں معلوم ہی ہے —— [illegible]
[illegible] ہیں گھر میں [illegible] نہیں سوجھتا تھا [illegible] سے [illegible]
میرے لیے سوال پیدا ہوا [illegible] سے [illegible] تھیں [illegible]
ایسی فضا دماغ سے نکل گئی تھیں۔

اسے پاس دیکھ کر میں چپکے چپکے سے نظر انداز کرنے لگتی تھی جب شیشم چاچا اپنے ہاتھ سے [illegible] جاتے۔
ایک بار [illegible] کے جلسے میں بیٹھ جاتی تھی —— پھر میں چودھری کی [illegible] تھی تب سنتا چاچی کی وہ
بات یاد آ جاتی —— [illegible] ہیں۔ [illegible] وقت کوئی پیار سے
نہیں ہوتا۔

سنتا چاچی چاچا جی کو بیچے کیسی گھر میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ رات چولہے کے پاس بیٹھی رہی ہیں۔ منہ پر [illegible] ہے۔ سارا پیٹ
گھونٹ کر وہ ہر رات سے بہتر بھینس کا دودھ دوہ رہی ہیں۔ آج بھی [illegible] سے [illegible] بیٹھی رہی ہیں۔ چولہے کے
دھوئیں میں۔

اس لیے تھی کہ جب سنتا چاچی بیاہ کر آئی تھیں تو ان سے زیادہ خوبصورت لڑکی پورے گاؤں میں اور کوئی نہ تھی میں نے
[illegible] ان کے [illegible] چہرے کو دیکھ کر سوچتی تھی کہ کہیں شیشم چاچا نے سنتا چاچی بدل تو نہیں دی۔ کیا پتہ انہیں کوئی [illegible]
[illegible] سے [illegible] کر دیا ہے۔ [illegible] اب تو وہ
[illegible] تھی۔ میں نے اتنی خوبصورت ایسی بھینس کی عورت پھر کہیں نہیں دیکھی۔ ویسے بھینس کی عورت تو شاید ہو ہی
سکتی نہیں۔

پہلے اس دن کی بات [illegible] ایک دن [illegible] ایک [illegible] دیکھیں گی۔ وہ مجھ سے [illegible]
مانگتی تو میں نفرت سے منہ پھیر کے کہہ دیتی —— کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میری چاچی کو [illegible] ساری زندگی [illegible] ہو گی؟
ایک بار ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھ کر دیکھ لیا تھا۔
"تم بہت اچھی خاصی سوہنی شکل کی ہے مگر کیسی [illegible] پیدا کر رہی ہے!"
ان کی بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ ذرا [illegible] پر چل کر تو دیکھو۔ اگر اب [illegible]
رہی ہے تو [illegible] کس چیز کا نام ہے —— پھر میں چاچی کو دیکھتی ہی رہ جاتی تھی جو اپنے دھان پان بدن کی [illegible]
[illegible] اپلوں کو سمیٹ رہی تھیں۔

اس بات کے کئی مہینے بعد ایک بار میں نے سامنے دیکھا تو جیسے دھکا سا لگا [illegible]
کھڑی تھی کہ [illegible] میں نے اس کے لیے [illegible] تھی وہ جانے کہاں غائب ہو گئی [illegible]
اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ہمارے گاؤں کی لڑکیوں نے بھی [illegible] کے اس کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے [illegible]

ہی پنے ساتھ لائی تھی۔ کوئی اس کے گھر نہ جاتا تھا۔ مگر جب اچانک سے یوں تنہا دیکھ کر مجھے اُس پر بے حد ترس آیا۔ پھر جب اُس نے
...ے سے مجھے گود میں اٹھا کر میں اُس کے پاس آئی تو مجھے دُنیا کی بہت بڑی دولت مل گئی۔ اسے قریب سے دیکھنے اور چھونے کی تمنا جانے
کب سے میرے دل میں دبی بیٹھی تھی۔

میں تیزی سے نیچے بھاگی جہاں چولہے کے پاس ماں بیٹھی سنتا چاچی کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"ماں ——— ماں وہ ماما ہے نا ——— وہ ———"

"چُپ ——— چُپ ———" ماں نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"کمبخت کنواریاں رنڈیوں کا نام لیتی ہیں! تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی جو تو نے پھر کبھی ماما کو دیکھا۔ چل جلدی سے چولہا سلگا"

میں سہم کر دیوار سے چپٹ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ماں نے مجھے پاپ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ اگر میں ماما کے پاس چلی جاتی تو ——— ! وہ مجھے چھو لیتی تو ——— میں جو بند کلی کی طرح پاک ہوں۔ دیوتاؤں جیسے بہت بلند ہوں۔ پہلے ... کہیں یہ گندی ماما اپنے ہاتھ سے ... ہو۔ کسی کو کیا پتہ ——— !

"ارے سنتا صبر کر بہن۔ بھگوان پاپ کی سزا کچھ نہ کچھ سنسار میں بھی دیتے ہیں۔" ماں چاچی کو سمجھا رہی تھیں۔

"بھابی میرے جیسے کیسے دو دکھ دیتی ہیں کہ آدمی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا دیا نہیں جاتا ہے۔" چاچی نے آنسو پونچھ
رہا

میں نے مہاشے کی بھابی چنتے تھیں ... سنتا چاچی اپنے پتی کو قصور وار کیوں نہیں ٹھیراتیں۔ دیوانہ بنانے کی جو دوا ماما کے پاس ہے وہ چاچی کو کیوں نہیں ملتی! میں یہ بات آگے بڑھ کر ماں سے پوچھنے والی تھی۔ مگر ماں کا غصہ یاد کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

"اسی بھگوان کے ... نے بندھن بھی کہیں توڑے ہیں۔ چار دن عیش کرے گا مگر میرا پتی بڑھاپے میں تو میرا ہی ہوگا۔" چاچی نے بڑے فخر سے کہا اور آنسو پونچھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیوں ——— بھابی میں کیوں نہیں ——— ؟" میں پھر چاچی سے پوچھنے چلی اور جلدی سے ... پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔

...بڑی پیاری کتنی سیدھی ہیں۔ جانے کس نے ان کے دل میں یہ بے تکی باتیں بٹھا دی ہیں کہ مرد ان ... باتوں پر یقین کیے بیٹھی ہیں۔ سنا ہے جب ... چاچا اس کے ... تو چاچی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ چاچا سے بھی نہیں۔ جنھوں نے دوسری شادی کے زیور اور کپڑے اسی کو دے دیے تھے۔ ... کی خاطر ... میں کسی مرد نے ایسی جرأت نہ کی ہو گی۔ کیونکہ لڑکے کا ... لڑکی والے دیتے ہیں مگر چاچا کو یہ ... یاد نہ تھا ——— !

... پچاس برس بعد بھی وہ دن میری آنکھوں میں روشن ہیں ———

کہتے ہیں مرنے سے پہلے سوکھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ شاید موت میرے پاس آ رہی ہے۔ ... آ جانے ... کا ... ہوں ——— یہ کیسے وقت وہ کیسی حقارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ... میں نے ... بھولوں سے ... !

آدھی رات ——— میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے دل سے کوئی بوجھ [illegible] ہے۔ مجھے پتہ نہیں ہے

بیاہ کر میں جو کچھ لائی تھی وہ سب [illegible]۔ شاید میں نہیں [illegible]۔ میرے ماں باپ بھی [illegible]

نہیں دیکھ سکتے۔ [illegible] شاید [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] کوئی [illegible]

——— : [illegible]۔ مجھے کوئی خوشی نہیں ہے۔ [illegible]

میں کتنی [illegible] سب [illegible] اپنا پیٹ [illegible] کر [illegible]

[illegible] ——— ! [illegible] کر کا تعجب ہے کہ [illegible]

بچہ ہوا [illegible] اس کے پیٹ سے [illegible] :

شاید سب [illegible] ہیں۔ ! مجھے [illegible]

جب میں نے [illegible] اپنے آپ کو اتنا [illegible] !

تو میں اپنے [illegible] کے اوپر سے [illegible]۔ وہ [illegible] اپنے ہاتھ سے [illegible] سکتا تھا۔ [illegible]

زندگی [illegible]۔ [illegible] کے گھر میں [illegible] تھے۔ وہ رات [illegible]

[illegible]۔ رات میں ایک [illegible] سے [illegible] کی فرصت بھی نہ تھی۔ اور گھر میں [illegible]

[illegible] ! [illegible] اور بچوں کے [illegible]

[illegible] کام [illegible]۔ مجھے تو اتنی فرصت نہ تھی کہ [illegible] کر لوں۔ [illegible]

کے ساتھ [illegible] تھی تو میری ساس چلاتی :

"کمبیوں کی طرح ہر وقت آئینہ [illegible] ہے۔ چل! [illegible]"

لیکن میرے [illegible]۔ جب سب سو جاتے تھے تو میں [illegible] [illegible]

[illegible] زندگی میں [illegible]۔ اور جب [illegible] تو میرے شوق بھی [illegible]۔ اس [illegible]

[illegible] کبھی کسی وقت میں [illegible]۔ [illegible]

[illegible]۔ ساس [illegible] کا [illegible]۔ لیکن [illegible] میں [illegible] سکتی ہیں۔ [illegible]

[illegible] تھی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ [illegible] سب کچھ [illegible] ہے۔

پانچ برس بعد [illegible] کوئی نہ [illegible]۔ میری ساس [illegible] نے [illegible]

خون [illegible]۔ میرا رنگ [illegible]۔ اس نے [illegible] نے سسرال میں [illegible]

[illegible]۔ [illegible] تھا۔

[illegible] اس [illegible] کا [illegible]۔ [illegible]

سسرال [illegible] اپنے پیکے [illegible] ہے "

بچے ٹکر ٹکر معصوم نگاہوں سے میشم چاچا کو دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے کہ ماما انہیں چھوڑ کر ایک دوسرے شیلا کے پاس چلی گئی ہے۔
اس نے اسے کالا پکوڑا دیا تھی۔ چاچا پھر اپنے گھر آ گئے تھے مگر اس شان کے ساتھ جیسے کوئی ملک فتح کر کے لوٹے ہوں۔ اس رات چاچی
نے بستے بچوں پر گر چھے۔ وقت مد کے کھانے کے برتن پھینک دیتے تھے۔ چاچی پچارنی دم سادھے، سر جھکائے سارے گھر میں دوڑتی پھرتی
تھیں۔ میں چاچا سے بہت خوش تھیں کہ اور دیکھ دیکھ کر بجھ بجھا کر اپنی کوٹھری کی پناہ میں آ گیا۔

مجھے
میشم چاچا کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں تو کہتی تھی وہ اب زندگی بھر چاچی کو صورت نہ دکھائیں گے۔ اپنے کیے پر ہمیشہ پچھتائیں
چاچی اپنے پتی کے واپس آنے کی خوشی میں دیوانی کیوں تو میں بھی اسی کے ساتھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے
ایک دیا کا ٹکڑا تھی۔ آنکھ خوبصورت جیسے مجھوں نے کوئی روپ دھارا ہو۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو میں گھبرا کے پیچھے کو ہٹ گئی
— وہ ایسا تھی — ستی ساوتریوں کی طرح سر پر پلو ڈالے، آنکھیں جھکائے، جلے ہوئے مجھوں سے کیا مانگنے آئی تھی! شاید اب
تک اپنے بڑھاپے کی فکر ہو۔ اولاد کی کمی محسوس کر رہی ہوگی۔ مگر اتنے دنوں میں اس نے اپنی عمر کچھ اور کم کر لی تھی۔ بچے سپنوں کی طرح شاداب تھی
دنیا کی کتنی عورتیں ایسی خوش نصیب ہیں کہ اپنے اصول بھول کر جسے اس کی مراد پوری کر ڈالیں۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں آگ سی
جل اٹھی۔ مجھوں سے اپنے بچے کی سرتاب دیں گے! یہ کب تک یوں ہی ٹھکرائے جائے گی۔
جھگڑا ختم کر کے میرے پاس سے گزری تو چاچا کی ادھر بچوں سے ڈانٹ ملے۔ ایک بار پھر — مجھوں کے سامنے بیٹھ کر میں
یہی سوچتی رہی کتنا مشکل کام کرنا پڑتا ہے۔ بیچاری مجھ میں بھی ڈر ہے — ! اور پھر مسکرا کر میں نے اس خیال کو مجھوں
کے دھیان میں ڈھکیل دیا۔

اس کے بعد جب میں سسرال گئی تو مجھوں نے چپ چاپ میرے دن پھیر دیے۔
انہیں صرف اس [illegible] اسکول میں نوکری مل گئی تھی۔ سب میرا اپنی۔ اس نے وقت دور ایک چھوٹے سے گھر کی مالکن تھی پھر
سے بیٹے بیٹی کو رکھ کے پہنے اور پڑھنے کے لئے آ گیا تھا۔ مرا بچے ٹب سے ہو رہے تھے۔ رانی اسکول کا امتحان دے چکی تھی
بیت جب بچے کھیلتے ہوں کر چپل کے کان کی رہ سکتی تھی تو رات کو پڑھنے کے بہانے بیٹھی دیتی تھی۔ شاید وہ جانتی بھی نہ ہوگی کہ جب
سے آتا تھا تو پھر سے کسی کام میں نہیں لگا دیتے ہیں۔ مگر انہیں اب اس وقت فرصت ہو نہ تھی کہ دو گھڑی بیٹھ کر ہنسی مذاق
کر سکے۔ لیے کچھ نہیں کہنے بیٹھی تھی۔ وہ شام میں بھی دوسرے دفتر میں چار کام کرتے تھے۔ پھر جب رانی نے بھی ہائی اسکول پاس
کر لیا تو میں نے پتی سے کہہ کر اسے نوکری کے لیے آمادہ کر دیا۔ اب تو میں بھی اس طرف سے مل گئی تھی جب بھی پتہ کالج کا خرچ
اس وقت چار بچوں کا پیسا کہاں سے کون آتا تھا۔ تنخواہ دیر سے ملتی تھی اور وہ خرچ بڑھ گئے تھے۔ اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ مجھے
نہ ملے۔ ان مجھوں نے مجھے بھی شامل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے میرا دل کمزور ہے۔ مجھے کھانا چاہیے۔ آرام کرنا ضروری ہے۔
پھر ان کی ان باتوں میں کیا رکھا تھا بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔
آخر ایک دن کسی نے کہا تو سنا تھا کہ ماما میشم کے پاس بھی چلی گئی ہے۔ اس نے کیا کچھ نہیں کہا۔ ہے اس کے پال لو

ہے۔ مجھے یہ شکایت بہت دنوں سے ہوتی تھی۔ سب چاہیں تو معلوم ہو کہ پیش کرنے کی مزہ کیا ہوتی ہے۔ اولاد اور بہو کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے۔ مگر سنسار کی ہر ریت نبھانا ہوتی ہے تو یہ پہلا کام ہے۔ جس دن تم استاد ہو چکے اور کسی قابل تھا تو خوشی اور فخر کے مارے میں پھولے نہ سماتی تھی۔ جس دن وہ ختنے میں بیکار بیٹھے تھے تو ان کے بیٹھنے سے [illegible] تھی۔ ہم میں [illegible] سادی ہوتی اور [illegible] کی ساری باتیں [illegible] نہیں پڑتے۔ [illegible] نے بیاہ ہی کیا ہے کہ [illegible] بنانے سکنے پر یہ شادی ہوتی ہے۔ اس کے چھوٹوں میں [illegible] ہے۔ میرے [illegible] چاہے وہ مجھ سے کتنا ہی [illegible] ہوں۔ مگر کبھی ایک منٹ کو بھی یہ دل دکھا کر میں اس سے الگ جا کر بیٹھ میں [illegible] کروں۔ یہ سب میرے دل کا چین تھے۔ میرا فرض تھے جبھی تو میں نے اپنے [illegible] کر کے یہ سب [illegible] دیے۔

کیونکہ [illegible] میں تو جب کہ ہم نے دنیا کا بیاہ کیا ہے تو وہ اپنے [illegible] کر بیٹھے تھے۔ اس وقت میں نے [illegible] کہ جب ہم تم کا بیاہ کریں کے اس کے جہیز سے اپنا گھر بھر لیں گے۔ سب قرض اتار دیں گے۔ لڑکیاں پرائی ہیں گھر بیٹھے [illegible] ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ بات اتنی لمبی نکلے گی کہ تم بھی تو تم انجینیئر بھی نہ بنا تھا کہ تم نے اپنی کلاس کی ایک لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ وہ بچارے [illegible] پہنچنے پایا: اس کی بہو نے میری چوکھٹ پر قدم رکھا۔

اب تو بیس برس گزر گئے اس بات کو ——— جانے تم اس گھر کا بیٹا تھا بھی یا نہیں: میں کمرے میں [illegible] اس کا تصور کرتی ہوں تو تم کو پیدا کرنے سے کر اب انجینیئر بنانے تک کے سب [illegible] ایک دم جاگ اٹھتے ہیں۔

تم نے بیاہ کر لیا تو مجھے [illegible] اور کتنی سے بھی کوئی امید نہ رہی۔ اسی لیے میں نے ان دونوں کے بیاہ جلدی جلدی کر ڈالے ان کے جہیز [illegible] کو میرے گھر میں جگہ نہ رہی۔ [illegible] سے گھر بھر گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب [illegible] سے کیا [illegible] نے تو اپنی بہوؤں کو لا کر پانی پینے بھی نہ دیا۔ ان کے پیچھے [illegible] خانے تک بیٹا ہو کے [illegible] سکے کہ [illegible] مجھے پھر بھی خوشی نہ رہی۔ بڑھاپے میں انسان کا دماغ ٹھکانے پر تھوڑا رہتا ہے۔ میں بھی اس پاگل پن میں جانے کیا کر بیٹھتی ہوں [illegible] اور بہوؤں کو ہمیشہ مجھ سے شکایت رہتی ہے۔ بے کام دھندا کرتے دیکھ کر بہوئیں چپکے چپکے ہنستی ہیں کہ اس بڑھیا کو کتنی ہوس ہے [illegible] کام کرتی ہے جیسی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔

مجھے جانے کیوں اپنے گھر سے اتنی محبت ہے: کوئی بچہ گلاس توڑ دے تو چھناکا میرے دل پر ہوتا ہے۔ بہو [illegible] تو میرے دل پر چوٹ لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر دل کیوں جلاتی ہو ——— وہ کیا جانیں کہ یہ باتیں میرے لیے کتنی اہم ہیں۔ میں نے اس گھر کے ذرے ذرے کو کتنی محنت سے جمع کیا ہے۔ اس سے بڑا کوئی دکھ ہے کہ کوئی [illegible] چھین لے: وہ کہتے ہیں کہ ساس بہوؤں سے جلتی ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ بڑھاپے میں ہاں مگر [illegible] کتنی بڑی سزا ہوتی ہے۔ اب میں اکیلی اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ شاید اب تو سب ہی اس بات کے منتظر ہیں کہ میں مرتے وقت اپنا [illegible] کے حوالے کروں گی ——— میرا سجا بنا گھر اب اجنبی ہو گیا ہے۔ میں کسی بات پر غصہ کروں تو یہ شکایت کرنے آتا ہے۔

"آپ ہر وقت سدھا کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہیں؟ آپ کہیں تو ہم آج ہی آپ کا گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔"
یہ سن کر میں سہم جاتی ہوں کہ کہیں یہ بات ان کے باپ تک نہ پہنچ جائے۔ وہ تو مجھ پر غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ بھی کیا کریں ——— ایک بوڑھے نکھٹو انسان کو غصہ آئے تو وہ نکاؤ بیٹوں کو ڈانٹ سکتا ہے نہ نک چڑھی بہوؤں کو ——— بھگوان جیون اتنا لمبا کیوں کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آئے۔

جب کوئی کام نہ ہو تو میرا دماغ ہمیشہ اوندھی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ شاید ایسی بھی عورتیں دنیا میں ہوں گی جو ہمیشہ سکھی رہیں۔ ہمیں تو کبھی چین سے سونا بھی نصیب نہ ہوا۔ میرے پوتے ہنس کر پوچھتے ہیں کہ پڑماں (بڑی اماں) تمہارا خزانہ کہاں ہے۔ ہمیں کب دو گی!

خود میں آنسو پونچھ کر سوچتی ہوں کہ میں کتنی مفلس ہوں۔ میں نے اپنا خزانہ کیسی لاپروائی سے لٹا دیا۔ کچھ بھی تو بچا کر نہ رکھا ——

آج مجھے یہ سب باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں ——— ؟ کل ہی شام کو ایک فلم کی شوٹنگ دیکھنے بہو کے ساتھ جاتی تو مجھے [illegible] آتا۔ میں روز کی طرح کسی نہ کسی طرح سو ہی جاتی۔ آج بہو کی چھوٹی بچی کو سنبھالنے کے لیے میں اس کے ساتھ ایک فلم اسٹوڈیو میں گئی تھی کیونکہ مجھے پاپا کی ایکٹرسوں کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میرا بیٹا فلم بناتا ہے اس لیے ہم بڑے ٹھاٹ سے وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں وہاں گھوم رہی تھیں، مگر ایک لڑکی کے پیچھے تو ساری خدائی ٹوٹی پڑتی تھی۔

میری بہو نے چپکے سے مجھے بتایا کہ یہی وہ ہیروئن ہے جو دس بارہ لاکھ پر بمبئی سے کام کرنے آئی ہے۔

"مگر اس کی صورت میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اتنا روپیہ کماتی ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"او جی ایکٹنگ کی بات ہے ——" میری بہو نے کان میں کہا۔

"اری ماں یہ بچاریاں کیا جانیں کا نا ——— ان کی پالنے والیاں ہوتی ہیں چالاک۔ انہیں اداکاری کے داؤ پیچ سکھا کر نمائش کرتی ہیں۔"

اتنی دیر میں وہ ہیروئن کی ممی ایک خوبصورت سی کار میں آ گئیں۔ سب کھڑے ہو گئے۔ پروڈیوسر نے خود بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہ اتریں۔ چند سلاموں کا نگاہوں سے جواب دیتی ——— یوں جیسے کوئی مہارانی چلی آ رہی ہو ——— بے حد قیمتی ساڑھی پہنے۔ مگر اُجلا میک اپ کیے ——— لوگ خوشامد کرتے اُن کے لیے راستہ بنا رہے تھے کہ بے بی کی ممی آ رہی ہیں۔ جب وہ میرے قریب سے گزریں تو میں چونک پڑی ——

"ماجا ——— اجا ———!"

ماجانے گرگلاؤ تارے مجھے بڑے غور سے دیکھا ——— پھر اپنے سینے پر ساڑی سنبھالتی، مسکراتی ہوئی وہ میری طرف بڑھی ——

نقش ———— م

قسم ———— ، قسم کھا ہر ———— ، ہاتھ کی لکیریں ہیں ———— ؟

اندھیرے کمرے میں بیٹھ جگنو میں سمٹ کر بوجھل کرتا ہوں کون پلکوں پہ ———— یہاں کیلی کیسی پہنچ

بھل ———— ؟

بہادر

مسعود مفتی

جنرل یحییٰ ہندوستان سے بہت خفا ہیں۔

وہ ہندوستانی وزیرِ اعظم شاستری اور وزیرِ دفاع چاون سے جسے وہ "وزیرِ جنگ اور جھوٹ" کہتے ہیں اپنا ذاتی دشمن سمجھتے ہیں کیونکہ ہندوستانی حملہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ صرف جنرل یحییٰ کے خلاف تھا۔

وجہ یہ ہے کہ اُنہیں چاند کی ایک ساعت سے کورٹ شپ اُن سے مصروف تھی۔ جہاں مشرق اور مغرب کی روایات کا امتزاج ہو جائے وہاں ترتیب میں کچھ تو الجھاؤ آ ہی جاتا ہے۔ زیرِ بحث محترمہ خالص مغربی روایات کی مرید تھیں اس لیے کورٹ شپ کے دوران میں یحییٰ کو پرکھ رہی تھیں۔ بظاہر تو یحییٰ بھی مشرقی کہلانے سے شرماتے تھے اور مغربی بننے کا ارمان دل میں رکھتے تھے مگر جب کورٹ شپ شروع ہوئی تو وہ خالص مشرقی انداز میں ظاہر ہوئے۔ یعنی محبت کے قریب ہونے کا عمر میں پہلا موقع تھا۔ تو بے ساختہ عاشق ہو گئے ——— اس لیے گو وہ یہی سمجھتے تھے کہ میں کورٹ شپ کر رہا ہوں مگر دراصل ترتیب اُلٹی تھی اور کورٹ شپ اُن سے کھیلنے میں مصروف تھی ہو کر وہ تو پہلے ہی عاشق ہو چکے تھے۔

بہر حال اس عمل کی ایک کڑی یہ تھی کہ یحییٰ نے یہ ساز ش کی تھی کہ وہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شالامار باغ لاہور میں محترمہ سے بے تکلف ہوں گے۔ محترمہ تعلق نشانے پر بیٹھ گئی (وزیرِ محمد نشانے پر تھے، ہاتھ ——— بازو ——— اور گوشہ علی الترتیب) تو شاید دو چار دنوں میں محترمہ کے دماغ پر کے اثرات دیکھنے لگ جائیں گے۔ اُس کے بعد ان کے چچا خسر انہیں سیالکوٹ مزید مدعو کریں گے۔ واپسی پر وہ شادی کی تجویز پیش کر دیں گے۔ اسی لیے پانچ ستمبر کی رات کو وہ بڑے خوش آئند تصورات کے ساتھ سوئے تھے اور پھر اٹھ کر ساری رات سوتے ہی رہے کہ ان کی آنکھیں کھل نہ پائیں۔

مگر چھ ستمبر کی صبح کو خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔

شالامار سے آگے جانے والی سڑک پر جو حملہ ہوا تھا اس کے اثرات گرد و نواح، "ہوائی جہاز" اور بحری بیڑے کی زد میں تھے اور تین ... سیالکوٹ والے چچا اُس دن گھر پر سو رہے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اُس دن یحییٰ نے محترمہ کے ساتھ تجویز رکھی کہ وہ چند میل ... پنڈی اور پھر پشاور چلے جائیں تو اُن سب پر بھی حملہ شروع ہو گئے۔ انہوں نے ذرا اندرونی علاقے میں جانے کی تجویز

---

* روزنامہ "مشرق" میں شائع ہونے والے ... ایک ہے ——— ...

... پاکستانی فضائیہ کے حملے سے دشمن کے بازو ... اور وہ بالکل ... ہو گئے

... مصنف کے ...

کی تنقید اور سرگودھا پر کچھ کام کرنے لگے۔ ان سب باتوں سے بجیا کو یقین تھا کہ ہندوستانی صرف ان کو تنگ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ قدرت نے فضل کیا کہ دوسری چیزوں کی طرح ہندوستانیوں کو [illegible] بھی کر دی تھی۔ وہ سمجھتے کہ بجیا وہاں پہنچ گئے ہیں اور [illegible] شروع کرتے حالانکہ وہ وہاں نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح بجیا ہندوستانیوں کے ناقص تعلیم کی وجہ سے بچ گئے۔ مگر دشمنوں نے کسر تو کوئی نہ چھوڑی تھی جب وہ بجیا کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ تو کھسیانے ہو کر سارے پاکستان سے دشمنی کرنے لگے۔ اور مشرقی پاکستان پر کچھ ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیے۔

بجیا کا یہ استدلال آپ کے لیے نئی چیز ہو تو ہو۔ ہمارے لیے ہرگز نہیں کیونکہ بجیا ہمیشہ سے اپنے آپ کو ہر چیز کا مرکز سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے ایسا سمجھتے ہیں۔ اور اگر نہیں سمجھتے تو انہیں سمجھنا چاہیے —— مثلاً کسی اخبار میں، اشتہار میں یا فوٹوگرافر کی دکان میں جب بھی کسی عورت کی تصویر دیکھتے ہیں تو پھول جاتے ہیں کہ وہ ان کی طرف دیکھ رہی ہے —— بغیر کچھ پڑھے لکھے اپنے آپ کو سب سے بڑا انٹیلکچوئل سمجھتے ہیں۔ ہم نے پوچھا بھی۔

"بجیا۔ آپ اتنے بڑے انٹیلکچوئل ہیں۔ مگر کبھی لکھتے کچھ نہیں۔"

عینک ناک سے ذرا اوپر اٹھا کر ناک سہلاتے ہوئے بولے "کیا لکھوں ——" پھر انھوں نے مایوسی سے سر ہلایا "آج کل کے رسالوں کا کوئی معیار ہی ہے۔ اپنا نام گھٹیا تحریروں کے جھرمٹ میں دیکھ کر ہی الجھن ہوتی ہے ——"

پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولے

"دراصل آج کل ادب پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ جب یہ ٹوٹے گا تو کچھ لکھیں گے۔"

اسی طرح امتحان میں مسلسل فیل ہونے کو ممتحن کی نااہلی بتاتے ہیں۔ سال ہا سال یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں۔

"پنجاب یونیورسٹی میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں کوئی قابل ممتحن نہیں ہے —— جب تک وہ میری بات نہ سمجھیں گے نمبر کیا خاک دیں گے۔"

انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ دنیا بھر کی عورتیں ان کے قدموں میں ڈھیر ہوں۔ اگر وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیں —— مگر وہ خود ایسا نہیں کرتے کیونکہ انہیں ابھی تک اپنی پسند کی کوئی نہیں نظر آئی۔

کسی بڑے افسر سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "میں بھی مقابلے کے امتحان میں بیٹھتا تو منتخب ہو جاتا۔ مگر میں بیٹھا ہی نہیں۔"

اسی قسم کا جواب وہ [illegible] فلمیوں کے چیمپئن لوگوں سے بھی کہہ چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر عورتوں کے مقابلے میں چنی جانے والی حسینۂ عالم سے بھی ملیں تو اسی قسم کی بات کہیں گے۔

مثالیں تو بہت ہیں۔ لکھتے ختم نہ ہوں۔ مگر مختصراً یوں سمجھیں کہ وہ بالکل اس مکھی کی طرح ہیں جو بیل گاڑی کے پہیے پر بیٹھی سوچ رہی ہوتی ہے کہ میں بہت گرد اڑا رہی ہوں۔

چنانچہ اب بجیا شاستری کے سخت دشمن ہیں۔ جب سے انہوں نے ان کی شادی کا الٹی میٹم شائع کر دیا۔ ابھی تک انھوں نے ہمیں [illegible] بھابی کی باتیں سنائی تھیں اور سب عمر میں پہلی دفعہ انھوں نے بیوی کی نسوانی آنکھوں کو اپنی طرف ایسے دیکھتے پایا۔ جیسے عورت

یتی ہے۔ تو بیچ میں شاستری جی کو ٹپکا۔ معاہدہ بہیں تک رہتا تو بھی خیریت تھی۔ مگر وہاں تو بھیا کی ڈوب گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ کے
نے ہی ہمارے معاشرے میں یکدم نئی اقدار ابھر پڑی ہیں۔ اور لوگوں کے نظریات بالکل بدل گئے۔ چنانچہ جب فلم ایکٹریس شمیم آرا نے اعلان
یں تو اس بہادر سے شادی کروں گی جو جموں اور کشمیر پر پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا۔ تو بھیا کی محترمہ بھی مغربیت ترک کرکے مشرقی ہو گئیں اور
ہو کر مٹ شپ چھوڑ کر سوئمبر رچانے پر آگئیں۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی شرائط کا اعلان کر دیا۔ آپ چاہے اسے عورت کی نقالی کہیں یا
ذ بہ حب الوطنی۔ مگر بھیا دونوں حالتوں میں پٹ گئے۔ چنانچہ شاستری کے پیاسے دشمن ہو گئے۔

خدا نخواستہ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بھیا اس جنگ کو ذاتی المیہ ہی سمجھتے تھے۔ یہ اُن کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ کیونکہ اُن کا جذبہ حب الوطنی
بڑی شدت سے بیدار ہوا تھا —— سب جانتے ہیں کہ بھیا کو پاکستان سے کتنی محبت ہے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ عرصے سے اُن
کی نیت، علی خاں شیخیاں برداشت کرتے رہے ہیں۔ کہیں اور ایسے چاہنے والے شاید نہ مل سکیں۔ اس لیے وہ بھی سب کی طرح اس ملک کی حفاظت
کو لے اور ان کا جذبہ حب الوطنی جوش سے بیدار ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بھیا فوج میں بھرتی کے دفتر پہنچ گئے۔

یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہیں ہوگا۔ کہ اعلان جنگ ہوتے ہی بھیا نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بہادر ہیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے
وہ ایک بہادر قوم کے فرد تھے۔ مگر وہ تو اپنے آپ کو ذاتی طور پر بہادر سمجھتے تھے۔ اور خفا بھی تھے کہ اُن کی سابق محترمہ یہ تسلیم کیوں نہیں
کرتیں اور ہم لوگ کیوں نہیں مانتے۔ ہم تو خیر بقول اُن کے حسد کی وجہ سے نہیں مانتے تھے۔ مگر جب جنگ کے دنوں میں بہادری کے
تمغہ جات وغیرہ کی فہرست میں اُن کا نام نہ ملا۔ تو انھیں بہت اچنبھا ہوا۔ ہم سے خفگی بھی بڑھی کہ اُن کا نام حذف ہونے پر ہمدردی نہیں
کی۔ بالآخر جب جنگ کے بعد صدر ایوب نے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر فضائیہ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ جن کو تمغے نہیں
ملے وہ بھی بہادر ہیں۔ تو بھیا کی کچھ تسلی ہوئی اور پھر جب صدر نے اسی تقریر میں کہا کہ جنگ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی
بہادری کے کارنامے دیکھنے والا کوئی موقع پر موجود نہیں ہوتا اور اس کی بہادری کا لوگوں کو علم نہیں ہو سکتا۔ تو بھیا کی باچھیں کھل گئیں کہ ان
کی بہادری بھی بالآخر تسلیم کر لی گئی ہے۔ خفا کے بیان دیدنی ہے اندھیر نہیں ہے۔ جس وقت وہ صدر کی تقریر ریڈیو سے سن رہے تھے اس
وقت ساتھ ساتھ شیو بھی کر رہے تھے۔ باچھیں کھلنے سے چہرے کی کھال زد آشنا گئی۔ اس دن سے اپنے آپ کو جنگ کے لیے خون بہانے والوں
میں شمار کرتے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ نہ جنگ ہوتی۔ نہ صدر ایوب تقریر کرتے اور نہ خون نکلتا۔

یہ ذکر تو ضمناً ہو گیا۔ اصل قصہ تو اُن کے فوج میں بھرتی ہونے کا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے اُنھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھرتی ہونے
جا رہے ہیں۔ لیکن واپسی پر کوئی اعلان نہ کیا۔ ہمارے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا۔

"ابھی حالات اتنے نازک نہیں ہوئے کہ انھیں میری ضرورت پڑے۔"

اور پھر اور سوالوں سے بچنے کے لیے اخبار لے کر بیٹھ گئے۔

مگر ہمارے ایک اور دوست بھی اسی گروپ میں گئے اور بھرتی کر لیے گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ بھیا طبی معائنے میں کامیاب
نہ ہو سکے حالانکہ میک اپ تک کر کے گئے تھے۔ اور پورے دو گھنٹے سے سگریٹ کی پرہیز کر رہے تھے۔

بھائی جان جب وہاں سے آئے تو کئی لوگ باہر والوں میں بیٹھے تھے۔ مگر بھیا ذہن میں پریشان سے بیٹھے تھے جیسے کوئی بات ہے۔ اس
لیے جب اندر گئے تو گھٹنے پکڑے بیٹھے تھے۔ بیٹھنا ضرور ہی گیا تھا مگر ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہہ گئی
بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں نے یہ چیز ہو ہے کی شدت پر محسوس کرتے ہوئے وزن یا اور دوسری پابندیاں کیں۔"

"اُن کا وزن کتنا تھا؟" ہم نے اُس کی دوست سے پوچھا۔

"میں صرف اس وقت تک اُٹھ سکتا تھا جب ہلکی ہو۔ مگر وہاں تو کوئی بھی پوچھنے والا نہیں، اس لیے مجھے نہیں معلوم۔"

"بھائی کی پیمائش کتنی تھی؟"

"بس یوں سمجھو کہ فیتہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پہلے دو چار انچوں میں ہی کام چل گیا تھا۔"

"اور قد کی اونچائی کتنی تھی؟"

"اللہ کا شکر ادا کرنے کو تو کافی تھی۔ مگر فوج کے لیے کافی نہ تھی۔"

مگر چند دن بعد بھیا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہیں انتخاب کے اس طریقے پر اعتراض ہے ——

"بھئی یہ فیتے، ترازو یا پیمانے سے بھی کہیں بہادری اور جذبہ ناپا جا سکتا ہے!؟"

جنگ سے پہلے بھیا کے دوستوں کی محفل شیزان ریستوران میں جما کرتی تھی۔ مگر جنگ کے دنوں میں پبلک لائبریری میں منتقل ہو گئی
کرتی تھی۔ پہلے سب لوگ اندر جا کر اخبارات پڑھتے۔ رسالوں میں تبصرے پڑھتے۔ پھر باہر لان میں بیٹھ کر صورتِ حالات پر تبصرے کرتے
اور ٹرانسسٹر ریڈیو سے خبریں سنتے۔ چنانچہ اُس دن جب اکٹھے ہوئے تو بھیا بہت ناراض تھے۔ کہ انہیں اپنی بہادری دکھانے کا موقع
نہیں دیا جا رہا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ وہ وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی سونا بھی جیتنا چاہتے ہیں۔ مگر حالات اُن کے قابو سے
باہر ہیں۔

"ہائی گاڈ" وہ وثوق سے بولے "اگر مجھے چن لیا جاتا۔ تو جتنے لوگ شہید ہوئے ہیں۔ اُن سب سے زیادہ کارنامے کر کے اور یہ
زندہ کا زندہ واپس آتا۔"

"ایسی لڑائیاں تو جنگ کے بعد بھی ہو سکیں گی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ بس آپ کوشش کریں کہ وہاں ہیرو کا پارٹ مل جائے" انور
صاحب بولے۔

اتنے میں کسی نے ٹرانسسٹر ریڈیو پر ہندوستان کی خبریں لگا دیں۔ وہاں سے اعلان ہو رہا تھا کہ پاکستان نے انبالہ اور دہلی کے
قریب پیرا شوٹ اتارے ہیں۔

بھیا غصے سے اچھل پڑے۔ "اگر مجھے فوج میں نہیں لے سکتے تھے۔ تو انہی لوگوں کے ساتھ وہاں پھینک دیتے —— اور
کچھ تو کام بنتے۔ یہ سب جذبے اور بہادری سے۔"

ہم نے یاد دلایا "مگر بھیا۔ وہاں تو آدمی نہیں۔ جنہیں اُتر کر کچھ کرنا بھی ہوتا ہے۔"

"سنئیے۔ وہ بھیا بولے" اور پھر پیرا شوٹ اُترنے کی شرط یہ ہوتی ہے کہ چھتری کے نیچے کافی وزن ہو —— آپ تو شاید

شروع نہ کر سکتے۔ مگر جب آپ کا پیراشوٹ اُوپر ہی اُوپر اُڑتا ہُوا چین یا جاپان پہنچ جاتا۔ اور بین الاقوامی کشیدگی پیدا ہو جاتی۔‘‘

بھیا بہت ناراض ہوئے اور ہمیں انتہائی ذاتی قسم کی بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر بولے۔

’’تمہارا کیا خیال ہے ہم کو جو ہدایات ملتی ہیں میں اُن پر عمل نہیں کرتا ——— بائی گاڈ اب تک سول ڈیفنس کی جو ہدایات شائع ہوئی ہیں میں اُن پر تم سب لوگوں سے بہتر عمل کرتا ہوں۔‘‘

یہ بات سو فیصدی درست تھی۔ وہ واقعی اُن پر خوب عمل کر رہے تھے۔ اتنا کہ بلیک آؤٹ میں کپڑے بھی کالے پہن لیتے تھے۔ سر کے تاؤ کا سفید بالوں کو بھی خضاب سے کالا کر لیتے تھے۔ چہرے پر کالک صرف اس ڈر سے نہ ملی کہ ملک کے غدار نہ سمجھے جائیں۔ اس لیے انہوں نے کالے فریم والی موٹی سی عینک دوبارہ نکال لی۔ جو وہ انٹلکچوئل بننے کے دنوں میں استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے اپنی کاروں پر کیچڑ مل رکھا تھا۔ مگر بھیا نے ایکسپریس سے فلم لپیٹنے والے کاغذات چسپاں کیے تھے۔ اور بتیاں بالکل معطل کر کے کار کے نیچے لالٹین اس طرح لٹکا دی تھی جیسے بیل گاڑی والے کرتے ہیں۔ گھر کی منڈیر سے کوّا کبھی نہ اُڑاتے کہ ’’کالا ہے کیا معلوم جو بیٹھا رہے۔‘‘ لیکن اگر کبھی سفید کبوتر وغیرہ بیٹھتا تو وہ پتھر پھینکتے ——— جیب میں روئی ہمیشہ رکھتے تھے۔ (فرسٹ ایڈ کے لیے) اور بمباری کے وقت دانتوں کے درمیان کچھ رکھنے کو ربڑ پاپ کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ ——— ایک جیب ریت سے بھری ہوتی۔ دُوسرے میں پانی کی چار اونس والی شیشی ہوتی۔ اگر ان کے کپڑوں کو آگ لگ جاتی تو یہ مقدار کافی ہوگی۔ جنگ میں کیا پتہ ہوتا ہے۔ ہر چیز کا امکان ہو سکتا ہے ——— سر کے بال کافی بڑھا لیے تھے تاکہ سر پر لگے تو چوٹ کم ہو جائے ——— ہمیشہ ٹینس کے جوتے پہنتے تھے کہ بمباری سے گرتی ہوئی بلڈنگ کے نیچے سے بھاگنے میں آسانی ہو ——— جوتوں کو رنگ ساز سے رنگ سیاہ کالا کروا لیا تھا۔

کافی دیر بحث ہوتی رہی۔ ہم بھیا کو سمجھاتے رہے کہ فوج میں بھرتی ہوئے بغیر بھی آپ خدمت کر سکتے ہیں۔ مگر وہ بہادری کے کارنامے کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور وہ موجودہ حالات میں ممکن نہ تھا۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو بھیا سخت بگڑے ہوئے تھے اور ناراض بھی تھے

جب باہر نکلے تو دیکھا کہ سڑک پر بہت سے لوگ ایک آدمی کو پکڑ کر لا رہے ہیں اور اُس پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ دُشمن کا ایجنٹ تھا۔ جو اُن کو خبریں پہنچاتا تھا۔ ساتھ ہی ایک اور آدمی کو لوگوں نے کندھوں پر اُٹھایا تھا۔ اور ہار پہنائے تھے۔ اس نے ایجنٹ کو خفیہ سگنل کرتے ہوئے وائرلیس سیٹ کے پکڑا تھا۔ یہ سب لوگ پولیس اسٹیشن جا رہے تھے۔

مسٹر کمال۔ شیدی بولے ’’بھیا۔ یہ بھی تو بہادری ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں کرتے۔‘‘

بھیا کُڑھ کر بولے ’’بہادری مرد کی ہے۔ مگر یہ تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ میں تو کوئی بڑا کارنامہ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

اس کے بعد بھیا دو چار دن غائب رہے۔ اندازہ یہ تھا کہ وہ ہم سب سے ناراض ہیں ——— مگر ایک دن دیکھا تو سڑک پر ایک بیل گاڑی کو ہانکتے چلے آ رہے ہیں۔

ذکی صاحب بولے ’’بھیا واقعی بہادر ہیں ——— یہ اتنے دن اس لیے غائب تھے کہ بلاوجہ دُشمن کا ایجنٹ پکڑنے نکلے تھے اور اب اُسے مار کر بیل گاڑی بنا دیا ہے۔‘‘

ہمارا قہقہہ ختم ہونے تک بھیا گیٹ میں مڑ چکے تھے اور بیل گاڑی آتے تک نکل گئی تھی۔ مگر خلاف توقع بھیا نے بہادری جیتنے کی

طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور تب ہی انکشاف ہوا کہ انہوں نے ایک ہندوستانی جاسوس پکڑا ہے۔

"بکواس نہیں" ہم سب جوش میں آ گئے۔

"ہر چیز کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب لاکر" وہ دانشمندانہ لہجے میں بولے "یہ ضروری ہے کہ اسے پکڑنے سے پہلے اندازہ ہو جائے کہ وہ کن لوگوں سے ملا جلتا ہے۔ تاکہ پورا گروہ پکڑا جائے۔"

وہ کافی عرصے سے متعلق اپنا مشاہدہ یقیناً ختم کر چکے تھے۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جاسوس ہے؟"

"بہت سی چیزوں سے ---- سنو۔

نمبر ایک ---- وہ شکل سے ہی جاسوس لگتا ہے

نمبر دو ---- ہمیشہ اکیلا رہتا ہے۔

نمبر تین ---- جہاں دو چار آدمی کھڑے ہوں۔ جا کر سننے کی کوشش کرتا ہے۔

نمبر چار ---- عام آدمیوں سے مختلف لگتا ہے۔ یعنی جاسوس ہے۔

نمبر پانچ ---- اکثر وہ پھر کر اکیلا کھیتوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہاں سے یقیناً وائرلیس کے ذریعے خبر پہنچاتا ہوگا

نمبر چھ ---- مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھتا ہے اور وعظ سنتے وقت کبھی نہیں سوتا۔ گویا بہت چوکس ہے۔

نمبر سات ---- اگر میری شکل اس جیسی ہوتی تو میں یقیناً جاسوس ہوتا۔

نمبر آٹھ ---- وہ بھینگا بھی ہے۔ اس لیے بڑی آسانی سے ایک طرف نظریں دوڑاتے ہوئے دوسری طرف بھی دیکھ سکتا ہے۔

نمبر نو ---- میں نے اسے بس سے اتر کر ٹیکسی میں سوار ہوتے دیکھا۔ حالانکہ بس بھی ادھر ہی گئی تھی جدھر ٹیکسی گئی۔ گویا سوال یہ ہے کہ اگر ادھر ہی جانا تھا تو بس پر کیوں نہ گیا۔

نمبر دس ---- اپنے گھر کو ہمیشہ تالا لگا کر رکھتا ہے ---- یقیناً اندر کچھ ہوگا۔

نمبر گیارہ ---- اگر وہ جاسوس نہیں تو . . . کیا ہے؟"

نمبر بارہ ---- اس کی . . . . . .

"بکواس بند کرو" اتو صاحب چلائے "تمہیں یہ کرنٹ کہاں سے ملے؟"

اب ہم سب سنجیدہ ہو رہے تھے۔ وہ یقیناً جاسوس لگتا تھا اور اگر جاسوس نہیں تو جاسوس کا چچا ضرور تھا۔

"میں پچھلے چار روز سے اس کا تعاقب کر رہا ہوں"

ہم سب ہتیلے قائل ہو گئے اور فوراً پیش کش کی کہ سب کی ڈیوٹی مقرر ہو جائے۔ ہم چاروں اس کے تعاقب میں رہیں۔ بہت ممکن ہے کوئی گروہ ظاہر ہو جائے۔ پولیس کو بھی ساتھ ملایا جائے۔

مگر بجیا نے کہا "تم سب بچے ہو۔ خواہ مخواہ کام بگاڑ دو گے۔ میں مناسب وقت پر تم کو ساتھ ملاؤں گا۔"

بجیا نے جیمز ہیڈلے چیز کی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ اور شرلاک ہومز اور آرسین لوپن کا نام ہم سے سُنا تھا ——— بس اُسی دن سے وہ اپنے کو بہت بڑا سراغرساں تصور کرتے تھے۔ ہم نے بہت سمجھایا کہ مل کر کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اور یہ کارنامہ اکیلے کرنے گئے ہوئے تھے۔

بجیا چلے گئے تو ہم لڑکوں نے بڑی چہ میگوئیاں کیں۔ بجیا کی ضد پر افسوس بھی کیا۔ یہ بھی سوچا کہ چپکے چپکے پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔ مگر آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اگلی رپورٹ کا انتظار کر لیا جائے۔

مگر کافی دن تک بجیا کی اگلی رپورٹ نہ ملی۔ البتہ ادھر اُدھر سے جو حالات پتہ چلے وہ آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ اگلے دن وہ جاسوس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اُس نے ٹیکسی پکڑی اور ایک طرف نکل گیا۔ بجیا بھی پیچھے جانے کے لیے ٹیکسی ڈھونڈنے لگے۔ مگر وہاں کوئی دُوسری ٹیکسی نہ تھی۔ وہ چوک کی طرف بھاگے کہ شاید وہاں سے کوئی مل جائے۔ مگر عین اسی وقت ہوائی حملے کا سائرن بج گیا۔ چشم زدن میں ٹریفک رُک گئی۔ بجیا کو بھی ایک خندق میں پناہ لینا پڑی۔

اب اس جنگ میں مسلمانوں کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ وہ ہوائی حملے کے وقت فضا میں ہوائی جہازوں کی لڑائی کو ٹھٹوں اور چھتوں سے دیکھا کرتے تھے اور خندقیں خالی پڑی رہتی تھیں۔ اس لیے خدا کی دُوسری مخلوق انھیں غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگی۔ چنانچہ خندق میں گھستے ہی بجیا پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک کتیا اور چار پلّوں کے آرام میں حارج ہوئے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بجیا کتوں سے بہت ڈرتے ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ کتوں کا سرگرم ہونے کی وجہ سے ان کا وہ ڈر اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس ڈر کی جڑ بچپن تک جاتی ہے۔ جب انھیں کسی ہندوستانی صنف کُتّے نے بغیر اشتعال کے کاٹ لیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے بجیا کی حفاظت بارہ چودہ ٹیکوں کے کورس سے کی۔ اس کے بعد سے بجیا اس جنس سے اتنے ڈرتے ہیں کہ اگر کہیں پلّا نظر آ جائے تو ڈر کے مارے ایسی عجیب و غریب شکلیں بناتے ہیں کہ پھر کتا ان سے ڈرنے لگتا ہے۔ اُن کا فارمولا درج ذیل ہے۔

۱. چھوٹے کُتّے سے ڈرو ——— کیونکہ وہ نظر آئے بغیر کاٹ سکتا ہے۔ اور بھونکنے میں بالکل پیچھا نہیں ہوتا۔

۲. بڑے کتّے سے بہت ڈرو ——— کیونکہ اُس کی موجودگی میں اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

۳. کتیا سے اس سے بھی زیادہ ڈرو ——— کیونکہ ہر مخلوق کی طرح سب سے بڑا کتا بھی بیوی سے ڈرتا ہے۔ چاہے وہ کتیا ہو کیوں نہ ہو۔

۴. چھوٹے پلّے سے سب سے زیادہ ڈرو ——— کیونکہ اُسے کتیا کی حمایت حاصل ہے۔ یعنی نمبر ایک اور نمبر تین مل جاتے ہیں۔

بہرحال اُس دن بجیا کو ایک طرف دشمن کے ہوائی جہازوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف بیک وقت ایک کتیا اور کئی پلّوں کا۔ کوئی ڈاکٹر موجود ہوتا تو "انسان اور خوف" کے موضوع پر ریسرچ کرنے میں خاصی مدد ملتی۔

اگلے دن جب ہم بجیا کی عیادت کے لیے گئے تو تمام جنگ کی ہڈیوں کو سہلاتے ہوئے وہ جاسوس سے مقابلے کی بجائے کتیا سے مقابلے کا اصل سبب بتاتے رہے اور اس اعتماد کے ساتھ کہ گویا اس مقابلے سے بچ نکلے ہیں۔ تو جاسوس کیا شے ہے۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ خندق

سکا کا سے بچتے ہوئے چاہئیں، تاکہ نکلنے کے لیے ہاتھ لگ سکے۔

دُوسرا واقعہ بھی ایک مادہ جنس سے تھا۔ جسے شاعر حضرات اور ماہرین جمالیات اپنی زبان میں عورت کہتے ہیں۔ ہُوا یوں کہ بھیّا نے ماڈل ٹاؤن بلڈنگ کے قریب گول چہرے کمانی کمانے جاسوس کو جاتے دیکھا۔ چشمہ والا پیالہ چہرہ کیا گیا پیچھے پیچھے۔ تو وہ چپکا ایک بہت بڑی بلڈنگ میں گھس گیا۔ جس میں کئی فلیٹ تھے۔ بھیّا بھی پیچھے پیچھے گئے۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈھونڈنے میں پینے فلیٹوں کے سامنے سے کئی دفعہ گزرے تو عورتیں بھی حسبِ عادت شرم اور نخرے بالائے طاق رکھ کے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اُس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کون شخص بار بار اِدھر اُدھر جا کا پھیر رہا ہے۔ چنانچہ عورتیں دروازوں سے سر نکال کر باہر دیکھنے لگیں۔ ایک دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے بھیّا نے سُنا کہ کوئی عورت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"یہ تو کوئی ہندوستانی جاسوس لگتا ہے۔"

"یا پھر پیراشوٹ کے ذریعے ہندوستان نے اُتارا ہوگا۔" دُوسری بولی۔

بھیّا کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً اُن کے اور قریب جا کر بولے۔

"جاسوس؟ کدھر ہے وہ؟ میں بھی اسی کی تلاش میں ہوں۔"

عورتیں حیران سی ہوئیں۔ مگر ایک کالج کی لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ "بھائی صاحب کس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہاں تو کوئی آیا ہی نہیں

کافی دیر سے ہم صرف آپ ہی کو دیکھ رہے ہیں۔"

تب بھیّا اُس کا حلیہ بتانے لگے۔ لیکن جوان لڑکی سے مخاطب ہونے کی گھبراہٹ اور مسرت سے ہکلانے لگے۔ عورتوں کی

آنکھوں میں شک تیرنے لگا۔

اتنے میں سامنے والے فلیٹ سے ایک عورت بولی

"میاں جی۔ میں نے دیکھا ہے۔ آپ ذرا اِدھر بیٹھک میں تشریف رکھیں۔ میں ابھی جا کر بتاتی ہوں۔"

بھیّا نے مُڑ کر دیکھا تو ایک خوبصورت سی سڈول عورت بول رہی تھی۔ یہ تو ایک دم پھول گئے۔ اور اپنے آپ کو اندر کے

اکھاڑے کا راجہ سمجھنے لگے۔ وہ بڑی خوشی سے مخاطب ہو کر بولے

"نہیں آپ مجھے بتا دیجیے۔ کہاں گیا ہے۔ میں ابھی اُس حرامزادے کو پکڑتا ہوں۔"

عورت بولی "نہیں آپ بیٹھیں۔ میں ذرا تسلی کر لوں کہ وہ کس کے گھر میں گیا ہے۔ وہ لوگ میرے جاننے والے ہیں۔"

بھیّا خوشی خوشی اسی کمرے میں جا کر بیٹھ گئے اور وہ عورت جاسوس کا پتہ لینے باہر چلی گئی۔ ساتھ ہی انھیں اکیلا چھوڑنے کی معذرت

بھی کرتی گئی۔

[illegible]

... چند منٹ میں مسلح پولیس کے دو سپاہی فوراً بیٹھک ...

"مم۔۔۔۔مم۔۔۔۔میں تو جاسوس نہیں۔ میں تو اُسے پکڑنے نکلا تھا۔"

سپاہی نے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور درشتی سے بولا۔

"ہاں صاحب۔ آئیے نا ذرا تھانے تک۔"

"مگر کیوں؟" بھیا اکڑے۔

"اوئے ادھر آ" سپاہی نے بازو پکڑ کر گھسیٹا اور بھیا بے بس ہو کر ساتھ چل پڑے۔

اتنے میں اُن کو خدا حافظ کہنے کو بہت سی عورتیں اور بچے اکٹھے ہو گئے تھے۔ جب وہ چلے تو بچوں نے نعرہ لگایا۔

"ہندوستانی جاسوس ——— مردہ باد۔"

کالج کی اُسی لڑکی نے ایک انڈہ ہوا میں اُچھالا۔ جو جیٹ ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتا ہُوا اُن کے رُخسار پر آن اُترا۔ کیونکہ سڑے جسم میں سب سے سپاٹ جگہ وُہی تھی۔ آدھے چہرے کی شرمندگی تو انڈے کے بیسدار لعاب سے چھپ گئی اور باقی آدھے پر کسی قدردان عورت کی جوتی دھپ سے آ کر لگی۔

تھانے جا کر معلوم نہیں کیا ہُوا۔ مگر بھیا کا بیان ہے کہ اُنھوں نے جب اپنے کالج کا شناختی کارڈ دکھایا تو پولیس والوں نے معافی مانگی اور وہ اُن کو خُوب ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آ گئے۔ پولیس والوں سے ابھی تک ہماری مُلاقات نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں اُن کا بیان کیا ہے۔

اب بھیا جیمز بانڈ کے طریقوں کو چھوڑ کر سیدھے انداز میں فوری پکڑنے پر تُل گئے۔ خُدا نے یہ موقع بھی جلد ہی دے دیا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ چوبارے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے نیچے سے جاسوس کو گزرتے دیکھا۔ بھیا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً اُٹھ کر دو دو چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے اُترے۔ برآمد ہوتے ہی اُنھوں نے دُور سے دیکھا کہ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا ہے۔ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے۔ گلی میں مُڑے تو اُس کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔ مگر بھیا جوش کے عالم میں سمجھے کہ شاید گلی آگے سے بند ہے۔ حالانکہ وہ بند تھی اور آخر میں بہت چھوٹا راستہ ساتھ والی گلی سے ملاتا تھا۔

"بہت تیرے کی" بھیا بولے "اب کہاں جائے گا۔ انہی مکانوں میں ہو گا کہیں ——— ابھی نکلے گا ہی نا"

چُنانچہ یہ بڑے اطمینان سے گلی کے مُنہ پر کھڑے ہو گئے۔ دُوسری طرف سے تو بقول اُن کے گلی بند تھی۔

اتنے میں ایک گھر سے ایک برقعہ پوش عورت نکلی ———

بھیا کو شک پڑا ——— یہ عورت اتنی لمبی کیوں ہے ——— اور چلتی کیسے ہے۔ چند لمحے اُنھوں نے اُسے دیکھا اور پر جھپٹے۔

"حرامزادے ——— تو اس طرح مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ تم جیسے تو میں نے کئی دیکھے ہیں۔"

اور جھٹ سے اُس کا برقعہ کھینچ کر پرے پھینک دیا۔

اندر سے ایک بڑی عمر کی محترمہ برآمد ہُوئی۔ بھیا تو مونچھیں ڈھونڈنے لگے۔ مگر وہ خالص نسوانی چہرہ بولا "حرامزادے"۔

اسلم کا ہاتھ دیکھ کر تو نیچے کلاس میں تالیاں بجنے لگی۔

ادھر کمرے سے ملازموں سے لوگ نکل کر نیچے آگئے......

....." ارے میاں اتنی بہادری کی پیشی پڑی ہے تو سر جا پاجاسوسی کی حرکتوں کے کپڑے اتار دو۔ یہاں کیا جاسوسی کا چھپا کام کرے

ہے......" بیگم نے کہا۔

"میاں جاؤ: جیل گیا چند دنوں میں۔ مگر تم ملکیوں کی کوشش نہ ہوتیں تو کوئی ڈاکو پکڑا جاتا۔"

"ہم..... ہم..... بیگم نے کہا تمہاری جاسوسی ہے۔" بھیا نے اپنے الفاظ کی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

"جاسوسی ہے؟" کوئی دانت پیس کر بولا" جاسوسی ہے تو اس کا پہچاننا تھا۔ جب وہ چار لوگ ہوتے تو ان سے مل کر یہ کام کرتے

دیکھنے میں محنت کرو دیکھ کر تمہیں کہیں جاسوسی نظر آنے لگے"

"چھپا کر ہی... میں کئی دن سے کر رہا تھا" بھیا نے کہا۔

"بس اس کو اب مزا آ رہا" محنت بولی "میں تو کئی دن سے گھر سے ہی نہیں نکلی۔ یہ پہلے میرا پیچھا کر رہا تھا۔"

ذلیل لڑکوں نے جان کو گھیر لیا۔" اور سارے کو" کوئی دانت پیس کر چیخا۔ اور.....

تھوڑی دیر بعد جب ہم لوگ بھیا کی عیادت کو گئے تو وہ چوٹوں کے درد سے بے تاب ہو کر کروٹ بدلتے ہوئے بولے۔

"بھائی اب ہم سب مل کر اس کو پکڑیں گے۔ اکیلے آدمی کے لیے وہ حرامزادہ بہت چالاک ہے۔"

ہم سب فوراً راضی ہو گئے۔

اس کا موقع بھی جلد ہی مل گیا۔

ہم پبلک لائبریری میں بیٹھے تھے کہ بھیا بھاگتے ہوئے آئے۔ اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بھاگتے گئے۔

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے ہو لیے۔

"ٹیکسی!" بھیا نے ہاتھ کھڑا کیا۔

چ ـــ وسـ ـــ ک ـــ ختم ہو کر ایک جھٹکے سے ٹیکسی رک گئی۔

بھیا نے خود ہی اس کا دروازہ کھولا۔ اور اچھل کر اندر۔ ہم بھی چشم زدن میں اندر تھے۔

"وہ جو دو منزلہ بس جا رہی ہے" بھیا نے بس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے پیچھے چلو ———

ٹیکسی والا حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"ارے بھائی" ہاتھ صاحب کے ڈھیرے سے اطلاع۔" جلدی چلو۔ اس میں ہندوستانی جاسوس ہے۔"

ٹیکسی والے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

گھرررر ـــ ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی" تعریف کر دی ——— ابھی پکڑتے ہیں"

جانم جناب ہم نے بس کو جا لیا۔

"ہم باہر ہیں ——— ہم باہر بھیا" بجیا چلائے۔

ڈرائیور ٹیکسی کو بس کے بالکل ساتھ لے آیا۔ ادھر سے ہم نے ہاتھ نکال نکال کر شور کیا۔

"بس روکو ——— بس روکو ——— اندر جاسوس ہے"

جنگ کے دنوں میں حیا کی مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ تھی۔ ساری قوم اُن کی جوانی کو اپنا محافظ سمجھتی تھی اور اُن کے جذبے اور جوش پر اپنی نبض رکھتی تھی۔ چنانچہ بس والے نے فوراً بس روک لی۔

ہم نے ٹیکسی سے اس کا راستہ روک دیا۔ بجیا چھلانگ مار کر باہر نکلے ——— لپک کر بس کے پیچھے گئے۔ دروازے میں زور سے گھسے۔ جاتے ہی اُس کو گریبان سے پکڑا۔ اور گھسیٹ کر نیچے لانے لگے۔ وہ ذرا بھاری تھا۔ اور مقابلہ بھی کرنے لگا۔ مگر جب ہم سب پہنچ گئے تو اُسے اُٹھا کر نیچے اُتار دیا۔

بس کی سواریاں حیرت سے منہ کھول کر یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ ایک آدھ آواز اعتراض کی بھی آئی۔ "کیا کرتے ہو میاں؟"

بجیا نے صرف اتنا کہا "جاسوس" ——— اور بس کی فضا ہی بدل گئی۔

"مارو حرامزادے کو۔"

"جانے نہ دینا۔"

"پکڑو۔"

"ابھی پولیس کو دو۔"

کسی نے جوتا اُتارا۔ کوئی گھونسہ تاننے لگا۔ کسی نے ویسے ہی گالیاں دیں۔

باہر آتے ہی بجیا نے اُسے گریبان سے پکڑا اور اُچھل کر زور سے ٹکر ماری

"حرامزادے ——— اب بھاگ کر کہاں جاتا ہے" وہ دانت پیس کر چلائے۔

اُس کے جبڑوں سے خون نکلنے لگا۔

دو منٹ بعد اتنے ہاتھ مارنے والے تھے کہ اُس تک شاید ہی کوئی پہنچتا تھا۔ بلکہ ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ کو ... لگتا تھا۔

وہ بے دم ہو کر نیچے گر پڑا۔

"ارے کیا ہوا ——— کیا بھئی" ایک آدمی اوپر والی منزل سے چلاتا ہوا نیچے بھاگا آیا۔

"حرامزادہ۔ ہندوستانی جاسوس ہے" بجیا بڑی فتح مندی سے چلائے۔

"بھائی آپ کو کیسے پتہ ہے؟"

"میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہر جگہ گھومتا رہتا ہے اور جہاں چار آدمی ہوں، اُن کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے۔

• تو کیوں ذکر سے بھائی صاحب" "وہ بولے" "یہ تو بس کا چپ ہے:

کئی سو میل تک وہی زمین کی طرف نکل گئیں۔

"یہ تو خیر مختصر ضمنی کا اظہار ہے"

بیچارہ مختصر کمرے کو ٹھیک ہے۔ اور ہم جھٹ سے انہیں ٹیکسی میں ڈال کر اس کو ہسپتال لے گئے۔

آج کل بتایا تو وہ لوگ ذکر کے ہیں۔ ایک پیسہ نہ لیتے" "تو کیسے یہ چندہ جمع کرتے ہیں۔ تو اور سے کہا تو میں،

سند و قیاس ہماری ہیں — ایک تو ان کا مدد کے لیے — دوسرا — "وہ بولے" "کہا تو ہم مدد کے لیے۔

نیم کے پتّے

آغا بابر

یہ بات تو اُس پر واضح تھی کہ عورت کی ذات اور پیچ در پیچ پگڈنڈیوں سے بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ کہ عورت پہلے سے پرکھے بغیر جنے نے بھر ڈالا کو جنگل میں تبدیل کر دے اور مرد پر اتنے ستم ڈھائے کہ اُس کی روح کے چیتھڑے اڑا کر ماضی حال اور مستقبل کی کھونٹیوں پر ... باندھیں اور جب ان میں سے قطرہ قطرہ ہو کر حسرتوں کا خون ٹپکنے لگے تو ایسے دو مختصر مرد سے پھر وہ پت بٹ کر شروع سے آخیر تک ... پیار کرانے اور پھر اس طرح شروعات سے ہو جائے جیسے ان دونوں میں لڑائی نہ ہو۔ اس کا اُسے علم نہ تھا۔

شکران کو آنے کے بعد جو شکست کھائی نے گویا انوں تکادی کا مضمون ہوتا ہے کہ جب بار بار سیلاب اور آندھیاں آ کر دیا۔ ان ویرانوں اور سالوں کہ جائیں تو آدمی تھک ہار کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے۔ جو دیا کئی مہینوں سے عثمان کے پرزے اڑا رہی تھی جنہیں ... یہ اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ جو دیا کے اندر بیزاری اور غصے کی چنگاریاں بھری رہتیں مگر عثمان سراسر مفاہمت بیزار رہتا

وہ اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے جو دیا کی ہنسی اور راحت کی خاطر ملتا مگر جو دیا گھر پہنچتے پہنچتے اکھڑ جاتی۔ غصے کا جھکڑ سا چلتا جو عورت کو اندر سے بکھیر دیتی اور خوفناک بادل کے پلٹنے اور ٹوٹنے پر عثمان کے مزاج اور وقار اور دل کے ٹیلے ڈھا کر دیتیں۔ وہ اس ... ہر بار کسی حال آگ سے اپنی روح کے جلنے کو بچانے کی بار بار کوشش کرتا مگر پے در پے دھماکے اُسے جاں بر کر دیتے۔ ایک تنکا سا بھی تو رہا سہا جل کر راکھ ہو جاتا۔

"تمہارا شکستاں کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اس کی شہرت بھی سنی اور آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ افضال کی بیوی تمہارے ساتھ بہت ملتی رہی ہے۔ تم کسی کو نہ چھوڑو۔" جواب بھی چاہیے مگر یہ دیتی ہے۔ عثمان کی روح کے پرزے اڑتے۔ مگر کوئی آگ دکھا نہ جاتی۔ احساسات الجھنے لگتے۔ مبہم اور دیوانی پرچھائیاں روح کے گرد لپٹنے لگتیں۔ وہ اپنے مردانہ وقار اور اپنے اوپر ان الزاموں کی تاب نہ رکھتا۔ اس کی سوچ جواب دے جاتی۔ اس کا ذہن رک جاتا۔ وہ نڈھال اور بے بس ہو کر کرسی پر گر پڑتا۔ اس کا ہجر اس میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں کو دیکھتا۔ رات کے سناٹے کو سنتا۔ اس کے اندر زخم کھائے ہوئے سانپ انتقام پھنکارتا۔ پھر اس کا پیچ و تاب اور اضطراب دیکھنے کو کلثوم کی پر سکون مسکراہٹ جیسے اس پر جھک جاتی۔

صفائی کی گواہیاں شادی اور بیانات سب سے چُھو ہو کر گر پڑتے۔

"تمہیں مجھ سے پیار نہیں رہا۔"

"کیوں کہتی ہے؟" عثمان جو دیا پر جھک جاتا۔ کلثوم مسکرا کر دیں، وہ بھی اپنی جگہ پیار مسکرانے لگتی۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے بہت گہرا ہو جاتا۔ پھر جب وہ ستارہ نمودار ہوتا تو پھول اور کانٹا ایک ساتھ مہک اٹھتے ہوتے۔

بیبا عثمان کے بچوں میں سے سب سے [illegible] بڑی ہوگی۔

جب سے عثمان کی جھولی میں شمشاد اور افضال کی بیویوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ ان عورتوں نے عثمان کے لیے نگاہ وہ [illegible] جھکا تو انھیں کبھی دیکھ لیا تو نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتا۔ کرنے بیبا کی خوشی کے لیے شمشاد اور افضال سے شادی کر دیا مگر بیبا اب بھی عمر رسیدہ تھی۔ پھر وقت اس کی بیوی تھی۔ جس جگہ جاتے وہ عثمان پر نگاہ رکھتی کہ وہ کسی عورت سے دو باتوں سے تیسری بات کرنے پائے اور اگر کسی سے زیادہ بات ہو جاتی تو عثمان کی شامت آ جاتی۔ کیا کہتی تھی؟ تم نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے بات کرنے کی؟

مسز مرزا بیبا کی نئی دوست بنی تھی۔ ایک پارٹی پر عثمان نے اس سے اتنا پوچھ لیا: "مرزا کہاں ہیں؟"

"کراچی۔"

"کب تک گئے کراچی سے؟"

اس دن تو وہ بجلی تک تک دونوں پیچ اپنی آرام کرسیوں پر اس طرح مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے بڑا سخت رن پڑنے والا ہو۔

بیبا نے کہا: "تمہیں کیا ضرورت تھی دخل در معقولات کی۔ مرزا کہاں ہیں اور کراچی سے کب آئیں گے۔ کیا تم مرزا کی عدم موجودگی میں مرزا کا خانہ پُر کرنا چاہتے ہو؟"

عثمان کے ماتھے پر ندامت اور ذلت کی کئی لکیریں اور خود کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کرسیاں چلا جاتیں۔

"دیکھو بیبا! زبان قابو میں رکھو۔"

"تم دونوں بھائی حرامزادے ہو۔"

عثمان تڑپ اٹھا۔ اس کا ہاتھ طمانچے کے لیے ہوا میں ابھر کر رک گیا۔ مگر عثمان کا گریبان بیبا کے ہاتھ میں آ کر چرچرا کر پھٹ گیا۔ وہ عثمان کے بہت قریب ہو گئی تھی اور ہوش کھو گئی تھی۔ عثمان نے اپنے ننگے سینے کے ساتھ اسے چپٹا لیا۔ غصے اور زہر کی چنگاریاں پڑی تھیں۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ بیبا ایک چاند پر بادل کی چادر ڈھک گئی۔ نسوانیت کے ہر شیشے پر تو بند کھول گئے پر عثمان کا لوہا اور فولادی روح اسے سینے پیٹتے ہی بھاگ گئی۔

وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر جذبات کے اس شور و ہنگامہ کو سمجھ کر رکھنے کی کوشش کرنے لگا جو اس کے قریب وہ ملک سے اٹھا تھا۔ اس اوپر کے شور نے جلنے والے بیبا کی محبت سے اس کی روح کا تمام خلا ہر جس کی تمام طاقت رخصت ہو چکی تھی جذبات کے بہتے بہت بات اذکر کے نے پر کر کر دیا تھا ان کے لیے سرمایہ دار ہو گئی تھی جیسے شکستہ پا خیالات وہ شتر بے مہار چوکڑیاں بھرنے لگے اور خیال کی آنکھوں میں بے بسی اور بدبو کی جگہ لگے۔

وہ سوچنے لگا۔ کتنے خوش نصیب ہوں گے۔ وہ شوہر جو اپنی بیویوں کو دوسروں سے ملاقات کرتے ہوں گے مگر اپنے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں گی۔

"میں کہتا ہوں یہ صاحب کا حوصلہ ہے۔ اپنی جورو ایسی جگہ گھر کاٹ کے رکھ دو۔ بات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔"
دلاور نے روز کی تناتنی دیکھی تو نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز عثمان برآمدے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ جمیلا پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک لڑکے پیسے عثمان خوش ہو کر: زندگی کتنی اچھی ہے۔ جمیلا نے نظر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا اور بولی:
"اچھا مالن کو دیکھ رہے ہو۔"
"کیا؟" عثمان ہونچکا رہ گیا۔
"وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے۔ حرامزادی کے بیٹ جیسے یہی جگہ رہ گئی تھی۔"
عثمان نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ دور پودوں کے پیچھے مالن گود میں بچہ لیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے یہ اب معلوم ہوا تھا۔
جمیلا منہ موڑ کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل دی۔ عثمان نے دل میں کہا جمیلا کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قدموں کی چاپ سن کر اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو جمیلا اور مالن اس کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ مالن کی قمیص پر جہاں اس کی دودھ سے اُبلتی چھاتیوں کی اکڑاہٹ تھی، گیلے دودھ کے دھبے تھے جیسے وہ بچے کے منہ سے دودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔
"میرے میاں تیرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا کرسی پر بیٹھ۔"

جمیلا کی زبان میں سخت زہر بھرا ہوا تھا۔

مالن حیرت سے عثمان اور جمیلا کی طرف ہٹر ہٹر دیکھ رہی تھی۔ عثمان کے بدن آپ ہی آپ بھڑک اٹھے۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس کے سامنے جمیلا کے منہ پر دو تین چوٹیں کر دے جو اسے تعجب میں ڈال دے اور بار بار تیری باتوں سے روکنے کا۔ مگر اس کا مزاج پھر اُدھر کی دھیان جھڑنے اور غصہ پی جانے کا عادی تھا سر انجام دے گیا۔

اگلے روز صبح ہی صبح مالی اور اس کی بیوی نے کوارٹر خالی کر دیا۔ مالی کے چلے جانے سے جمیلا کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر ڈرائیور کے چلے جانے سے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ پڑوس کی کوٹھی کا ڈرائیور ایک جان پہچان کے کو لے آیا۔ اور بولا "بیگم صاحب! وہ دور خان ایک اچھا ڈرائیور ملتا تھا۔ بڑی اچھی گاڑی چلاتا ہے۔ صاحب بڑے دیکھ چکے ہیں۔ آپ جو تنخواہ دیں گی اسے منظور ہوگی۔"
جمیلا نے پہلے گاڑی چلوا کر دیکھی پھر سو روپے تنخواہ مقرر ہو گئی۔ اس نے دوسرے نے کہا "اس کی بیوی بچے گاؤں چھوڑ رکھے ہیں۔ اگر اسے یہاں کوارٹروں میں جگہ مل جائے تو بڑی مدد ہو جائے گی۔"
"ہاں کیوں نہیں۔"

وہ وہاں بیوی اور چار بچوں کے ساتھ کوارٹر میں رہنے لگا۔ کپڑے بہت تو پہنے نہ تھے۔ وہ پھٹے پرانے سے چیتھڑے پہنے پھرتے۔ وہ پھٹے تنگ ... پھرا کرتے۔ بیوی برقع پہنتی اور سخت پردہ کرتی۔ عثمان دور سے دیکھا تو اس نے کوٹھی کے

[illegible] گھر میں [illegible] پلٹ کر دیکھا تو چیا نے کہا :

"ڈاکٹر صاحب کے بچے ہیں۔ انہیں کچھ ہی میں نے [illegible] کیا ہے۔"

"گاڑی ٹھیک چلاتا ہے ؟"

"جی ہاں۔"

ڈاکٹر نے [illegible] سر ہلایا۔ [illegible] نے اس کو پہلی [illegible] کر دیا۔ [illegible] پھر [illegible] دیکھ کر بولا :

"تمھارے بچے بہت ہیں۔ انہیں صاف رکھا کرو۔ کیا تمھارا کوئی بچہ [illegible] نہیں ہوتا۔ بڑے گندے رہتے ہیں۔"

"نہیں صاحب اب صاف رہیں گے۔ [illegible] غربت بڑھ رہی ہے سرکار۔ [illegible] بارہ برس کا ہے۔ [illegible] کسی نوکری دلا دیں تو دعائیں دوں گا۔"

"بلا دیں گے۔ جاؤ گاڑی صاف کرو۔"

وہ دور [illegible] کہ [illegible] نج گئی۔ جب شام کے [illegible] چلے جانے کے بعد [illegible] تو [illegible] جس میں وہ [illegible] کی طرح دکھتی رہتی۔

ایک دن کار میں [illegible] نے [illegible] سے کہا "ڈاکٹر صاحب تمھاری بیوی بڑی خوبصورت ہے۔"

"جی ہاں بیگم صاحب پانچ بچے پیدا کرنے پر بھی اس کا [illegible] بڑی مضبوط ہے۔"

"تمھارے پانچ بچے ہیں ؟"

"جی ایک مر گیا تھا۔"

دھوپ کا رنگ اب زرد ہو گیا۔ [illegible] تیز ہو کر [illegible] لگی تھی۔ رات کو خنکی ہو جاتی۔ کتے درختوں [illegible] پر [illegible] کرتے پھرتے۔ ایک دن شام [illegible] برآمدے میں بیٹھے تھے۔ [illegible] گرم [illegible] نکال نکال کر [illegible] پکڑ رہی تھی۔ [illegible] گڑیاں [illegible] دیکھ کر [illegible] خوش ہو رہے تھے۔

پھر [illegible] نے [illegible] کر دیا۔ [illegible] ایک [illegible] کر چکا تھا اس نے [illegible] پوچھا۔ [illegible] نہیں چلتے۔ [illegible] دوں :

"[illegible]"

اس نے [illegible] کر کہا "[illegible] بچے [illegible] ہیں۔ [illegible] تمھارے [illegible] گئے [illegible] دیا چلا گیا [illegible] خوشی [illegible] تھے۔ پھر [illegible] جب [illegible] پہنچا۔

گلشن چاند کا چہرہ پردوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تو اُسے اُٹھانے کو جب لپکتی تو ڈرائیور کی بیوی کی جھلک دکھائی دیتی۔ ایک دن جمیلہ نے دیکھا۔ کار میں بیٹھتے وقت عثمان کی نگاہیں کوارٹر کی طرف اُٹھی تھیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ عثمان دفتر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا۔ ادھر کھڑکی کا پردہ اُٹھا ہوا تھا اُدھر دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔

"میں یہ ہر روز دیکھتی ہوں آج ہی کھلی پا رہی ہوں۔"

"کس کو؟" عثمان نے شیشے میں ٹائی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"جس کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کھڑکی کھلی دیکھی ہے۔"

جمیلہ ایک دم سے باہر چلی گئی اور اُس نے تنک کر آواز دی۔ "خدا بخش ادھر آؤ۔"

دلاور خاں جو گاڑی صاف کر رہا تھا "جی" کہہ کر لپکا۔ جمیلہ نے اُس سے کہا "میں نے پہلے روز کہہ دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے دفتر جانے کے بعد کھلا کرے۔ کہا تھا؟ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمہاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔"

اُس نے جا کر کچھ کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔

عثمان کو جب گاڑی چھوڑ آئی تو جمیلہ بازار چلی گئی۔ جب آئی تو سکول کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے سکول بھیج دیا۔ ملازم کو دلاور خاں کی بیوی کو بلانے بھیجا اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ نوکر نے آ کر کہا "وہ کہتی ہے مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے" جمیلہ غصے میں اٹھی اور دو قدموں میں ملازموں کے کوارٹروں تک جا پہنچی۔ دلاور خاں کی بیوی کام کر رہی تھی۔ "میں نے تمہیں بلا بھیجا تھا۔ تم نے کہا مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی تو باپردہ ہو تم مجھے پتہ ہے۔ تمہارا کیا تھا پتہ ہے کہ تم وقت بے وقت کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتی ہو میرے میاں کو دکھانے بیٹھتی ہو۔ میں نے سوچا تھا صاحب سے آج تمہاری ملاقات کرا دوں۔ دونوں کی بے چینی دور ہو جائے۔"

دلاور خاں کی بیوی کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ دھو کر اٹھ بیٹھی اور بولی "میرے خاوند کو تو جو بن دکھاتی پھرتی ہے تو بے چینی دور ہو جاتی ہے جب کندھے سے کندھا ملا کر میرے خاوند کے ساتھ جا بیٹھتی ہے گاڑی میں اور گھومتی پھرتی ہے۔"

جمیلہ کو محسوس ہوا جیسے اُس نے غلط عورت کو ہاتھ ڈال دیا۔ "زیادہ بات کی تو زبان کھینچ لوں گی۔"

"پہلے اپنا منہ دھو رکھنا" دلاور کی بیوی نے ہوا میں ہاتھ نچائے۔

"بڑی احسان فراموش ہو۔ کمینی میں نے رحم کھا کر تیرے بچوں کو کپڑے دیئے" جمیلہ ذرا نرم ہو کر حیرت سے بولی۔

"میرے بچوں کو اپنے بدن کو ڈھانکنے کی خاطر دیے ہوں گے۔ پر تمہیں بتا دوں تیرے اوپر تھوکنے کا بھی نہیں میرا خاوند۔

یہ سینہ دیکھ کر ڈھلکا جا رہا ہے، یہ دیکھ مردی کا گارا۔"

اُس نے سینہ پھیلایا۔ جمیلہ کا گریبان پھاڑ ڈالا۔ جمیلہ کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ بڑی مشکل سے کہہ سکی "بے حیا۔"

"بے حیا تم۔ اپنا سینہ ہو تو کانیاں دیکھو۔"

حمیدا نے [illegible] سے نظر پھیر کر دیکھا۔ بچی اور اماں اور مشاں سب باہر کھڑے ہنس رہے تھے۔ حمیدا نے مشاں کو پکارا

"جاؤ پہلے کپڑے بدلو۔ اس کمینی کا دماغ ٹھیک کر دوں۔"

"بھلا جلدی جاؤ۔ میں کہتی ہوں میرے خاندان سے تعلق ہے تمہارا، اور تم ان کپڑوں کا احسان لیتی ہو۔"

اس نے کپڑوں کو ڈھیر کیا۔ مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ غصے میں ہانپتی ہوئی ہمدرد بنی پاس یوں کھڑی ہو گئی جیسے بیوہ ہو۔

"خدا کرے میرے بچے ننگے پھریں پر تم جیسی کا احسان نہیں۔" گرچہ [illegible] اور کپڑے کھونے کی حسرت باقی رہ

گئی اور جب شکل سے بچوں کو سے کر باہر آ گئے میں نہا نا نہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی [illegible] کر بہت غصے

اپنے کمرے کی طرف بڑھا جیسے بیوہ کو آج پیٹ ڈالے گا مگر غصے سے تھم واپس آ کر بولا "آپ سے بہرہ بیوہ کی عزت پہ الزام طلاب

بیگم صاحب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

"لاکھ ہو ہیرا کے سینے پر مونگ دلتا" کوشش کی مگر پھر آتا ہوا نکل گیا۔ بچے حمیدا کا منہ تکنے لگے۔ جیسے یوں محسوس ہو، اتنا

جیسے اس آنگن میں اس کی عزت کا دیوالہ پٹ کر نکل گیا۔

گشّاں آیا تو حمیدا چپ چاپ بیٹھی تھی۔ گشّاں نے حمیدا کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا "تم اس طرح چپ چاپ

کیوں بیٹھی ہو؟"

حمیدا کی آنکھوں میں نم آ گیا۔ اس نے سارا واقعہ سنا ڈالا۔

"اور یہ نوکر کلوٹے اس ذلیل عورت کا منہ دیکھتے رہے۔ انھوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔"

حمیدا اداسی سے مسکرا کر بولی "یہ کچھ نہیں۔"

اس نے حمیدا کو سینے سے لگا لیا اور نگاہ اس کی اس راکھ پر جا پڑی جہاں سے چیتھڑے کے جلنے سے کالے دھوئیں کی لکیر

ہوا میں اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ جیسے دیکھ کر گشّاں کے پیٹ کی تہہ میں سے خوشی کا ایک میٹھا میٹھا سا بلبلہ اٹھا۔ وہ ٹھنڈا سا مسکرایا۔ یہ

اس نے حمیدا کا [illegible] حمیدا اور بوہ [illegible] تم کچھ کوئی بات نہیں ہوئی۔"

...زی خدا

...و قدسیہ

ننھی بسم شدت سے بھوکی تھی۔

تابی نے جونہی بچی کو گود میں لیا تو یکبارگی لپک کر اُس نے اُن کی چھاتیوں پر ہاتھ مارا اور پیچ ساڈو وہ مچل مچل سے لگا۔ اس وقت ننھی کو
...دھ پلاتی تابی عجیب سی لگ رہی تھی جیسے پانچ کیرٹ کے گنیش کے فریم میں کسی نے گلال کی لال ابھری اُنڈیل کر دی ہو۔ انگیا کے پلے باہر
...تے اور پلو پر کڑھائی کا کام تھا۔ ہر کلی کی کنٹھری پر ساری سیدھی مرانی دار موتیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ململ کے کرتے تلے ایسی جگہ جگہ
...گیا بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایک تو ویسے ہی کپڑوں پر لیسیں ... کے ساتھ تابی کا دودھ پلانا اچنبھے کی بات تھی لیکن یہ کس کو گمان
...تابی دودھ پلانے سے پہلے وضو کر سکی۔ وہ آج نہ جانے کیسے وضو کا پانی کنویں تک گیا ہی نہ تھا۔ یہ اچانک کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟
کالاوں سے تابی لڈی کو گلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اُس کے کانوں میں بتو کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ عرس کی کرامات تھی کہ بتو کی
...کا ہاد وقت تھا کہ تابی کے مہاڑی پر ... سوائین پہنچی تھی اپنے لال نلت دکھانے کا وقت پہنچا۔ وہ عشرہ کی خیتی اُوپر پہنچی بچی نہایت
...سے بچا کر ہاتھ سے بچ رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہ تھا۔ ساڑھی اتارتے ہی اُس نے جلدی سے ململ کا کرتا
...رت پر پہن لیا۔ اور وضو کر کے بیٹھ گئی۔

اس سے پہلے تو تابی نے کبھی وضو کر کے بچی کو دودھ نہ پلایا تھا۔ پھر یہ کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

وہ جھلنگی چارپائی پر بیٹھی کروٹ کرتے میں بسم اللہ ... سے بچی کو گود میں بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر ... معصومیت
... بالکل نیلو کی سیدھ کے چہرے پر ... ہے سامنے ... کے ... ۔ یہ وقت ...
... اور بنیرہ کا نیہ ... مستقل کی طرح اکڑا بیٹھا۔

دراصل بات کر تابی کا ارادہ آلاؤں جانے کا نہ تھا۔ ننھی بسم اللہ سے واقعی بہت پیار تھا اور وہ اسے ساری رات ...
...ے رضامند تھی کچھ اُس کی ... طبیعت بھی اداس تھی۔ لیکن ... شاہ کی ... کے دم میں وہ آ ہی گئی۔ کئی سالوں سے وہ
...ت شاہ کے عرس پر مجرا کرنے جا رہی تھی اور اُسے ... ایسا لگتا تھا جیسے ... عزت، دولت سب شاہ جی کی دعاؤں کے
...ل ہو۔

... شہر کا ... ذی ... تھا ... تھا۔ گلی میں ... سا ... تھا۔ وہ پردہ اُٹھا کر ... کمرے میں
... گرمی ... پنکھے سے ... کا رہی تھی۔ تابی کو ... کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ... کے ساتھ ان کے
... سامنے کمرے میں ... خوشبو پھیل گئی۔ تابی نے ... سے ... ڈھانپ لیا اور ... کی جانب ... کر لی۔ ...

[illegible] آگے کچھ [illegible] ۔ [illegible] بولتے جا رہے تھے [illegible]

نجانے یہ شیریں شام سے خود کیوں کر سکتی؟

خدا جانے یہ نادر کے انداز قہقہے کا اثر تھا؟

کہہ کر سکتا ہے زندگی بھر کے دو دو میں [illegible] جنہیں [illegible]

نادر کے چہرے [illegible] تھا کہ [illegible] کے باب [illegible] ہے [illegible]

متاثر [illegible] ۔

" وہ وہ پینے دو بھائی ! ـــــ بات بہت بھری گئی ہے ۔ "

" ہم بھی بات بھر کے بھر سکتے ہیں " وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

اپنے خلاف، نادر کے خلاف اور [illegible] کے خلاف [illegible]

[illegible] اپنا سر [illegible] تھا۔

" بات کیا ہے؟ ـــ " اس نے نرمی اور [illegible] سے پوچھا۔

" کوئی بات نہیں ہے، ہوا کا اور پھر [illegible] ـــ "

" نشہ تو نہیں ہو گیا تجھے؟ ـــ "

" ہو گیا ہے ـــ تو؟ "

" دیکھ لے پہچانے گی۔ شہر کے سارے [illegible] میری مٹھی میں ہیں " نادر نے [illegible]

" بھاڑ میں جائیں تیرے دل [illegible] اور تو؟ ـــ "

نادر نے [illegible] ۔

اس وقت تک [illegible] تھا اور نہ ہی نادر کو شبہ ہوا تھا کہ [illegible] اپنی پہلی زندگی کو [illegible] جوں جوں [illegible] گزرتے [illegible] کے پیچھے [illegible] ۔ جو بات [illegible] سینے میں رکھ لی۔

نادر کا خیال تھا کہ [illegible] ہے چند دن [illegible] کو [illegible] ۔ [illegible] سال کے بعد رہ سکتا [illegible] کو [illegible] شرمندہ [illegible] گیا۔

[illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ہاتھ [illegible] ۔

ملازم نے بہت سر مارا۔ منتیں کیں، سمجھایا، ڈرایا، دھمکیاں دیں۔ لیکن اس کی باتیں سن کر وہ اور بھی بپھر گئی۔ تائی کو ایسے منہ چڑھی عورتوں کو قسم کھا لینے کی عادت ہوتی ہے۔ مقصود امرودی کھٹے کا پیشہ سر آنکھوں پر، محبت اور بھائی چارہ بھی قبول، لیکن ہیرا پھیری اور مکاری کا دھندا نہ کرے گی۔ ادھر تائی نے سو سو گز کے گھاگرے گھماتے ہوئے ہیرا منڈی میں جیسے خوبصورتی باتوں کے غبارے اڑنے لگے۔ بنگلے کی خورشید جہاں نے پوری چودہ گز کی بیگم خانی اور درباری بجوا دی۔ جو صحت اس کے ساتھ تھا کہ کسی چور راستے سے تائی کے کوٹھے ایسے پڑھتے کہ پھر وہیں کے ہو رہتے۔ چوکی والی نانو نے برقعہ اوڑھا اور چلتے چلتے وہ تھپیڑے جوڑتی پھری کہ افواہ کو جیٹ دیا۔ وہ کی اڑان گم گئی ——

بچے اتنی اتنی باتیں —— کوئی کیا کیا کرے گا ——!

پنکھے کی تیز ہوا میں جاپانی عورت والا کیلنڈر آنچل کی طرح لہرا رہا تھا۔

حمیدہ کے گریبان میں منہ دیئے ننھا سا جاوید چسر چسر دودھ پیئے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سونے کے گھنگروں کی طرح ابھر آئے تھے۔ اس نے جاوید کی پیٹھ میں دھوکا مار کر اسے پرے کیا اور شیخ جی کے ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی۔ "سنیے نا —— ! اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے مزید کوئی دوا لے کر آئیں کل ——"

"اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے! امراد جمیلہ کے پیٹ میں ہوں تو ہوں ——"

"سنا اور میری جان نہیں چھوڑتا۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو۔ اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو مرجاتا!"

جاوید بڑی ڈھٹائی سے اب حمیدہ کی پشت سے چپکا ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی چوٹی کو چوس رہا تھا۔

"میں تو جب تک اس کے ساتھ بیٹھی رہوں گی یہ میری بوٹیاں نوچتا رہے گا ——"

"ادھر آجاؤ میرے پلنگ پر —— شیخ جی نے لجاجت سے التجا کی۔

لیکن حمیدہ ناصر کی ماں کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے شیخ جی کے تکیوں میں ایک وحشت سی گھس آتی تھی۔ گھر کی چار دیواری میں جب دروازہ کھل جاتا اور محلوں کی چاک جیٹھانی تو حمیدہ کو ان سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی۔ وہ تو قدرت کی ستم ظریفی سے وہ حمیدہ کے من مندر کے کلس تھے ورنہ حمیدہ کبھی اس پلنگ کا کنارہ بھی نہ چھوتی —— اللہ میاں! آپ نے یہی کیا دیکھ کر بیاہ دیا۔

جب حمیدہ ناصر کے پلنگ پر چلی گئی تو ننھے جاوید نے پہلے تو قند بھری پھریری لی اور تھوڑی دیر منہ کھول کر روتا رہا۔ شیخ جی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور بڑی دیر تک تھپکتے رہے۔ جب نیند کا کچھ غلبہ ہو گیا تو جاوید غلاف کے کونے چوستا آہستہ آہستہ سو گیا۔

ناصر کے ساتھ سر جوڑ کر حمیدہ بولی —— "اس بار پھر آپ ہمیں شریف شاہ کے عرس پر نہیں لے گئے —— ہاں!"

"جاوید چھوٹا ہے۔ اگلے سال سہی۔"

"ہر سال آپ یہی کہتے ہیں۔"

تنا ٹھیک ہے اباجی وہ ہم سے منہ پھیر کر لیٹے ہوئے تھے شاہ صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی۔
مرزا کی ایک ایک بات ایک ایک شعر تاثیر کا خزانہ ہے۔ میں ان کا تذکرہ انہی کی آن بان میں لکھنا چاہتا ہوں پر
دیکھتے ہیں تاثیر کہاں تک پہنچتی ہے۔ دیکھیں مجھے کتنا وقت ملتا ہے ـــــــــ نشر شد۔

تابان کو چپ کر کے سونا پہاڑ سا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ جس کشمکش سے گزر رہے تھے اس میں اس لڑکے کی ذہانت کی شہرت ان تک پہنچانے میں بہت مدد کی تھی۔ شہر کے بہت سے لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ امراؤ جان نے جب پیشہ چھوڑا تو اس کی کوئی بھی دوستی نہ رہی پر نہ ابھری اس کے بعد سے اس کی باتیں باعزت پیار اور لوگوں نے پیسہ اٹھا دیا۔ جب وہ جہاں پہنچے ہیں بتا تھا اب وہاں اور چلا گیا۔ سارا دن تو بستر پر گزر دیں پر شام سے بڑا ماحول تھا شام کے وقت دیا۔ دالان میں سے یہاں وہ بیٹھے ہوتے تھے کہ ان سب بیٹھے ہیں ہر ایک کا دکھ لے اور کوئی بیٹھے دل دار۔

اپنا بیتا ماضی سے کس تعلق کرنے کے بعد کچھ روز تو ان کو یہ سکون ملا کہ نئے قصبے اور سیاست کی سیرت۔ چپ چاپ سی ہو گئی جب تابان کا نام پر ہو گئی تو دل کی بے سکونی سے اس کام کو رسالہ۔ جب سے تابان نے یہ پڑھنا چھوڑا تھا اپنے گھر پر سارا دن اب دونوں میاں بیوی کا کنبہ ہر روز اور تابان کے دل پر ہر بار چوٹ سی پڑتی اور کہ کتنا صاحب بیگم کی راہ چلنے سب نے ملال ظاہر کر دیا۔ کہاں وہ لوگ آکر دم بجاتے تھے کہاں اب منہ پر کوئی تک نہیں ہوتی۔

جس دن وہ رشید علی پر وارد ہوئے اس سے پہلے کیا وہ ادراس اور ناز کی کہ وہ پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس شخص کی تعریف کرے۔ کوئی تو ایسا آیا جس نے اس کی بات پوری راہ اختیار کی لیکن چونکہ وہ بہت خوب کیا۔ پر ملانہ صاحب نے کہا کہ وہ باتیں کرتے تھے۔ تابان نے بعد دیکھیں وصول کرنے کے لیے نیچے اترے اور بیٹھک میں انہیں جلدی پر مقدار اس کے کر پر چشمہ صاحب نے کہا تھا رخصت کے وقت وہ کام کرنا فائدہ کا۔ اس کے حوصلے کے عنوان سے تابان کا ایک سفر ہوا تھا جس میں اس نے ملاقات کی بات کی رات سب سے کم ایسے خواب اور جنت کی طرف سے تشبیہ دی تھی۔ اس سفر کا چہرہ چیدہ و شاداب ہو گیا تھا کہ وہ بیوی رہتی تھی اور ملانہ صاحب اس سے پہلے باعزت بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلا نہ صاحب کرو دیکھ کر تابان کا دل رک گیا افسوس اور دکھ سے بھرا۔ اسے پہلے آپ اس شدت سے آرزو تھا کہ سلام کا جواب لیتے ہیں اس سے صاحب کے پاس پہنچے اور گلے لگا لیا۔ پہلا صاحب بولا بیٹھیے ـــــــ خدا کے لیے بیٹھ جائیے۔ ـــــ

پہلا نہ صاحب وہ پہلے تھے۔ تابان کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے بولے ـــــــ صاحب ہم آپ کو کیا کہا ہے؟ پہلو کیا کہ یہ کا شعر ہے۔ تابان پر ایک باعزت بیوی بنے کا ثبوت ہم تک پہنچنے تو اگر نعوذ صورت میں پیش کرنے کا صبر کر لیں کہ بیٹھیں۔ پہلا نہ صاحب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ خدا قسم یہ بھی کا ثواب ہو۔

پہلا نہ صاحب کچھ کہہ کر بیٹھے اور تابان کے چہرے پر نظر ڈالے گئے۔ جب بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھے رہے تو تابان نے کوئی بات نہ کی تو تابان ایک بار پھر بہت کچھ کہنے کے پاس جا بیٹھیں اور رکا یہ بیچارگی سے بولی ـــــــ کیوں پہلا نہ صاحب

میری بات کا کیا جواب ہے؟ ———"

کمال تو چپ چاپ بیٹھے چھند نے اُودھیڑ رہے تھے اور کہاں ایک دم کسی منبر سے پیش پڑے۔ "کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا کیمیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی۔ لعنت ہے ایسی عورت پر جو زیورِ حیا سے آراستہ نہ ہو ———"

تابی کو یہ جملہ بازی اور بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ تلملا کر بولی ——— "کیمیوں پر واہ صاحب میں نے کونسی بے شرمی کی ہے بھلا؟ آپ سے نکاح کی درخواست کی ہے کوئی بات گناہ کرنے کے لیے تو طلب نہیں کیے۔"

"اور یہاں نکاح کا خواستگار ہونا کیا یہ بے شرمی نہیں بے حیائی نہیں ——— استغفر اللہ!"

پہلے ہی چوٹ پر جو کلا آ گیا تو پھر تابی میں کسی سے عرضِ مدعا کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ آپ سے ہوا چال چلن پہلے ہی بند تھی۔ محلے والیاں سنتے سلائی کی ذرا پار روپے ہی ترک کر رکھا تھا۔ نادرہ سے معاملہ یوں ہی چوپٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گرمیوں کی دوپہر ہو گئی اٹھتے بیٹھتے خیال آتا کہ یہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی سے بچا سکے گی اور کسی کا ساتھ؛ عالمِ تنہائی بھری جوانی کی سرد رات کب تک کٹے گی؟ جو سنی پڑھی پڑتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں تو پارسا ہو گئی یہ بوا پاپ کی بچی بس کی کہلانے لگی۔ جوان ہو کر کہاں جائے گی کہاں سے کھائے گی؟ غدیری زندگی کا کیا ہے؟ جس رفتار سے وہ بنک کے چیک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی اس رفتار سے تو سارا اثاثہ دنوں کی کھیل تھا۔

اللہ آمدنی کی صورت نہیں اور اخراجات کل کی صورت ہر دن پھیلتے ہوئے جاتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں نے جب تابی کی زندگی کو زرکرا کر دیا تو ایک شام وہ اُٹھی اپنا بندلا پیٹ نکالا۔ اس پر فرانسیسی خوشبو چھڑکی اور کو پشیلی سبز مخملت سرمہ لگا اور نیچے اُتری۔ جو پی ناصلاہ کی پہلی منزل میں تھی وہ کا ڈیننگ ہال اور ڈاک کمرہ تابی نے پہلی فتح دیا ہوا تھا۔ صبح دوپہر جلنے بجانے کے علاوہ سودا سلف لانے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے کام بھی آتا تھا جب وہ فتح دین کو خط پکڑانے نیچے جا رہی تھی تو سامنے شیخ جی نظر آ گئے۔

تابی نے پہلی مرتبہ کے لئے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ شیخ جی مسکراتے مسکراتے آگے آ گئے۔ اخلاقی جرأت تو تابی میں کبھی تھی سو انہیں بڑھ کر گھر سے نکال دیتی۔ ہنس کر ایک طرف ہو گئی اور شیخ جی اندر آ گئے۔

اور ——— تابی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

حمیدہ نے فرحت کو مار مار دھکا دیا کہ بیچاری ابھی ناں ہیں کرتے کرتے رہ گئی۔ خالہ معصومہ نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے روکا، "انسان ہو کہیں اپنا غصہ اس بے زبان پر نکالتی ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس بدبخت تابی کی آنکھیں نوچ لیتی۔ پھر تم کو تو تمہاری کم عقلی ——— ہاں۔"

حمیدہ کی آنکھ سے بہتے آنسو ڈوں ڈوں کا کی تھیلی میں پڑتے دانی چاولوں کی طرح آکر بیٹھ گئی خالہ معصومہ نے پیچھے کو کر

کرنے کے قریب کر لیا اور ماں ان کی سے لپٹیں ـــــ "بیٹی تم ہم سے خفا ہو گئی ہو۔ اچھے خاندان ہو تم کو مرد بیٹے کماتے ہیں۔ یہ طعنے تو سنے کے بہن بھائی کی وجہ سے کیا تم نے گناہ کیا ہے اس چیز میں شیخ جی کا ہے؟"

"بیٹی کی چاہت سامنے ہے۔ بابا جی بہل گئی اور یوں نا انصافی ہو گئی۔"

"یہ تو سنی کام ہیں سنی کام انہی لوگوں کو آتے ہیں۔ گھر کی شریف بیبیاں ان باتوں کو کیا جانیں۔ لیکن تم کو تو پہلے بتا دیتیں کہ مجبور ہو وہ نہ ہو شیخ جی نکاح پڑھا لیں اس کنجی کے ساتھ!"

حمیدہ ان دنوں میں تکلیف سے گھر ہی بیٹھی تھی۔ نکاح کے نام پر کسا گئی۔ ایک روز شیخ جی کا اس سے بھی نکاح ہوا تھا۔ آج کل دیوے کی تصویر سے کا گا بیاں سنانے لگیں۔ اللہ اسے تو پہلے دن سے شیخ جی ڈسے گئے تھے۔ موسلے سے بیٹھے سے اڑ کے۔ کہیں جو ایسے مذاق کی زندگی نہ بندھی ہوتی تو ـــــ لیکن اب تو بندھی تھی اسی لیے وہ زندگی ایسے آواز میں بولی "اللہ نہ کرے خالہ جو کہیں نکاح پڑھا لیا تو پھر میں یہاں کیوں رہوں گی؟"

خالہ اصغری سے عطر جلیل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کانوں میں منہ کے پھول، ہونٹوں پر لاکھا رنگ و رنداسے کی رنگت۔ بڑے بڑے سے کلیوں کا پھلکا ریشمی برقعہ کھا کر لیں۔ "تمہاری ہاں بنی ہے ہو تو ان کو کسی پیاری ہے تو پھر تم کیوں دیں ہاتھ سے جانے دو۔ اگر اس بندہ الشیں کی اولاد تمہاری اولاد بن جائیں تو کہلائے گی۔"

برستے بادلوں میں سے بجلی کوندی ـــــ "اے اللہ نہ کرے، اے اللہ نہ کرے تو بہ خالہ منہ سے کچھ تو بھلی بات نکالا کرو ـــــ سبھی میں آ کشمیری بانہ جاری ہوں ـــــ" کلیجہ پھٹا جا رہا تھا نہ سارے تکلیف سے دل میں سوچا حمیدہ کہ حق جاں لو کہ پر منظور تو نہیں کشمیری بانہ ہے؟"

خالہ اصغری گئیں تو پھر بھی حال آ رام گئیں۔

دو گھنٹے وہ بیٹھی باز پرس کرتی رہیں اور حمیدہ کی نظروں ہی نظروں میں گم سم بیٹھی رہی۔ دراصل یوں تو شیخ جی سے بیرا منڈی کا تعلق پرانا تھا مگر اس را بطے کو سوا رے حمیدہ کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بلکہ حمیدہ کو تو آل لکھ تھا۔ گنڈ سنبھالنے کو کرشمے دالیاں اور تنکے پانے کو حمیدہ لیکن کچھ عرصے سے وہ تالی کے ہاں تیسے آوازے کسنے جانے لگے تھے۔ جیسے تیز گام وقت مقررہ پر آتی ہے۔ ادھر وہ دودھ والے کا رز مانگ داخل ہوتا ادھر شیخ جی سیاہ اچکن، جناح کیپ، پشاوری چپل پہنے تخت پر پہنچتے۔ دودھ والا سلام کرتا۔ ادھر سے سر کے اشارے سے جواب ملتا۔ ملیک سلیک ہوتی۔ لیکن آتی صبح وہ کہہ رہے تھے ہیں اس بات کا بھید کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لوگوں نے بہت جلد خود وہ میں چھپے ہوئے راز کو پا لیا۔ بات کا نکلنا تھا کہ حمیدہ کے پیٹ ہمدردی کا ایک اژدہا باب کھل گیا۔ اسے ملنے تف تف بیچاری ادر کسی آوٹی اللہ اسے اللہ توبہ توبہ . . . کی بوچھار سے حمیدہ کے دل کا آنگن بالکل بھیگ گیا۔

سانپ تو نکل گیا مگر راستہ نہ پڑا۔ تالی نے بازار حسن کا ہی چھوڑا اور شیخ صاحب کی بیوی بھی نہ ہو سکی۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال آتا نہ ہو سو جوتیاں بھی کھا نا پڑیں اور سو پیازیں بھی زہر مار کرنا ہوں۔

شیخ جی پچاس کے پیٹے میں تھے اور تائی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دُوسرے شیخ جی کی صحت بار بار کا ملیریا تھی۔ حقہ تمباکو کے گھر بنا کے تو وہ مرود بنہ پانی کے پیتے اور ادھر ادھر ساری عمارت زمین پر۔ چھینک کیا آتی سارا سینہ جھنجھنا جاتا۔ ذرا سی سردی کا جھونکا اور جوڑ جوڑ میں ورم آ جاتا۔ بند بند دُکھنے لگتا۔ کبھی سانس اکھڑا ہوتا ہے کبھی نبض کھینچی چلی جاتی ہیں۔ کا منی ایسی تو شکل و صورت کی بھولی بھالی تھی پر ایسے تناور درخت کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ تال کھانے جیسی رنگت اور عناب کے ہونٹوں والی تائی اُن کی ہو تی تھی۔

عجیب سی بات تھی کہ نہ تو شیخ جی کی صحت پر تائی کو کوئی اعتراض تھا نہ اُن کی عمر پر اُسے تو اُتنا ہی اُن کی خوبیاں گنتی تھیں۔ ایسے شخص کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ شیخ جی تائی کو ساتھی نہ بنا سکے تھے پر نکاح کی بات دو سال سے کھٹائی میں پڑی تھی۔ ان کا وعدہ تو شیخ صاحب نے بڑے ہی فراخدلی سے کیا تھا لیکن آج کل کرتے دو سال بیت گئے۔ کبھی تائی کے مُنہ سے نکاح کا نام سن بیٹے زور زور کمرے میں بکھو کرنے لگتے۔ فوراً یا تو سردی لگ جاتی یا جوڑوں کا درد اُبھر آتا۔

شیخ جی کچھ ایسے بدنیت بھی نہ تھے۔ پر فی الحال اپنے آپ کو پابند بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تائی کا خیال رکھتے۔ نخرے سب کی سی محبت برتتے۔ خرچ اخراجات کے وہی کفیل تھے۔ پر مفت دودھ والی وہ بھینس کا کمبخت کیوں پالے؟ ادھر تائی کو مٹھی بند رہنے کا ایسا سودا سمایا تھا کہ دن رات یہی دُکھ کھائے جاتا کہ یہ زندگی پہلے سے بھی پلید ہے۔ رہ رہ کے سوچتی کہ شیخ جی کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہتر تھا کہ اپنی جوانی پر اعتبار کیا ہوتا۔ وادی سم وادی سُروں کی سمجھ سنی سُلجھے میں قدرتی سُرنیاں بھری تھیں۔ شکل و صورت کی ٹھنڈون جیسی گوری چٹی ——— کچھ دیر اور بیلو ونتی بنی رہتی تو کم از کم کچھ اثاثہ ہی جمع ہو جاتا۔ پھر یہ اطمینان ہوتا کہ جو نا ہر ہے وُہی ہے جیسی باتیں ہیں ویسے ہی اعمال۔

بیماری تائی کی تو وُہی حالت ہو چلی تھی کہ کھوں تو ماں ماری جائے نہ کھوں تو باوا کتا کھائے۔ ادھر شیخ جی نے اُسے ستی ساوتری جیسی بہت بنا رکھی تھی۔ شیخ جی کو دیکھ کر سارے پاپ کٹ جاتے۔ سارے گلے بھول جاتے لیکن جب اکیلی ہوتی تو ضمیر کا ستا ہوا دل شن رہتا۔ اس کے ضمیر کے جانے نہ ادھر اُدھر سارا دن اُسے طعنوں سے گالتی رہتیں۔ اس رستہ کشی کو تائی اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک روز اس کا نتیجہ ہو لیا۔

اس روز تائی کو ٹھیک کر بخار چڑھا۔

بستر ان کو پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر بات بے بات ضد کرنے لگی کبھی یہ دو کبھی وہ دو۔ نوکرانی ہل ہل باہر نے جاتی نیم بہ دھول تی ——— نہیں نہیں نہیں ——— آخر پتہ چلا کہ کہیں پہلے میں ننھی گڑیا دیکھ لی ہے اسی کی ضد مانگتی ہے۔ شیخ صاحب تائی کی کلائی پکڑے بیٹھے تھے تھک ہار کر تائی بولی ——— اللہ شیخ جی نارکلی لے جایئے اور دُلہن گڑیا دلوا دیجیے۔ اس کا رو دا سُن سُن کر تو سر پیٹنے لگے:

ان کی بازو کا سُننا ہی تھا کہ شیخ جی کے کلیجے سے چھٹ گئی اور تب تک چپٹی رہی۔ جب تک گال پر کالی لکیریں نہ پڑ گئیں۔ آخر پھر پریشانی ہوگئی لیکن شیخ جی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ تائی یا تو کو رے کر وہ آج تک کہیں باہر نہ گئے تھے۔ گڑگڑا کر

[illegible] شامل ہوگا۔

"جاریں تو پھر ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ "یہ بات کیا ہے آپ [illegible] کیوں نہیں؟ ——"

[illegible] دیکھتے دیکھتے شیخ جی [illegible] کھڑکی کی طرف چلنے لگے۔

"آپ سچ سچ اصل وجہ بتا دیں شیخ صاحب ورنہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔"

شیخ صاحب کو سچ بولنے کی عادت نہ تھی مگر تائی کے [illegible] سے بھی خوب واقف تھے۔ [illegible] میں بولے۔ "مجھ [illegible] [illegible] جائیں؟ کوئی [illegible] ہو گیا اگر؟ ساری بات کھل جائے گی ——"

اب تک تائی نے [illegible] شیخ جی کے ساتھ [illegible] باتیں [illegible] یہ جواب سنتے ہی [illegible] گئی۔ کچھ عجب سے [illegible] نے [illegible] سے نکل آئی۔

شیخ جی اس [illegible] کو دیکھ کر [illegible] کھڑکی کے شیشے [illegible] بجانے لگے۔ [illegible] خیال تھا [illegible] بستر [illegible] دیکھ کر تائی [illegible] چلی جائے گی۔ لیکن [illegible] آ رہا تھا۔

"کیا بات کھل جائے گی شیخ جی؟ ——"

شیخ جی نے سنی ان سنی کر دی اور [illegible] لگے۔

"میری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف ——"

"تم کو بخار ہے خواہ مخواہ بستر سے نکل آئی ہو ——"

"آپ بخار وخار رہنے دیجیے۔ ایسی ہمدردیاں بہت ہو چکیں۔ میری طرف دیکھیے ——"

جیسے [illegible] شیخ جی نے تائی سے نظریں ملائیں۔

"آپ کا [illegible] سے رشتہ کیا ہے؟ ——" تائی ترشول کی طرح تنی کھڑی تھی۔

"بیٹی ہے —— کمال ہے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!"

تائی غصے میں کانپ رہی تھی [illegible] "اور مجھ سے آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟"

"میری [illegible] تمہارے سر پر [illegible] کیوں سوار ہو گیا ہے ——؟" شیخ صاحب اصل موضوع پر [illegible] چاہتے تھے۔

"میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟ ——" تائی اب ان کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ——"

"آپ کے نزدیک تو بالکل اہم بات نہیں لیکن میری تو جان پر بن آئی ہے۔" تائی چیخ کر بولی۔

"میں ... تم ... میری بیوی ہو [illegible] آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ [illegible] لیٹ جاؤ [illegible] بولنے لگی۔"

[illegible] —— میری تو [illegible] شیخ صاحب [illegible] —— میں نے تو [illegible] کیا۔

بیگم آپ کو شرم نہیں آتی آپ تو بڑے دین دار، وضع دار معزز شہری ہیں۔"

شیخ جی بسم اللہ کو کندھے سے لگائے کرسی کے پاس بیٹھ گئے اور یہ موٹے موٹے آنسو گرانے لگے کہاں تو تابی پھری لسرین کرا رہی تھی اور کہاں ویسے صابن کی جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔ موٹے موٹے آنسو اور وہ بھی شیخ جی کی فربہ گالوں پر تابی انہیں گود بند کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن بھاگ کر ان کے پاس جا بیٹھی اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"شیخ جی کیا بات ہے! طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ لائیے بسم اللہ کو مجھے دے دیجئے۔"

شیخ جی نے بنو کو اور بھی بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور ناک سے شلک شلک کی آوازیں نکال کر رونے لگے۔ تابی بے تاب ہو کر کمرے میں پھرنے لگی۔ اُسے کچھ نظر آ رہی تھی کہ اپنے سے بیس برس بڑے مرد کو کیسے چپ کراتے ہیں۔ ویسے بھی اُسے اب شیخ جی اتنے اچھے لگنے لگے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان نہ ہونا اُس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ادھر شیخ جی گلے کا گھنگھرو بجا بجا کر کہہ رہے تھے "خدا قسم میری نیت نیک ہے۔ مجھے تمھاری قسم تابی نکاح میں ضرور پڑھواؤں اور پڑھواؤں گا بھی لیکن کیا کروں جس علاقے میں تم رہتی ہو—— وہاں ...... وہاں رہ کر ایسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں تم باہر مکان لے لو تو ..... تو کیا مجال جو میں ایک منٹ بھی دیر کروں۔ خدا قسم تابی ——"

تابی واپس پلنگ پر چلی گئی۔ جیسے ایک سوچ بچار میں برف کا غسل لے چکی ہو آہستہ سے بولی —— "شیخ جی آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں تو کبھی سے دونوں کو بلا کر گلبرگ میں کوٹھی لے لوں گی۔ خرچ ورچ آپ کے ذمے نہیں ہو گا۔ جب نہ ہوں گے آپ ہی سے لینے ہیں نا! ——— لائیے بنو کو میرے پاس ڈال دیجئے۔" اُسے بیچاری روتے روتے سو گئی۔

تابی کو گلبرگ میں آئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن کسی دن تو شیخ زادیوں نے قسما قسمی دن نکاح پڑھوانے والے مولوی کے گھر سے میں دور ہونے لگتا۔ یہ دونوں مل جاتے تو گواہ کچھ پھریاں بھگتنے چلے جاتے۔ غرضیکہ شاہی مسجد کے کچھ ... سے ... کرانے کا فتویٰ ایک نفع ہوا وہاں سے اٹھا جاتا تھا۔ سارے کام گھر بیٹھے ہوتے۔ گلبرگ میں کتنی کی جگہ روپیہ خرچ ہونے لگا۔ پھر تابی کے پیسے اس نئے ماحول میں ایک بڑی مشکل در پیش تھی۔ اپنے محلے میں اُن کی پرانی ساکھ تھی حیثیت کو فی ... سب واقف تھے۔ یہاں اس کی ناز کلی ہیں۔ بہت سے تمام مجیموں کی سی تھی۔ لیکن بی کا چہرہ ہیجنے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت لوگوں سے ... کراؤں؟ خیال تو تھا کہ کوٹھی لیتے ہی پاسا پلٹ جانے کا یقین ... لیکن شیخ جی سے کسی بھی بات کا ... کے بیت ... رہی ——

اور سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ گڈا جانے کیوں اور کیسے اُسے شیخ جی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس خیال سے تابی لرز اٹھتی کہ ... شیخ جی نے بالکل چھوڑ دیا تو کیا بنے گا ویسے بھی تابی میں ... جیسی بے باکی نہ تھی۔

ہر بات کا الزام گھر پھیر کر ... جانے کیسے اپنے سر ... کی عادت تھی۔ دو مہینے گزر گئے اور شیخ جی پر دباؤ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی اور شیخ جی تابی کو گلبرگ پہنچا کر مطمئن ہو گئے۔ روز ... ہو جانے کا کام ... تو ... کی طرح ... اپنا ... میں

فضا سے خاموش ہو گیا ہے۔ شیخ جی [illegible] سے کچھ کہہ گئے

بہت کا موسم تھا۔ کینال پارک کی جانب سے آ رہے تھے۔ [illegible] لڑکیاں [illegible] شام
ملی کی [illegible] ایک [illegible] شیخ صاحب [illegible] ساتھ [illegible] کے بعد
[illegible] اب وہ سب بیٹھے [illegible] کر شیخ جی کو دیکھ کر [illegible] گئیں۔ ساتھ ہی
میاں شمیم [illegible] آپ نے پھر [illegible] ان کی [illegible] نکال لیں۔

شیخ جی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے [illegible] شیخ جی کو وہ [illegible] درست کی [illegible] تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ [illegible] شیخ جی آپ کے [illegible]
[illegible] سانسوں کا فاصلہ ہے اس [illegible] سے سمجھتا [illegible]
[illegible] ساتھ [illegible] جانا ہوگا۔ اور پھر جانے کیا ہو؟

ایک [illegible] نیم بیہوشی کے عالم میں شیخ جی نے [illegible] پکڑ لیا اور [illegible] صاحب کو [illegible] بھیجنے کی تاکید کر دی۔

رات کو [illegible] وقت [illegible] آدمی آئے [illegible]
میں شیخ جی کا استعمال شدہ بیڈ پین [illegible] کی طرف جا رہا تھا۔

[illegible] کی زبان پر اس کے لیے ہمدردی کے بول تھے۔

پہلے [illegible] سے آنکھ [illegible] گیا۔ [illegible] کو چارپائی پر قرینے سے [illegible] کر وہ بھائی [illegible]
رونے لگیں۔ [illegible] ان کے ساتھ ان کی دونوں [illegible] بھی تھیں۔ [illegible]
[illegible] سات بچوں کے [illegible] آ گیا۔

[illegible] ختم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ [illegible] آنسو بہائے گئے [illegible] ختم ہو گیا۔

سارا دن [illegible] رہا۔ [illegible] رات [illegible] حمیدہ [illegible]
[illegible] بڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ غیرت [illegible] جاؤں یا [illegible]
[illegible] شیخ صاحب کے ساتھ [illegible] کا سوال [illegible]
[illegible] ان سے [illegible]
[illegible] حمیدہ کو [illegible] وقت [illegible]
[illegible] ایک [illegible] سے [illegible]
[illegible] اور پھر [illegible]
[illegible]

بیہودہ ڈرامے جانے کیا تو شیخ جی کو طلاق دے دیں یا ہمیشہ کے لیے حمیدہ سے کٹھائی ہو جائے۔

لقمہ بیبی کی بہو دو سب سے پہلے چپکے سے ان کی ماں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کانوں میں بد بد کرتے تھے ”ارے یہ منیس دو لاکھ گھی میں بیا ہاتھی ہی تم یہ تو کیا جانو ——۔“

”دیکھا میں کہتی تھی حمیدہ —— کوئی مرد لڑکی یوں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟ ——“

”تم کو کیا معلوم! کیا کیا گل کھلاتی ہیں یہ کرکٹ والیاں۔“

”اللہ بچائے اب زمانہ دو گھڑی —— ہم کو کیا یہ شیخ جی روز روز کہاں جاتے ہیں۔“

کچھ دیر حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اٹھی صندل کا شربت دو گھونٹ حلق میں ٹپکایا — نائیلون کے دوپٹے سے آنکھ کے کونے زور سے رگڑ کر پکار کر بولی —— ”چلو یہی کیا! نکاح پڑھ لیا تو اچھا کیا۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ روز ہماری پرشانیاں توڑ توڑ تے۔ ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں۔ آپی ٹھا دیں گے۔ جب دوسری بیٹا پیٹے گی تب آنکھیں کھلانے آئے گی۔“

ساری محبت حمیدہ کو اپنے اندر کی تھی۔ بار بار سوچتی کہ وہ جو کہیں اس الم ناک نے خرچ بند کر دیا تو کیا ہو گا؟ رفتہ رفتہ بیگم نسیم کی حالت سے وہ کچھ اس طرح متاثر ہوئی کہ آنکھ کر ململ کا سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اوڑھ لیا اور ایسے بیٹھی ہوئی آ بیٹھی جیسے محفوظ شدہ قدیم مصری کی کوئی ممی ہو۔

آنسو آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے ——

ٹپ ٹپ ..... بوند بوند

سمجھ بھیگنے لگا —— لیکن عجیب سی بات تھی اتنے سارے آنسوؤں میں ایک آنسو بھی شیخ جی کی یاد میں نہ تھا۔ سب اپنی بدنصیبی پر بیٹے بچوں کی بدنصیبی اپنے مستقبل کے اندھیرے پن پر بہہ رہے تھے۔

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی۔

آپا کی چکا سی نگاہیں بار بار چھت کا طواف کرتی تھیں۔ کھڑکی میں بیٹھنے سے لگ رہا تھا جیسے وہ صندوق بھر روح میں بیٹھی نیم آفتاب کا منتظر ... کسی ... سے لوٹ رہا ہے۔ سارے گھر میں سکوت کا پہرہ پڑا ہوا تھا۔ گو باہر بوندیں برس رہی تھیں لیکن گھر کے اندر ... گرم گرم دھوپ کا سا سماں تھا۔ ... یادوں میں ... تکان اور آنسو تھے۔ ... اپنے ادھورے کندھوں پر بوجھ اٹھائے ... سے گڑیاں قطار در قطار پانی ... رہی تھیں۔

آپا کی چکا سی نگاہیں سوتے ہوئے شیخ جی پر منڈلا رہی تھیں۔

یہ مردود ایک شیخ صاحب تھا۔ اس سے اسے نفرت تھی لیکن اس کے وجود سے آپا کے ... گناہ کی خارش ... تھی ... کسی ... اپنی کارگزاری بند کر دیتے تھے۔ آپا کا سب کچھ پہلے ہی شیخ صاحب کے لیے تھا لیکن نکاح ... اس گھر میں کیا ... سارے گھر میں اس شخص کے وجود سے بہار آ گئی۔ آپا کو شیخ جی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ علاوہ ہر

——— اِمّن بی کی عدالت

تو پھر یہ اعتراض تمام شیخ جی کے مرنے کے بعد بہت ہیں اور غرض بی آپا سے تو سب کچھ بہت ہیں۔ آپ کے سامنے تو آپ چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں تاکہ سوچتی ہوں کہ میں لڑکیا تھا، شوہر مرا، نہ تو زعب و دبدبہ والا نہیں لگتا۔ مگر مرد کی محبت سے بڑی کوئی نعمت نہیں چاہیئے۔ شادی کے دوسرے سال میاں بیوی کا رشتہ ماں بیٹے کا ہوتا ہے۔ ان کی بیماری سے بی آپا کو مرتے دم تک لگاؤ ہو گیا تھا۔ سوچتی وہ تو شیخ کی قسمت سے یاد رہتے ہیں۔ ورنہ ان ہاتھوں کو ان کی خدمت کا موقع کب ملتا!

شادی سے پہلے محض ایک مدرسے کی باپتائی شیخ جی کی ہو چکی تھی۔ تب ہی دھوم سے ان کی غلام تھی۔ اب تو بڑی مسعودہ کو سے بھی دور رکھا جاتا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ شیخ جی کے پاؤں چومے۔ اپنے چہرے کے ساتھ بیٹھ جائے کہ شیخ جی کے گھٹنے سے پیروں پر ہی جائے ——— اللہ مجھ باندی پر لطف سے شیخ جی نے نکاح پڑھوایا۔ مجھ نابکار کو یہ عزت بخشی۔ کس کی ٹھوکر کو سر پر اٹھایا۔ جب یہ باتیں اس کے ذہن میں آتیں تو شیخ جی کی محبت کا سوتا جسم پر آبشار بن کر گرتا اور روح تمکنت سے سرشار ہو جاتی۔ اس جنت میں اندھیرے بادلوں کی سی ستر پوشی تھی۔ حضرت بلال کی سی عبودیت تھی۔ رام رام کرکے تو چاہے گرد جینے لگی تو پڑی کی لکھی تھی۔

تائی آپا سے مضمون ہر دو سے عاشق اور سے جیسے شیخ صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر جو بے پروا سونے لگی۔

حمیدہ اتنی زور سے ہنسی کہ بیگم نسیب برگشتہ کی طرح پیر ڈھیر ہو کر چوکی پر جا بیٹھی۔

"اماں نے کتنی مرتبہ پھر یہی بات کہی ——— لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ شیخ صاحب دوسرے نکاح کے بعد بھی حمیدہ کی کفالت کرتے رہیں گے؟ ——— اس سارے معاملے کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ کسی طرح شیخ صاحب اس بدمعاش کو چھوڑ دیں"

جہاں تک حمیدہ کا تعلق تھا وہ یہ چاہتی تھی کہ شیخ صاحب چاہے جسمانی طور پر تائی کو چھوڑ دیں نہ چھوڑیں لیکن پلک کو دیکھ کر کا پلڑا روپیہ پیسہ کی ہمراہ کھڑا رہے گا۔ ایک طرح سے وہ خوش تھی کہ گناہ بیٹھنے کو ایک دوسری آگئی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ مقابل اس تائی کمینی تھی، رنڈی تھی، روپے پیسے کی لوبھی، وہ کب تک برداشت کرتی ہے کہ حمیدہ کو ہزار روپیہ ماہوار مفت کا ملتا ہے۔

"اسے تم نہ ڈرو حمیدہ ہم تمہاری پشت پر ہیں۔ ادھر تو کارخانے کا انڈسٹری کے ڈائریکٹر سے کہہ کر بند کروا دیں گے اور پٹرول پمپ ہاتھ سے نکلوا دیا تو کہنا۔ جب بزنس کا دریچہ بند ہوگا تو یہ ساری جنت تو آپ ہی دم بخت ہو جائے گی۔"

حمیدہ لرز گئی۔ جنت کو دم بخت کرنے کا یہ طریقہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اللہ وہ جو کہیں سے ایسا علاج ہو کہ سانپ بھی جائے اور بزنس کی لاٹھی بھی سلامت رہے تو بڑی بات ہے۔

خالہ اصغری ریشمی برقعے میں انتظار کر رہی تھیں "بھائی جی ہماری حمیدہ تو سیدھی سادی ہے آپ خود جا کر ان کو تاب سے اس رنڈی کے شکنجے سے چھڑا کیوں نہ لیں ———"

"مشکل تو یہی ہے اگر شیخ صاحب ان غنڈوں کے سامنے ہو بھی گئے تو کوٹھے والی کسی کو کب گھسنے دے گی۔ شیخ صاحب

واپس بھاگنا پڑے گا —— ہر قیمت پر ——

اپنے ساتھ والے پلنگ پر قتل عمل کرتے ہوئے نرخرے سے بھیانک آوازیں نکالتے شیخ جی کے تصور سے ہی حمیدہ لرز گئی اس کے دل کے آنگن میں پیاں [illegible] سی پر شیخ جی کی وہ ساری باتیں افسوس کرنے آئی بیٹھی تھیں جن کا شیخ جی کی موت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ ندی کے ہاتھوں طرح بند ہو جانے کا خدشہ تو تھا ہی ڈر بھی ہے۔ وہ پھر ستاتا تھا کہ سارے میں تک کئی جوڑی ہاری تو پ کو کیسی انجک پات گئی کر شیخ جی جیا کو دن شکار ہاتھ سے جا آرہا۔

جب ماموں نے گلبرگ جانے کا قصد کیا تو خالہ اصغری نے بچوں کو گندے میلے کپڑے پہنا کر یتیموں کی ساری خوبیاں پیدا کر کے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لا بٹھایا۔ پہلے تو حمیدہ ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی تھی لیکن جب اٹھارھویں مرتبہ چلتے چلتے ماموں بولے۔ دیکھ حمیدہ! وہ عورتیں بازاری ہوتیں بات دے کے کی تھیں یہ مت سمجھنا کہ ایسی عورتوں کے وعدے اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سامنے مٹھو وساں جانے کی لیکن ایسی عورتوں کا اعتبار کیا۔ بہتر تو یہی تھا کہ تم ساتھ چلتیں اور کسی طرح شیخ جی کو رلا لاتیں ورنہ ان کے چیتر [illegible] کیا پھر آنکھوں میں مٹھیاں بند ملنے کر روؤ گی ۔۔۔

حمیدہ خوفزدہ ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ کھڑکی سے سر اندر ڈال کر خالہ اصغری بولیں ۔۔۔ اے حمیدہ! جب ماموں دبا چکیں تو پھر ڈلار سے کام چلا کہیں بیٹھا بٹھایا شکار نہ بدکا دینا۔ وہ تو ایسے سب گن پڑھی ہیں۔ بس تم کوتاہی کرتی ہو ان لگاوٹ کی باتیں کرنا لگاوٹ کی۔ وہ نہ کہیں شیخ صاحب کی ہر شے کی وہی مالک بن بیٹھے ۔۔۔

کینال پارک کی جانب سے آنے والی فیٹ … بادل گلبرگ پر بے جان پڑا تھا۔ ٹیکسی کی پلی چھت پر شہد جیسی بوندیں [illegible] رہی تھیں اور میٹر دم بدم بڑھ رہا تھا۔

تاج کسمت خوردہ اچھوت سانپ کی طرح سندوق جوتے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پہلے ماموں نے پون گھنٹہ اس کی اس کے پیسے کی اس کے باپ دادا کی بے غیرت زندگی کی پچھلی ناکامیوں سے ضیافت کی۔ اس دوران حمیدہ چارپائی کے سرہانے یوں کھڑی رہی جیسے اس کمرے کی ہر چیز میں … ماموں اپنے … سے پیسے کی گاڑی شنٹ کرتے ہوئے شیخ جی سے بولے … تم جانتے ہو … سے میرے تعلقات ہیں۔ … شیخ الہی بخش … دولت کے مالک … اس دولت کا پرنالہ ہی بند کر دوں گا انشاء اللہ!

شیخ جی کچی نیند سے جاگے تھے۔ چہرے پر پسینہ … اور دل … تھے۔ پھر نگاہ … سامنے حمیدہ اور اس کی شکل نظر آئی۔ بیماری نے پہلے ہی قوت مدافعت چھین لی تھی۔ پلنگ پر عادی مجرموں کی طرح بیٹھ گئے۔

تم کچھ بولتے کیوں نہیں ۔۔۔ شیخ جی اس … سے کان … کیا ۔۔۔ بے شرم کار تو گھر پر … بیٹے

یہ ملکہ تو سارا دن جیتا کرتی تھی اپنی خیر چاہتی :

" یہ میری لاڈلی بہو بیوی کا بیٹا ہے جیسے حمیدہ . . . . . آپ آپ " انھوں نے آپ کی بیٹی تو اندر بلا کر اچھا دیکھی حق بجانب ہو گئی۔

بہا سے جب حمیدہ دھکے سے چپ نے بجو چپا کا تھا۔ ننھی بسم اللہ کی سائیکل کرو دھرا دھڑ دونا بہتے تھے۔ ساتھ چمکر سے تر کی لاد میں خوفناک سی چمک کنڈلیا ہے سانپ ہو کر بار بار لہرا رہی تھی اور میں بس دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

آپی آہستہ سے جہاں میں سے اتریں۔ حمیدہ کے پیروں کی آواز بند اس کے کان میں گرم سیسہ پگھلا رہی تھیں۔ آخر ان معصوم کا کیا قصور تھا، جس نقد بستوری ایک دوا کی ضرورت تھی اسی قدر مان بجا ان کرکے تو ہم سب سے دور کر دیتے؟ وہ تو بستر پر بستہ اللہ کی گٹھڑی اور جیکٹ پر کیل جوتی ایکشن آتا رہے گی۔

شیخ جی نے اماں کی طرف دیکھا، اچھا ایسی اسی وقت انکے بچہ کو حمیدہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چنیاں پیروں سے کر ان کے باہر کر دیں۔ جانے جمیلہ نے تو شیخ جی نے پلٹ کر دیکھا اور نہ جانے کیا شاید انہیں کیسی ٹھاک چھوڑ نے گئی۔

—

کیلاش پاک سے آنکے وہ سے بادل کی قناتیں پھٹ گئیں اور کابل بھری چھار گلبرگ کی کوٹھی پر پڑنے لگی آپی نے مسکرا کر بے نگاہ ڈال اور پھر شیخ جی کے ناک پٹک کر اٹھتی جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے اور ایک آنسو میں شیخ جی کی شبیہ تڑپ رہی تھی ہمکر ہی تھی اس کے سر کا سیس پھول تو بچے سے فرش میں بکھر چکا تھا۔

———

مری موت

لام علی چودھری

ننھا بندو آج پھر مر گیا ہے۔ چھپر کے برآمدے میں چھمّو اس کے پاس گم صم بیٹھی ہے۔ صمدو اندر گڑگڑی پی رہا ہے اور عزیزن ایک طرف پڑی سو رہی ہے۔

بندو کا تنور کی طرح تپتا ہوا بدن، ماتھے پر چمکتا ہوا پسینہ، آنکھوں کی الٹتی پلٹتی سیاہی سفیدی اور سانس کا الجھا الجھا اتار چڑھاؤ۔۔۔۔ چھمّو یہ سب کچھ بڑی بے چارگی سے دیکھتی رہی ہے یہاں تک کہ تنور ٹھنڈا پڑ گیا ہے پسینہ سوکھ گیا ہے سیاہی سفیدی ٹھہر گئی ہے اور سانس اڑ گیا ہے۔

شہر سے تین میل دور ریل کی پٹڑی اور کرتار کی سڑک کے درمیان چمڑے کے کارخانے کے قریب گارے کی چار دیواروں اور پھوس کی لپی چھت کے سائے میں چھمّو نے بندو کو ایک بار اور مرتے دیکھا ہے مگر اس نے میاں کو آواز دی ہے نہ بہن کو جگایا ہے۔

ادھر ریل ایکسپریس، مسافر اور مال گاڑیاں شوں شاں، بھک بھک کرتی ہوئی چلی آ رہی ہیں اور کھٹا کھٹ نکلتی جا رہی ہیں اور گارے کی دیواریں اور پھوس کی چھت برابر پٹپٹا کر رہ جاتی ہے۔ ادھر کاروں، لاریوں، بسوں، ٹرکوں، چھکڑوں، تانگوں اور رکشوں کا ابلتا دھارا بہہ رہا ہے جو اکثر گرد کے بگولے اڑاتا ہے اور کبھی کبھی ٹرکوں کی لپیٹوں میں ہارنوں کے شور اور گھوڑے ہانکنے والوں کی آوازوں کو بھی سمو دیتا ہے۔

سنو کی اس دکھتی ہوئی نگاہ سے دوپہر میں کارخانے کی چمنیاں برابر کالے دھوئیں کے ہوائی اژدہے اگل رہی ہیں جو پھیل پھیل کر پیڑ سے ہیں اور چنگار چنگار کر فضا کو اور بھی آتشیں بنا رہے ہیں۔ کارخانے کی بھڑکتی ہوئی بھٹیوں کے دہانوں سے ابلنے والے اور لوہے اور لکڑی کے تپتے ہوئے پہیوں کے بل پر چلنے والے سیکڑوں انسانوں سے ذرا دور گارے کی دیواروں اور پھوس کی چھت کے سائے میں ایک ننھی سی سانس کی لو دہکتی تپ کے تنور میں جل کر راکھ ہو گئی ہے اور بندو آج پھر مر گیا ہے۔

بندو پہلی بار مرا تھا تو چھمّو نے سر کے بال نوچ لیے تھے اور عزیزن نے طرح طرح چیخ چلائی تھی اور پل بھر کے لیے صمدو کی بھی گھگھی بندھ گئی تھی۔

بندو دوسری بار مرا تھا تو چھمّو روتی اور بین کرتی رہی تھی اور عزیزن سسکیاں بھرتی رہی تھی اور صمدو کی بھی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

بندو تیسری بار مرا ہے تو چھمّو گم صم بیٹھی ہے۔ صمدو اندر گڑگڑی پی رہا ہے اور عزیزن گھوک سو رہی ہے۔

چھمّو سوچ رہی ہے کہ وہ میاں سے کیا کہے کیا بتائے۔ صمدو نے تو اس دن جب بندو کو تپ چڑھتے ہی بتا دیا تھا کہ بندو پھر مر جائے گا اور آج سویرے صمدو کی کھانسی کے وقت اس نے ننھی بیماری کے بارے میں کہا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے بندو کا کچھ دوپہر کا گھر ہم

لے سکا تو چھمن نے ایک سستی سی پھولی تو اس پر ڈال رکھی تھی اور عزیزن نے گستاخ کا منہ دوسری طرف پھیر دیا تھا۔

چھمن سوچ رہی ہے کارخانے کا منیجر صمد وہاں یوں منتظر نہیں کرے گا۔ تنخواہ کی چھٹی میں کارخانے اس کے حق میں ہوتی تو وقت یوں چپ چاپ نہ بیٹھا رہتا۔ وہ سب کہہ دیں گے بیدردی کھانے کے لیے کہ چاہو آ کے کر جب سے تنخواہ کا گالیاں دینے کو مجبور کر رہے ہیں اب جب اس کی بھوک اور نیند اور نشہ بڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن ابھی اس نے روٹی نہیں کھائی شاید وہ جانتی ہے کہ باہر بندو دم توڑ چکا ہے۔

چھمن کو کمرے کے عالم میں ہے۔ وہ بندو کی میت کے پاس کب تک یوں بیٹھی رہے گی؟ وہ گالیاں بکنے والا صمد اور روٹی، پھر نے اور گوڑی کے رسیا صمد کے ڈر سے کب تک یوں کمرے کی کھڑکی سے لگی رہے گی؟ کیا وہ اندر جا کر عزیزن کو بھی نہیں جگا سکتی؟

چھمن کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل جاتی ہے۔۔۔۔۔ عزیزن ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھتی ہے اور صمد کو گرتے دیکھ کے سوتا رہتا ہے۔ تھا سے اور چھمن کے گھر میں موت کی پرچھائیں پھیل گئی ہے۔

عزیزن اُبلے ہوئے بالوں کا گٹھا سا سر اٹھائے آنکھیں ملتی ہوئی بھیجتی چھپر کے برآمدے کی تیز روشنی میں آ گئی ہے اور دیکھتی ہے کہ بندو چھمن کی میلی اوڑھنی کے نیچے بے حس و حرکت پڑا ہے۔ وہ ذرا سا ٹھہرے کو سرہانے کی طرف سے ہٹاتی ہے اور اس کے زرد چہرے اور آنکھوں کی پتھرائی ہوئی سیاہی سینے کی پرانی ڈھال کر اُتارتی ہے۔ اسے اسی طرح ڈھانپ دیتی ہے اور چپ چاپ ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔

صمد دروازے میں کھڑا ہے وہ چند لمحے عزیزن، چھمن اور اوڑھنی میں لپٹے ہوئے بندو کو گھورتا ہے۔ پھر اپنی پگڑی سی ماتھے پر کھاتا ہوا سر پر میل کی گندی ٹوپی جماتا ہوا باہر نکلتا ہے اور جھکتی ہوئی نوکری پیشہ رہین کارخانے کے کوارٹروں کی طرف چل دیتا ہے۔

چھمن پھوٹ پھوٹ کر رونے جا رہی ہے مگر بندو کو نہلانے کی فکر میں بھی ہے۔ وہ اُٹھتی ہے۔ پہلے ایک گھڑے کا پانی مٹی میں انڈیلتی ہے پھر دوسرے کا اور دیکھتی ہے کہ وہ تو خالی ہو گئے لیکن پانی نہیں بھری۔ عزیزن اٹھتی ہے اور بال ٹھیک کرتی ہوئی اندر جاتی ہے۔ اپنا سوٹ کیس کھولتی ہے۔ اس کا دوپٹہ اوڑھتی ہے پھر گھڑا اٹھا کر بیل کی پٹڑی کے قریب والے کنوئیں کی طرف چل دیتی ہے جو برسوں سے کمپنی اور بستی والوں نے چندہ دے کے ٹھیکیدار سے بنوا کی مرمت کے لیے کم دیا ہے اور جس سے ان دونوں بڑی پٹڑی اور سنٹ سیپر بچھانے والا گینگ پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

باہر کے دروازے میں آہٹ ہوتی ہے تو سسکیاں بھرتی ہوئی چھمن مڑ کے دیکھتی ہے۔ عزیزن کی جانے کیا سلام زنگاری سے پر گھڑا اٹھائے اندر آتی ہے۔ اسے نیچے رکھ دیتی ہے اور دوسرا گھڑا اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد عزیزن قمیص بھیگی ہوئی، دوپٹہ سرک جاتا ہے اور راستے صابن کی ایک ٹکیا نکالتی ہے۔ چھمن نے بندو کا کرتا اتارا ہے۔ وہ اس کے بدن پر بندھا ہوا چھوٹا سا سوتی لے کر تعویذ کھینچنے لگی ہے تو اس کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ اس کی مرحوم ماں نے بندو کے پیدا ہونے پر وہ تعویذ بھیجی کا دوا حرمت نے اسے بندو کے بازو سے الگ کیا ہے۔ عزیزن نے بار بار پانی ڈال کر گرم چوکی کو ٹھنڈا کیا ہے۔

...ں نے نعشِ میت کو اس پر لٹا دیا ہے

پھتوں بیٹھا بندو کے جسم پر صابن مل رہی ہے اور عزیزن پاس کھڑی لوٹے سے پانی کی دھار ڈال رہی ہے۔ اس کے نتھنوں میں صابن کی ہلکی ہلکی خوشبو داخل ہو رہی ہے اور اس کے لیے یہ غنیمت ہے کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جب وہ گھڑا اٹھانے کنوئیں کو جا رہی تو راستے میں کارخانے کے پچھواڑے میں بہتے ہوئے گہرے سبز، گندے اُبلتے ہوئے پٹ سن کے رس کے دھارے نے ... ہے جا بجا بنے ہوئے چھوٹے بڑے جوہڑوں نے سڑاند کے ایسے بھبکے چھوڑے تھے کہ اس کے دماغ کے پردے پھٹنے لگتے تھے۔ وہ تو ہیڈ گینگ مین کا بھلا ہو کہ اس نے دیکھ لیا اور بیلدار کو گھڑا اٹھا لانے کے لیے بھیج دیا اور پھر خود وہاں سے ... پوچھنے آیا کہ آج بندو کا کیا حال ہے۔ عزیزن بہت دنوں سے یہ صابن استعمال کر رہی تھی مگر اسے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ خوشبودار ہے۔

بیلدار پانی کا دوسرا گھڑا بھر کے لایا ہے اور ہیڈ گینگ مین کے کہنے پر اس میں بیری کے پتے بھی ڈال لایا ہے۔ وہ لوٹے ... کے قریب رکھ کے لاش کی طرف دیکھ رہا ہے کہ صمد ورث کے آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی ہیں جو کارخانے والی [illegible] میں بھی ہے۔ صمد اندر سے پرالی کی ایک چٹائی اٹھا لایا ہے اور وہ چاروں اس پر آنگن میں باہر والی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے ... ہیں۔ بیلدار واپس اپنے گینگ کی طرف چلا گیا ہے۔

بندو کو نہلا دیا گیا ہے اور عزیزن اندر چلی گئی ہے اور کفن کے لیے کپڑا ڈھونڈ رہی ہے [illegible] ساتھ اور ہیڈی جلتی کے نیچے چھپے [illegible] پھولوں والے [illegible] معلوم ہے [illegible] کی بار بندو کو بیٹے [illegible] کی انتظامات بھی نہیں [illegible] سال [illegible] بھی پڑے کے اور کچھ [illegible] نہیں۔ وہ کچھ دیر [illegible] میں [illegible] کرتی ہے [illegible] اس کے [illegible] کا [illegible] ہے۔ یہ اس نے بڑے عرصے سے اپنے [illegible] کے لیے رکھا ہوا ہے [illegible] کے لیے [illegible] اور [illegible] روپے [illegible] ہوئے نوٹ بھی صمد کے ہاتھ [illegible] دیتی ہے [illegible]

چاروں آدمی جنازہ اٹھا کے چلے گئے ہیں۔ بندو تو تیسرے پہر [illegible] کو [illegible] گیا ہے۔ وہ [illegible] پانی [illegible] ہے اور عزیزن اس کے پاس بیٹھی [illegible] رہی ہے۔

قبرستان ڈھیر کے [illegible] کنوئیں سے بہت [illegible] کی [illegible] کی [illegible] ڈھیری [illegible] میں قبر کھودنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے [illegible] بیٹھ [illegible] ملا۔ [illegible] کے دو ساتھیوں [illegible] سے اپنی بات [illegible] وہ [illegible] دیا تو نہ صمد سے بچا [illegible] میں [illegible] دونوں بیلداروں کو [illegible] اور [illegible] اٹھا [illegible] کا بچہ [illegible] کہ [illegible] سے [illegible] ہے

ہیں . . . . . وہ بہر دو تی کا منہ نہیں دیکھا اس گودی سے کوئی پیٹ متعلق ہوتا ہے . . . . میرا جی چاہتا ہے اس کے گلے لگ
کا سپیرا منہ کرکے کارخانے سے گھر پہنچے جب بعد پانی کے جوہڑ میں ڈبو دیتا پھر اسے خیال آتا ہے کہ جیسے اتوار کو پچھواڑے کے قریب
سے جھٹ سے آتے گھروں کے وہ دو تھڑوں پر بچھی چٹائیاں بچھا رہے تھے اور فضا بہت کیا ایک طرف ایسے ہی ایک تھڑے پر
ایک بستر بچھا تھا جو یقیناً بہت دیر سے وہاں تھا . . . . . وہ سونے کی تیاری کر رہے ہیں اور یہاں ایک مسعود کی صحت کا خواب
آ رہا۔ اس نے ایک نوکری کی سوچ ہوئی عزیزہ پر ڈال دی ہے اور پھر جیسے کارخانے کے اندر اٹھ گئے جو لگی شدی اور سات بجے
اسپیر لیے جوش و خروش سے ایک ساتھ اس کے سر کو جھنجھوڑ دیا ہے اس نے ایک بجر [illegible] کو لیا ہے اور سکیں برتی ہوئی
نے سر پر زور سے تھپڑ مارا ہے اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا چولہے کے سامنے لے گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چولہوں کی چٹاخ
کے ساتھ ساتھ چپاتیاں بننے کی تھپ تھپ سنائی دینے لگی ہے۔
عزیزہ کھیس میں تہ ہوئی آسمان ہے تو آنکھ نہیں لگتا کہ کھانا کھٹ جاتا ہے۔ مسعود روٹی کھا رہا ہے اور گھر کے پاس آ گیا ہے
ہے۔ پہلے وہ دونوں کو کھڑا تھا ہے پھر یہ جان کر کہ میاں بیوی کو روٹی کھانے کے لیے نہ کہے گا اس نے بہن کا ہاتھ پکڑ کر جھڑکی کا
جھاڑا ہے اور اس کے ساتھ خود ہی کھانے لگی ہے اسے حیرانی ہوتی ہے کہ اس کی طرح چھوٹو کو بھی ذرا بھوک لگی ہے۔ دونوں کو
جلتی ہیں تو جھپٹ کر صاف کرنے چلی جاتی ہے اور وہ اندر سے چارپائی نکال لاتی ہے۔ اس نے اسے صحن میں پرال کی چٹائی سے
خالی پر ڈال دیا ہے۔

ڈوبتے پہلے سورج ڈوبتے ہی دم توڑ گئی تھیں لیکن سڑک پر آنے جانے والی بسوں اور کاروں کے ہارن اب زیادہ صاف سنائی
دینے لگے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ کارخانے کا سائرن ہے وہ جو زور بلاتا گھٹتا ہے۔ عزیزہ نے کروٹ بدل کر دیکھا ہے تو مسعود چٹائی پر لیٹا
ہوا ہے اور چھوٹو بیٹھی اس کے پاؤں داب رہی ہے۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی ہے اور اپنے آپ سے کچھ پوچھ رہی ہے۔ [illegible]
چھوٹو کو آج بھی چھٹی نہ ملے گی؟ پھر جیسے وہ اپنے کسی فیصلے پر نظرثانی کرنے کے لیے اٹھ کر بیٹھ گئی ہے اور پھر جیسے اس نے
فیصلے کو منسوخ کر دیا ہے۔ وہ اٹھ کے اندر چلی گئی ہے اور بڑی دیر تک اپنے ٹوٹے کیس سے مشورہ کرتی رہی ہے آخر [illegible]
اور عالم سرسراہٹ جو ہے وہ پھر بستر پر آ لیٹی ہے۔
ساڑھے دس بجے کی ماں گاڑی کھڑکھڑ کرتی رینگتی ہوئی نکل گئی ہے اور فضا میں ہلکی ہلکی شنڈک سانس لینے لگی ہے۔ [illegible]
والے دریا کے پار پاؤں کی دھیمی دھیمی چاپ اور گھنٹی گھنٹی کھانسی سنائی دی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اچانک گزرتا کوئی [illegible]
مسعود کی بند آنکھوں کے سامنے دیل کی ننھی ننھی پٹڑی کے قرینے سے جوڑے ہوئے ٹکڑوں کے تھڑے پر اکیلا جا ہوا ہے [illegible]
عزیزہ نے چوری سے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھولا ہے اور باہر چلی گئی ہے۔
مسعود نے ایک لمبا سانس لیا ہے اور اس کا ہاتھ پاؤں داتبی ہوئی چھوٹو کے بازو تک جا پہنچا ہے
دھیرے دھیرے جلتی ہوئی پگڈنڈیوں پر پرالی کی چٹائی میں سر کی چھت اور گلے کی دیواریں کسی تہہ میں بند دقیق بار کے کو [illegible]
ہوا بند ہو رہی ہے۔

صمد کی بھوک اور نیند اور نشہ کم رہا ہے۔ بندو بڑا کیا کا بچہ ہے یونہی دق کرنے کو آنکھیں میچ دم سادھ ٹھنڈا پتھر سا ہو جاتا ہے۔ وہ اسی لیے ڈیسک سے لپٹ آئے گا۔

چھموں کی جیب والا سونے کا تعویذ اور اس کی تیز کمانے والی چندیا اور پاؤں دابنے والے ہاتھ کم رہے ہیں۔ بندو دو بار جا کے آ گیا تھا تو تیسری بار جا کے کیوں نہیں آئے گا۔ بندو آئے بغیر نہ رہے گا۔

عزیزن کا ریشم اور خوشبو اور نوٹوں والا سوٹ کیس کم رہا ہے۔ بندو پرانا بہروپیا ہے میں اس کے جھوٹے غم میں کیوں زخم ہو جاؤں؟

اور گامے اور پچھوس کے گھر سے ذرا دور کارخانے کی بھڑکتی ہوئی بھٹیوں کے دہانے اور کالے اژدہے اگلنے والی چمنیاں اور جا بجا جھلملاتی جوتی روشنیاں اور لکڑی اور ربڑ اور لوہے کے ان گنت شبانہ روز گھومتے ہوئے تپتے پہیے اور دن رات چیختے چلاتے ہوئے وسل اور سیٹیاں اور ہارن اور موٹر گویا ناچ رہے ہیں، تالی بجا رہے ہیں، چیخ چلا رہے ہیں کہ صمد اور چھموں اور عزیزن نے بندو کا بھید پا لیا ہے۔

ضرورت ہے

حفیظ رومانی

[illegible] برنی ہوسٹل کی رہنے والی لڑکیاں اپنے کامن روم میں بیٹھی ڈان اخبار میں دیکھ رہی تھیں۔ برنی ہوسٹل ایلگن روڈ [illegible] بنا ہوا تھا۔ جس کی عمارت ریلوے اسٹیشن جیسے بہت چھوٹے کمرے تھے اور ان کمروں میں چند نوکری پیشہ لڑکیاں رہتی تھیں [illegible] مسافر خانہ میں رہنے کا نتیجہ تھا یا محض اتفاق کہ یہاں کی لڑکیاں مسافروں کی سی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کا یہاں قیام مسافروں کی طرح مختصر سا ہوتا۔ مسافروں اور ان میں یہی تو فرق تھا کہ مسافروں کو تو اپنی منزل کا پتہ ہوتا ہے لیکن ان بیچاریوں کو اپنی منزل کا کوئی علم نہ ہوتا تھا۔ اس [illegible] حالات کچھ ایسے ہوتے تھے کہ وہ اپنے گھروں سے باہر رہ کر ادھر ادھر کام کر کے گزر اوقات کرنے پر مجبور ہوتی تھیں۔

ان کے کھانے پینے کا حساب اکثر ہی ہوتا تھا۔ یہ کھانے پینے کا خرچ فی ماہ [illegible] کے [illegible] اپس میں بانٹ لیتی تھیں۔ ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے [illegible] کم خرچ ملے۔ اور جب بھی کبھی کوئی باہر کھانے کی دعوت ملتی تو یہ بے تکلفی سے منظور کر لیتیں۔ ان کی آمدنیاں اپنے دوستوں کی جیبوں پر پلتی رہتی تھیں۔

برنی ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیاں ان کمرا ساتھیں [illegible] گزارتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی سے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔ کوئی کہاں سے آئی ہے اور کہاں جا رہی ہے۔

ان لڑکیوں کے چہروں سے تو معلوم ہوتا کہ وہ بہت بھولی بھالی ہیں لیکن ہر قسم کے لوگوں سے ملتے ملتے وہ بہت تیز طرار ہو چکی تھیں۔ جب کوئی ان پر نئے آدمیوں سے ملنے جلنے پر انگشت نمائی کرتا تو یہ بڑی بوڑھیوں کی طرح کوسنے دینا شروع کر دیتیں اور اپنے شوہروں سے [illegible] کرتا کیا کچھ نہیں کرنے [illegible] سمجھتے ہیں۔ [illegible] وہ تو کچھ نہیں کہا جاتا۔ مگر معصوم مردوں سے بچاری [illegible] کیوں [illegible] کر دیا جاتا ہے۔ عورت کا تو نام ہی بدنام ہے۔

ان لڑکیوں کے پاس کبھی ان کی ایسی سہیلیاں بھی آ کر ٹھہرا کرتی تھیں جنہیں کوئی بہتر ملازمت مل جاتی یا پھر ان کی واقفیت [illegible] سے کہیں نوکری کا موقع ملتا۔ ایسی لڑکیاں کچھ روز تو ساتھ رہتیں پھر [illegible] جب [illegible] تو وہ [illegible] کہیں مستقل رہائش اختیار کر لیتیں۔

برنی ہوسٹل کی لڑکیوں کا یہ معمول سا بن گیا تھا کہ جب کسی نئی لڑکی کو یہاں جگہ ملتی تو سب کی سب [illegible] ایک [illegible] گرد جمع ہو جاتیں اور اس کی کوئی ایک بات [illegible]۔

[illegible] کا [illegible] سب کچھ ہی بے تھے۔ [illegible] جاری ہوگئی [illegible]

[illegible] شروع ہو گیا [illegible] ہوتے تھے [illegible] ہو۔

قہقہوں اور نسوانی چیخوں سے فضا گونج اٹھی تھی!

نجمی کی ایک [illegible] شمیمہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بڑے [illegible] انداز سے رقص کر رہی تھی۔ یہ دونوں ناچتے ناچتے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے اور پھر ایک [illegible] اور جھٹکے سے آپس میں [illegible] ناچتے [illegible]! شمیمہ کی حرکات و سکنات سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دوست کو جنسی طور پر رجھا رہی ہے اب وہ ناچتے ناچتے ایک دوسرے میں کبھی یوں سمو جاتے کہ یقین ہونے لگتا دونوں ایک دوسرے کے آر پار ہو جائیں گے!

بلقیس ایک اور دبلی پتلی لڑکی اپنے [illegible] کے دوست کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ بلقیس کی نرم و نازک کمر کو اس کے دوست نے اپنے ہاتھوں کی گرفت میں یوں لے رکھا تھا کہ اس کی [illegible] کی [illegible] پر [illegible] رہی تھیں۔ لیکن [illegible] کو وہ یوں سے جا رہی تھی کہ وہ اپنے اس دوست سے اپنی کوئی نئی فرمائش پوری کرانا چاہتی تھی۔ [illegible] نے بلقیس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بڑے [illegible] انداز سے کہا۔ "میں تمہاری آنکھوں کی شفاف جھیلوں میں ڈوب جانا چاہتا ہوں" بلقیس نے دبی مسکراہٹ سے جواب دیا "تم بڑے [illegible] ہو چکے!"

نجمی خود ایک طرف بیٹھ کر خاموش [illegible] اور حیران بھی تھی کیونکہ [illegible] کے جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط ناچ ایک نئی سی بات تھی اور اس نے یہاں آ کر یہ رنگ بھی [illegible] تھا

نجمی جب بورڈنگ ہاؤس میں آئی تھی تو اس نے [illegible] سادے کپڑے پہنے ہوئے تھے جنہیں شمیمہ نے اس کے کپڑے اتار کر چھپا دیئے [illegible] اپنے [illegible] کانٹ چھانٹ کر اس کے جسم پر فٹ کر دیے تھے۔ نجمی کا [illegible] اندازہ [illegible] میں بڑا خوب نظر معلوم ہونے لگا تھا۔ [illegible] شمیمہ کے کمرے میں [illegible] ایک [illegible] نجمی بھی [illegible]

نجمی اپنے کمرے میں جب پہلے دن سوئی تو [illegible] کمرے کا جائزہ لیا [illegible] کی [illegible] ساری دنیا میں گھٹی تھی جہاں رات کی رانی [illegible] ہوئی تھی

اس وقت [illegible] کی [illegible] ہوئی تھی اور رات کی رانی کی خوشبو [illegible] تھا۔ نجمی رات کی رانی کی خوشبو سے متاثر ہو [illegible] اور وہ اپنی زندگی کے [illegible] وہ [illegible] اب [illegible] متوالی خواہ [illegible] تھی اور [illegible] زندگی [illegible] کے اصلاحات [illegible] وہ بھی [illegible] وہ [illegible] ہوئی تھی تو اس سے اپنے متعلق جاننے کیا کچھ دیا تھا!

دراصل نجمی ایک چھوٹے سے قصبے میں [illegible] جوان ہوئی تھی وہ [illegible] تھا اس کا باپ جب وہ [illegible] برس کی تھی تو فوت ہو گیا تھا اس کی ماں جو قصبے کی [illegible] نے [illegible] چھوڑ [illegible] کی [illegible] کر کے [illegible] وہ محلے بچوں کو پڑھی محنت سے پالا تھا [illegible] نے جب [illegible] پاس کیا اور وہ اب چاہتی تھی کہ [illegible] اپنے ماموں کو تعلیم دلائے اور اس کی خدمت کرے۔ نجمی نے اپنے قصبے میں [illegible] اور [illegible] بھی سیکھ لیا تھا۔

نجمی کی سہیلی شمیمہ [illegible] میں اس کے ساتھ پڑھتی رہی تھی [illegible] شمیمہ نے نجمی کو اپنے پاس بلا لیا کہ وہ کہیں

ہو رہی تھی۔

ایک دن نسیمہ اور چند لڑکیاں بیگ اینڈ کمپنی کے پروپرائیٹر مسٹر بیگ کے ساتھ ان کے کالج میں پکنک کی غرض سے آئیں تو بیگ صاحب سے لیلیٰ کے متعلق بات کر لی۔ چنانچہ بیگ صاحب نے کالج پہنچ کر لیلیٰ کو بیٹے کے لیے مانگ لیا اور لیلیٰ کی شادی طے پا گئی!

جس دن لیلیٰ اپنے گھر سے رخصت ہوئی تو اس کی زندگی کا یہ بڑا دکھ کا دن تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں وہ اپنی امی اور اپنے سسرال والوں سے چھپا کر پونچھتی رہی۔ اس نے جب اپنی تمام ضروری چیزیں باندھ لیں تو اپنے کمرے میں ——— باقی چیزوں پر نظر ڈالی۔ اسے طاق پر رکھا ہوا قرآن مجید دیکھ کر یاد آ گیا۔ یہ قرآن مجید اس کے ابا نے بڑے شوق سے اس کے لیے خریدا تھا۔ اس کی امی نے اس پر سبز ساٹن کا جزدان چڑھا دیا تھا اور بسم اللہ کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی اور اب تک وہ قرآن مجید بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی اور جب بھی کبھی وہ نیا کام شروع کرنا چاہتی تو وہ قرآن مجید کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگتی۔ اب بھی اس نے قرآن مجید دیکھتے ہی بے اختیار چوما، آنکھوں سے لگایا اور پھر اس پر پیشانی ٹیک کر اپنے لیے دعا مانگی کہ پردیس میں رب العزت اس کی حفاظت کرے!

اس نے دعا مانگ کر قرآن مجید کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے سنبھال لیا اور پھر وہ اپنے مکان کے ہر کمرے میں گھوم گھوم کے کونے کونے کو دیکھتی رہی اور یوں محسوس کر رہی تھی گویا وہ کسی بڑی پیاری جگہ کو چھوڑ رہی ہے۔ سچ ہے اس کا دل چاہتا تھا وہ کہیں نہ جائے لیکن وہ مجبور تھی۔

پہلی رات کے کہیں دو بجے گھنٹے نے اسے چونکا دیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ رات کے دو بجے تک سو نہیں سکی۔ چنانچہ اب اس نے کوشش کر کے سونا چاہا، لیکن بے سود۔ اس کے خیالات میں عجیب بے کلی سی تھی، وہ اپنے جہیز کے قرآن میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی جس سے خوفزدہ اور پریشان تھی اور خیالات کی یورش سے گھبرا اٹھی اور اس نے کھڑکی کو کھول کر بند کر دینا چاہا۔ اس نے کھڑکی میں ایک لمبا سانس کھینچ کر رات کی رانی کی خوشبو اپنے اندر بھر لی۔ اس وقت وہ زندگی کی تلخ شیریں بھول سی گئی تھی اور کسی قدر آسودگی محسوس کر رہی تھی کہ یکایک اس کا چہرہ روشن ہو گیا وہ چونکی اور اس نے دیکھا کہ کھڑکی سے دور ایک شخص کھڑکی کے سامنے کھڑا ہے اور اس کی نگاہ کھڑکی کے اندر ہی ہے۔ وہ پہچان نہ سکی وہ کون ہے!

رات کا وقت، تنہائی اور کسی غیر کی موجودگی، وہ گھبرا گئی کہ وہ کیا کرے۔ اس کی تنہائی میں کسی کا غیر مردوں نظر آیا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ گئی۔ اس نے یہ سوچ لیا کہ اس ڈر سے کوئی نظر نہ آئے کہ جسے کھینچ کر اپنے کمرے میں رکھ سکتی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر ڈالی پھر اس نے دیکھا تھا جب وہ نسیمہ کے کمرے میں رہتی تھی تو نسیمہ کا ایک دوست اس کے کمرے میں کھڑکی کے رستے زیادہ رات گئے پچھلے دروازے سے آیا کرتا تھا اور نسیمہ سے باتیں کر کے اسی رستے سے چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ چنانچہ لیلیٰ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے اپنے کو بستر میں گرا دیا۔ وہ گم صم تھی اور اس کے جذبات میں ایک ہلکا سا تلاطم پیدا ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خوفزدہ ہونے کے باوجود ایک نئے احساس سے دوچار ہو رہی تھی جس کے ساتھ ساتھ تھر تھر کانپ بھی رہی تھی!

نجمہ نے صبح شمیم کو یہ تمام ماجرا سنایا لیکن شمیم صرف مسکرا دی۔ شمیم کی مسکراہٹ میں ایک راز چھپا ہوا تھا۔

اتنے میں لاج کی دوسری لڑکی بلقیس آگئی اور نجمہ نے شمیم کے کمرے سے اپنے کمرے میں چلے جانا مناسب سمجھا کیونکہ بلقیس اشارہ و کنایہ میں کچھ ایسی باتیں کہہ کر سنایا کرتی کہ نجمہ پریشان ہو جاتی!

بلقیس نے نجمہ کو جاتے دیکھ کر شمیم سے کہا "ہفتہ بھر تو ہوا ابھی اسے یہاں آئے ہوئے ہیں لیکن ہر ایک کے پیچھے ہی آگ لگا دی ہے اس دیہاتی لونڈیا نے!"

شمیم نے ترس کھاتے ہوئے کہا "بیچاری بڑی سیدھی سادی ہے!" بلقیس نے جھنجھلا کر کہا "ایسی سیدھی سادی خوب مزے کرتی ہیں ہم تو خواہ مخواہ لوگوں میں آکر بدنام ہو جاتی ہیں!"

شمیم نے کہا "نہیں نہیں ابھی اس کی ایسی کوئی بات نہیں" بلقیس نے طنز سے کہا "تو بیگ اینڈ کمپنی میں یونہی نہیں نوکری مل گئی ماہانہ تین سو روپے جیب میں جھٹکے سے ڈال لیتی ہے!"

شمیم نے دور سے لاج کی سپرنٹنڈنٹ کو آتے دیکھا تو بلقیس کو متنبہ کر کے چپ رہنے کو کہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے دور ہی سے پوچھا "شمیم رات بیگ صاحب تمہارے ہاں آئے تھے؟" "نہیں۔ کیوں؟" شمیم نے دبی مسکراہٹ سے کہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے لاپرواہی سے کہا "کچھ نہیں۔ بالا کہہ رہی تھی کہ صبح کے چھ بجے پارک میں رات بیگ صاحب کی کار کھڑی تھی۔" شمیم نے بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ خواہ مخواہ خبریں اڑاتی رہتی ہے۔ ساری رات یہاں سے دور تھی سو رہتی ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "خیر یہ تو یہی اڑاتی ہے۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا جس میں کوئی نہ کوئی شگوفہ نہ کھلتا ہو" اور ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ کوٹھے پر جا رہی تھی کہ شمیم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "بدلی مزدوری دوگی۔"

نجمہ کو بیگ اینڈ کمپنی میں کام کرتے تین چار ہفتے گزر چکے تھے لیکن اب تک وہ مطمئن نہ تھی وہ سارا دن دفتر میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھی رہتی اور اس کا تمام وقت بیکار جماہیاں لیتے گزر جاتا حالانکہ اس کے ساتھ کام کرنے والے مرد ٹائپسٹ روزانہ کی کشتی والے مزدوروں کی طرح سارا دن ٹائپ کرتے رہتے اور نجمہ کو دفتر میں بیکار بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اب ایک مجسمہ کی مانند دفتر میں فقط صرف دیکھنے کے لیے رکھ دی گئی ہے اور اس کا کام دفتر میں آنے جانے والوں کی نظروں کو لبھانا ہے!

نجمہ نے ایک دن شمیم سے پریشان ہو کر پوچھا کہ یہ فرموں والے ہر لڑکی کو اپنی فرموں میں کیوں ملازمتیں دے دیتے ہیں حالانکہ مرد جو بہت زیادہ محنتی اور تجربہ کار بھی ہوتے ہیں۔ شمیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "فرموں کے مالک سمجھتے ہیں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت تجارتی مال زیادہ اچھی طرح فروخت کر سکتی ہیں۔" نجمہ نے بہت سوچا اور اس نے دل ہی دل میں جواب بیان کرنے کے علاوہ میں تو کوئی دوسری بات نظر آتی ہے کیونکہ آنے جانے والے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا راز ہو!

ایک روز شمیم کچھ دنوں کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ ہوا خوری کے لیے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو نجمہ طبیعت کی خرابی کے بہانے گھر میں بیٹھی رہی۔ چنانچہ شمیم نے دیکھا کہ نجمہ اداس بیٹھی ہے۔ شمیم نے ہنستے ہوئے پوچھا "کیوں جان! میرا انتظار کیوں کر رہی ہو؟" نجمہ نے زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے شمیم سے کہا۔ "بیگ صاحب کی کمپنی میں میرے لیے کوئی کام تو ہے نہیں بیکار وہاں چلی جاتی ہوں۔" شمیم نے

شرمی سے کہا: "تو کیا تمہارا سینما جانے کا ارادہ ہے [illegible]" نجمہ نے کہا "بیٹا بیٹھے بیٹھے تم سے بیٹا بھلا اچھا نہیں لگتا"
شمیم نے پوچھا "اچھا نہیں لگتا، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے" نجمہ نے پھر کہا "تم سمجھتی کیوں نہیں شمیم یہ عزت کا سوال ہے" شمیم نے چڑ کر کہا
"یہ [illegible] فیصلہ ابھی [illegible] تو زیادہ بہتر ہوگا۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ نجمہ اس کے چلے جانے کے بعد پھر
ایک لمبی سوچ میں ڈوب گئی۔

نجمہ نوکری کے متعلق روز بروز زیادہ حساس ہوتی چلی جا رہی تھی [illegible] دفتر جا [illegible] بیٹھے بیٹھے تو
[illegible] سے [illegible] چنانچہ اس نے [illegible] کے ہاتھ اپنا استعفیٰ [illegible] کہا تھا
[illegible] صاحب [illegible] ساحب [illegible]
ہوئے تھے [illegible] آخر [illegible] تھا۔

[illegible] صاحب [illegible] تھے [illegible] اس نے اپنا استعفیٰ لکھ کر [illegible]
تھا [illegible] چنانچہ اس نے استعفیٰ [illegible]
[illegible] نجمہ نے [illegible]
سے [illegible] کے ہاتھ [illegible]
[illegible] لکھا تھا:

[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

نجمہ نے [illegible] استعفیٰ [illegible]
[illegible] غائب ہو گیا تھا

[illegible] اس کے [illegible] تھے اور وہ [illegible]
[illegible] نجمہ نے اپنا [illegible]
[illegible] استعفیٰ [illegible] استعفیٰ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کے ساتھ [illegible] اس استعفیٰ کو [illegible]
چاہتی تھی!

نجمہ دروازے پر ابھی پہنچی ہی ہوگی کہ بیگم صاحب [illegible] کے قریب آ [illegible] بیگم صاحب نے [illegible]
[illegible] کہا۔

"بیٹھیے!" نجمہ نے [illegible] اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں کو [illegible] کر اپنے [illegible] سے [illegible]

نے انگلیوں سے جواب دے دیا گویا وہ شل ہو گئی ہوں، وہ کانپ گئی، اُس کا حلق خشک ہو گیا آخر وہ گھبرا کر کار میں یوں بیٹھ گئی جیسے صاحب نے اس پر کوئی سحر پھونک دیا ہو!

کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور نجمی خاموش بیٹھی گزرنے والی شے کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کھوئی ہوئی اس کی آنکھوں کے سامنے گزر رہی ہو، اس کے سامنے واقف ہو کر وہ جانتی ہو کہ اسے مفت کی تنخواہ ملتی ہے، اور اب بیگ صاحب کی کار میں کیوں ضرورت ہے، بیگ صاحب کی نیت کیا ہے، بیگ صاحب اس سے کیا چاہتے ہیں!

کار ایک موڑ مڑ کر کھلی سڑک پر آ گئی تھی، بیگ صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا مس نجمی اپنے متعلق کچھ تو بتائیے، شمیم تو آپ کی بہت تعریفیں کیا کرتی ہے۔" نجمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔ "بیگ صاحب! دراصل، معاف کیجیے، ہمارے گھر کے کہنے میں، اچھے گھرانوں کی لڑکیاں نوکریاں نہیں کرتیں۔"

"مگر آپ تو پڑھی لکھی اور کچھ معقول بھی نظر آتی ہیں شاید آپ کی فیملی پرانے خیالات کی ہو۔" بیگ صاحب نے نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نجمی نے بات مختصر کر کے جواب دیا۔ "بیگ صاحب دراصل میں خود یہ کام کرنا نہیں چاہتی۔" اور اپنے بٹوے سے اپنا استعفیٰ نکال کر بیگ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔

کار جا رہی تھی، بیگ صاحب استعفیٰ دیکھ کر مسکرائے اور پھر بڑی بے تکلفی سے کہا "چلو اب تم ہماری ملازمت میں نہیں ہو اب سے بے تکلف اور میں تمہیں ڈارلنگ بھی کہہ کر پکار سکتا ہوں۔" نجمی نے کچھ جواب نہ دیا اور زہر کے گھونٹ پیتے خاموش بیٹھی رہی۔

بیگ صاحب نے بہتیری کوشش کی کہ وہ کچھ بولے، کچھ کہے اور کچھ نہیں تو ہنستے ہی میں ساتھ دے مگر نجمی تو ایک پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہی۔ ناچار بیگ صاحب نے نجمی کے قریب آتے ہوئے کہا "میری زندگی میں صرف ایک آرزو تھی وہ آج پوری ہو گئی، مجھے کسی ایسی لڑکی کی محبت چاہیے تھی جو میرے دل کے ساز دل سے اور مجھے محبت کرے، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ زمانے میں سے ایک پتھر کی مورتی بھی کر رہا ہوں، مکمل مکمل کر اس کی محبت میں جان دے دوں، میری تمنا پوری ہو گئی نجمی مجھے آج ایک ایسی مل گئی ہے جو پتھر کی مورتی تو نہیں لیکن میرے سینے میں پتھر کا دل نہ رہنے دیا جو اس کی جدائی کا عذاب مجھے محبت کرنے کا جرم کے لیے کافی ہوگا۔"

نجمی نے سب کچھ سنا مگر کہنے سے خاموش اتر گئی، بیگ صاحب کو یقین ہو گیا کہ نجمی اب پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی تو مسکرا کر کہا "تمہاری یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، میں اپنی ساری دولت تمہارے قدموں پر ڈال دینے کو تیار ہوں۔" نجمی سنی ان سنی کر کے نکل گئی۔

نجمی گھر میں پہنچ کر سر تھام کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے کانوں میں بیگ صاحب کے الفاظ اب بھی گونج رہے تھے۔ ہوا سے بند کمرے کی کھڑکی کو ایک شور کے ساتھ کبھی بند اور کبھی کھول رہے تھے اور رات کی رانی کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

کمزوری کے شوہر سے نفرت حاصل کرنے کے لیے نجمہ اپنے بستر سے اٹھی اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سامنے دیکھا کہ اندھیرے میں سے ایک شخص آ رہا تھا۔ تب نجمہ نے اس شخص کو ذرا پہچانا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا: "بیگ صاحب!"
نجمہ کے دماغ میں بیگ صاحب کے خوبصورت الفاظ کا ارتعاش پیدا ہونے لگا اور وہ ان کے الفاظ میں سچائی تلاش کرنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ بیگ صاحب کے الفاظ میں سچائی کی چاشنی ہو تو اس کی ساری زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھر جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی بیگ صاحب کے الفاظ نجمہ کو بھلے لگنے لگے:

نجمہ اس وقت بھرپور جوانی میں تھی اور اس کی یہ عمر ایسی تھی جس میں عموماً لڑکیاں جوانی کی مستی میں کھو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی ہیں جو وہ عام حالت میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔ نجمہ کوئی ایسی کمزور سی لڑکی تھی لیکن نجمہ کا گھریلو ماحول اس کے چاروں طرف ایک آہنی دیوار کھڑا کر رہا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جوانی کی مستی بھی اب تک اس آہنی دیوار کو پار نہ کر سکی تھی لیکن اس وقت تو وہ اپنے گھر سے بہت دور تھی اور وہ ہر طرح کی بندش سے آزاد تھی اور زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کر چکی تھی اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے ہر لڑکی کو کسی نہ کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے: نجمہ نے دور دیکھا بیگ صاحب کھڑکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے یہاں تک کہ وہ کھڑکی کے بہت قریب آ پہنچے تھے۔ نجمہ نے بیگ صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی اور اسے بیگ صاحب کی آنکھوں میں محبت کا پیغام نظر آیا۔ نجمہ کا دل دھڑکنے لگا اور اس کے دل نے کہا واقعی بیگ صاحب اس سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کا خیال آتے ہی اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اس کے گال سرخ ہو گئے —— وہ تھر تھر کانپنے لگی پھر اسے فوراً خیال آیا کہ وہ بھٹک رہی ہے۔ جھٹ نسیمہ یاد آ گئی کہ جب وہ گاؤں میں تھی تو وہ بھی اسی طرح کی شرمیلی سی لڑکی تھی لیکن اب وہ کتنی نڈر ہو چکی ہے اسے اپنی اماں کا بھی یاد آ گیا کہ جب کوئی لڑکی نڈر ہو جاتی ہے تو وہ پھر لڑکی نہیں رہتی کچھ اور ہو جاتی ہے پھر وہ اپنی ناموس اور عزت کا منہ کالا کرنے کو نہیں ڈرتی۔ یہ سوچتے ہی وہ چونک گئی۔ اس نے دیکھا بیگ صاحب اس کے قریب آ چکے تھے۔ وہ گھبرا گئی اور جھٹ اس نے کھڑکی بند کر دی! بیگ صاحب نے پھر اپنی محبت کا پیغام دہرانا شروع کر دیا —— نجمہ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں لیکن پھر بھی بیگ صاحب کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ "تمہاری یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، میں اپنی ساری دولت تمہارے قدموں پر ڈال دینے کو تیار ہوں!"

نجمہ نے جھٹ الماری سے قرآن مجید کو نکال کر اسے چوما، آنکھوں سے لگایا اور اس پر پیشانی ٹیک کر اپنے لیے دعائیں مانگنے لگی۔

نجمہ نے اس وقت تک قرآن مجید سے پیشانی نہیں اٹھائی جب تک اسے یقین نہیں ہو گیا کہ بیگ صاحب چلے گئے ہیں:

دوسرے دن جب نجمہ کی آنکھ کھلی تو نجمہ کا ذہن بالکل صاف تھا اس کی آنکھوں میں ایک عزم چمک رہا تھا اور وہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بے پناہ قوت محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ نجمہ اسی دن اپنے گاؤں واپس چلی گئی۔

"ضرورت ہے"

کا کالم برنی کالج میں رہنے والی لڑکیاں کامن روم میں بیٹھی ڈان اخبار میں دیکھ رہی تھیں!

ماں

احمد شریف

میں گھر آیا تو ماں دالان کے دروازے میں پسر کر اپنا منہ پیٹ پیٹ کر بے تحاشہ رو رہی تھی۔ رانجھے کی بیوی بال جو کھلے سے تھی
رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائی اور پھر دالان میں جھانکنے لگی۔ میں نے اُس کے قریب رُک کر اندر دیکھا۔ ابا فرش پر بیٹھے تھے
ہاتھ سے ... سے پی رہے تھے۔ خالہ شوراں ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے پلنگ پر مبہوت بیٹھی تھی۔ اس کے قریب اس کی لاڈلی تاجاں پاؤں لٹکائے بیٹھی
اور اس کی چوڑیاں اس طرح بج رہی تھیں جیسے زیرِ لب گنگنا رہی ہوں۔

میرا جی چاہا میں ماں سے کندھا چھڑا کر کھڑا ہو جاؤں۔ جب اس کا بوجھ ... سے ... باپ ... اور وہ لپکا ... دھکا دے تو میں ہنستا
دالان میں جھانک جاؤں۔ لیکن اس وقت صورت حال بڑی سنگین تھی۔ میں کتابیں کونے میں پڑی میز پر ڈال کر سنگین بنا ... کے دروازے
پر کھڑا ہو گیا۔

ماں ابھی تک رو رہی تھی۔ اس نے دھاڑ ماری اور دوپٹے کی جھولی ابا کی طرف پھیلا کر بولی

"پیر وشاہ تیرا گھر نہ رہے۔"

ابا نے معصومیت سے ماں کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں میں ... جیسے دست و گریباں ہو گئے۔ ابا کی آنکھیں کسی ...
ماں کے دو دو دیپک تھے۔ جب وہ دیپک جلتے تو میں ... جاتا

خالہ تڑپ کر اٹھی اور دونوں ہاتھ ماں کی جھولی میں رکھ کر بولی۔

"بکھاں! کچھ عقل کر۔"

خوفناک دیر کے لیے ... ابا بھی کھسک کر ماں کے قریب ہو گئے۔ ماں نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے پہلے خالہ اور پھر ابا کی طرف دیکھا
... جونہی اس کی نظر تاجاں پر پڑی بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔ ابا نے ڈرتے ڈرتے اس کا شانہ ہلایا اور کہنے لگے

"بکھے کی ماں۔"

ماں نے جلتی جلتی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ابا ان آنکھوں میں ڈوب گئے۔ پھر ادب سے ... کر بولے

"دیکھ! بکھے کی ماں:"

ابا اس طرح ہانپ رہے تھے جیسے کالے کوسوں کا سفر طے کرنے کے بعد ... ماں نے ایک ... پر ڈالی اور کہنے لگی

"میں نہیں روتی۔"

یک دم ... لیکن پھر ماں پھوٹ پھوٹ کر روئی اور دونوں ہاتھ پلنگ سے اپنے گالوں پر مارنے لگی۔

"میں تو تیرے سنگ پیا بن کے باولی ہو گئی تھا —— سجنا باولی ہو گیا —— سجنا باولی ہو گیا ——"

میں حیران رہ گیا۔ غنڈے کے ساتھ اس کے ہاتھ بھی تو تھا اور تسلسل سے چل رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ کبھی رواں خمداروں پر پڑتے۔ پھر ٹھوڑی کے نیچے دو کے ہلانے کو لپکتی تھی۔ اور پھر دونوں ہاتھ رخساروں پہ آ پڑتے۔ میں اس شکل کی طرح مبتلا کیا جیسے کر درخت کے قریب سے تو نے غول نے کھینچ کر پھینک دیا ہو۔

"بی بی:"

میں چپ رہا اور دوسری بار اس کی گود میں اسیر ہو گیا

"تو بھی" اس نے میرا کہ کر دو تجزیہ اسے ملاحظہ کر چکا تھا۔ "منہ کالے والا۔"

میں دونوں رانوں کے درمیان اس کے نیچے جا گرا۔ اس کے سینے کے ساتھ جیسے ہونٹ بھر گئے۔ میرے کسمسانے پہ تن کے بٹنے پر کسمسانے کو توجہ دی۔ کہاں ابھی ایک پاؤں چلا رہی تھی۔ اس کی سونے کی کیلی والی چمڑی سی چھبن تھی اک کے سینے میں گلاب کی دو پنکھڑیاں پڑی ہوتیں۔

خالہ اصل میں اس کی خادمہ تھیں۔ پر ہم بہت خدمت کرتے تھے۔ اس کے سفید بال، سفید دوپٹہ، سفید کرتی، سفید شلوار اور اناری سی سرخ چہرہ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا جیسے برف میں آگ لگی ہوئی ہو۔

ابا جی اناری کی طرح تھی۔ [illegible] اس نے بڑے گرد کھلایا تھا [illegible] پکے گلاب توڑنے کے لیے جب میں ہاتھ بڑھاتا تو وہ میرا ہاتھ جھٹک دیتی۔ وہ ہر وقت اس شخص کی طرح سمٹی سمٹی رہتی جس نے جنم دیا ہو، کا لال چھپا رکھا ہو۔

خالہ نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا اور کہنے لگی

"جوان بیٹی کو بیوگی کی پھٹی چادر میں چھپائے چار دن کاٹنے آئی تھی اور تو الزام دھرنے لگا ہے۔ برکت بی - چل بیٹی۔"

اس نے تایا ماں کی طرف دیکھا۔ تا جان جھک کر اٹھی اور گرد و پیش لرز گیا۔ ابا جی رنگ گئے۔ انہوں نے لپک کر خالہ کو شانوں سے پکڑ لیا اور کہنے لگے

"کہاں جاؤ گی خالہ؟ میرے منہ کا لقمہ چھن جائے گی۔"

اس گھر میں سب تائی سے ڈرتے تھے۔ اس لیے ڈرتی تھیں کہ اس کا باپ حاجی تھا۔ ابا اس لیے خوفزدہ تھے کہ جیسے وہ جوان ہوتے تھے ان کو اندر کی آنکھ کے آستر سے [illegible] تھی۔ [illegible] گھر میں سے اور چی خانے میں [illegible] آگ پر توے کی طرح تلنگی رکھی تھی [illegible] جلاتے تو ان کے چہرے پر راکھ کی چتیاں سی بکھر جاتیں اور جب وہ ماتھے سے [illegible] صاف کرتے تو [illegible] سرمئی لکیروں کا جال بچھ جاتا —— پیچھے میں تایا اور ابا کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو بادشاہی کے [illegible] شیشے [illegible] کی کلاریاں سخت غصے سے پیس کر رکھ دیتیں۔

پھر بھی اس گھر میں سب تائی سے ڈرتے تھے۔

مس کے قد سے نکال کر روک لیا۔

سے برتنوں کے ڈھیر میں الماری کے نیچے پڑا تھا۔ آ جان جس طرح بمل کر پلنگ سے اٹھی تھی اسی طرح دھپ سے بیٹھ
ہیں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

ریں اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے میں ہنڈولے میں سوار تھا۔ دالان کے نیم تاریک سایوں میں وہ لوگ اس طرح نظر آ رہے تھے
قبریں تخت سے پھر رہے ہوں ——— میرا کانپ ۲ گئی۔ میں نے جلا کر دہلا کے ساتھ کھڑے ہو کر پیچھے کی
ڈیوڑھی میں آ گیا

میرے پیچھے تھی اور ایک ڈبا میرے نیچے۔ پچھلی کے دو مہیب پاٹ تھے جن کا درمیانی خلا لمحہ لمحہ تنگ ہو رہا تھا۔
بند کر لیں اور دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔
سے کالا لحاف اوڑھے دبکا کھڑا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زش کر میں نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھ کر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دونوں بانہیں میرے گرد ڈال کر مجھے
سینے سے لگا لیا۔

مر جائے گا۔"

حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

بابا کا بیاہ ہو رہا ہے۔ آ جان کے ساتھ۔"

ت میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس وقت میرے سارے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت
میاں سمیٹ کر مجھے قرار آ گیا تھا۔ میں اسی چاہ سے سر رہنے تھیں کر لحاف سے ہمیشہ کر لیا۔ ریت پر قدم بانیاں کھاتا ساری زندگی
نے دھکا دیا اور میری کمر پر دو ہتھڑ مار کر بولی۔

ہ۔"

دکان کی طرح نظر آ رہی تھی جس کا سارا مال فرش پر سجا ہوا ہو۔ جیسے ما بھاتر جیسے اندھا تھا۔ اس کے اندر کھڑا رہنے بیٹھے
میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

سے ابا ہوا بابل کا سامان، دیوان خانہ، بچھونی سہرا فیض میرا ابو خونی کا رخانہ اور دالان میں ان کے بہاتے گئے جیسے
پر سوار تھا۔ اس پر پہلا بابا کا پھوپھی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہمارے گھر میں آ بھتے جن کو میں پہچانتا تھا کبھی کبھی
ابا اور میں ساتھ ساتھ پیدا ہوئے تھے

بیٹھنے کے لیے چوپال کے چبوترے کی طرف گیا۔ بابا زون میں گردوں پھرنے والی چاند کی ماں نہ جانے کہاں سے آ گئی۔ اس
پاس بیٹھ گیا اور پوچھنے لگی۔

"میرے چاند کو دیکھا کہیں؟"

وہ بہت عرصے سے اس کا پتہ پوچھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور ایک سیب بلند ہوتا [illegible] مجھ سے [illegible] اس کی سرخ آنکھوں میں وحشت تھی، چاند کا جنازہ اٹھنے کے لیے بار بار [illegible]۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور مجھے ندامت سے مٹھی میں مسوس کر رہ گیا۔

"نہیں۔"

اس کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی تھی [illegible] چار مہینے کے بعد آگ کی لپیٹ میں آ گیا ہو۔ وہ [illegible] جل کر راکھ ہو گئی۔

"پتہ نہیں کہاں چلا گیا میرا چاند!"

میں اسے تاریک گلیوں میں چاند کی تلاش میں سرگرداں چھوڑ کر قبرستان کے باغ کی طرف ہو لیا۔ [illegible] جہاں آم کے درختوں کی جھکی شاخوں میں [illegible]۔ میں نے دیکھا کہ چند [illegible] آم کے درختوں پر [illegible] تھے۔ میں ان کی خوشبو [illegible] مدہوش ہو گیا۔ اس پر بھی وہ درخت کسی تصویر کی طرح ساکت کھڑے تھے۔

میں [illegible] قبر پر جا بیٹھا۔ جب سے [illegible] آسمان پر [illegible] آئی تھیں۔ [illegible] سر پر [illegible]۔ [illegible] پاؤں [illegible]۔

ندی میں [illegible] ہوئے [illegible] میرے درختوں نے شام کی سرمئی چادر اوڑھ لی۔ وہ قبرستان کے [illegible] چاند کی ماں کسی [illegible] کنویں میں منہ ڈال کر [illegible]۔

"چندا ——— میرے چندا!"

پاس ہی پیپل کا پتا کانپ اٹھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر چاند کو پکڑ لیا۔ لیکن ہاتھ لگاتے ہی چاند [illegible] کی سطح پر [illegible] بکھر گیا۔ [illegible] خیال آیا کہ چاند کی ماں نے اگر خواب میں بھی اپنے چاند کو پا لیا تو [illegible] اس کا چاند [illegible] ہو جائے گا۔

میں [illegible] باندھ کر چاند دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر ڈوب گیا اور [illegible] آنکھوں سے [illegible] تکنے لگے۔

ایک زمانہ تھا جب [illegible] بیوہ ماں [illegible] کی خاطر [illegible] کی گندم پیسا کرتی تھی۔ اور وہ دو پیسے روز پر حافظ محمود کی کتابوں کی دکان پر ملازم تھے۔ اس دکان میں ایک بہت بڑی الماری تھی۔ [illegible] ساری دکان اس الماری میں بند تھی۔ [illegible] حافظ محمود کے [illegible] کی طرح [illegible]۔

[illegible] دکان کی [illegible] ساری کی ساری الماری میں [illegible] کتابیں تلاش کرتے [illegible]۔ وہ [illegible] ایک [illegible] کا سلسلہ [illegible]۔

[illegible] الماری میں [illegible] کتابیں تلاش کر رہے تھے [illegible] تمثیل [illegible] سے [illegible] اشرفیاں [illegible]۔ [illegible] رہ گئے۔ [illegible] بیوہ کی [illegible] تھے [illegible]

گیا۔ اماں کی حالت بارش سے شدّ کر شاخوں میں چھپے اس پرندے کی سی ہو گئی جس کے سر پر اچانک اولے آگرے۔ پردادا کا دل چاہا اماں کے گلے چمٹ کے سر پر اولوں کی بارش ہونے لگے اور ان کا سر چاند ماری کے تختے کی طرح زخموں سے اٹ جائے اور جب غرور دس کر اماں کے کوں پہ جھٹکے تو وہ اس غم میں آنکھی ڈولکرا سے شہد کی طرح چاٹنے لگیں

دروازے کے اس طرف دادا کر بجلیاں کوندنے لگیں اور ابا بے خوف سے اپنے گرد سنہری تاروں کا جال بننے لگے۔ برکت بی جتنی تو وہ دھوپ میں پڑی موم کی طرح پگھلنے لگے۔

ایک شام برکت بی بیٹھک کا دروازہ نیم وا کیے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر گلال سا چھڑکا ہوا تھا۔ چنبیلی شانوں پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ ابا اس کے سراپا کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اتنے میں برکت بی کی نظر حاجی رحمت علی پر پڑی اور وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر کوٹھری میں بھاگ گئی۔ ابا کو دیکھ کر حاجی رحمت علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ابا اس غبارے کی طرح جس کی ہوا یکبارگی نکل جائے پچک کے اٹھے اور تھکے بلیوں کا چکر کاٹ کر اندھیری کوٹھری میں صندوق کے پیچھے جا چھپے۔

اب پتہ نہیں وہ حاجی رحمت علی کی دور اندیشی کا نتیجہ تھا یا برکت بی کے جذبۂ عشق کی تاثیر کہ دادی والی جوتے سے گوڑگانی کا گھر اور ایک ہفتے کے اندر اندر برکت بی کو دلہن بنا کر گھر لے آئی۔ حاجی رحمت نے اپنے داماد کو جہیز بازار میں بساطی کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول دی۔

حویلیوں میں رہنے والی دور اندیش برکت بی آڑے وقت کے لیے اپنے جہیز میں ایک چابک چھپا لائی۔ شادی کے ہنگامے ذرا سرد پڑے تو اس نے دال جوتا تہ کرکے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پچھیت والے پچھے کوٹھے کے اندر کھڑی ہو کر تماشے کے طور پر چابک سڑسڑایا۔ دادی نے سر کر بہو کی طرف دیکھا۔ دبے پاؤں اس کے قریب آئی۔ اس کے سر پر دونوں ہاتھ گھما کر اس کی ساری بلائیں اپنے سر لیں اور صندوق کی چابی اس کے سپرد کرتے ہوئے بولی

”بٹیا رانی جُگ جُگ جیو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔“

دادی بچی اُٹھا کر اندھیری کوٹھری میں چلی گئی۔ ابا اس وقت صحن میں تھے۔ انھوں نے سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سنا اور جوتا پہن کر بنا کچھ کہے دوکان پر چلے گئے۔

بساطی کی دوکان سے داستے ابا کے خون میں ... کا ناگ رینگتا گیا۔ اور وہ ... جھنجھنا گیا اور ... ان کی ... جس پر ابا کبھی فدا تھے پھیکی اور زہریلی ہو گئی۔

حویلی والے کچے کوٹھے کے ... کے دو سال بعد میں نے چپل پار آنکھیں کھول کر آ گیا۔ اماں کی آنکھوں میں بے شمار چنگاریاں جل رہی تھیں۔ اس پر بھی وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیں

دادی خوشی سے پاگل ہو گئی۔ وہ پہلی ہوتی تو اتنی ... جب مجھے اٹھا کر گود میں بیٹے کی قندیل سے لے جڑا دیا۔ ابا کی آنکھوں میں ... چنگاریاں اور بھی بھڑک اٹھیں۔

دادی ایسی کمزور دل تھی کہ ایک ہی دھچکے سے مر گئی۔

رفتہ رفتہ اس گھر میں ابا کی حالت اس خط کی سی ہو گئی جس کو پڑھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا ہو اور پھر ایک کھوٹا آیا اور اس

خوب کھلنے لگا۔ ابّا وہ سنہری جال جو کسی زمانے میں بڑے غرور سے اپنے گرد بنا کرتے تھے توڑ کر بھاگ گئے

ہمارے پچھلے گھر میں کئی دالان، کوٹھریاں اور دو چھتیاں تھیں۔ اماں بیچ کو بیچ بڑے دالان کے دروازے میں تخت پہ بیٹھی پکار
تی رہتیں اور زینے میں پڑی پڑی شام تک بیٹھی رہتی۔ ان کی آنکھوں میں کہانیاں کی کہانیاں رہتیں ——— لیکن ابّا کی جیبوں کی نسبت
نہ تھے۔

ایک روز ابّا اچانک گھر آئے اور سیدھے اوپر چلے گئے۔ حویلی کے بعض ایسے حصوں میں ابّا مجھے بہت یاد آتے ہر وقت کوئی نہ کوئی
کرنے میں چھپ کر بیٹھ کر شکار کرتی۔

راتوں کو میں ان کے پہلو میں لیٹ کر چت لیٹ جاتی۔ چھت کی جانب تکتے تکتے اکثر وہ اس نقاشی کا حوالہ دیتے جس پر ابّا کی جھلک پڑتی
جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی میرا چہرہ بھیگ جاتا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنے بڑے ابّا کی جیبی کیسے بجلی اُتر آیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر سلگتے رہتے
ایک مدت تک ابّا کونسل اور کلکتہ کی خاک چھانتے رہے اور جب وہ واپس آئے تو انھوں نے کندھے پر اشرفیوں کا توڑا دھر کھا
تھا۔ پہلی نظر میں تو میں انھیں پہچان ہی نہ سکا۔ ان کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر ان گنت آڑی ترچھی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔
وہ یوں جھکے جھکے چلتے جیسے وقت کا بوجھ کمر پر لاد رکھا ہو۔
انہیں دیکھ کر اماں کی آنکھیں اس شکاری کی طرح چمک اٹھیں جو بار بار بچ کر نکل جانے والا شکار پھر جال میں آ پھنسا ہو۔
ابّا نے آتے ہی پچھلے گھر کی جھٹ پٹ گھر کی بنیادیں اٹھوانا شروع کر دیں اور جب وہ بن کر تیار ہو گئیں تو انھوں نے معماروں سے کہا
"ایک منزل اور بناؤ۔"
انھوں نے ہنس کر اماں کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔
"اماں تو اوپر ہی الگ منزل میں رہیں گے۔"
پہلی بار میں نے پچھلا مکان دیکھا۔ اس گھر میں تو ابّا تھے جو ہر کام میں بچوں کی طرح پہچانا جاتا ——— وہ منزل پر منزل اس لیے بنواتے
جا رہے تھے کہ صحن کے اوپر مینار کے نیچے بساطی کی دوکان سے گزر وہ جائے۔ وہ تک جو بساطی کی دوکان کے سامنے اماں کے دل میں
چھپا گیا تھا کسی طرح بجھ جائے۔
اماں نے زور دے کر ابّا کی طرف غور سے دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی۔
"نوبی رحمی، وہ بھی بد صورت"
وہ پھر کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ ابّا اس پچے کی طرف مبہوت رہ گئے جس کی اڑتی ہوئی پتنگ اچانک ہاتھ سے چھوٹ جائے۔
ایک بات ہمارے گھر میں عجیب تھی۔ ابّا اماں اور ہم تینوں اکلوتے تھے۔ اماں کے دیکھے پڑھے کسی حقے حنائی گھر کی نوعیت
اور یہ تھا کہ دیکھنے ہی کی وجہ سے ابّا کی بیماری اور مظلومیت اس نوکر تک کی سی تھی جو شکاری کے ہاتھوں سے بچ کر رہ گیا ہو۔
شاید میری آنکھیں بھی کسی سبب زرد دھکان کے ساتھ گول گول میری کی مانند تھیں۔ ابّا جب بھی میری طرف دیکھتے سامنے سے شکر سے ایک
طرح چلنا چُور ہو جاتے۔

ماں نے نئے بیاہ کی بات چھیڑی کیا، میری سمجھ میں آ گئی۔ تمکنت سے تمتماتے چہرے پر کھلے گلاب ابّا کے آبگینۂ دل میں بھی جھلملاتے ہوں مگر اصل بات یہ تھی کہ ابّا نہیں چاہتے تھے کہ میں اکیلے پن کی اس دھیمی دھیمی آگ میں جلوں جس میں وہ زندگی بھر جلتے رہے تھے۔ وہ میرے دل کو اس جلاپے سے بچانا چاہتے تھے جو کروٹ کروٹ ان کے دل میں تپتی رہتی تھی۔

میرے ابّا بہت دکھی تھے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے سوچا اللہ کرے رات کو سوتے میں امّاں چپکے سے مر جائے۔

پھر یہ خیال آیا ——— کیوں نہ میں ہی مر جاؤں۔ میری وجہ سے ابّا نے سارے جھمیلوں میں پڑے ہوئے تھے۔ میرے مر جانے سے یہ جھگڑا ہی مٹ جائے گا ——— میں نے جیا پر سے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ چاند نے میرے گرد سنہری تاروں کا جال سا بُن دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ قدم قدم میں گہرائی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا میٹھا پانی میرے سینے کو چھو کر نکل گیا۔ ایک قدم پر موت زندگی سے آنکھیں چار کیے کھڑی تھی۔ اتنے میں دور سے امّاں کی آواز آئی۔ وہ چاند کی ماں کی طرح کسی اندھے کنوئیں میں منہ ڈالے پکار رہی تھی۔

"بالے ——— وے بالے:"

میرا اٹھا ہوا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں ندی سے نکل کر سرپٹ گھر کی طرف بھاگا۔ مائی جیواں کے برج کے قریب دھندلکے میں میری نظر ایک ہیولے پر پڑی۔ میں دوڑ کر اس سے چمٹ گیا۔

"امّاں"

اور اس سے لپٹ گیا۔ لیکن وہ ماں نہ تھی۔ بالو تھی۔ وہ مجھے چھاتی سے لگا کر پوچھنے لگی

"تو نے بالے کو دیکھا ہے کہیں؟"

وہ نہ جانے کس نے اپنے کو آنسو ڈالے پھر رہی تھی۔ میرے جی میں آئی اس سے کہوں ——— میں تو صرف تیرے ہی بالے کو جانتا ہوں ——— مگر میں خاموش رہا اور اس کے بازوؤں سے نکل کر گھر کی طرف بھاگا۔

زرد پھول

وقار بن الٰہی

بڑی مدت بعد یہاں آیا ہوں اور اپنے پرانے دوستوں کو ساتھ لے کر کمرے میں بیٹھا ہوں۔ تم چپ چاپ کے اس طرف دیکھتا ہوں
لگتا ہے جیسے اس جگہ کو میں کل ہی چھوڑ کے گیا تھا۔ یہاں کوئی بھی تو تبدیلی نہیں آئی۔ صرف الماریوں میں کتابیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ کبھی شیشے کے
پیچھے دکھائی دیتے تھے اور اب نئی اور پرانی کتابیں بے طرح ٹھنسی ہیں۔ اس لمبے چوڑے میز پہ بے شمار رسالے ترتیب سے رکھے ہیں۔
میں یہاں چپ چاپ بیٹھا ہوں جیسے اس فضا اس ماحول میں اپنے آپ کو گم کر دوں گا۔ تو وہ دن بھی لوٹ آئیں گے جنھوں نے اس
فضا اور اس ماحول کو جنم دیا تھا۔ الماریوں میں جھانکنا تو بہت دور کی بات ہے، کمرے میں ہر ایک شے کو ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ پہلے میری آنکھیں
بند ہیں۔ پھر انہیں ہاتھوں کے کٹوروں سے ڈھانپ لیتا ہوں اور پھر اپنے ہاتھ بھی ہٹا لیتا ہوں۔ ہم سب جب منتشر محفل میں سے اٹھ جائیں گے
پھر تنہا بیٹھنا پڑے تو وہ وقت کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ سارے قہقہے اب سسکیوں میں بدل گئے ہیں اور سسکیاں
سنائی بھی نہیں دیتی ہیں۔ پھر میں اپنے جسم کو ایک وحشی کی طرح اٹھاتا ہوں اور رسالے دیکھنے لگ جاتا ہوں اور جب بہت پیچھے سے ایک
رسالہ نکالتا ہوں تو جیسے میرا ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔ میری انگلیاں کام کرتی رہتی ہیں لیکن ذہن —— مجھے یوں محسوس ہوتا ہے
جیسے میں کسی وادی میں کھڑا ہوں اور اچانک ایک سرمئی بادل پہاڑ کی اوٹ سے نکل کے دھیرے دھیرے وادی پر چھانے لگ گیا
ہے۔ وادی میں کتنا سناٹا ہے اور ہرے بھرے درخت ڈھلوانوں پر قطاروں میں چپ چاپ کھڑے ہیں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کتنا خوش
ہوتا ہوں کہ ابھی پانی برسنے لگے گا کہ —— رسالہ ہاتھ میں لیا ہے تو وادی کو پر لپیٹ آنے والے بادل کی طرح مجھے ذہن یاد آ گیا ہے
جو میرے ذہن کی کسی آنکھ کو چھو کے میرے سامنے آ گئی ہے۔ اسی میز کے پرے کھڑے کھڑے اس نے کتنی حسرت سے کہا تھا۔

"دیکھو تو —— ہم کتنے شوق سے ان پرچوں کو خریدتے ہیں۔ دو چار ہی روز میں جی بھر جاتا ہے تو انہیں اٹھا کے پھینک
دیتے ہیں اور پھر کبھی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔ یہاں تک کہ اوپر تلے بیسیوں پرچے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اپنی یادوں کو بھی انہی
پرچوں جیسی سمجھو —— یاد بھی ایک دوسرے کے اوپر جمتی چلی جائے تو اچھا ہے۔ نہیں سمجھے تو وقت تمہیں سب کچھ
سمجھا دے گا۔"

اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دکھ اور غم کی زردی میں دھل نکلا ہوں۔ وہ مجھے اب بھی دیکھ رہی ہے۔ میں اس سے
نظر ملا نہیں رہا۔ بار بار پلکیں اٹھاتا ہوں اور پھر جھکا لیتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھتی رہتی ہے اور آخر تھک کے جب اپنی نظروں پر
اعتبار نہیں رہتا کہ وہ اس کے بوجھ کو سہار لیں گی تو وہ گردن جھکا کر چپ چاپ چلتے ہوئے قدموں سے باہر نکل جاتی ہے ——
شہر شہر گھوما ہوں تو وہ درد جو کبھی زندگی سے بھی بیزار کر دیتا ہے، کم ہو گیا تھا۔ شاید یہ دیکھ کے کہ دنیا میں اور بھی غم ہیں اور دنیا

ہی کوئی بھی ڈھنگ نہیں ہے۔ لیکن یہاں کیا آیا ہوں' وہ سارا درد جاگ اُٹھا ہے۔ درد سینے میں ہو تو اُس کی تکلیف اتنی نہیں ہوتی لیکن اگر وہ ہمارے کسی گوشے میں چھپ کے بیٹھ جائے تو پھر وہ نہ جینے دیتا ہے اور نہ ہی موت کو گلے لگاتا ہے۔

بعض کیمرے تھوڑے پیسے تو دیتے ہیں لیکن پھر اُن سے سنبھالا نہیں جاتا۔ تھوڑے عرصے میں وہ سینکڑوں تصویریں بنا ڈالتے ہیں لیکن کام کی اُن میں ایک بھی نہیں ہوتی۔ ناظم بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔ سارے شہر کو برف میں ڈوبا دیکھ کر اُس نے اپنی بلیک اینڈ وائٹ کو نکال دیا تھا اور نئی کلر فلم لوڈ کر کے کیمرا اس شان سے بار بار مڑتا اور اونچی نیچی ڈھال پہ چلنے لگتا جیسے کوئی بہت بڑا سرمایہ اُٹھائے ہوئے ہو۔ سارے شہر کا چکر کاٹ کے جب ہم سرکاری عمارتوں کی سنسان راہوں پر جا پہنچے تو ناظم نے ایک ریلنگ کے پاس ہمیں ایک قطار میں کھڑا کیا اور خود کچھ اس انداز سے پیچھے ہٹنے لگا جیسے وہ ہماری تصویر بنانا چاہتا ہو۔ میں احتجاج کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"خدا کے لیے۔ اگر اُس نے تمہیں ناخن دیے ہیں تو ———" میں نے بڑھ کر کیمرہ اُس سے چھین لیا۔ "چلو کسی بچی کو ڈھونڈتے ہیں۔ اُس کے رنگ اور کپڑے اس پس منظر میں ہمیں اچھی تصویر دیں گے۔ چلو ———" اور میں اُسے گھسیٹتا ہوا پھر اونچی نیچی ڈھال پہ لے آیا۔ پہلے تو ہم دیر تک بھٹکتے رہے۔ اول تو کوئی معصوم چہرہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور اگر کبھی ملتا تو اُس کے رُعب میں غرق والدین کو دیکھ کے ہمت نہ بندھتی۔ ایک جگہ جہاں سڑک کافی چوڑی ہو گئی تھی اور دُکانوں کے سامنے گرجا گھر کا مینار بہت اُونچا ستاروں سے باتیں کر رہا تھا اور بند دکانوں کے سامنے برف کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک بچی نیلا فراک پہنے بڑی کھوئی کھوئی سی نظروں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے پاس ہی دو تین عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک کا لباس سخت بھڑکیلا تھا اور باقی دو جانے کس سوگ میں سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ وہ سب لڑکی کی طرف پیٹھ کیے ریلنگ پہ جھکی جانے پیچھے بند دُکانوں کی طرف کیا دیکھ رہی تھیں۔ ناظم نے مجھے دیکھا۔

"ٹھہرو۔ میں اُس کی ماں سے اجازت لے آؤں ———" مجھے پھر غصہ آیا۔ "مُردار کہیں کے۔ اجازت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کیمرے کو سیٹ کیا اور پھر بچی کے بالکل پاس جا بیٹھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں گھل مل گئی۔ میں نے جو دو چار باتیں اُس سے کیں تو وہ عورتیں بھی مڑ کے دیکھنے لگیں۔ میں نے بچی کی تصویر بنائی جب کہ وہ ناظم پہ برف پھینکنے ہی لگی تھی اور پھر بچی کے گال تھپتھپاتے ہوئے میں نے اُن عورتوں کی طرف دیکھا۔ ایک کے چہرے پر بڑی میٹھی، بڑی لطیف اور پُرترس مسکراہٹ دیکھ کے میں سمجھ گیا کہ یہی اس بچی کی ماں ہے۔

"دراصل ہمارے کیمرے میں کلر فلم تھی اور ———" وضاحت کے دوران میں نے سانولی فطری صورت کو بھی دیکھ لیا تھا۔ شکر ہے ہم نے فقرے کے بالکل آخر میں اُس کی طرف دیکھا۔ ورنہ درمیان میں اٹک جاتا اور وہ میرا مذاق اُڑاتیں۔ اُن کا شکریہ ادا کر کے ہم کتنی دیر ہوٹل میں بیٹھے رہے، پھر ہم ہال سے اُتر آئے، ہم مروت سے اتر آئے لیکن وہ نگاہیں مسلسل متواتر یہ پیچھا کرتی رہیں۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے میں نے کسی ناگن کو قتل کر دیا ہے اور اب ناگن نگاہوں کا روپ دھار کے میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اس وقت بھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ نگاہیں برف کے پانی میں دھل گئی ہیں اور ان میں دُکھ اور غم کچھ اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ [illegible] خوشی کا [illegible] نشان نہ ملتا تھا۔

مُدتوں میں اُن نگاہوں کو ذہن میں محفوظ کیے اور اُس بچی کی کلر ٹرانسپیرنسی جیب میں چھپائے سڑکوں پہ آوارہ پھرتا رہا۔ کون جانے کب کہاں اور کس وقت وہ مجھے مل جائے اور ——— یہ جستجو بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ لگتا ہے یہ بھی منہ کے پانی کا دوسرا نام

ہے۔ پانی ہی بہتا ہے لیکن بار بار مڑ کر آتا ہے اور ساحل سے ٹکرا کے لوٹ جاتا ہے۔ تھکنے کا تو نام ہی نہیں لیتا۔ [illegible] کہ غالب کہ وہ کسی جستجو میں کناروں پر بار بار آتا ہو۔ پھر دل ہی دل میں ہنسا اسے دیکھ کے ہنسنے لگے تو ایک دن میں نے سوچا۔ پاگل [illegible] ' [illegible] ہے کیبن میں بیٹھے اور [illegible] منزل پر تھے سوچا اس دنیا میں جتنے مسافر ہیں بیٹھے ہیں پھر کہاں ہیں سے حقیقت نہیں تو [illegible]۔ زندگی میں ہزاروں لاکھوں انسان پاس سے گزر جاتے ہیں۔ کون کس کا [illegible] ہے ——— تو میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ پر [illegible] اپنے دل اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ وہ لائبریری کی گیلری کے کونے پر بیٹھے ہوئے میں [illegible] اور [illegible] سے ایک کتاب تلاش کر رہا تھا، مجھے افسوس ہوا کہ کوئی لڑکی بالکل میرے ساتھ والی الماری میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ میں نے سوچا کوئی ہوگی۔ [illegible] پڑھتی ہیں۔ مجھے کتاب مل گئی تو میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کتاب بازوؤں میں سنبھالے میں نے فہرست پڑھنے سے پہلے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ وہ کتاب لے کے کوئی صفحہ نکالتے نکالتے رک گئی تھی اور [illegible] سے گردن پھیرے اس نے مجھے دیکھا پھر [illegible] ہیں جیسے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ ہم پہلی ہی نظر میں کسی کو پہچان نہ پائیں اور ساتھ ہی ذہن میں کچھ پہلے کہیں دیکھا ہے۔ اس نے بھی [illegible] مجھے دیکھا اس نے بادِ [illegible] پہچان نہ سکی۔ وہ بڑی بے دلی سے کتاب کے ورق الٹنے لگی جیسے [illegible] اس کی نظریں کتاب کے صفحوں پر جمنے کے باوجود وہاں نہیں ہیں۔ وہ شاید ان راستوں پر دوڑتی پھر رہی ہیں کہ جو انھوں نے پچھلے چند برسوں میں اپنے سامنے ہی اور جنہیں وہ دیکھ کے [illegible] رکھ سکی ہیں۔ پر میں دیکھ رہا تھا کہ کتاب کے جس ورق کو الٹا جس بے صبری سے وہ پانی [illegible] ہیں اور یہ کہ [illegible] گیلری فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔ ورنہ میں اس خوشی کے کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھوں گا۔ اس کی نگاہیں [illegible] [illegible] میں نے کتاب بند کر کے اس سے کہا۔

"آپ افسوس نہ کریں تو میں آپ کو یاد دلا دوں ——— " وہ کسی قدر بوکھلائی کہ میں نے اس کی پریشانی کو شاید بھانپ لیا ہے پھر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ پر وہ مسکراہٹ زبردستی کی تھی۔ اس نے بھی کتاب بند کر دی۔ ساڑھی کے پلو کو درست کیا اور کہنے لگی۔

"سب کچھ غلط ملط ہو گیا ہے۔ آپ ہی یاد دلا دیجیے ——— "

"مری میں ایک ساحل نے آپ کے ساتھ ایک بچی کی تصویر ——— " باقی فقرہ اس کی ہنسی میں ڈوب گیا۔ وہ ہنسی تو اس کے بازوؤں پر رکھی کتاب ڈگمگا گئی۔ ذرا بھی اس نے لپک کے کتاب رکھ دی اور پھر کہنے لگی۔

"میں بھی کہوں۔ یاد کیوں نہیں آ رہا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ بچی کی تصویر تو آپ نے بہت عمدہ بنائی ہوگی میرا ہی جی چاہا " جیب میں رکھی ٹرانسپیرنسی اسے دے دوں۔ لیکن فوراً ہی میں نے بچی کی تعریف میں دو چار جملے کہہ دیے اور آخر میں ہی لیا۔

"اس وقت تو گھر ہے۔ آپ کہیں تو میں پہنچا دوں گا۔ لیکن ——— " اس نے میری بات کہہ لی۔ اپنا پتہ بتایا اور جب چپ چاپ باہر نکل گئی ——— یہ اس نے اچھا ہی کیا" ورنہ وہ چند لمحے اور ٹھہرتی تو میرے پاس بات بڑھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے

... محسوس ہوتا کہ اُس کاغذ میں سے ایک عجیب سی خوشبو چھپی رہتی ہے۔ جتنی دیر میں اندر گیلری میں گھومتا رہا وہ خوشبو میرے چاروں طرف بکھری رہی۔

بس میں بیٹھا تو تحت دانتوں میں چلتے اور کاٹتے ہوئے مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں بس میں سفر نہیں کر رہا بلکہ باغ کی روش پر چل رہا ہوں اس روش کے دونوں طرف گہرے زرد پھول کھلے ہوئے ہیں لیکن بس سے اتر کر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مجھے اتنی تنہائی محسوس ہوئی گویا میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا ذہن اندر پھولوں کی مہک سے بھر گیا ہے۔ آخر کیوں ایسا ہوا کہ اتنی مدت سے ایک عام سی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا ہوں اور فکر یوں تھی جب وہ اچانک مجھے مل گئی ہے تو میں اتنا خوش ہو رہا ہوں۔ بار بار اپنے دل کو سمجھاتا کہ وہ مجھے بس دھوکا تو نہیں دے جائے گی لیکن نہیں اُس نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ مجھے اُس لڑکی کی اُداس صورت پر نگاہیں بہت اچھی لگی تھیں اور بس —— اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں

شام اندھیرا ہونے سے تھوڑی دیر پہلے جب میں گھر سے نکلا ہوں تو میں نے ڈرافٹ پیپر نسیں اور اُس کا چھوٹا سا نوٹ دونوں ایک جیب سے نکال کے دوسری جیب میں رکھ لیے پتہ نہیں کیوں باہر نکلتے نکلتے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں نے اپنے آپ کو دیکھا اور ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ زینی کے [illegible] جب پہنچا ہوں اور گیٹ کھولنے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا ہے تو اچانک برآمدے سے اتر کے پورچ میں سے گزر کے اسی طرف آتی ہوئی دو ہستیوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سوچا جانے کون ہیں یہ لوگ —— اور پھر پتہ نہیں انہیں میرا یہاں ٹھہرا دیکھ کے کیا لگا میں گیٹ کھولنے کی بجائے میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر رعب تھا، چوڑے کچھ بھاری تھے اور گالوں کے اوپر آنکھوں کے نیچے کا گوشت ڈھلک رہا تھا۔ دوسری عورت تھی جس نے اپنے سارے چہرے کو سُرخی اور پوڈر میں ڈبو رکھا تھا۔ اس کی [illegible] سگریٹ تھی [illegible] کش اس نے کچھ ایسے لیا اور دھواں اسی مرد کے چہرے پر پھینک کے زور سے ہنسی اور بازو میں اپنا ہاتھ ڈال کے سڑک پر اتر گئی۔ میں نے ان دونوں کو زندگی کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے۔ کبھی ایسے لوگوں کو دیکھنے کی تمنا نہیں کی جو زندگی کو منہ چڑا کر رہتے ہیں اور جو [illegible] کے مالک ہوتے ہیں اور باوجود اخلاق کے علمبردار ہیں [illegible] سوچا بھی کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں مجھے جواب نہیں ملا تو میں گیٹ کھول کے [illegible] چلا آیا اور [illegible] زیادہ [illegible] آیا۔ سامنے بالکل قریب ہی لان میں تین چار کرسیاں پڑی تھیں اور میز پر [illegible] سامنے پھولوں کی ننھی کلیاں بکھری تھیں میں نے گھنٹی بجانے کے لیے کال بیل پر ہاتھ رکھا۔ اُدھر گھر کے کسی کونے میں گھنٹی بجی اور ادھر کسی نے [illegible] دروازہ کھولا اور زینی باہر نکل آئی۔ میں نے [illegible] روشنی میں اسے دیکھا وہ کچھ سہمی سہمی سی لگ رہی تھی اُس کی نگاہوں میں [illegible] نہیں تھی۔ بس ایسے پیار [illegible] خاموش اور دیاں [illegible] کر [illegible] کر کے اُن کا سارا حسن لوٹ [illegible] دروازہ کھولا اور [illegible] ہنستے ہوئے بولی:

"آپ نے بہت دیر کر دی۔ میرا خیال تھا آپ [illegible]" میں نے [illegible] "ایسا کیا آپ نے [illegible]" میں نے اپنے بازو کے نیچے نرم [illegible] کیا اور صوفے میں اُتر [illegible] جیب پر ہاتھ رکھا [illegible] اس صوفے کو [illegible] کر دینے کے اور موضوع [illegible] ہاں تو تم [illegible] ذرا [illegible] صوفے پر بیٹھی تو میں نے [illegible] کا جائزہ لینا شروع کیا وہاں وہ سب کچھ موجود تھا جو قیمتی سے قیمتی ہو سکتا ہے اور جس کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض

محنت سے مذہب سے بھی [illegible] کیا جا سکتا ہے۔ کمرے میں [illegible] تھی [illegible] میں [illegible] کے بیچ [illegible]
تھا کہ [illegible] نہ تھی۔ مجھے کچھ [illegible] نے [illegible] سے آنکھیں ملانے کی کوشش کی۔

میں جانتی تھی کہ آپ نے تصویر بنائی تھی، وہ میری ایک دوست کی تھی۔ میں اس تصویر کی زیادہ خوبصورتی [illegible]
[illegible] سردی کا [illegible] اور یہاں پہنچتے [illegible] ختم ہو گئی۔ میں نے دوست کو [illegible] تھا کہ وہ آپ سے ملنے [illegible]
کیسا [illegible] ہے۔ نہ کوئی بات سے [illegible] اور [illegible] ہو گیا۔ کمرے میں [illegible] تھی۔ میں نے تصویر [illegible]
دی۔ وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر جب [illegible] گئی تو تصویر اس نے شیلف میں رکھ دی اور خود چائے بنانے لگی۔ میں نے [illegible]
[illegible] چسکیاں لے [illegible] مجھے [illegible] وقت [illegible] تھا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی بات [illegible] نہ ہو سکی۔ البتہ ایک بات میں نے
شدت سے محسوس کی تھی کہ [illegible] میں ایسی کوئی خصوصیت نہ تھی جو اس طرح کے [illegible] میں ہوتی ہیں۔ وہ خوبصورت [illegible]
[illegible] بس عام سی۔ اس میں نہ شوخی تھی [illegible] اپنے آپ کا [illegible] نہ آپ کی دوست کا [illegible] البتہ ایک [illegible]
[illegible] سے [illegible] ہوئے تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنے آپ کو ایک خول میں چھپا رکھا ہو اور [illegible] نہ جانے [illegible]
خول سے باہر نکلنے کو تیار نہیں۔ میں [illegible] کو جا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

• آپ یہاں [illegible] کب [illegible] ہے [illegible] مجھے [illegible] سوالیہ [illegible] کوئی موضوع [illegible] اس سے کوئی بات تو کی۔

• [illegible] ہوں۔ ایک [illegible] کام [illegible] ہے۔ اس کے بعد شاید [illegible] باہر چلا جاؤں۔ بات پھر ختم ہو گئی۔

• آپ یہیں [illegible] ہیں نا [illegible] وہ بڑی [illegible] ہنسی ہنس دی۔ جس میں [illegible] زندگی کی حرارت [illegible] نام کو بھی نہ تھی

• نہیں تو [illegible] مجھے [illegible] تو ایک مدت ہو گئی ہے۔ میری [illegible] دوست کے خاوند [illegible] میں پروفیسر [illegible]
[illegible] کے نام [illegible] سے [illegible] ہوں [illegible] آپ نے اس کے خاوند کو شاید دیکھا ہو۔ وہ [illegible]
[illegible] ہوئے تھے ——

میں نے نہیں دیکھا تھا [illegible] سوالیہ نظروں سے کہ اس کے چہرے کا کوئی نقش ذہن میں نہ تھا۔ [illegible]

خود ہی کہا۔

• وہ وہ [illegible] آپ کو تلاش کرنے اور آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق تھے۔ [illegible] —— میں [illegible]

کھڑا ہوا۔

• مجھے اجازت دیجیے۔ آپ [illegible] میں [illegible] کبھی [illegible]

• [illegible] پہلی مرتبہ میں نے اس کے لبوں پر [illegible] مسکراہٹ [illegible]

[illegible] کے [illegible] چلی گئی اور [illegible] ہاتھ کی [illegible] میں [illegible]
میں [illegible] اور [illegible] ہیں اور اس [illegible] کر [illegible] میں نے [illegible]
[illegible] وہ نہیں [illegible] اپنے [illegible] کے [illegible] قیمتی [illegible]

میں سب سے مختلف تھی۔ بلکہ زینی کو اُن کے ساتھ ساتھ سوچنا بھی زیادتی تھی۔ میں بہت دُور نکل آیا۔ تو مجھے یاد آیا کہ زینی نے یہ بھی کہا تھا کہ "چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بہت سمجھتے ہیں۔ پھر اُس کے چہرے پر اُس کرب اُس سارے گھر پر اتنی اداسی چھائی کیوں ہے؟ آخر ——— لیکن میرے ذہن نے غلطی ہی سے مجھے پکڑ لیا۔ آخر تم کیوں اتنی اہمیت دے رہے ہو زینی کو —؟ پہلے تو میں آ کو کیوں اتنی اہمیت دے رہا ہوں، اس کو ہو نہیں ——— شاید یہی وجہ ہے مجھے اتنی سنجیدگی سے نہیں سوچنا چاہیے۔ ہو گا کوئی غم، کوئی دکھ ایسا کہ جس نے اس بات اس کی زندگی چھا کر رکھی ہے۔ اب مجھے دکھ کا حساب نہیں، مجھے اس سے کیا سروکار۔ کوئی کسی کے دکھ دیکھتا بھی کہاں ہے۔ ہمیں تو پاؤں پڑانے کی جلدی ہے۔ انسان کے دکھوں سے ہمیں کیا واسطہ۔

کو میں نے زینی کو اہمیت نہیں دی تھی اور جیسے اُسے بھول کے میں کام میں مصروف تھا۔ کتابیں پڑھتا تھا، نوٹس لیتا تھا اور رات گئے تک ذہن سے اپنے موضوع کو آگے بڑھاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا تھا، لیکن جب بھی لائبریری یا چراسی گیلری کی طرف جاتا تو مجھے یہی محسوس ہوتا جیسے میرا ذہن کا لب اور وہ مجھے یہیں آملے گی۔ یہ موہوم سی امید تھی جو ٹوٹنے میں نہ آتی تھی۔ پھر جیسے یہ بھی ٹوٹ گئی اور میں بڑا بے نیاز ہو گیا۔

اس دوران میں نے ایک روز اچانک ہی ایک شخص کو پروفیسر صاحب کے کمرے میں بہت حلقا دیکھا۔ یہ وہی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو زینی کے گھر سے نکلتے ہوئے پایا تھا اور جسے سڑک کی روشنی میں دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور گرد و غبار شکستہ جسم جھکا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ سامنے چند کمی تھی اور ان کو چھپانے کے لیے وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی، یہ کافی اور ——— پاؤں بھی ٹیک پہ میں لا دی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ اور ہونٹ بتا رہے تھے کہ پیچ میں کی انہی بھول بھلیوں میں اُسے بُری طرح نچوڑ لیا گیا تھا۔ میں نے صرف اتنا ہی سوچا کہ آخر یہ کون شخص ہے اور پھر سے لائبریری میں جا کے کتاب کے ورق الٹنے لگا۔

گرما کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھلی تو میرے ذہن سے سارا غبار اور ساری تھکن دُھل چکی تھی۔ ان چھٹیوں میں، میں بہت بار مری دیکھنے گیا تھا۔ وہ جھرکی انارکلی اور مال کے ہجوم میں پھر رہا تھا۔ کافی ہاؤس میں بیٹھ دوستوں کے ساتھ ہر لطیفے پر قہقہے لگاتے تھے۔ نیم عریاں انگریزی فلمیں دیکھی تھیں اور ——— جیسے ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا اور اب میں وہی احمد تھا جسے تھیسس لکھنے تھے اور جو ہر وقت طالب علم بنا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کھلنے کے بعد تیسرے یا چوتھے روز کا ذکر ہے کہ میں آنے کو تو آ گیا تھا لیکن دل میں لائبریری میں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رات بہت زیادہ بارش ہوئی تھی اور صبح سے اس قدر تیز ہوا چل رہی تھی کہ کمرے برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں کچھ بور بھی ہو رہا تھا۔ اپنا کام تو میں نے تقریباً ختم کر دیا تھا۔ چند صفحے ہی رہ گئے تھے اور وہ دو چار دن میں لکھے جا سکتے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کام آیا تو یہ نے فراغت کرنے لگ گیا۔ نہیں میں تو قدم اٹھاؤں ادارہ کی طرف بڑھا لیکن ——— زینب کا ہی کرنے کے پاس نہیں لگا رہی تھی۔ چپ چاپ ——— سے قدم رک گئے۔ اُسے دیکھ کے میں حیران ہوا۔ درمیان کے سارے دن غائب ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسا اپنے تھیسس لکھا دیتا اب یوں کہ میں زینی کو اہمیت نہیں دے رہا۔ میں مسلسل اُسے تلاش کرتا رہا ہوں۔ میں نے جیسے کتنے کرشمے سے جیا تھا اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ کہ وہ کسی طرح سامنے آنے کا نام نہیں لیتا۔ زینی اداس اداس تھی اور خاموشی پر قسمت پر سکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے کھوئے کھوئے پن کی جگہ سکون بستا تھا۔ آنکھوں میں بھی بڑی شناسائی تھی۔ میں نے چونک کے اُس سے پوچھا۔

کب تک جو زینی ——— وہ خود بھی فرش پر بیٹھ گئیں۔

ابھی چند لمحے پہلے ——— تم بے حد مصروف تھے۔ میں نے سوچا تمہیں ڈسٹرب نہ کروں ——— میں نے اجنبیت کو ختم کرنے کے لیے مسکرانا ضروری تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا تو وہ جسیسی کی باتیں کرنے لگے۔ اس سلسلے میں ... نے ... کیا کہ زینی سب کچھ اس حد تک ... ابھی اس ... ہی اتنا اہتمام ضروری ہے کہ وہ جلد پہنچ جائے ... کا احساس ... نکھر کر سرخ پھولوں کے ساتھ کیا سفید پھول ایسی لگتی ہیں۔ وہ دلہن بہار کی ... ہے اور دلہن کا ... ایک ... ہوتا ہے۔ نہ جانے کس طرح آ چلتے چلتے خوشیوں تک ... زدہ کئے ہو۔

قصور ہمارا اپنا ہے۔ ہم خود ہی خوشیوں کو رد کر دیتے ہیں۔ ہم سے ... زندگی ... ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو گنی چنی ہوتی ہیں۔ لیکن ہم ان کا احساس نہیں کرتے اور جنہیں حاصل کر سکتے ہیں انہیں ہم گنوا بیٹھتے ہیں۔ جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہمیں جیسی خوشی میسر آ سکتی ہیں ... سے فوراً ... کر دامن بھر لیں۔ سچی بات ہے نفسیات کا میں طالب علم رہا ہوں اور نہ کبھی میں نے مطالعہ کیا ہے۔ پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زینی کے اس پوشیدہ ... تمام ... کی ... اور دلچسپی ہوتی ... اس کے ... کا ... کیا ہے۔ میرے دل نے فوراً ہی مجھے ... کی کوشش کی کہ یہ تمہاری خوش فہمی ہے لیکن اس بار میں اس کے دھوکے میں نہیں آیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ زینی بھی وہ جانے کس طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے موضوع کو بدل دینا بہتر سمجھا

کون سے مصنف تمہیں پسند ہیں زینی ——— ؟

میں نے صرف ... کے ابتدائی دور سے بہت ... شروع کی تھی اور ... میں ... مصنفوں میں ... نہیں جاتی۔ مصنفوں کا انتخاب تو بہت دور کی بات ہے۔ جس کی کتاب سامنے آ جائے، اسی کو پڑھ لیتی ہوں ——— پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

مجھے خاصی دیر ہو گئی ہے۔ میں چلتی ہوں۔ زندہ منتظر ہوں گے ——— میں اسے لائبریری کے دروازے تک چھوڑنے وہاں گیا

اس روز میرا کیبن ... سے اٹھنے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا۔ پھر بہت دیر ہو گئی اور مجبوراً اٹھنا پڑا تو جانے کہاں سے یہ سوال چپکے چپکے آتا ہوا میرے سامنے آ گیا کہ میں کہیں زینی سے محبت تو نہیں کر رہا۔ یہاں پھر میرا ذہن مجھے چھلنے لگا۔ نہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں البتہ اس کی شخصیت سے انس ضرور ہے اور وہ بھی شاید اس لیے کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اسے کون سا ذہنی دکھ ... ہے جس سے وہ ہنس نہیں سکتی۔

زینت سے اس کے بعد میری ... جلدی جلدی ہوا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں نے زینی کے کہنے کے خلاف ... کو کم کر لیا ہے۔ جیسے میں نے جان بوجھ کے ایک زخم کھایا ہے اور ... کر لیا ہے کہ زینی ملے گی تو خوش ہو کر ہنسا دوں گا ... کی ... ہمیشہ کے لیے ہنسنا سکھلا جاؤں گا۔ لیکن ... تھی۔ مجھے لگتا تھا زینی زینی نہیں ہے بلکہ گلاب کا وہ پودا ہے جسے میں نے شب پانے ایک گملے میں لگا ... اپنے کمرے کے دریچے میں رکھتا تھا کہ اسے ہوا اور دھوپ ملتی

پھر وہ اُسے پانی دیا تھا، ہر روز اُسے دیکھتا تھا۔ بلا بستر سے اُٹھ کے میری آنکھیں کھلتی ہی وہاں تھیں لیکن وہ پودا تھا کہ اُس پر کوئی سبز شاخ نکلتی ہی نہ کوئی پتا پھوٹتا ہی نہ تھا، کوئی کلی نہ تو ہی نہ کوئی پھول کھلتا ہی تھا۔ میری ریاضت کے باوجود وہ ہمیشہ ہی خشک رہا۔ پھر میں ہی چاہتا تھا کہ اُسے اُٹھا کے باہر پھینک دوں۔ زینی کو ہر مرتبہ مل کے مجھے وہی پودا یاد آیا۔ آہستہ آہستہ یقین سا ہو گیا کہ زینی کی شاخوں میں کبھی کوئی کلی نہیں چٹکے گی۔ اُس کے گالوں پر کبھی گلاب نہیں کھلیں گے۔ اس زردی کی بجائے اُس کے چہرے پر کبھی سُرخی نہیں آئے گی، کبھی نہیں ——— اُس روز کے بعد میں پہلی مرتبہ تو اُس سے پروفیسر حامد کے ہاں ملا تھا۔ حامد کی بیوی بڑی عجیب عورت تھی۔ میں نے زندگی کی تصویر ہی بنائی تھی اور اب میں خالی ہاتھ اُن کے ہاں گیا تھا لیکن اُس نے استقبال کچھ یوں کیا تھا جیسے میں اُس کی بچی کے لئے آیا ہوں۔ اُن کے بچے سے ملاقات کے بعد شاید تک ڈرم میں ہم اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ سورج کی اوداسی کرنیں سامنے دیوار پر سے ہٹ کر غائب نہ ہو گئیں۔ مجھے یاد ہے، زینی نے ہنستے ہنستے اپنی انگلیوں سے پلکیں، اپنی آنکھوں کو گرا کے نیم گرم، نیم سرد آواز میں کہا تھا۔

"یہی تو بات ہے کہ انسان ہمیشہ ہمیشہ محروم رہا ہے۔ وہ بنیادی حقیقت کو مانتا ہی نہیں کہ وہ تو ایک کھلونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی خوشی مل گئی تو جنس ہے، نہیں تو دُکھوں کی دلدل اور دُکھ ہی اُس میں دھنس کے نیچے جاتا ہوا انسان ——" پھر اُس نے پلکوں کو اُٹھایا۔ میں گھبرا کے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن مزہ تو جب ہے کہ یہ خوشی وہ خود چھین لے ——" پروفیسر نے گردن پھیر کے مصنوعی حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"واہ گڑیا ——— تُو تو بڑی گہری باتیں کرنے لگی ہے۔ یونیورسٹی تو تمہیں فلسفے کے چکر دار کے پاس چھوڑ آؤں لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ انسان چھین کے ہی خوشیاں حاصل کرتا ہے۔ کوئی پکی آپ اُس کی گود میں نہیں آ گرتیں ——" زینی نے کہا کچھ بھی نہیں، صرف مسکرا دیا لیکن پھر بھی جیسے وہ کہہ گئی ہو "مطمئن زندگی گزارنے والے پروفیسر تم کیا جانو ———"

وہاں سے نکلنے کے ہم باہر لان میں ٹہلتے رہے پھر گیٹ پار کر کے فٹ پاتھ پر چلنے لگا تو جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے یہ احساس ہونے لگا جیسے میں ——— میں نہیں ہوں۔ اپنی کوٹھی کے سامنے زینی نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی لیکن میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر معذرت کی اور سیدھا چل دیا۔

دُوسری اور تیسری مرتبہ بھی وہ مجھے ملنے آئی۔ دونوں مرتبہ کافی ساتھ لائی تھی۔ وہیں گیلری کے نزدیک، سفارش پر بیٹھ کے اُس نے جب ٹیبل کافی کی پیالی اور تھوڑے سے نمکین بسکٹ سامنے رکھے تو زینی نے اُس سے کہا۔ "تم نہیں پڑھتی کیا ——؟"

"میں گھر پہ رہتی ہوں اور پھر ——— تم سارا سارا دن ان کتابوں سے اُلجھتے رہتے ہو، تھکتے بھی تو نہیں۔ پتہ نہیں تم نے کتنی مدت سے کیسے گزار دی ———" پھر تھوڑی دیر رُک کے اُس نے کہا۔ "کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے ان کتابوں کو جلا دوں۔ ہزاروں لاکھوں انسان جانے زندگی ہمیشہ چھپا دیتے ہیں لیکن ——— مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔"

"اتنی انتہا پسند نہ بنو ———"

"میں انتہا پسند نہیں ہوں بلکہ وہ کتابیں کس کام کی کہ جو انسان کو کچھ بھی نہ دے سکیں۔ ہم کتابیں پڑھتے اسی لیے ہیں کہ ہمارا

ماہیوں پر چاند کی چاندنی پھیل رہی ہے۔ شدید ہونے لگیں ——— تم تو یوں ہی بہت سے بجھ کر رہ گئے ——— اس
نے یہ بات بہت دھیمے سے کہی اور خود ہی ہنس کے رکھ دی۔

• تمہیں سب، اس کا علم تو ہو گیا ہو گا کہ میں آتا ہوں اچھی طرح سے بیدار ہوں۔ وقت ہوں — یہ سب کچھ یہ کیا۔

نہیں۔ اس کا علم تو مجھے ایک حد تک ہے۔ وہ دو کمرے بنتے ہیں لیکن پہلے بات کا تعلق کیا جذبہ و عدہ
جیسے شعلہ، یہ دو قدم سے پھیلا ہوا کمرہ جیسی تھی کچھ نہیں تھی تو ہم نے ذہن میں ———

• کیا کام ہو گیا ہے تمہارا۔ میں تو اب اس حالت سے تنگ آ گئی ہوں —

• کوئی بات زیادہ نہیں۔ تقریباً ختم کر چکا ہوں۔ البتہ اسے ٹائپ کرانے کی مصیبت باقی ہے۔

گیلری سے نکل کے ہم دونوں یونیورسٹی کے ونڈو میں جانے تو پیدا ہو جاتا، ایک بوجھل تشکیک پیچھے سے اس کے بالوں میں الجھا دی۔ لیکن میں بہت دیر تک ... پھر میرا ذہن بھی تو شیشوں کا کارخانہ ہے نا۔ یوں ہی دھڑا دھڑ سوچے جا رہا تھا۔ زینی چلی گئی تو ونڈ کی چھت پر بیٹھے میں نے سوچا، وہ تو واقعی بہت خوش تھی ——— لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ذہن نے اس کی تردید کی۔ وہ تو پہلے کی طرح اداس لگ رہی تھی۔ خوش کہاں تھی۔ ضرور اس سے کچھ دکھ چھپ گیا ہے اور جب کچھ چھپ جائے تو پھر خوش ہونا تو ———

پھر زینی دو روز مسلسل تو میں آخری مسودہ رکھ رہا تھا۔ اس روز بھی ہم نے کافی پی، باتیں کیں، میں جان بوجھ کے اس سے جلدی سے نکل آیا۔ کہا اور اسے جیسے میری خاطر ہنستی بھی رہی اور جب چلی گئی یہ کہتے کہ اس کے ڈیڈی کی طبیعت اچھی نہیں ہے تو میں گیلری میں بیٹھا رہا۔ پہلے میں کافی کے انتظار میں رہا، وہاں پھولوں بیٹھا ان خوبصورت پھولوں کو دیکھتا رہا جو چاروں طرف کھلے ہوئے تھے سرخ سرخ پتیوں کا حسن نئی دلہن کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ چند لمحے تو میں آنکھیں چراتا رہا کہ ان کے رنگوں کی شوخی جیسے میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی لیکن پھر میں ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگا جیسے پھولوں نے مجھ سے التجا کی ہو کہ وہ مجھ سے چند لمحے آنکھیں چار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دو روز بعد جب ان کی کلیاں بکھر جائیں گی اور گزرنے والوں کے قدموں سے پامال ہوں گی تو کوئی ان کی طرف دیکھے گا

لیکن وہاں مجھ سے نہیں بیٹھا گیا۔ سڑک سے اترتے ہی کافی ہاؤس گیا۔ وہاں پہروں بیٹھا رہا لیکن ایک عجیب سی سنسنی، ایک عجیب سی سردی میرے سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔ جانے کیوں؟ میں نے اس کی وجہ دریافت کرنا چاہی تو دل پکار اٹھا۔ میں تم سے کہیں محبت تو نہیں کرتا —— ؟ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں پیالی میں پڑی کافی کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے زینی کے چہرے کا عکس وہاں موجود ہے۔ وہاں سے گھبرا کے نگاہیں ہٹا کے دیوار پر دیکھتا ہوں تو مجھے وہی کچھ دکھائی دیتا ہے۔ وہی چوڑی پیشانی پر بولتی ہوئی آنکھیں، سرخ چھوٹے چھوٹے ہونٹ اور گھنی پلکیں اور

دو روز لائبریری نہیں گیا۔ لیکن تیسرے روز جاتے ہی لائبریرین سے ہی پوچھا کہ کوئی ملنے تو نہیں آیا مجھ سے ——— در حقیقت اگر زینی نے مجھے نہ دیکھا ہو گا تو کہیں وہ یہ نہ سوچ بیٹھے کہ میں اپنے آپ سے شکست کھا گیا ہوں۔ لیکن زینی نہیں آئی تھی۔ اس سے دو روز بعد بھی نہ آئی اور میری وہ چند سطور وہ ادھوری رہ گئیں۔ کئی مرتبہ میں نے کوشش کی کہ نہ پڑھوں لیکن کسی کتاب کی ——— ——— چند سطور پڑھ ڈالوں۔ لیکن صرف دیکھتے ہی کتاب بند کر ڈالی ——— پھر جب زینی دس روز تک نہ آئی

اس کے بعد بار بار شیلف خالی کر کے تھک گیا اور کسی نے کال کا جواب نہ دیا تو جیسے میری نیند ٹوٹنے لگی۔ جیسے میرا خمار اترنے لگا، ایسا خمار جس نے میرے ذہن کو چکنا چور کر دیا تھا۔ میں نے دو موٹی کتابیں زمین پر رکھیں۔ ایک کتاب لے کے بیٹھ گیا۔ نظریں کتاب پر تھیں لیکن میں سوچ رہا تھا۔ میں یونہی بھٹک گیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ زینی مجھے دوست سمجھتی ہے اور اسی طرح ہمیں کئی دوست ملیں نہیں ملتے۔ زینی نہیں ملی تو کیا ہوا۔ مجھے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہو نہ ہو بات ہی کوئی سی ہے۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں کرنٹ مالی اور کتاب زیادہ انہماک سے پڑھنے لگا لیکن ——— صرف ایک پیرا ہی پڑھ سکا تھا کہ میں نے پھر کتاب پٹخ دی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں جھٹ اٹھ بیٹھا۔

"کہیں زینی تو نہیں آگئی ———؟"

لیکن وہ ایک چپراسی تھا جو الماری سے کتاب نکالنے آیا تھا۔

پھر بہت دیر کی بات ہے۔ یونیورسٹی بند ہونے ہی والی تھی اور میں اپنے تھیسس صرف پڑھ رہا تھا کہ ایک روز زینی اچانک آگئی۔ اس کے بالوں میں سفید سفید تازہ کھلے پھول تھے۔ کپڑے سادہ تو تھے لیکن ان میں سے دھیمی دھیمی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اہتمام ضرور تھا لیکن اتنا ہی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بھٹک نہ سکے۔ لیکن میں اس اہتمام سے زیادہ اس کے مزاج کی نفاست کہوں تو درست ہوگا۔ جیسے ہنس کے اس نے کہا۔

"میرا خیال تھا، تم مجھے یہاں نہیں ملو گے کہ تمہارے تھیسس تو کب کے مکمل ہو چکے تھے۔" میں نے فوراً اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ میری کمزوری کو تو نہیں بھانپ گئی۔ کہیں وہ طنز تو نہیں کر رہی پر اس کا چہرہ تو اس کا بالکل ساتھ دے رہا تھا جیسے سچ مچ نہا گئی ہو۔ میں نے چاہا، اس سے اتنے روز نہ آنے کا شکوہ کروں۔ میں نہیں کر سکا۔ میں نے چاہا اس سے پوچھوں، تو سہی کہ وہ اتنے روز آئی کیوں نہیں، میں نہیں پوچھ سکا، میں نے چاہا، اس سے اپنی ساری بے تابی کہہ دوں، میں نہیں کہہ سکا صرف اتنا پوچھا۔

"تمہارے ڈیڈی کیسے ہیں زینی ———" اس کے چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدل گیا لیکن تبدیلی بالکل ایسی ہی البتہ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے ناخنوں سے سیمنٹ کے پختہ فرش کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی

"اب تو تندرست ہیں ———" میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا۔ میں کیوں نہ اس کے ڈیڈی کے بارے میں پوچھوں۔ میں نے آج تک کچھ بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی اس نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کیسے ہیں۔ پر پھر میں نے سوچا۔ مگر یہ اس سے سوال کیا ہوگا تو جانے وہ کیا سوچے، مجھے مطلب تو زینی سے ہے، اس کے ڈیڈی سے تو نہیں۔

مجھے اس روز یہ شدت سے محسوس ہوا کہ واقعی، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ مناسب نہیں ہے۔ اب زینی آئی ہے تو میں بے حد خوش ہوں۔ میں پچھلے دنوں کی اپنی حالت، اپنا کرب سب کچھ بھول گیا ہوں۔ بس اطمینان سے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اس سے باتیں کر رہا ہوں۔ زینی نے مجھے کچھ اپنا چپ چاپ سا ہی پوچھا۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟ ذرا بتاؤ ———" اس کے چہرے کو دیکھ کر اور اس کے لہجے کو محسوس کر کے مجھے دھچکا سا لگا۔ کہ یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کے چہرے پر امید کی کرن سی جھلک رہی تھی لیکن ——— پتہ نہیں کیوں میں نے جھٹ سے کہا، اتنی اہمیت دینے لگ گیا تھا۔

[illegible] بات بھی نہیں۔ پہلے صرف تھا، باہر چلا جاؤں۔ پر اب یہ بھی نہیں چاہتا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی [illegible] اُف ہے۔ شاید میں بیٹھنے کے بعد کسی نہ کسی کو تو قبول کروں گا اور کرنا بھی کیا ہے مجھے ——!"

"دوسرے الفاظ میں تمہارا مستقبل طے ہو چکا ہے ——"

"یہی سمجھ لو۔ گو میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن فی الحال اسے ہی غنیمت سمجھتا ہوں ——" اچانک زینی کے چہرے پر چاندنی کی سی معصوم خوشی بکھر گئی۔ اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں، پر وہ اداس مسکراہٹ، وہ تنہائیوں کا سوگ کا سا عالم اس سے چھپایا نہیں گیا۔

"بہت اچھا ہے۔ یہ جان کے بڑی خوشی ہے۔ لوگوں کو یوں اپنا مستقبل بناتے دیکھ کے مجھے بڑی ہی خوشی ہوتی ہے۔ ورنہ میرے نزدیک زندگی اتنی سستی بھی نہیں کہ اسے بھیک مانگتے اور بے نام سی تمناؤں کے سہارے کاٹ دیا جائے۔ تم پہلے جاؤ گے تب بھی مجھے خوشی ہوگی۔ تم کہیں پروفیسر وغیرہ ہو جاؤ گے۔ کم از کم اپنی زندگی تو اطمینان سے کاٹ سکو گے اور یہاں دنیا میں اتنا ہی بہت کچھ ہے"

زینی کے ان فقروں میں ہو سکتا ہے کوئی خاص بات، خاص اشارہ چھپا ہو۔ لیکن مجھے دُور کہیں ذہن کے کسی گوشے میں کوئی شے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ مجھے لگا جیسے ایک ٹیس سی اُبھری ہو اور اس نے پل پل چاٹ دی ہے اور اس پل نے مجھے خفا بھی محسوس کر دیا۔ مجھے پہلی بار شدت سے محسوس ہوا کہ میں ہار چکا ہوں اور شکست کے بل اس طرح گرا ہوں کہ شاید کبھی نہ اٹھ سکوں

زینی اس روز کچھ زیادہ ہی خوش تھی لیکن کم از کم میرا احساس یہی کہتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ دیر تک بیٹھی رہی لیکن میں مشکل سے کوئی بات کر سکا اور جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو وہ اپنی ہنسی کی جھلملاہٹ کو اُس خاموش کمرے میں چھوڑ کے چلی گئی۔

سڑکیں پہلے ادھر کے 'کافی ہاؤس' میں ذوب کے اپنے آپ سے شدید جنگ لڑنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں میں نہیں جانتا کہ زینی کون ہے، وہ کیا ہے، اسے کون سا دکھ ہے اور اس خول کو توڑ دیا جائے تو حقیقی زینی کیسی ہوگی لیکن اس کا قرب حاصل ہے۔ اس کا خیال میرے ذہن میں ہو تو وہ میرے لیے تسکین کا سبب ہے اور اس کے بغیر زندگی جیسے دوپہر کی دھوپ ہے۔ جسم کو جھلسا دینے والی تیز دھوپ۔ اس کے بعد وہ ایک شام اچانک تو سڑک پر مل گئی تھی اور ہم کچھ دیر کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے لیکن وہ بہت کھوئی کھوئی سی رہی جیسے شناسائی دو چار روز کی ہو۔ وہاں سے اٹھ کے میں دور تک اس کے ساتھ آیا اور پھر شہر کے نسبتاً خاموش علاقے میں اس کے گھر کے قریب جا کے وہ مجھ سے رخصت ہو گئی تو میں سڑک کے کنارے ایک کھمبے کا سہارا لیے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے قدموں کی چال میں قطعاً کوئی لڑکھڑاہٹ نہ تھی، بڑی متوازن چال تھی۔ جیسے اسے کوئی غم کوئی فکر نہیں۔ وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی اور میں سڑک کے کھمبے سے لگا کھڑا ہوں تو میرے ذہن نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ اب جب بھی زینی مجھ سے ملے گی، میں اس سے سب کچھ کہہ دوں گا کہ زندگی میں تماشا بنتے ہم خود ہی اپنی خوشیوں کو بھٹکاتے ہیں اور پھر تمام عمر خود ہی بھٹکتے ہیں۔

لیکن زینی کا [illegible] بند ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں ملی۔ پتہ تھی اور مختلف موضوعات پر کام کرنے والے طالب علم آتے جاتے تھے [illegible]

بس اس کا دل بھی تو فن ملا تھا۔ میرا موضوع ٹائپ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے اس کی جلد کی فکر کرنا تھی۔ اور پھر تھیسس فیس کے ایک ٹ دو سنی یونیورسٹی میں پہلے جاتا تھا۔ بہار کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ یونیورسٹی کھل گئی لیکن اب زری گرمی پڑنے لگی تھی۔ لانز میں پھول اب بھی تھے لیکن ان میں وہ شوخی نہ رہی تھی۔ جگہیں وہی رہتی ہیں لیکن وقت نہیں رکتا، گزرتا چلا جاتا ہے۔ ان سارے دنوں میں زینی کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ ہوسٹل سے کچھ پوچھ لیتا تھا، کبھی کبھار ٹیلی فون بھی کر لیتا تھا لیکن پھر بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ آخر ہے کہاں۔ صرف ایک روز جب میں نے ٹیلی فون کیا تو کسی نے چونکا دینے والے سخت لہجے میں بیٹھ کہا تھا اور پھر میری ہمت نہ پڑی کہ پوچھوں۔ جملے سے پونچھا کر دیا اور فون رکھ دیا۔

پھر اس دن جب میں تھیسس جمع کر کے لائبریری میں بیٹھا اور اس میز پہ جیسے سال سے صرف سرورق پڑھنے لگا تو پہلے کی طرح میرے پاس ہی زینی آ گئی۔ اس نے ویسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بالوں میں سفید پھول اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ میرے سامنے بیٹھ کے اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"میرا تو خیال تھا تم اطلاع دیے بغیر ہی چلے گئے ہو گے۔ آج صادق کو فون کیا تو پتہ چلا کہ تم ابھی تک یہیں ہو۔ ادھر تم تو بہت پکے ہو چکے ہو۔" دراصل جذبات نے ایک ساتھ مجھ پر یورش کر دی تھی اور میں مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کونوں کے کونے سے مجھے دیکھا اور پھر چپ چاپ سر جھکا کے ایک پرچہ اٹھایا اور ورق الٹنے لگی۔ لیکن اس کی اندرونی بیتابی تو اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میں جو ابھرا ہوں تو پھر ایک طوفان کی طرح سب کچھ کہہ گیا

"تم آخر اتنا بنتی کیوں ہو زینی۔ تم مجھ کو آزار کیوں نہیں دیتیں۔ تمہیں بتاؤں تمہارے دل میں کیا ہے؟ لیکن ٹھہرو، پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟" میں اس سے سب کچھ کہہ گیا سب کچھ ——— زینی پہلے پرچہ دیکھتی رہی اور ورق الٹتی رہی پھر اس نے پرچہ بند کر دیا۔ اور اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا لیکن اتنی دیر میں اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ان پھولوں کی طرح جو اس کے بالوں میں تھے۔ تب کانپتے ہاتھوں سے اس نے میرے ہاتھ دبا کر چٹکیاں لیں۔ پھر اپنی انگلیاں چٹخائیں اور ہنس دی۔ بڑی پھیکی ہنسی تھی اس کی ——

"تم نے جو کچھ کہا ہے وہ میں بہت ایک مدت سے جانتی ہوں۔ میرا خیال تھا تم کوئی نئی بات کہو گے لیکن ——— تم نے اگر میری صورت میں کچھ پایا ہے تو ——— مجھے تمہاری صورت میں سب کچھ مل گیا ہے۔ لیکن میں نے تم سے کہا نا، یہ میرے اوپر جو تمہیں موسم خزاں کا ایک غلاف دکھائی دیتا ہے اسے وقت نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ اس کے نیچے بچی زینی کچھ کرنے کی کوشش کرے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ کرنا چاہتی بھی نہیں۔" مجھے یقین ہے کہ کوئی دن ایسے ہی لیکن اب یہ وہ مشکل سے کہہ سکی کہ کہاں بیٹھی ہے۔

آہستہ آہستہ اس کی حالت درست ہوتی گئی۔

"تم میرے ذہن سے واقف نہیں ہو۔ تمہیں جو ابھی نہیں چاہیے۔ تھا۔ اور تم سے تھا تمہیں تم نے میری باتوں کو سنا نہیں تم خود اپنے آپ کو کہے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وقت جو گزر گیا ہے اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ خوشی کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو، کچھ نہیں۔ کو وہ چلنے لگا تھا سے سوچتے ہو۔ سوچتے وہ بھی ختم ہو جائے۔ ہم دونوں نے چند لمحے ایک ساتھ گزارے ہیں۔ ہمیں اسی خوشی سے

[illegible] سمجھ کی فقط ضرورت نہ تھی کہ ہم ... کا اعتبار ہے۔ بس تم نہیں سمجھ سکتیں [illegible]

... تم نے کیا [illegible] کی دوستی بن نہیں پائی تھی ——

میں سادہ دل اور سادہ ہوں ——— تم ذہین ہو۔

• دیکھو پچھلی رات میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نے کسی بات پر ایک مرد کی محبت کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر تو تم ہمیں بتا رہی تھیں ... وہ میرے ڈیڈی تھے۔ ان کے ساتھ آپ کے ساتھ جو محبت تھی وہ ایک مشہور مثل ہے کہ ... جو محبت تم نے دیکھی۔ وہ ایک بہت گہری ... ہے۔ ایک وہ بات نہیں ——— سنو! میرے ڈیڈی شراب پیتے ہیں اور شہر کی سیکڑوں عورتوں سے تعلقات رکھتے ہیں، ہماری سوسائٹی کی ... ——— ۔" اس نے ... کا ذکر ... تھا اور میں ایک ... دیکھنے کے لیے کہ میری ... اس کا ... ہے ... چپ چاپ سن رہا تھا۔ اس کے ... اس کے چہرے کا رنگ ... تم ذہین ... تم ... سامنے ہے۔

• اصل میں میرے ڈیڈی کو ... نہیں ... تم نہیں سمجھ سکو گے۔ ... نہیں ... تو وہ ... ہیں جو ... میری ماں ... ہر شام وہ کلب جاتی ... تھے۔ مجھے پچھلی ایک ... اس ... کہ جب میرے ڈیڈی کا علم ہوا کہ میری ماں کے تعلقات کچھ ... ہیں۔ ... اکثر کے ... میں اس ... پھر ایک ... وہ اس ... کر وہ گھر سے باہر جانے لگے تھے ... میری ماں کا اپنے ... ایک دوست ... تھیں ... دیکھ ... تو ... ——— دوسری بات ... میری ماں ... ایک ہی چارپائی پر ... تھیں۔ ڈیڈی واپس نہیں آئے تھے۔ ... ماں نے مجھے ... کہا اس ... اور ... جاگتی رہی تھی۔ میری ... تو سارے کمرے میں اندھیرا ... تھا۔ میں نے ماں کی چیخ سنی تھی، ... میں ... چیخ ... پھر اس اندھیرے اور چیخ نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ میرے حلق سے آواز ... نکل ... میں اندھیرے میں ... جاگتے جاگتے سو گئی۔ دوسری صبح جو اٹھی تو سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ میری ماں اور ... دونوں مر چکی تھیں۔ ماں نے میرے ڈیڈی کی ... دونوں کا گلا گھونٹ ... تھا۔ ... میرے ... بہت ... افسر ہیں، انہیں کسی نے کچھ نہیں کہا ... ——— وہ بات ... نہ ہوتی ——"

• تم ... محبت ... کہ ... ہے لیکن ... کہا جائے تو وہ ... میرے ڈیڈی نے پھر شادی نہیں کی۔ ... نے بتایا تھا کہ وہ ... کرتے ہیں ... ایک ... کے ... سے ... کہیں ... نہ جائے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ہر شام میں نے ... دیکھا ہے ... ہر شام ... کے ساتھ نئے نئے چہرے دیکھتی ہوں۔ یہ چہرے سب کے سب ... ہیں کہ ... چھپا ... میرے ... ہوں۔ یہ چہرے ... کے ساتھ ... شراب پیتے ہیں ... کے ... کا ... وہی بات ... آتے ہیں پھر اندھیرا ... ہے۔ ڈیڈی ... کو

آئی کچھ اس طرح بچوں کی طرح سے ظلم سہنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ انھوں نے مجھے سرسری سی تعلیم دی۔ کوٹھی کے اچھے کمروں میں کبھی نہیں آنے دیا۔ میں نے تو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان کی نوکرانیوں کے نوکروں میں گزارا ہے۔ پر اب ——"

اس وقت زینی سے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے لگتا تھا، جاگ نہیں رہا سو گیا ہوں اور ایک عجیب سا خواب دیکھ رہا ہوں اور —— یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھا ہوں اور ایک منہ چڑاتی تصویر دیکھ رہا ہوں کہ جس کے مناظر ایک ایک کر کے ذہن میں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ میں نے بے بسی سے اس دلدل میں سے نکلنے کی کوشش کی۔ دو چار مرتبہ کرسی پر پہلو بدلے، زینی کی طرف دیکھا۔ جس میں اب شاید نگاہیں اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے سامنے سے کپ اٹھایا، ٹھنڈی کافی انڈیلی اور جیسے پیتے ہوئے سوچ کر بڑی ڈھٹائی سے پوچھا

"لیکن زینی، میں نے تم سے کیا کہا۔ اس کا تعلق تمہارے ڈیڈی سے تو نہیں۔ پھر ——" زینی نے اتنی ساری دیر میں پہلی مرتبہ سر اٹھایا، میری طرف دیکھا اور کسی قدر بے کسی سے بولی۔

"تمہارا قصور نہیں۔ انسان جذباتی بنے تو سوچ اکثر ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ میں تمہیں سمجھا سکوں گی یا نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس بارے میں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔" اس کی نگاہیں جھک گئیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کو اس طرح دھوکا دینا چاہتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں

"لیکن ڈیڈی کو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔ کچھ بھی ہو۔ آج سے چار پانچ برس پہلے انھوں نے سب اس چھوڑ دی تھی کہ ایک عقیدے میں آ گئے تھے۔ ان کے پاس جائیداد کافی تھی لیکن سب کچھ شراب، کلب اور ان چیزوں کی نذر ہو گیا کہ دولت ہو تو یہ تینوں دوست ہیں، بڑے پکے دوست۔ دولت نہ ہو تو ان کی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ یہ کوٹھی جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی چند ہی دنوں ہوئے بک چکی ہے۔ ان کے پاس اب اتنا ہی پیسہ ہے کہ دو چار ماہ اور گزر جائیں۔ پھر —— اس کے بعد ——" اس نے سر نہیں اٹھایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بات کھل کر تو کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا لہجہ بہک گیا ہے۔ اور اس کی نے اس کی آواز کو دبا دیا ہے۔ میں نے سوچا ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے جس نے اسے یوں روک لیا ہے۔ پوچھا۔

"پھر —— اس کے بعد کیا ہو گا زینی۔ تم خاموش کیوں ہو گئی ہو ——"

زینی نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا پھر دونوں کہنیاں میز پر ٹیک دیں اور گردن جھکا کے دونوں ہتھیلیاں گردن پر رکھ دیں جیسے کوئی چیز گم ہو گئی تھی۔

"میرا خیال تھا تم سمجھ گئے ہو گے۔ ڈیڈی کو زندگی گزارنے کے لیے دولت کی ضرورت ہے جو انھیں اتنے پیسے دے سکے کہ ان کی باقی ماندہ زندگی گزر جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ میرا زیادہ ہی خیال رکھنے لگے ہیں۔" میں نیم جان سا کرسی پر زینی کے سامنے بیٹھا ہوں یا جیسے بہت پیچھے کہیں میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب سی سردی کی لہر تھی کہ جو میرے جسم میں دوڑ گئی اور میرے سارے اعضا شل ہو کے رہ گئے۔ مجھ میں تو اب جانے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آئی کہ میں نے اس سے پوچھا

"تو اس کے باوجود بھی تم اپنے ڈیڈی کو اچھا سمجھتی ہو زینی ——؟"

میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے اور کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ وہ بڑا مذاق ہے تو صداقت کی وجہ سے میرے [illegible] نہ ہوتی تو شاید میرے لئے وہ پیار کرنے والا شخص دنیا میں نہ ہوتا۔ لیکن —— یہ کہتی ہوئی اس بیچاری لڑکی کا قصور نہیں [illegible] محبت اور دوستی کی چمک نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا اور وہ دھوکا کھا گئی۔ اس میں —— "اس نے دوسرے کی طرف دیکھا جیسے جواب چاہتی ہو۔

"لیکن اب تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ چھوڑ سکتی ہو ——"

"ان کا ساتھ —— دنیا کی کس نے ہے جو میں بھی چھوڑ دوں۔ ان کے دل میں کچھ کہا کہیں نہ ہو۔ آخر کو وہ میرے ڈیڈی ہیں! میں ان کے کہنے سے انکار کیوں کر سکتی ہوں۔" میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ یہ لڑکی کیسی لڑکی ہے۔ عقل مند یا بے وقوف —— ایک لمحے کے لئے وہ مجھے جذباتی پتلیوں پر بکاؤ دی اور پھر گرم خاموش ہی ——

"... پھر تو تمہاری اپنی خوشیاں بھی پامال ہو جائیں گی کیا تمہیں اس کا غم نہ ہوگا؟" اس لڑکی کے ہونٹوں پر زہریلی سی ہنسی نمودار ہوئی۔ جو ابھی ابھی میرے سامنے آئی تھی اور جو اب کھوئی کھوئی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر سے اس نے ایک لمحے کے لئے بھی تو میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

"میں نے کبھی اپنی خوشیوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ میرے حصے میں خوشیاں جیسے آئی ہی نہیں ہیں اور ! چھپ کر [illegible] نہیں سکتی۔ اس کی بیاں منتیں کیا کروں۔ تم کہو گے کہ میں قنوطی ہوں۔ یہ فرار ہے۔ ایسا ہی ہے میں نے اب اس سمت میں کچھ [illegible] کیا ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے اس نے گلاس کا کپ چڑھایا پھر دیر تک میری طرف دیکھتی رہی اور جیسے ساری بات پا گئی۔ اس نے نہ غم و غصہ جذبے کو دیکھ پایا جو میرے چہرے پر چھایا ہوا تھا۔

"نجانے میرے رب اب کہ میں نے تم سے پہلے کنارہ کشی نہ کی لیکن یہ سمجھ کہ میرے اندر بیٹھی ہوئی عورت مجھے دھوکا دے گئی میں [illegible] سمجھتی رہی اور یہ جاننے کے باوجود کہ بات کتنی سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ بلا وجہ [illegible] ہوتی رہی لیکن اب بھی کچھ نہ گیا ہے دوست۔ تم اب بھی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہو۔ تمہیں کرنا چاہئے اور کرنا پڑے گا۔ جیسے دنوں کا کیلنڈر۔ ایک نہ ایک وقت میں ضرور آتا ہے کہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔" میں نے کرسی میں پہلو بدلا تو وہ بے ساختہ کر گئی

"دیکھو نا۔ یہاں کتنے سارے رسالے پڑے ہیں۔ اوپر نیچے —— یا دیکھو ہم ٹوٹتے تاروں کو دیکھتے ہیں تو کتنا ڈر ہوتا ہے۔ سوچتے ہیں یہ ستارہ کہاں گیا ہوگا۔ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اس سے پہلے سیکڑوں ہزاروں ستارے ٹوٹ چکے ہیں ان کا بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ چپ چاپ وقت کی گود میں سر رکھ دو میرے دوست۔ تمہیں وہاں آرام ملے گا۔ پھر ایک دن آئے گا جب نہ کیا بہت کچھ بھول دو گے ——"

وہ بے قدم اٹھاتی دروازے کی طرف چلی آئی۔

"میں نے سوچا تھا تم جا چکے ہو گے لیکن تم مل گئے ہو تو —— آخری بار تم سے مل بھی لیا ہے۔ تمہیں دیکھ بھی لیا۔ اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔"

اُس نے جانے کے لیے قدم اُٹھایا تو میں نے جلدی سے کہا۔

"دیکھو زینی سُنو تو ——— ہم ———" وہ فوراً رُک کے پیچھے ہٹی اور میری بات کاٹ دی

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی نا۔ تمھیں دُکھ پہنچا ہے تو تم جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ کیسا ہی بُرا سہی، پھر میرا باپ ہے اور اُس کے بغیر اگر میں تمھارے ساتھ چلی گئی تو وہ جی سکے گا نا اگر ——— آخر کس ماں کی اولاد ہے ——— اور یہ میں کسی صورت نہیں سُننا چاہتی۔"

پھر اُس نے تیز تیز قدم اُٹھائے اور باہر نکل گئی۔

میں نے اُس یونیورسٹی کی نوکری نہیں کی۔ چپکے سے باہر چلا گیا۔ میں کہاں کہاں نہیں گھوما۔ سالوں سے یہ کے فلسفہ پر کام کر رہا ہوں لیکن مجھے کہیں بھی زینی جیسی لڑکی نہیں ملی۔ مجھے کہیں بھی وہ ٹھنڈا سایہ میسر نہیں آیا جو اُن دنوں مجھے حاصل تھا جب زینی میرے ساتھ تھی۔ کبھی میرے کان اُس مترنم آواز کے رس سے آشنا نہیں ہوئے۔ اُس کے بعد زینی نے کبھی مجھے ٹیلی فون نہیں کیا۔ کبھی خط نہیں لکھا اور نہ ہی کبھی ملنے کی کوشش کی۔ ایک بار سڑک پر مل گئی تھی تو مجھے دیکھتے ہی فوراً ایک دُکان میں چلی گئی اور میں اُسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھرا۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کہاں ہے، میں اسے دُوسرے شہروں، دُوسرے ملکوں اور دوسرے لوگوں میں تلاش کر رہا ہوں۔

ایک مدت کے بعد لوٹ کے آیا ہوں تو ماں نے بتایا ہے کہ زینی کی شادی ہو گئی ہے۔ اُس کے کہنے میں کہ اُس کے ڈیڈی نے اُسے بیچ دیا تھا۔ اُس کا خاوند جوان ہے، زندگی اچھی کٹتی ہے لیکن پھر بھی زینی خوش نہیں ہے، جانے کیوں؟

تم میں اب ٹھہراؤ ضرور آ گیا ہے۔ واقعی میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ وہ دن، وہ لمحے، وہ قربت، مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں لیکن ایک احساس ضرور ہے کبھی کبھی جی چاہتا ہے زینی جہاں ہو اسے تلاش کروں اور پوچھوں صرف یہ پوچھوں کہ میں نے تمھارے لیے ... زانوؤں پر سر رکھ دیا تھا۔ وقت نے میرے زخم بھر دیے ہیں لیکن اُس نے میری نگاہوں کو بیمار کر دیا ہے کہ میں جہاں جاتا ہوں، جس طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھتا ہوں مجھے دُور دُور تک زرد ہی زرد پھول دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

زمین کا درد

اقبال متین

میں جب قبرستان میں داخل ہوا تھا اس وقت شام کے دھندلکوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں رات کے اندھیروں کو سونپ دی تھیں۔ رات دبے پاؤں میرے دل کی وادیوں کی طرح اترتی جا رہی تھی۔ رات کیا چاہتی تھی اس کا مجھے علم تھا۔ میں تو یہ کہہ جانتا تھا کہ زندگی ٹھیک ٹھیک کی مصیبتیں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ میری جیب میں وہسکی کی آدھی بوتل تھی جو آدھی سے کچھ زیادہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے کبھی کبھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صداقت کا انبر ہی کر زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا انسان شراب کا سہارا لے کر بھی پچھتاتا ہے۔ آج پھر میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ وہسکی کی آدھی بوتل نے مجھے مسرور تو کیا ہے لیکن زندگی کے اس دیدنی کرب کو جو میرے نس نس میں سرایت کر گیا ہے' میں جیسے کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ انسان جس کی بسری کی پہلے جس آتی تھی تو اس سے بچنے کے پہلے ... کا گمان ہوتا ہے ——— میں سوچتا ہوں زندگی کے اس سفر میں، میں اکیلا نہیں ہوں۔ کتنے ہوں گے جو اخباروں میں آدمی کے خلا میں تیرنے کی خبر پڑھ کر ان خلاؤں کے متعلق ہوں گے جو اس زمین پر ان کے اطراف پھیلے ہوئے ہیں اور چاند تک پہنچنے والا آدمی ان کا سینہ چیرنے کی دسترس نہیں رکھتا۔

میں جب اپنے ٹیبل پر بیٹھتا ہوں تو اس وقت تک ایک لفظ بھی مجھ سے لکھا نہیں جاتا جب تک کہ شیشے پر اڑتی ہوئی گرد کو رومال سے صاف نہیں کر لوں ——— اور جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ جان کر بھی رک نہیں سکتا کہ میرے دل پر گرد کی جو تہیں جم گئی ہیں ان کو صاف کر کے اجال دینا میرے ہونٹوں کی کسی مسکراہٹ کے بس میں نہیں ہے۔ میں باہر کی گرد جھاڑ دیتا ہوں۔ اندر کی گرد کو زندہ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہوں۔

میں قبرستان سے ایک ہی جست میں آپ کو اپنی لکھنے کی میز تک لے آیا ہوں۔ لیکن مجھے قبرستان سے لکھنے کی میز تک لانے کا فاصلہ محسوس نہیں ہوا۔ حقیقت کے اس فاصلے کو اگر آپ زندگی سے فرار کا نام دیتے ہیں تو مجھے خود پر نہیں آپ پر رحم آتا ہے کہ آپ سچ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

چلیے میں پھر آپ کو قبرستان لیے چلتا ہوں۔ میں جس وقت یہاں پہنچا تھا تو میں نے اپنے بیٹے کی قبر کے پائنتی سر جھکا کر اپنے بیٹے کی آخری صدا سنی تھی۔ میری آنکھوں اور قبر کے درمیان پھیلے ہوئے آنسوؤں کی ایک جھلی سی حائل ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود میں اپنے سینے پر پھیلے ہوئے بال دیکھ سکتا تھا جو میری شرٹ کا بٹن کھل جانے سے بے نقاب تھے۔ میرا بیٹا قبر میں سو رہا ہے وہ سدا کی نیند ... جانے کس کو پکار رہا ہے؟ ... میں آنسوؤں کی جھلی سے میں قبر کو دیکھتا ہوں اور اپنے سینے کے سفید بالوں کو بھی ... کیا آج کی زندگی جینے والوں کے لیے یہ کوئی بہت بڑا المیہ ہے؟

اگر یہ سب کچھ ہوتا تو مجھ پر وہسکی کی آدھی بوتل اپنا اثر نہ کرتی! میں اس کی قبر سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا۔ میں تو

ہوں کہ مجھے اتنے آنسو ملیں کہ میں انھیں فراخ دلی سے بہا سکوں ——— لیکن اتنے آنسو میں کہاں سے لاؤں ——— چاند تک پہنچنے والی ترقی یافتہ نسل کا آدمی اتنا تعلیم یافتہ ہو گیا ہے کہ اس کے پاس آنسوؤں کا اندوختہ نہیں رہا ہے ——— اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پر فخر کرتا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر تجربہ حسین ہوتا ہے

کہانی شاید اس طرح نہیں تھی جس طرح میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں ——— کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کے سانس کی طرح مسلسل ——— جس یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں ——— میں یہ سارے تجربات کرتا ہوں لیکن مگر آپ کو ان اکھڑی اکھڑی سانسوں کی کہانی سنانا چاہتا ہوں تو کہانی کے تسلسل کا کیا ہوگا ——— پھر بھی میں اکھڑی اکھڑی سانسوں کو جوڑ کر انھیں مسلسل اور مربوط کر کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے اپنی سیاہ زلفیں زمین کے شانے پر پھیلا دیں تو زمین کی ساری ہنگامہ آرائیاں چین کی نیند سو گئیں ——— یہ تو قبرستان تھا جہاں میں تھا ——— یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی کہ کوئی سونے والا جاگ پڑے گا اور اس کے زخم ہرے ہو جائیں گے۔

میں سگریٹ جلا کر اس کی قبر کے پائنتی بیٹھ گیا ہوں جس جس پر میرا ان کا سہرا دیکھنے کی تمنا تھی اس زمین نے نوشاہی کے بجائے اگر پالش کیے ہوئے پتھر سے ڈھانک دیا ہے اور اب یہ پتھر مجھے پیارے ہیں جن پر میں نے پھول بکھیر دیے ہیں ——— اگر بتیاں سلگا کر سرہانے رکھ دی ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں

تاریکی بڑھنے لگی تو سناٹے اور شدید ہو گئے ——— شہر خموشاں مردوں کا شہر نہیں ہوتا اگر آپ کو ایک بار بھی کسی اپنے کی قبر کے پائنتی بیٹھنا ہوا ہو ——— وہ تو مجھے بہت پیارا تھا ——— میں نے موم بتیاں جلا کر قبر کی محرابوں میں رکھ دی ہیں ——— میرے اطراف اجالے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کی سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں ——— اجالے کے ساتھ یہ سائے کتبوں سے چمٹنے کے لیے چلے آئے ہیں اور جب یہ سائے کتبوں کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں تو بہت ڈراؤنے لگتے ہیں۔

یہ قبرستان بہت وسیع ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں ——— میرے اطراف چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ چھوٹی بڑی، نئی پرانی، بہت پرانی ——— میری پشت پر جو تربت ہے اس کے احاطے کی دیوار ——— ایک مکان ہے جو آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا ہے اور ایک بہت بڑی قبر کے مانند لگتا ہے جس میں کتنی نسلیں دفن ہیں ——— اس مکان اور میرے بیٹے کی قبر کے درمیان جو پگڈنڈی ہے وہ یہاں آنے جانے کے لیے ——— راستہ چھوڑ کر جو کچا راستہ استعمال کیا جاتا ہے وہ اسی پر آنے جانے والوں کا منتظر ہے۔

روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے میرے خوف کو ہوا دی ہے اور میں نے ان کو بجھا دیا ہے ——— میں مسلمان ہو کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو جب میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اجالوں سے ڈر لگتا ہے اور کبھی کبھی اپنے آپ سے ——— ایک موت سے نہیں لگتا بلکہ اس زندگی سے لگتا ہے جو کھنڈر بنتے ہوئے مکان میں سے مجھے تکتی ہے

بیٹے کی قبر سے ... دیکھو کر اس گھر میں سب سے پہلے میں ہی بیاہی گئی تھی ——— پھر اس گھر ہی سے ایک ماں نکلتی ہے جو راستے میں دوڑتی ہوئی قبروں کے اوپر پہنچتی ہوئی دبے پاؤں میرے سامنے تک پہنچ جاتی ہے ... میں اس کی آہٹ سے بے خبر بیٹھا ہوں۔ وہ بہت آہستہ سے چپ چاپ مکڑی کی طرح داخل ہوتی ہے۔ جیسے بکریوں کو راستے میں آنے سے روکنے کے لیے جو گیٹ بنایا گیا ہے اسی گیٹ سے ... راستے میں میرے قریب تک چلی آتی ہے میں اگر قصداً کوئی جواب نہیں دیتا ہوں اور اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا ہوں تو وہ کچھ دیر کھڑی رہتی ہے۔

پھر لوٹ جاتی ہے۔

اُٹھو ——— جس کی ماں بھی اس نے تم سے لی ہے۔

اور میرے دل پر ایک عجیب سا قلق ہے۔ میں جب کہ اپنی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جیسے عالم کی بے بسی سمجھ رہا ہوں کہ وہ سب میری نشانیاں رہ گئے۔ مجھے اس جگہ ایک چھوٹے گھر میں جب تک چاہے چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ پھر چلا جاؤں۔ لیکن کلکتہ جیسے بڑے مکان میں رہنے والی ان لڑکیوں کی یہ ماں دراصل ہندوستان بھر کی ماؤں کی روح معلوم ہوتی ہے ——— اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں عالمِ ارواح میں پہنچ گیا ہوں اور یہ اداس ہندوستانی جو میرے مقابل ہے دراصل ایک روح ہے۔ ایک ایسی ماں کی روح جس کی بچیاں بیاہی جا رہی ہیں۔ اور جنہیں کر دکھانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مجھ سے وہ بار بار اپنی بیٹیوں کی باتیں کر کے وہ اپنی رام کہانی سنانے بیٹھتی ہے۔ بیچ بیچ میں مجھے نصیحت بھی کرتی جاتی ہے کہ میں غم نہ کروں ——— یوں کرنا شاید اس لیے وہ ضروری سمجھتی ہے کہ مجھے احساس دلاتی رہے کہ اس کے علاوہ بھی ... ہے حالانکہ وہ خود بھی دنیا سے چلی آئی ہے۔

لالی جان کا ... وزن کا دوپٹہ پرسوں جیسے اس نے بیچ دیا۔ اس کی شادی کے لیے کب سے انتظار کیا تھا۔ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ ہم سب پیسے کمانے چاول لے جاتے ہیں اور وہ بھی کس طرح جب کہ میں نے دوکان والے پر پکڑ لیے ——— ایم سرکار نے۔ چاول بیچنے پر پابندی لگائی ہے اور جس دوکان سے چاول حاصل کرنے کے لیے کارڈ بنا کرتی ہے وہاں نہ چاول کا دانہ ہے نہ گیہوں کا ——— خشک روٹی ہمیں کا شکر ہے ... کچھ ہے۔ پچھلے سے ملتا ہوا تب بھی نہیں ملتی ——— وہ دو روز میں نے ہوٹل سے لا کر کھلائی ہیں۔ تب کہیں ذرا سا دھارس ملا ہے ——— اس وقت سے پیٹ کے بھوکے ہیں تو دو روز کا فاقہ رکھتا تھا ——— پہلے بھیڑ تو میں بھی دیکھتی تھی لیکن ہی رہتی ہوں ——— اب تو جانے کا مجھے خیال ہی نہیں آتا ——— کچھ پہاڑ سینے پر دھرے ہیں ——— انہیں سمجھو کر ... عمر سے مکمل ہوتا تو میں بھی کسی قبر میں چپکے سے نیند سو جاتی۔ جینے میں مزا نہیں ہے لیکن یہ اذیت میں نے ... لیے برداشت کی ہوں اور زندگی سے ... یہاں ... یہ لوگ اچھے ہیں جو چپکے کی نیند سو رہے ہیں ——— وہ قبروں کی طرف اشارہ کرتی ——— میں چاہتا کہ وہ سب مل جائے لیکن وہ چپ رہتی ——— کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیل چھڑک کر سب کو جلا ڈالوں اور خود بھی جل مروں ... ہمارا نام تک ... جب میں ... کرتے ہیں ... ہمدردی سے ... ہوتی ہے ——— ... ہوں وہ سے سینے میں دل نہیں پتھر ہوتے لیکن وہ روز ... کوشش میں لگے رہتے ہیں ... بیٹیاں بچ سکتی ہیں ...

تو تمہارے سینوں میں بھی جوالیسی زندگی جی رہے ہو۔

میں اس کی باتوں سے تنگ آ گیا ہوں ——— اوٹ پٹانگ بہت سی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ مجھے اپنی تنہائی کے گھٹنے کا غم نہیں ہے اور یہ عالم ارواح کی ماں جو قبروں پر پاؤں رکھ کر دبے دبے میرے پیچھے چلی آئی ہے اپنے سینے پر سے چھ پہاڑوں کا بوجھ تیل اور آگ کے سہارے اتار دینے کی سوچ رہی ہے۔

"اور پھر جل مرنا بھی تو آسان نہیں ——— وہ پھر شروع ہو گئی ہے ——— مٹی کا تیل چوالیس پیسے شیشہ ہو گیا ہے۔ اس طرح مرنا تو بہت مہنگا پڑے گا۔"

میں اٹھتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ تو اب سلام کے بعد میں اس کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ وہ پھر کچھ مجھ سے کہہ سکے۔

اس وقت تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس وقت تو میں اکیلا ہوں لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ وہ آ نہ جائے ——— روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلنے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے۔ میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔

روشنی کے یکایک غائب ہو جانے سے اندھیرے زیادہ گہرے ہو گئے ہیں لیکن آنکھیں دیکھتے دیکھتے اندھیروں سے مانوس ہو گئی ہیں اور اب میں اپنے سامنے گنبد کا بڑا دروازہ ہمیشہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں جو بند ہے۔ اس گنبد میں میرے جد امجد یا پھر شاید ان کے بھی جد امجد سو رہے ہیں ——— میں نے صحیح رشتہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے علم کے دریا بہائے ہیں۔ انسانوں کے انبوہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان سے عرفان و آگہی حاصل کی ہے۔ بہر حال میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کے اعمال و عادات پر چاہوں تو میں بھی فخر کر سکتا ہوں جس طرح ماؤں کی وہ پیاسی روح کرتی ہے جو کھنڈر ہوتے ہوئے بنگلے سے نکل کر دبے پاؤں میرے پیچھے موم بتی کی روشنی کا دھبہ دیکھ کر چلی آئی ہے۔ یہ عورت میری رشتہ دار ہے اور گنبد میں سونے والی ان بزرگ ہستیوں سے اس کا رشتہ زیادہ قریبی ہے۔

مجھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی ہوئی اس گنبد کو دیکھ کر اپنا بچپن یاد آیا۔ میری نانی امی یہاں گنبد کے باہر بیٹھی ہوتی تھیں اور نانا ابا ساتھ کی آخری کھڑکی پر نقار خانے میں رہتے تھے جیسے طوطی کی آواز بن گئے ہوں ——— عید بقر عید میں ہم سب جب آتے تو نانا ماں کے اکثر بچوں کے ساتھ مل جل کر ایک اچھی خاصی فوج تیار ہو جاتی۔ فوج گنبد کے دروازے پر یلغار کرتی تو گنبد کے دروازے کھول دیئے جاتے اور ہم سب کے سب ادب سے اندر داخل ہوتے ——— بند گنبد میں بھی شدید خاموشی ساتھ ہوتی اور دھوئیں سے اٹی سسکتی ہوئی لوبان کی بتیاں تبرکاً کھلا دیتیں ——— پھر فاتحہ کا درود شروع ہوتا اور وہ کورس شور کے ایک دل چھو لینے والے لحن میں ادا کرنے سے زیادہ آگے بڑھتا۔ تیس کئی کئی منٹ تک خشوع و خضوع کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔

* ۱۰ آنا حصہ پیسے دو۔

* یہ چاروں قل ترنم میں الفاظ توڑ توڑ اور کھینچ کر ادا کیے جاتے۔

پتہ نہیں گنبد کے ساتھ بھیک مانگنے کی رسم کیسے وابستہ ہو گئی ہے۔ یہ کھڑکی یاد ہے کہ کس نے یہیں کر دیا تھا۔
کبھی سوچتا ہوں تو صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں فقیروں پر سب سے زیادہ ترس کھایا جاتا ہے اور شاید اسی لیے بھکاریوں نے اللہ والوں کے پیچھے بیٹھ کر بھیک مانگنے کا پیشہ اپنایا۔
ناصحت نے کسی کو کچھ دیا ہو کہ نہ دیا ہو، اس بیابانی میں رہنے والوں کو جو معلوم تھا کہ اس کے روشنی کو شدت سے دیکھ کر قبروں سے
شعور کی لکیر کی طرح قبر سے مٹانے دیں کہ وہ بھی چاہتے ہوں کا بوجھ ہیں اور دنیا کا وہ پیچ ہے جس کے سہارے کو غنیمت ہے۔ اس لیے بھی
کر یہ بیابان ناصحت پر سب سے زیادہ حق رکھتی ہے، کیوں کہ وہ اس کی درگاہ کے تماشے کی بیل ہے۔ اور یہ سب وہ اتفاقاً
چلا پڑا مسکرا رہا تھا کچھ تو ہے۔

اب بیابان آنکھیں اندھیروں سے اتنی مانوس ہو گئی ہیں کہ دور تک دیکھ سکتی ہیں۔ جیسے یہاں دیکھنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔
جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں۔ قبریں ہی قبریں ہیں۔ جہاں میں نہیں دیکھ سکتا ہوں وہاں بھی قبریں ہیں جو وہ کے اندھیرے میں مجھے نظر آتی
تھیں اور اب آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ پاس ہی ٹوٹے ہوئے درخت کے نیچے ایک جگنو چمک رہا ہے۔ کوئی مسافر یہاں ہوتا تو اس
جگنو کی روشنی میں بھی راستہ پانے کی سوچ سکتا تھا لیکن یہاں تو سارے مسافر تھک کر سو گئے ہیں اور ایسا سوئے ہیں کہ انھیں سورج
کی کرنیں جگا سکتی ہیں نہ بارش کی بوندیں۔ ایسے میں یہاں اس جگنو کا وجود بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔
کسی قبر پر کوئی چراغ نہیں ہے۔ چراغ خود بخود بھی تو نہیں جلتے۔ اب زندگی کو اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ موت کے راستوں
میں بھی اجالا کرتی پھرے۔

میں خود بھی تو مہینوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔ جس شخص کا چہرہ میں دس بار دیکھے بغیر چین نہ پاتا تھا اس کی قبر کی طرف مہینوں
تک میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ہے ——— یہ سوچ کر بھی کتنا ڈر لگتا ہے کہ کل ہم بھی ذہنوں سے حرف غلط کی طرح مٹ
جائیں گے ——— اس سے پہلے جب اپنے معمول کے مطابق میں چند روز بھی دیر کی تاخیر سے قبرستان کو گیا تھا تو مجھ سے اس
پاگل ماں کو روک نہ سکا تھا۔

"اس وقت تم یہاں کیسے آ سکتے ہو اس وقت تو تمھیں نمے کے لیے گھر پر ہونا چاہیے تھا"
اور اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا ——— اس نے خود جواب گھڑ دیا تھا۔
"تم اس لیے اتنے دن نہیں آئے ہو ——— کیوں ہے نا؟"
جب یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت اندھیرے بھی نہیں تھے۔ جو بھی چھپا بیٹھے ——— سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ نکلنے کے
پہلے سنورا تھا ——— وہ الیسان سے میرے پیچھے احاطے کی دیوار تک چلی آئی تھی۔
آج مہینوں بعد میں جب یہاں آیا ہوں تو میں نے اور بھی جلتی ہوئی موم بتیاں چھوڑ کر بجھا دی ہیں کہ کہیں وہ پیاسی روح
سب پاؤں چلی نہ آئے لیکن اس وقت جبکہ موم بتیوں کے شعلے لرز کر بجھنے ہی والے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھول
دیکھے تھے ——— جیسے کوئی اچنبھا نہیں ہوا تھا۔ دراصل یہ میری بھول تھی ——— میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں نے ہی پھول چڑھائے

ہیں۔ لیکن جب میری آنکھیں اندھیروں سے مانوس ہوئیں اور جب میں نے گنبد کے بڑے دروازے کو بند دیکھا تو اس دروازے کی درازوں سے مجھے اپنا سرکش بچپن جھانکتا ہوا دکھائی دیا جو ابا حضرت سے پیسہ مانگنے کی اہانت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا تھا ——— اور جب ان یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر میرا ذہن اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ جلانے کے لیے کتبے کی اوٹ میں چھپ کر اس احتیاط سے تیلی جلائی کہ لمحہ بھر کو پھیلنے والی یہ روشنی بھی کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں بسنے والی بچی ماں کی نظروں سے چھپی رہے ——— لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب چیز دیکھ لی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا ——— میں نے جھک کر دیکھا ——— میں جو کچھ دیکھ رہا تھا سچ تھا ——— وہ کون ہے، وہ کون ہے جو میرے غم میں شریک ہو گیا ہے ——— وہ پھول جو میں نے قبر پر چڑھانے کے لیے لیے تھے وہ تو پیپل کے بھیگے ہوئے بڑے پتوں میں لپٹے تھے۔ ان پر میرا بندھا ہوا دھاگا بھی جوں کا توں تھا۔ پھر یہ تازہ پھول کس نے میرے بیٹے کی قبر پر چڑھا دیے تھے ——— میں نے پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کر لیے ——— میری انگلیوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک محسوس کی۔

ہمیں سورج کی کرنوں نے نہیں چھوا ہے ——— نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے کہہ رہے تھے ——— میں نے انہیں قبر پر اس احتیاط سے رکھ دیا جیسے پلکوں میں آنسو پرو رہا ہوں۔

جی چاہا موم بتیاں جلا کر اس بچی ماں کا انتظار کروں جو روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ کے بغیر سب سے پہلے چلی آتی ہے ——— میں نے مزید کچھ سوچے بغیر موم بتیاں جلا دیں ——— تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پائنتی بچھے ہوئے پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑے ہیں۔ میں نے انہیں چومنا چاہا تو پیاسا سا قبر پر ڈول گیا ——— پھر میں نے خود کو سنبھال لیا ——— وسکی کی بوتل سے کئی ہی گھونٹ پیے۔ پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اس طرح چھپا سا بیٹھ رہا جیسے دور سے سانسوں کی آواز سن رہا ہوں۔

بارش کے اجالے نے دور کے اندھیروں کو اور گہرا کر دیا تھا۔ نیم کے بوڑھے درخت کی بلندی کو اب تک نہ جانے کتنے جگنو گھیر رہے تھے۔ یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی اگا دیا جائے تو بے فائدہ ہے ——— یہاں جگنوؤں کی طرح موم بتی کے اجالے، قبروں کی بھلا کچھ بھی تو دوروں کے اندھیروں کو دور کرنے کی اہمیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں ہے

لیکن وہ کون ہے ——— وہ ——— بوڑھے نیم کے گھنے اندھیرے میں ——— میں کھڑا ہوا ہوں

میں نے بغور دیکھا ہے۔ یقیناً کوئی ہے۔

میں آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے باہر نکل آیا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پر نظر ڈالی ——— موم بتیوں کی روشنی میں بھی میں اس کے کتبے پر لکھا اس کا نام، اس کی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں پڑھ سکا، شاید پہلے سے عبارت کی سیاہی اکھڑ گئی ہے ——— میں پھر اداس ہو گیا ہوں۔ کسی کتبے کے حروف مٹ رہے ہوں تو سمجھو کہ اس نے

معلوم نہیں کہ تھکن سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔

میں مرگھٹ سے ملحقہ لاوارث قبرستان کی پگڈنڈی پر ہو کر لپٹتے ہوئے درختوں کی جانب چلا جا رہا ہوں ——— یہ پگڈنڈی سے دور تک شکستہ قبروں کا سلسلہ ہے۔ ایسی قبروں کا سلسلہ جن کے نام و نشان کا کوئی پتہ نہیں ہے کہ ان میں ——— میں چلتا چلا جا رہا ہوں ——— سوچتا ہوں کہ میری جان کی ملکیت سی ہو گئی ہے کہ میں یہ نامعلوم زمین پر کھو رہا ہوں وہ دور اس کی کوئی قبر ہے ایسی قبر جسے پہچاننے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ ——— ایک خیال میرے ذہن سے تیر کی طرح سنسناتا ہوا گزرتا ہے ——— کیا یہاں بھی کہیں کوئی میرے بیٹے کی قبر ہے، جس کا بے گور و کفن لاشہ ادھر کھڑکر پھینک دیا گیا ہو ——— نہیں ——— ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا ——— لیکن اس کا کیا جسے میرے بیٹے پر آتا ہے ——— مجھے پتہ ہے ——— تمہارے بیٹے کو میرے بیان ہے ——— میرے سارے زخم بے شمار ہو گئے ہیں ——— تمہارے زخم ہرے ہیں ——— آؤ اور اپنے خون کو پھر سے ہرا کر کے زخم ہرے کرو۔

میں ناہموار شکستہ قبروں سے اترتا ہوا چلا جا رہا ہوں جیسے پیر زمین پر رکھنا ہی نہیں چاہتا ہوں ——— اب میں ایک املی کے پیڑ کے بالکل پاس پہنچ گیا ہوں ——— خودرو جنگلی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے میری نظروں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے یا ابھارا ہے ——— میں گھوم کر جھنڈ کے اس سمت پہنچتا ہوں جو پیڑ کے بالکل نیچے ہے۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا ہوں۔ ایک قبر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے ——— پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن وہ مجھے دیکھ سکی یا نہیں، اس کا پتا نہیں ہے ——— وہ بالکل وہی ہے جس کا سوم تیل جلا کر میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر انتظار کیا ہے۔ نیم روشنی کے دھندلکوں کی جانب سے نگاہ اٹھنے والی یہ شدت آج اس تازہ قبر پر اندھیروں کی ہو کر رہ گئی ہے۔

"کس کی قبر ہے یہ؟"

میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا

"تم کون ہو؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا ——— وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی ——— پھر وہ ہنسی، اس کی ہنسی سے مجھے وحشت سی ہوئی۔

"تم شوہر کی امانت تھی اس نے تم سے واپس لے لی ہے" ——— میں نے دل مضبوط کر کے یہ جواب دیا۔

اس نے کسی جیا جیا کر مجھے دیکھا ——— پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی ——— "یہ میرے بلوان کی قبر ہے ———

اس نے خودکشی کر لی ہے ———

وہ سنو ——— سنتے ہو ——— بلوان کا پتہ ملتا ہے۔

بلوان کا پتہ؟

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرا سب کچھ کھو گیا اور اس کا مجھے علم تھا ——— بھلا میں اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ اپنی جان کا حصہ اس سے کہاں گرد بیٹھیں جس کا یہ پتہ ہے۔

اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی تھی۔

ٹوٹی ہوئی قبروں پر پیر رکھتی ہوئی وہ اپنے کھنڈر ہوتے ہوئے مکان کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی اور کھنڈر سے کسی زمرو و پتھے کے بلک بلک کر رونے کی آوازیں صاف سُن رہا تھا۔

اپنے بیٹے کی قبر پر رات کے وقت میں نے اس قبر کو نہ رونے کے خیال سے جس کی شکستگی نے میرا دل جو دیا تھا کتنی قبریں روند ڈالیں جو سرے سے مٹ چکی تھیں۔

ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے لیکن جب میں اس کی تربت کے پائنتی پہنچا ہوں تو درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا چاند اب اتنا ابھر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی سامنے میں بکھر کر لوٹ لوٹ گئی ہے

——— میں نے قبر کی مٹی سے ملا کر وہ مکھونٹ حق سے نیچے آ تا رہے ہیں۔

——— میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی زمرو و پتھے کے رونے کی آواز پھر سُنی ہے۔

——— میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھولوں کو پھر دیکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ یہ کس نے چڑھائے ہیں۔

——— میں نے پھولوں کا دونا کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھا دیے جو میں اسی لیے لایا ہوں۔

——— میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا ——— وہ اب درختوں سے بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لاکھ یہاں تک پہنچ بھی جاؤ تو اس زمین کے درد کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ گے اے میرے بیٹے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ درد سمیٹ سکوں۔

اور چاند نے بادل کی چادر تان لی۔

میں بھی چادر کو کفن تو نہیں کہہ سکتا

———

سیکنڈ راؤنڈ

انتظار حسین

چپکے چپکے اُسے وہ راستہ سے ہٹ کر چلنا پڑا۔ دونوں طرف قطار قطار کاروں کے نئے بنگلے جن کے آگے آگے لانوں سے سجی ہوئی کیاریاں تھیں اور پیچھے پیچھے کہیں کہیں کہیں کچھ نسوانی صورتوں سے بھری ہوئی کاریں۔ اور پھر وہ اس کوٹھی کے سامنے سے گذرا جس کے دروازے پر ایک سرخ تختی پر WELCOME لکھا ہوا تھا۔ باہر چمکتی دمکتی کاریں ایک دوسرے سے بڑھ کر ... کوٹھی، اندر شامیانہ تنا ہوا، درخت جگمگ جگمگ قمقموں سے سجے ہوئے۔ اور ابھی ابھی وہ اپنے گھر سے چلا آ رہا تھا جہاں چھوٹے بڑے کی گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ ابھی ابھی بڑے ابا نے دیوان حافظ سے فال لی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جنگ ہوگی۔ آگے کیا ہوگا۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے۔"

"وہ میں بتاتا ہوں" چچا میاں کہ اب تک کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"ضرور بتاؤ" بڑے ابا نے دیوان حافظ بند کر کے ایک طرف رکھا اور عینک اتار کر کیس میں رکھنے لگے۔

"بس شمالی ہند پہ مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

"کیسے" بڑے ابا عینک کیس میں رکھتے رکھتے رک گئے۔

"کیسے کیا، بس ہو جائے گا۔ مگر صرف شمالی ہند پر۔ جنوبی ہند کی میں گارنٹی نہیں لیتا۔"

"کیسے ہو جائے گا۔ کوئی ثبوت؟"

"ثبوت" چچا میاں نے بڑے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی۔"

بڑے ابا سوچ میں پڑ گئے۔ تامل کیا۔ پھر بولے۔ "انہوں نے یہ لکھا ہے؟"

"صاف لکھا ہے جی۔"

بڑے ابا پھر سوچ میں پڑ گئے۔ آخر انہوں نے بند کئے ہوئے کیس کو پھر کھولا، عینک لگائی اور دیوان حافظ اٹھا

"فال دیکھتا ہوں۔"

اور اس کا موڈ کچھ یہ تھا کہ دیوان حافظ کی فال کا اعلان کیا ہوا سڑک سے گذرے۔ مگر اس لمبی اور کشادہ سڑک پر سے وہ بار قطار قطار کاروں کے سبب سڑک سے اتر کر چلنا پڑا۔ اسے یوں ہی خیال آیا کہ ابھی تھوڑے دن پہلے اس سڑک کی صورت کچھ اور تھی۔ کچی تھی اور یہ کاریں تھی کہ اِدھر اُدھر نظر آتی تھیں ... پکی ہوئی۔ پھٹوں پر گھاس پھوس ... ہوئی، ہمیشہ لالٹینوں پر کالا دھواں ...

سارے ہاتھ ماحول کے ساتھ ٹریفک کے سپاہی تیزی سے سیٹیاں بجاتے ادھر ادھر بھاگتے۔ منی سے لپی ہوئی موٹر کاریں رستوں سے اتر کر غائب ہو جاتیں [illegible] نظر آتیں، اور سڑک خالی اور خاموش ہو جاتی۔ وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی عجیب لگتی تھی، ساری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی جیسے اسے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ ظاہر ہوئی ہے۔ آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اور اب! اب سڑک پھر سے کتنی مصروف ہو گئی ہے۔ اب پھر سے کاریں کتنی اجلی ہو گئی ہیں۔ چمکتی دمکتی کاریں، ایک کے بغل میں دوسری، سرخ پنی اور سنہری دیکھو۔ ایک لمبی کار سے اترتی ہوئی ہلکے زیور اور بھاری جوڑوں میں ملبوس خواتین۔ "طاہر!" پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مسعود اور رضا بس شاپ کے قریب کھڑے تھے۔ رک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں قدم ملاتے ہوئے آ گئے۔ "تو خالی ہے نا اس وقت؟"

"اور کیا؟"

"بس پھر چل۔ گرینڈ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ نر سائی ٹیکسی مل جاتی تو اچھا ہوتا۔"

"اس وقت یہاں ٹیکسی ملے گی۔ توبہ کرو۔"

"چلو پھر پیدل چلتے ہیں۔ کونسی ایسی لازمی دوڑنی ہے۔"

"یار۔" وہ چلتے چلتے بولا۔ "آج شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔"

"ہاں بہت بکرے ذبح ہوئی ہیں آج۔" مسعود نے یہ فقرہ بہت گمبھیر لہجہ میں کہا تھا۔ مگر وہ اور رضا دونوں ہنس پڑے۔

پھر رضا کہنے لگا۔ "اصل میں موسم کے انتظار میں شادیاں رکی ہوئی تھیں۔ موسم اس برس بدلنے ہی کو نہیں کہتا تھا۔ بہرحال اب موسم بدل گیا۔"

اس نے رضا کی طرف دیکھا اور کسی قدر بجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "ہاں موسم بدل ہی گیا۔" چپ ہوا۔ پھر بولا "کیا خیال ہے یارو، سیکنڈ راؤنڈ ہوگا؟"

"سیکنڈ راؤنڈ؟" مسعود نے بے اعتنائی سے کہا "لگتا تو نہیں۔"

"ہاں یار لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" اس کا لہجہ ڈوبا اور بجھ گیا۔

"کیسے لگتا ہے؟" رضا نے گرم لہجہ میں سوال کیا۔

مسعود نے لہجہ میں تھوڑی طنز پیدا کرتے ہوئے کہا: "شاید تم نے طاہر کی پہلی بات نہیں سنی۔"

"کونسی پہلی بات؟"

"یعنی یہ کہ شادیوں کا موسم شروع ہو گیا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ہماری گمشدہ لڑکی بھی واپس آ چکی ہے اور رکشاؤں کا میٹر بھی پھر سے تیز چلنے لگا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نارمل وقت واپس آ چکا ہے۔"

تم دل پھینک عقیدے کے پیرو کیا ہے؟
"بھئی دل پھینک کی تین نشانیاں ہیں۔ سال بھر پہلے تو پھرتی لڑکیاں، رکشاؤں کا تیز چلتا ہوا میٹر اور چھلک سکتی ڈبیہ"
اس جواب پر رضا کچھ خفا ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا۔ مسعود اس کی طرف جھکا اور پھر ایک سگریٹ منہ میں لگا کر سلگا لیا۔ سگریٹ کا کش لیا۔ پھر بولا "کچھ کہتے ہو۔ جنگ ہوگی"
مسعود ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا "یار لوگ جذباتی ہو رہے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ جنگ کیا ہوتی ہے"
"یار معاف کرنا" رضا نے چمک کر کہا "پتہ تمہیں بھی نہیں ہے کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ جنگ اور عشق یہ وہ معرکے ہیں کہ نہ شروع کرنے سے شروع ہوتے ہیں نہ ختم کرنے سے ختم ہوتے ہیں"
"خوب" مسعود نے طنزیہ انداز میں داد دی۔
"مسعود" وہ بولا "رضا ٹھیک کہتا ہے۔ اعلان بے شک کر دو مگر سیز فائر ہوتا نہیں عشق میں تو نہیں ہوتا"
"جنگ میں بھی نہیں ہوتا" رضا نے جوش میں آ کر کہا۔
مسعود نے رضا کی بات کو نظر انداز کیا اور اس سے مخاطب ہوا "یار ایک بات بتا۔ تو ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ قصہ ختم نہیں ہوا ابھی؟"
"ہو بھی گیا اور نہیں بھی ہوا"
"پیارے تو بھی بحث کرو۔ سیکنڈ راؤنڈ کر ڈال۔ کہیں تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو"
اس نے ایک بجھی سی ہنسی ہنسی اور چپ رہا۔
رضا کا چہرہ تمتا نے لگا "یار یہ جو لوگ CYNIC بنتے ہیں یہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں"
وہ چپ ہوا۔ پھر براہ راست مسعود سے مخاطب ہوا "تم محاذ پر گئے ہو"
"نہیں گیا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے"
"بہت فرق پڑتا ہے" رضا کے لہجہ میں ایک برتری کا احساس پیدا ہو گیا "میں محاذ پر گیا ہوں۔ تم نے سپاہیوں کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے"
مسعود جواب میں چپ رہا۔ پھر وہ چلتے چلتے رکا "یار مولوی سے سگریٹ تو لیتے چلیں"
اصل میں وہ باتیں کرتے کرتے منزل کے قریب آ گئے تھے اور مولوی کی دوکان تو وہ مقام تھی جہاں سے وہ گزرتے ہوئے آتے جاتے ضرور کچھ نہ کچھ خریدا کرتے تھے۔ وہ باتوں میں اسے پیچھے چھوڑ چلے تھے۔ آگے چلتے چلتے وہ پلٹے اور مولوی کی دوکان پر آن ڈٹے۔
"مولوی" مسعود نے کہا "صاحب آج نہیں ہوگا کہ سگریٹ چلے گا۔ کیوں؟"
"چلے گا جی" مولوی نے قلندرانہ شان سے جواب دیا۔
مگر رضا اس موڑ میں تھا۔ یہیں نے شفقت بھری نظر کر دیکھی۔ "عجب آدمی ہے"

"شفقت بلوچ کو؟" مولوی چونکا۔ "شفقت بلوچ کو آپ نے دیکھا ہے رضا صاحب؟"

"ہاں .... ہاں" اس نے برتری کی شان کے ساتھ کہا۔

اس موٹے آدمی نے جس نے شلوار کے ساتھ کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر جناح کیپ منڈھی ہوئی تھی۔ رضا کو غور سے اور قدر احترام کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا جی! تو آپ کی شفقت بلوچ سے باتیں بھی ہوئیں؟"

مولوی بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولا۔ "خواجہ صاحب جی، آپ ہمارے رضا صاحب کو نہیں جانتے۔ یہ بہت بڑے ں ہیں۔ یہ محاذ دیکھ کے آ گئے ہیں۔ اچھا جی رضا صاحب یہ بتاؤ شفقت بلوچ کیسا آدمی ہے۔ کیا سوچتا ہے؟"

"بہت عجیب آدمی ہے۔" رضا کہنے لگا۔ "وہ ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں عزیز بھٹی کی شہادت ہوئی تھی۔ اس ں کا حال بتانے لگا۔ اتنے میں ایک جوان آیا اور بولا کہ چائے تیار ہے۔ آپ لوگ اب واپس چلیں۔ ہم واپس چلنے لگے۔ مگر نت بلوچ وہیں کھڑا رہا۔ ہم ٹھٹھکے۔ ہم نے کہا میجر صاحب آپ نہیں چل رہے۔ شفقت بلوچ نے ہمیں غور سے دیکھا۔ اور نے لگا کہ یہاں سے واپس جاؤں۔ اس مقام سے جہاں عزیز بھٹی کا خون بہا ہے۔ آپ لوگوں کو واپس جانا ہے۔ آپ واپس یں۔ میں تو یہیں کھڑا ہوں .... ہم اس شخص کی صورت دیکھنے لگے۔"

"سبحان اللہ۔" خواجہ صاحب نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئے۔

"میں چھمب جوڑیاں بھی گیا تھا۔" اور رضا نے سوچیہ انداز میں کہا۔ "معلوم ہے چھمب میں داخل ہوتے ہی پہلے نظر آتا ہے؟"

"کیا؟" خواجہ صاحب اور مولوی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"قبریں۔"

"قبریں؟"

"ہاں قبریں۔ ایک لمبی قطار چلی گئی تھی۔ برابر برابر اکیس قبریں تھیں۔ یہ بلوچ رجمنٹ کے سپاہی تھے۔ مگر یار عجب بات ے۔ اتنی قبریں تھیں اور وہ جگہ قبرستان سی نہیں لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ میدان جنگ میں کھڑے ہیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ جب ڑھ چکے تو ایک سپاہی ہمارے قریب آیا۔ کہنے لگا کیا خیال ہے آپ شہری جانیوں کا، ہم ان قبروں کو چھوڑ کر واپس ائیں .... یار میرا جی چاہا کہ میں کچھ کہوں۔ مگر کچھ کہا نہیں گیا۔ میرا کچھ .... بس کچھ دل بھر آیا۔"

چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

تھوڑی دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر خواجہ صاحب کسی قدر آہستہ لہجہ میں بولے۔ "بات ٹھیک ہے کہ یں کیسے چھوڑ دیں؟"

مولوی نے جھرجھری لی اور کہا۔ "خواجہ صاحب جی۔ لڑائی نہیں رکتی، ہو کر رہے گی۔"

"تاشقند کچھ پتہ نہیں۔"

"پتہ نہیں جی" مولوی شروع ہو گیا۔ "بھارت کہتا ہے کہ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ میں کہوں ہوں کہ دلی ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ پوچھو کیسے لیے کر ..... سب گنتے جاؤ" اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا "لال قلعہ، قطب صاحب کی لاٹھ، جامع مسجد، اولیا صاحب کا مزار، چار۔ اب میں پوچھوں ہوں کہ کشمیر میں ان بزرگوں کا کوئی قصہ مندر کوئی، یا منشا ہے"

خواجہ صاحب نے مولوی کی بات سنی اور پھر وہ اس سوٹ بوٹ والے شخص سے مخاطب ہوتے جو ابھی ابھی کار سے اترے، کار لائے اترا تھا اور فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی ہوئی خاتون کے لئے ابھی ابھی کوکا کولا بھجوایا تھا۔ "کیوں جناب خبریں کیا کہتی ہیں۔ جنگ پھر ہوگی؟"

سوٹ بوٹ والے شخص نے تامل کیا پھر بڑی متانت سے بولا "بات یہ ہے کہ ......"

"پان کیسا؟" مولوی نے پان لگاتے لگاتے پوچھا۔

سوٹ بوٹ والے شخص نے کہا "سادہ خوشبو ڈال دینا"

خواجہ صاحب نے بے چینی سے کہا "ہاں جی"

سوٹ بوٹ والے شخص نے اسی متانت سے بات پھر شروع کی "بات یہ ہے کہ پاکستان ابھی جنگ افورڈ نہیں کر سکتا"

"جی کیا فرمایا؟" مولوی کا ہاتھ پان لگاتے لگاتے رک گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ" سوٹ بوٹ والے شخص نے پھر اسی متین انداز میں بات کی "ایک چھوٹے ملک کے لئے جس کے وسائل محدود ہوں کسی بڑے ملک سے ٹکر لینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے"

"اس بار کے یار بڑے ملک نے تو ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا۔ مگر ہوا کیا" مولوی کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"ہوا کیا؟" سوٹ بوٹ والا شخص نہایت متانت سے مسکرایا "مجھے کہنا تو نہیں چاہیے۔ مگر بہر حال اتنا واضح ہے کہ اس جنگ کا اثر ترقیاتی منصوبوں پر بہت پڑے گا"

مولوی نے پان لگاتے لگاتے ہاتھ روکا۔ ادھر لگے پان کو الگ رکھ پاس کھڑے ہوئے لڑکے کو ڈپٹ کر کہا "ابے او لونڈے بیگم صاحبہ سے بوتل لے کے آ" اور دونی نکال کر سوٹ بوٹ والے شخص کے سامنے رکھ دی۔

"میں نے پان بھی مانگا تھا"

مولوی نے انگلی سے سامنے دوسرے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے پنواڑی کی طرف اشارہ کیا "پان وہاں سے"

سوٹ بوٹ والے شخص نے کسی قدر بے دلی سے دونی اٹھا کر جیب میں رکھی اور واپس اپنی کار کی طرف چل دیا۔

سٹارٹ ہوتی ہوئی کار کو مولوی دیکھتا رہا۔ جب وہ روانہ ہو گئی تو اس نے بہت غصہ سے کہا "امریکہ کا پٹھو"

"یہ شریف آدمی تھا" خواجہ صاحب نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"شریف آدمی؟" مولوی نے تحیر سے کہا "خواجہ صاحب آپ جانتے ہیں اسے؟"

"نہیں یار، میں تو نہیں جانتا کون صاحب ہیں"

"خیر مٹی پاؤ جی" خواجہ صاحب بولے "مولوی تو یہ بتا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی"

"بتا دوں؟"

"بتا دے"

"خواجہ صاحب جی، رات کو اٹھو چار بجے کے ہون میں آسمان کو دیکھو۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی"

"ہاں یار میری زنانی کہہ رہی تھی۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ پر مولوی" خواجہ صاحب رکے اور بولے میری زنانی تو بہت ڈری ہوئی ہے"

مولوی نے سیدھا سوال کیا "خواجہ صاحب جی، ایک بات بتاؤ۔ پاکستان میں گیہوں مہنگا ہوا"

"نہیں"

"پر بھارت میں ہوا۔ یا کچھ دو کر نہیں ہوا؟"

"ہوا"

"ہوا کیا جی۔ واں پہ تو کال پڑ رہا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ بلا اُدھر ٹل گئی"

خواجہ صاحب نے اس بات کو یہیں چھوڑا اور کہا "خیر یہ تو دمدار ستارہ ہے۔ مگر وہ کیا تھا یہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا"

"کیا؟" مولوی نے سوال کیا۔

"بادشاہو جنگ کی تیسری رات تھی۔ کوئی آدھی رات کا وقت۔ کیا دیکھو رہوں کہ یہ بڑا روشنی کا گولہ جیسے آسمان میں قندیل لگی ہوئی ہو۔ کئی منٹ تک لگی رہی۔ پھر غائب۔ میں اب تک حیران ہوں کہ کیا چیز تھی۔ ۔۔۔۔۔۔ پر اس رات" خواجہ صاحب رک کر بولے "توپ بہت چلی۔ چھت ایسے ہل رہی تھی جیسے پنکھا ہلتا ہے"

مولوی نے بہت غور سے یہ واقعہ سنا۔ پھر بولا "یہ تو جنگ سے تین دن بعد کی بات ہے۔ مگر مجھے تین دن پہلے پتہ چل گیا تھا۔ پوچھو کیسے۔ وہ ایسے کہ خواجہ صاحب جی میں نے خواب دیکھا کہ جیسے شالامار باغ میں آگ لگ گئی ہے۔ جیسے سارا باغ جل گیا ہو۔ جی پھر وہ آگ اک دم سے بجھ گئی۔ اور سارے درخت ویسے کے ویسے ہی۔ میں بہت حیران ہو رہا ہوں کہ جیسی واہ وا آگ خود ہی بجھ گئی۔ اور درخت سب ویسے ہی ہرے ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ جی تیسرے دن حملہ ہو گیا"

خواجہ صاحب حیرت سے سنتے رہے۔ پھر بولے "ہاں صاحب بعض بعض خواب بڑا سچا ہوتا ہے"

[illegible] " یہ تو خوب کی بات تھی۔ سب اور سنو" بات کرتے کرتے اس نے اُسے مسعود اور رضا کو دیکھا " یار جنس! میں تم بھی سنو۔ خواجہ صاحب جی میں فجر کی نماز کے بعد یک وظیفہ پڑھوں ہوں، تو گنتی بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے پڑھوں تسبیح پھیر رہا تھا کہ نیند آگئی۔ ایسے لگا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ پیچھے مڑ کے دیکھا .... کوئی بھی نہیں تھا .... اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بس جھپکی آئی تھی کہ لگا ...... کوئی کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا .... میں حیران ہوں خواجہ صاحب جی کہ اس بات کے معنی کیا ہوئے۔"

خواجہ صاحب کا سر جھک گیا، آنکھیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد آنکھیں کھولیں، بولے "آج کل کے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔"

مولوی بولا "میں کہتا ہوں کم بختو اب تو تم نے آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیا، اب تو سمجھ لو۔ اب بھی نہیں سمجھتے۔" یہ کہتے کہتے مولوی ان کی خاموش کھڑی ہوئی ٹولی کی طرف متوجہ ہوا "یہ کھڑے ہیں ہمارے بابو لوگ۔ میری باتوں پر ہنستے ہیں۔"

مسعود ہنس دیا "مولوی تو کچا ہے۔ کیپسٹن کا ایک پیکٹ دے دے۔"

کیپسٹن کا پیکٹ لیا۔ تینوں نے سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رضا نے اچانک بے چینی کا اظہار کیا "یار میں چلا۔"

"گرینڈ نہیں چلنا؟" مسعود نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یار اب دیر ہو گئی۔ اور مجھے یاد آیا مجھے تو اس وقت گھر پہنچنا تھا۔ کچھ مہمان آنے والے تھے۔" رضا نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ کہا "اچھا میں چلا اور یہ جا وہ جا۔

"یار میرے خیال میں گرینڈ کا پروگرام آج ملتوی کریں۔" اس نے ببل سے کہا۔

"کیوں سالے تم بھی ٹوٹ رہے ہو؟"

"ٹوٹنے کی بات نہیں۔ ایک تو رضا چلا گیا، پوری کمپنی نہیں رہی اور پھر اتنا وقت یہاں ہم نے گزار دیا۔ اتنی تو دیر ہو گئی .... اور یار پھر آج کچھ موڈ نہیں رہا۔"

مسعود کچھ مجبور سا ہو گیا۔ بے دلی سے بولا "اچھا .... اصل میں ہمیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔"

"ہاں" وہ اپنے دھیمے لہجے میں بولا "ہمیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔"

ٹیکسی پھر نہیں ملی تھی۔ اور ٹیکسی کے لئے انہوں نے ایسی خواہش بھی نہیں کی۔ یوں بھی اب سڑک نسبتاً خاموش تھی اور انہیں پیدل چلنے میں ایک لطف آ رہا تھا۔

"یار طاہر" مسعود چلتے چلتے بولا "تم اس وقت کیا کہہ رہے تھے۔ اب بتاؤ۔ کیا پھر کہہ ......"

"نہیں یار۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا "وہ تو میں کچھ اس کہہ رہا تھا۔ اب کوئی قصہ نہیں ہے۔"

"خیر اس نے تو جو کیا وہ کیا، مگر" مسعود کہنے لگا "ایک غلطی تم سے بھی ہوئی ہے۔"

"کیا؟"

"نہیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔"

وہ نہایت بے تکی سی ہنسی ہنسا "پھر کیا ہو جاتا؟"

"پھر بھی ہوتا۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آدمی اس رستے پر پڑے ہی نہیں جیسے میں نہیں پڑتا۔ سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ ہی بے کار ہے۔ لیکن اگر اس رستے پہ پڑے تو پھر انتہا تک جانا چاہیے۔ چاہے انجام کچھ ہو۔ بیچ میں رک جانے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ آخر عشق اور جدال پسندی میں کیا رشتہ ہے؟"

"عشق اور جنگ" اس نے مسعود کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنے ہی طور پر کچھ کہنے لگا۔ یا شاید وہ بات بدلنے کی کوشش کر رہا تھا "بات رضا اچھی کہہ گیا۔ عشق اور جنگ۔"

"دونوں کا حاصل خانہ خرابی۔" مسعود نے ٹکڑا لگایا۔

"ہے تو سہی مگر ...."

"مگر کیا.........."

"یار دکھ کی بات کیا ہے۔"

"کیا؟"

"دکھ کی اصل بات یہ ہے کہ جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے اور عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہی کہ جنگ شروع نہ ہو مگر شروع ہو جاتی ہے لیکن اگر ختم نہ ہو تو ختم ہو جاتی ہے۔"

"اور عشق؟"

"وہ بھی۔"

"واقعی؟" مسعود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ کچھ اکھڑ سا گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "یار کچھ پتہ نہیں۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر چلتے چلتے مسعود نے کہا "تمہیں ایک خبر سناؤں۔ وہ لندن جا رہی ہے۔"

"مجھے خبر ہے۔"

"تمہیں افسوس تو ہوگا۔"

"کس بات کا؟"

"اس کے چلے جانے کا۔"

وہ ہنسا۔ "وہ تو پہلے ہی جا چکی تھی۔"

مسعود نے پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"کیا واقعی اب کوئی قصہ نہیں ہے؟"

وہ پھر اٹھ کر گیا، چپ ہوا۔ پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "یار پتہ نہیں۔"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔ چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر وہ کہنے لگا "یار بات یہ ہے کہ عشق ختم کرنے کو تو کر دو۔ مگر اس کے بعد یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں۔ علاقہ فتح ہو جائے تو بہت سی نئی الجھنیں مصروف رکھنے کے لئے پیدا ہو جاتی ہیں لیکن علاقہ بھی فتح نہ ہو اور جنگ بھی ختم ہو جائے، یہ بہت بے لطفی کی بات ہے۔ تو ہمارے ہاں سے تباہ شدہ دیوان حافظ سے صحیح فال نکالی ہے۔ کہ جنگ ہو گی؟"

مسعود زور سے ہنسا اور خاموش ہو گیا۔

دونوں دیر تک خاموش چلتے رہے۔ وہ لمبی اور کشادہ سڑک جس پر چلتے ہوئے آج اسے دوبارہ سڑک سے اتر کر چلنا پڑا تھا اس وقت خالی اور پرسکون بھی اس کوٹھی کے سامنے کاروں کی ہر وہ قطار نہیں تھی۔ دو تین کاریں کوٹھی کے احاطہ کے اندر کھڑی تھیں اور درختوں میں لٹکے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ قمقمے جھلک جھلک کر رہے تھے۔ کوٹھی کے سامنے سڑک بہت روشن نظر آ رہی تھی۔

اس نے چلتے چلتے بغیر کسی تمہید کے کہا "یار شک سی ہے۔"

"کیا؟" مسعود نے سوال کیا۔

"یہی کہ جنگ ہو گی یا نہیں ہو گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"حافظ شیرازی کی فال کے باوجود؟"

"حافظ شیرازی کی فال کے باوجود۔"

مسعود پھر ہنس دیا اور چپ ہو گیا۔

"یار مسعود تم کچھ COMMIT نہیں کر رہے۔"

"کیا کمٹ کریں یار" وہ کسی قدر بیزاری سے بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

پھر وہی چپ چپ۔ خاموش سڑک اور قدموں کی چاپ۔ رنگ برنگ قمقموں سے جھلک کرتی ہوئی کوٹھی۔ کوٹھی کے سامنے کی منور سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے سڑک خالی اور خاموش تھی اور اندھیرے میں تھی۔ اور اسے پھر جنگ کے دنوں کی خالی اور خاموش سڑک کا دھیان آ گیا۔ مگر اس وقت وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی پر وقار نظر آتی تھی اور اس اندھیرے میں کتنا شکوہ تھا۔ اور اب .... ایک خالی دو منزلہ بس شور کرتی ہوئی قریب سے گزرتی چلی گئی ...

"یار ہمیں ٹیکسی لے لینی چاہیے تھی۔"

"ہاں یار، سب کچھ زیادہ ہی الٹا ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ گئے بھی تو پیدل ہی تھے۔"

"مسعود۔" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس مرتبہ اس نے بہت سنجیدگی سے مسعود کو مخاطب کیا ہے۔

"ہاں۔"

"کیا خیال ہے تمہارا جنگ ہوگی؟"

مسعود اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا "بتاؤں اپنا خیال؟"

"ہاں۔"

مسعود کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بڑی بے چارگی کے لہجے میں بولا "یار کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

کوڑیوں کے مول

(چوتھی قسط)

بمل مترا، ... احمد سعدی

کلرک نے سامنے کے کمرے سے پکار کر کہا، شاید اتنا دیپنکر کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کر اس کے قریب آگیا۔

"کتنا دیا؟ ایک روپیہ یا آٹھ آنے ——"

دیپنکر نے بے وقوف کی طرح کرن کی طرف دیکھا۔ کرن باہر اس کا انتظار کر رہا ہے یہ بات تو وہ بھول ہی گیا تھا

کرن نے کہا ——— کیوں کیا سوچ رہے ہو؟ رسید تو دیکھوں؟ میں دو گھنٹے سے یہاں کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کر رہا ہوں، سوچا تھا کہ تم پانچ روپے وصول کر کے لاؤ گے، تم نے کہہ دیا ہے اگر وہ کتابیں خریدنے کو دیں گی۔"

دیپنکر نے کہا ——— "میں نے تو نہیں کہا ——"

"نہیں کہا؟ تو پھر کتنا چندہ دیا؟ رسید تو دیکھوں؟"

اتنی دیر کے بعد دیپنکر کو رسید بک کی بات یاد آئی۔ جیب سے نکالتے ہی کرن ورق الٹ کر دیکھنے لگا۔ آخری ورق دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا، کچھ بھی نہیں دیا؟"

دیپنکر نے کہا ——— "میں نے کہا ہی نہیں بھائی۔ چندہ کے بارے میں کہنا ہی بھول گیا۔"

"چلے جاؤ! چندہ کے لیے اس لڑکی کے گھر پہنچ گئے اور وہاں جا کر چندہ کی بات ہی بھول گئے؛ پھر تم دو گھنٹے وہاں بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ بڑا بزدل ہے؟"

کرن نے دیپنکر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں دیکھتا ہوں تم سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ میں تمہیں سبھا میں نہیں جانے دوں گا۔ اب کے الیکشن کے بعد میں خود ہی سبھا کا سیکرٹری ہو جاؤں گا۔ ایک معمولی سا کام بھی تم سے نہیں ہو سکتا؛ میں سارے راستے سوچ کر چندہ وصول کر کے لائبریری چلاؤں گا اور تم ایم اے پاس ہو گئے، یہ نہیں ہوگا ——"

اس کے بعد کچھ دیر ایک دم رک گیا، پھر بولا

"پھر اتنی دیر تک تم وہاں کیا کرتے رہے، بتلا دو مجھے بتاؤ ——"

"وہ سب دوسری باتیں تھیں!"

"دوسری باتیں؟ دوسری باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ اس لڑکی کے ساتھ تمہاری دوسری باتیں کیا ہو سکتی ہیں، وہ لڑ

میری ماں اور ہم لوگ غریب ملازموں کے ساتھ امیروں کی لڑکیوں کی کیا باتیں ہو سکتی ہیں؟ میں بھی تو سنوں؟"

"تم نہیں جانتے" دیپکر نے کہا ——— "کمو دیدی بہت اچھی لڑکی ہے، وہ بڑے آدمیوں جیسی نہیں ہے۔"

"بڑے لوگ بڑے لوگوں جیسے نہیں ہوتے؟ کیا معنی؟ سب بڑے لوگ ایک ذات کے ہوتے ہیں، وہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ بھوجو دا کہتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہی جو بڑے لوگ ہیں وہی ایسے ہی ہیں، انگریز جب سے یہاں آئے ہیں تب سے بڑے لوگوں کی بھلائی کر کے غریبوں کے سر پر لات پھیرتے رہتے ہیں۔ بھوجو دا تو جھوٹ نہیں بولتے، بھوجو دا جیسا ایماندار آدمی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا، انہیں سب کچھ ازبر ہے، انگریزی، جرمنی، فرنچ، نیپالی، برمی، تمام زبانیں بھوجو دا گھول کر پی چکے ہیں ———"

دیپکر نے اس کی باتوں پر کان ہی نہیں دھرا۔

"نہیں، تمہیں نہیں معلوم، کمو دیدی بہت مصیبت میں ہے۔"

"مصیبت؟ کیسی مصیبت؟ اتنا روپیہ ہوتے ہوئے کیسی مصیبت؟"

"ہاں بھائی، بہت بڑی مصیبت میں ہے، کمو دیدی کی تکلیف دیکھ کر مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"

کرن نے کہا ——— "خاک مصیبت میں ہے، مجھے ہی دیکھو نا، مجھ سے زیادہ مصیبت اور تکلیف بھی کسی کو ہو سکتی ہے!"

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا بھائی، لیکن کمو دیدی کی زندگی ہم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ باہر سے وہ رنگین ساڑی پہنے رہتی ہے، بس میں بیٹھ کر کالج جاتی ہے، ہنستی ہے، باتیں کرتی ہے، بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہے، کالج میں پڑھ رہی ہے، رقص کرتی ہے، لیکن اندر ہی اندر وہ بہت زیادہ دکھی ہے، جانتے ہو ..."

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے کمو دیدی نے بتایا ہے۔"

"کیا تکلیف ہے، سنوں تو سہی؟"

"وہ بات کہنے کی نہیں ہے بھائی؟"

"کہنے کی نہیں کیا معنی؟ تکلیف کا کوئی سبب تو ہوگا؟ جیسے کھانے کو نہیں ملتا ہے یا تعلیم کے لیے روپیہ نہیں ہے یا گھر کے لوگ پسند نہیں کرتے ———"

"ایسی ہی بات ہے ———" دیپکر نے کہا۔

"لیکن گھر کے لوگ اسے کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ تمہاری کمو دیدی نے کیا قصور کیا ہے؟"

"اس نے کوئی قصور نہیں کیا، تم اسے تقدیر کا کھیل کہہ سکتے ہو، اپنی قسمت کے ہاتھوں وہ تکلیف اٹھا رہی ہے، اس کے علاوہ اس کی ماں بھی زندہ نہیں ———"

"مگر ماں تو سب کی ہمیشہ زندہ نہیں رہتی؟ ایک نہ ایک دن تو ماں مر ہی جائے گی؟ دراصل اس نے یہ سمجھا کر تمہیں بہلا دیا ہے، عورت کی فطرت کو سمجھنا بہت مشکل ہے، بھوجو دا کہتے ہیں، جانے دو، تم سے یہ سب کہہ کر کوئی فائدہ نہ ہوگا، الٹا کی

ہے؟ یہ لڑکیاں ان دونوں کی باتیں ایک ایک لفظ سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں — بار بار اس نے کتاب کے دام ادا کر دیے ہیں اور تم کو دے
پھر بھی تم اس دکان سے کچھ سستی کتابیں اور چند رسالے بھی لے گئے —"

دیکھنے کہا — "اس روز جو ایک آدمی نے تمہیں پانچ روپے دیا تھا وہ تم نے کیا کیا؟"

"وہ بھی یہیں۔ دیکھو! وہ رکھا ہے۔ ایک اسی کتاب خریدنے کا اس روپے سے میں نے چھپا کر رکھ دیا ہے۔ صرف
دیکھ لینے کی ترسیل روپے سے باقی وہ خرید لوں گی۔ کیونکہ کئی دنوں سے اس کے ساتھ یہ کتاب بھی نہیں ہے، جانتے ہو —"

سنتے ہی پیچھے ہٹ گئے وہ دونوں بہت شرمندہ ہو گئے تھے۔

کال کوٹ میں شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دکاندار لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ اس وقت بجلی کی روشنی بھی
کا پہیہ چلتی تھی۔ اس وقت لوگ میں نئی بات دے کر کے تھے اور شہر کے گرد کی گلیوں والا دوسرا پہیہ لاتا تھا۔ اس وقت چند ہی
لوگ کے مکان میں کے اندر کا منظر اٹھا تھا۔

دیکھنے پوچھا
"اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"ابھی کہیں نہیں جاؤں گا۔ ابھی وقت ہی بچے گا نہ سے بہرک لگے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ لائبریری میں چل کر بیٹھیں۔ تم مدد
چاہو تو تم کسی لائبریری میں بیٹھ کے ابھی کا بہتر وقت ہے، سب ہی پوچھتے رہتے ہیں —"

کرلائبریری کو خوب سجا رکھا تھا۔ مگر اس پیسوں سے کم کرنے سے ایک اچھا خاصا کمرہ بنا لیا تھا اور فرش پر ایک چٹائی ہوگی جیسا
بچھا رکھی تھی اور کتابوں کو رکھا۔ اس میں رسالہ رکھا تھا۔ کال کوٹ میں کتابوں کی کوئی دکان نہیں تھی۔ کتابیں خریدنے کے لیے بہت دور
جانا پڑتا تھا۔ پڑھنے کے شوقین کے لیے صرف ایک چھوٹی سی دکان تھی جو دھری کی دکان تھی۔ اسی سے چودھری کی کمپنی سے کتابیں خریدنی پڑتی تھیں۔
کچھ کتابیں پولیس ضبط کر لیتی تھیں۔ پھر بھی کرو نے کئی کتابیں خرید لی تھیں۔ جیسے سرکار کی "اوتار" اور "جوالا مکھی" (سرخ دنیا) اور کرشن داس
کی سوانح عمری۔ "بیگم قوم کے ہیرو" جو اسی وقت چھپی تھی۔ "گلیور کے سفر" اور "کنگ" اس کے علاوہ "راجستھانی کا سفر" اور "آرکنات" وغیرہ کی

J. T. Sunderland اور India in World Politics

Catalogue کے ذریعے ایک چھوٹا نام تھا "India in Bondage" .

ضبط شدہ بہت سی کتابیں ہیں جن سے کچھ لوگ ملتا تھا وہ کتابیں لایا تھا۔ کرو نے بہت دنوں تک لائبریری کے فرش
پر بچھی چٹائی پر بیٹھ کر بیٹھے بیٹھے بہت سارے خواب دیکھے تھے۔

اس نے کہا تھا — "مجھے دیر سے معلوم ہوا ہے کہ کتابیں پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جتنی کتابیں پڑھو گے
اتنا ہی معلومات میں اضافہ ہوگا۔"

کرو ان دنوں کئی کتابیں پڑھتا تھا۔ وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر ہر روز تبصرہ کرتا تھا۔ انقلاب روس کی تاریخ اور انقلاب فرانس
کی کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ رات ہو جاتا تو اسے لگتا کہ وہ دیکھے کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔

وہ پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا۔
"کیا بات ہے؟ بہت خوش ہو رہے ہو، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
کرن کے بابا کی طبیعت اچھی ہو گئی کیا؟ کرن کا اپنا مکان ہو گیا؟ کرن کو ملازمت مل گئی؟ نہیں، یہ سب کچھ بھی تو نہیں ہوا۔
"سچ کہتا ہوں، میں نے ایک ایسی کتاب پڑھنا شروع کی ہے کہ تم پڑھو گے تو چونک اٹھو گے ——"
"کون سی کتاب ہے؟"
کرن کتاب دکھاتا۔
"بھوجوا نے مجھے پڑھنے کے لیے دی ہے، یہ دیکھو۔"

وہ کون سی کتاب تھی، کیا نام تھا، کس کی لکھی ہوئی تھی، اب یاد نہیں رہا۔ شاید کوئی فرانسیسی مصنف تھا، اسی کی سوانح عمری تھی، جہاں تک یاد پڑتا ہے [illegible] کی سوانح عمری تھی۔ کرن کے بھوجوا پتہ نہیں کہاں کہاں سے ایسی انوکھی کتابیں لا کر کرن کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے، وہ سب کتابیں تو اب دکھائی ہی نہیں دیتیں۔

کرن نے کہا —— یہاں سے پڑھ کر دیکھو، کیا خوب لکھا ہے ——

وہ نہ جانے کب کس صدی کی بات تھی۔ ۱۷۸۹ عیسوی میں ایک وقت ایسا تھا جب وہاں کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں دنیا میں مشینی تہذیب کے نمود کے ساتھ ہی ساتھ فرانس نے اور ایک نئی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ ان دنوں فرانس کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہاں کے مزدور داد بھی اسی طرح دیوتا کے مندر میں جا کر گاؤں کو فریب دیتے تھے۔ وہاں کی جنتا بھی تعلیم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے جاہلیت اور غلط رسوم کے اندھیرے میں [illegible] شرمناک کہانیاں بھری زندگی گزار رہی تھیں۔ وہاں بھی فرانس میں بھی [illegible] کی طرح [illegible] تھا۔ وہاں کی بیشتر [illegible] میں بھی [illegible] نہیں تھی۔ تعلیم عام نہیں تھی، تہذیب عام نہیں ہوئی تھی۔ سبھی لوگ [illegible] بیٹھ کے مر جانے پر وہاں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ سبھی لوگ ٹھیک یہاں کے لوگوں ہی کی طرح بے [illegible] سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تحریک چلتی تو پھر نکلتے اور تحریک ختم ہو جانے کے بعد پھر غم بیٹھ جاتے۔ وہاں بھی کمیٹی دیتی [illegible] ریلیاں چھاپ کر چھپنے والوں کو پالیسی دیتیں اور انہیں بہلا پھسلا کر [illegible] کے پاس بھیجتی تھیں۔ وہاں بھی کرن راستے میں کھڑے ہو کر [illegible] تھا اور دیکھتا کہ [illegible] دوسروں کا کھانا چھین کر [illegible] انسان بنانے کے خواب دیکھتی تھی اور وہاں بھی جو بڑے لوگ تھے، جو [illegible] کی طرح امیر تھے، جو [illegible] کے جانوروں کی طرح سرمایہ دار تھے، وہی کھا پی کر [illegible] اور چاول [illegible] کی طرح [illegible] کے محل پر جو غریب رہتے تھے —— [illegible] تو اب غریب رہتے تھے، غریب رہتے تھے، وہ غریب غریب رہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عزت، ثروت، اثر، کردار، قوت اور بقا کے دام غریب رہتے تھے۔

کرن نے کہا —— ہو بہو ہم لوگوں کے ساتھ مل جاتا ہے نا، ہوں؟

واقعی بڑی ہی مماثلت تھی۔ وہاں بھی چوروں کے علاقے میں جیسے لوگ بستے تھے، محل پر [illegible] بڑی بڑی کوٹھیوں میں صاحب

[illegible] نے 'بیوٹیفل ینگ مین' سے واشنگٹن کی عظیم الشان کرسمس سالگرہ [illegible] سال بھر میں صرف ایک بار [illegible] ہوتی تھی اور
[illegible] کے استقبال کے لیے سال بھر [illegible] ہزاروں [illegible] بیچ [illegible] صاف کرتے تھے اور [illegible] کے
[illegible] امیر [illegible] اختیار کر لیا [illegible] کرنے کے لیے ایک [illegible] وہاں
[illegible] کسی کا دل [illegible] تھا اس صاحب کے [illegible] ہزار [illegible] پانسو [illegible] ——

کرشن نے کہا —— "دیکھا، [illegible] صاحب کے حالات ہیں یہ تو ——"

ویکٹر پڑھتا گیا۔ وہاں جو عجیب و غریب تماشے پیش ہوتے تھے، وہاں کے لوگ بھی [illegible] کو کھانے کو ترستے تھے اور
[illegible] سے اپنا پیٹ بھرتے تھے اور ان کے [illegible] گھر میں [illegible] کر
[illegible] دروازوں پر [illegible] دیتے تھے۔

"اس کے بعد اور بھی بہت کچھ ہے، پڑھ کر دیکھو۔"

پھر ویکٹر نے [illegible] فرانس کی داستانِ انقلاب [illegible] پڑھی تھی [illegible] بار [illegible]
[illegible] انقلاب [illegible] کی تاریخ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] داستان تھی۔

ایک جگہ سرخ پنسل سے نشان لگایا ہوا تھا۔

ویکٹر نے پوچھا تھا —— "یہاں نشان کیوں لگا ہوا ہے، کس نے لگایا ہے؟"

کرشن نے کہا تھا —— "سمجھو ذرا، پڑھ کر دیکھو ——"

اور ویکٹر پڑھنے لگا۔

Robespierre نے کہا تھا —— ——

"When I see the poor without the clothing and without the shoes which they themselves are engaged in making, and contemplate the small minority who do not work and yet want for nothing, I am convinced that Government is still the old conspiracy of the few against the many, only it takes a new form— ——"

"بہت خوب، کیا کہتے ہو؟"

اس کے بعد ویکٹر نے کرشن سے پوچھا۔

"Conspiracy کے معنی کیا ہیں؟"

ویکٹر نے جواب دیا ——

سدوش ؟

کرن نے کہا —— ٹھیک ہی کہا ہے، لیکن تو ظاہر میں سبھی تقریریں جا کرتے ہیں دکھانے کے لیے، ورنہ یہ سرمایہ دار سبھی ایک سے ہیں، یہ سبھی —— گینڈوں کی جماعت کے ہیں ——

دیپک نے کہا —— لیکن مکھو دیدی ان سے مختلف ہے۔

کرن نے کہا —— دیدی، یہ سب ان کی سازش ہے، جو کچھ تمہاری مکھو دیدی کہتی ہے، وہی پالتا بھی ہیں یا تم خوبصورت چہرہ دیکھ کر پھسل جاتے ہو، دیکھ لو گے تمہارے کاکا بابو چندہ نہیں دیں گے، وہ ہرگز چندہ نہیں دیں گے ——

لیکن نہیں، اس روز دیپک کا ایک ملتے ہی ہیں کاکا بابو سے ملاقات ہو گئی، شام کے وقت وہ دفتر سے لوٹ رہے تھے اور اس روز ان کے کپڑے بھی صاف ستھرے تھے، اکٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور سر پر ہیٹ تھا۔

انھوں نے کہا —— ارے دیپو بابو ——

دیپک ان کے نزدیک جا کر بولا ——

"آج آپ بہت سویرے واپس آ گئے؟"

"آدمی کا نہیں، کام نہیں رہے گا تو گھر نہیں آئے گا؟"

ایک بار اس کے جی میں آیا کہ وہ پوچھے، کاکا بابو کیا کام کرتے ہیں، کس دفتر میں ملازم ہیں، لیکن اس کے بعد ہی اُسے چندے کی بات یاد آ گئی۔

"کاکا بابو ہم لوگوں کو آپ چندہ دیں گے؟"

"چندہ؟ کیسا چندہ؟"

"ہم لوگوں کی لائبریری کا ——"

"تم لوگوں نے کیا لائبریری قائم کی ہے؟ خوب، خوب، اچھی بات ہے۔"

کاکا بابو نے حوصلہ افزائی کی۔ دیپک ان سے باتیں کر رہا تھا اور کرن اس کے قریب ہی چپ چاپ کھڑا تھا، کاکا بابو کی حوصلہ افزائی کے بعد وہ زیادہ خاموش نہ رہ سکا۔

"کاکا بابو میں اس لائبریری کا سیکرٹری ہوں اور دیپو صدر ہے ——"

"یہ بات ہے، واہ، بہت اچھی بات ہے، تم لوگوں نے کہاں لائبریری کھولی ہے؟"

کاکا بابو نے بہت ساری باتیں دریافت کیں، کتابیں پڑھنا بڑی اچھی عادت ہے، دنیا میں کتنی ساری بہترین کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان کتابوں کا شمار کرنا ممکن نہیں، دنیا میں انسان بننے کے لیے کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

کاکا بابو نے کہا ——

"میں تمہاری لائبریری ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں، دیپو بابو ——"

"ابھی نہیں ——"

ویشیشور نے کہا ——

"ہم لوگوں نے پانسو کتابیں جمع کر لی ہیں، مزید کتابیں خریدیں گے لیکن آپ کچھ چندہ دیں ڈاکٹر جی ——"

"میں چندہ دوں گا، کتنا دینا ہوگا؟"

ویشیشور اس سوال کا جواب نہ دے سکا، جتنا زیادہ دیں گے اتنا ہی اچھا ہے، ایک روپیہ طلب کرتے یا دس روپیہ یہ سوچنا

لیکن اس نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"آپ دس روپے دیجیے گا ڈاکٹر جی ——"

ڈاکٹر نے کہا ——

"اچھا، میں دس دوں گا ——"

گروہ نے کہا ——

"آپ اسی وقت لائبریری میں چلیے، افتتاح کیجیے گا، آپ نے وعدہ فرمایا کہ ہم اسے اور بھی بڑی کر دیں گے، آپ کا

دلوں کے تمام ہم ہمارے مستقبل کا منصوبہ ہے، آپ چلیے، دیکھ لیجیے گا ——"

ڈاکٹر اسی حالت میں لائبریری دیکھنے چلے گئے۔

ایشور چندر ابھی بہ دامن ہو کر نیپال پہنچا۔ وہ اسٹریٹ کی گلی کے اندر بستی کے بالکل قریب لائبریری قائم تھی۔ وہاں سوت کا

پرانا تھا۔ سارا علاقہ اندھیرا، کچھ سنبھالا نہ دیتا تھا۔ بہت دور جلتی ہوئی گیس بتی کی مدھم سی روشنی کہیں کہیں پڑ رہی تھی، ان

علاقوں کا لائبریری کی بستی کی یہی حالت تھی۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ٹوٹی پھوٹی اینٹیں، سب کچھ پر انا ہو رہا تھا، ڈاکٹر کے چلتے ہوئے

ویشیشور کر تیزی شرم سار ہو رہی تھی:

گروہ نے کہا ——

"ہمارے پاس سو روپے جمع ہو جائیں پھر ہم دوسری جگہ کرایہ پر کمرے لیں گے، ابھی پہلے پہل شروع کیا ہے اس لیے..."

ڈاکٹر کو کوئی اعتراض نہیں تھا، انھوں نے کہا ——

"اس سے کیا ہوتا ہے، بہانے کہاں سے تو کہیں شروع ہوتے ہیں ——"

اس کے بعد وہ لوگ اس کمرے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے، دیوار پر دیکھ کر ڈاکٹر کچھ سوچ کر بولے ——

"شاید یہی تمھاری لائبریری ہے؟"

سامنے ہی سائن بورڈ لٹکا ہوا تھا، جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "— لائبریری" لکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا ——

"وہ سکے ساتھ لیا نہیں جا سکتا؟"

کرن نے کہا ——

"پہلے ہی لائبریری [illegible]، آپ نے ساتھ ٹھیک کر لیے گا۔"

[illegible] کو یاد آ گیا کہ اسے شرم بھی آئی اور ہنسی بھی اور فکر بھی ہوتا۔ لیکن اس وقت تو دیکھ کر معلوم نہیں [illegible] دلچسپی سے اس کی لائبریری دیکھنے کیوں جا رہے تھے؟ آفس سے گھر واپس آنے کے بعد بھی بستی میں پیدل ہی گھوم کر پہنچ گئے جو تھے وہ وہاں کیوں چلے گئے تھے؟ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی لائبریری ایک دن اس کے لیے مصیبت کا سبب بن جائے گا اور وہ لائبریری کرن کی زندگی میں تباہی لے آئے گی۔

ٹاٹا بابو نے کہا —— "وہ بہت اچھی لائبریری ہے۔ یہ لائبریری تم لوگ ہی چلا رہے ہو شاید؟"

کرن نے جلدی سے کہا —— "اس میں یہ سیکرٹری ہیں اور میں پریسیڈنٹ ہے ——"

لالٹین کی روشنی میں ٹاٹا بابو ایک ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ فرش پر پرانی بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ مٹی کا برا حال اور پہلے سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور اس روز اس متعلق آپ [illegible] لالٹین کی دھندلی روشنی میں ٹاٹا بابو کا جوش، ان کی دلچسپی اور شوق تجسس دیکھ کر دیپک اور کرن کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ چندہ تو بہتوں نے دیا تھا۔ زبانی ہمدردی بھی بہتوں نے جتائی تھی اور راستے گھاٹ میں بہتوں نے جس طرح ان کی ہمت افزائی کی تھی، بہتوں نے حوصلہ افزائی بھی کی تھی، لیکن ٹاٹا بابو کی طرح کسی نے بھی جوش، دلچسپی اور شوق تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے لائبریری میں قدم رکھ کر اس کی عزت بڑھا دی تھی اور [illegible] شکریے سے دبا جا رہا تھا۔

کرن نے کہا —— "ٹاٹا بابو! آپ ہم لوگوں کے پریسیڈنٹ ہو جائیے۔ آپ پریسیڈنٹ ہو جائیں گے تو ہم لوگوں کو بڑی آسانی ہو جائے گی ——"

ٹاٹا بابو نے پوچھا —— "کون کون ممبر ہیں؟"

"سبھی کو ممبر بنا لیا ہے ٹاٹا بابو" کرن نے جواب دیا —— "ڈونی، ٹاٹا، پنچا، اچھو، نے دا، ہمارے جتنے کلاس فرینڈ ہیں، بیر بشر پات [illegible] چندی [illegible] کمال سب کو۔"

ٹاٹا بابو نے پوچھا —— "اور محمود بھٹاچاریہ؟"

دیپک نے کہا —— "اس کو تو محمود نے ممبر بننے ہی نہیں دیا۔"

کرن نے کہا —— "میں محمود کے پاس بھی گیا تھا، محمود کا کہنا ہے کہ [illegible] ——"

"تمام ممبر یہاں آتے ہیں؟" ٹاٹا بابو نے پوچھا۔

"کوئی نہیں آتا ٹاٹا بابو، میں دیکھ کے لائبریری [illegible] بتاتا ہوں، کوئی نہیں آتا، روپیہ بھی نہیں آتا ——"

ٹاٹا بابو نے کہا —— "ٹھیک ہے، اب میں آیا کروں گا۔"

[illegible] نہیں ہے؟

[illegible] —— [illegible]

سر.....

"آپ نے [illegible] —— [illegible]

کتابیں تو ہیں لیکن ہم سب [illegible] نہیں سکتے؟"

اس کے بعد [illegible] —— ایک دوسرے کے پاس [illegible]

[illegible] ۲۲ بابو [illegible]

۲۲ بابو کی بہت عزت [illegible] گیا ہے

بہت دنوں کے بعد [illegible] کر

گیا [illegible] —— [illegible] ۲۲ نام [illegible]

ہندوستان [illegible]

نہیں [illegible]

[illegible] لائبریری [illegible]

[illegible] ۲۲ بابو [illegible]

[illegible] دنیا [illegible]

[illegible]

۲۲ بابو سب کچھ حیرت سے سنتے رہے، پھر بولے ——

"تم کتابیں پڑھتے ہو؟"

کرمو نے کہا —— "مجھے پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے ——"

۲۲ بابو نے کہا —— "بہت خوب!"

دیپک نے کہا —— "آپ کو معلوم ہے ۲۲ بابو [illegible]

[illegible] ہو سکا۔"

۲۲ بابو نے گمبھیر لہجے میں کہا —— "ہوں، میں سمجھ گیا۔"

دیپک کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا، اس نے کہا —— "کرمو سے میری [illegible] ہم دونوں نے مل

کر یہ لائبریری قائم کی ہے۔"

کرمو [illegible] اس نے کہا —— [illegible]

جانتے ہیں۔ ہمارا ملک نہیں جانتے، اسی لیے ہم ملک میں ... جتنی کم لائبریریاں ہوں اتنا ہی اچھا ہے! اسی لیے ہم لوگوں نے بھی یہ لائبریری کھولی ہے۔

کالا بابو نے ایک دم پوچھا ——

"یہ سب باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں؟"

گرو نے جواب دیا —— "سکھانے کا کون؟ کالا بابو، سبھی تو جانتے ہیں، اب دوران یہ بات تو سبھی جان گئے ہیں، انگریز ہم لوگوں کے دشمن ہیں۔ ابھی اس دن جلیانوالہ باغ میں کتنے ہی لوگ مارے گئے ہیں۔ ... کوشش کرنے والے کو پھانسی کی سزا ہوئی ہے، بہت سے لڑکے قید کاٹ رہے ہیں، یہ سب کس لیے، بتائیے؟ یہ بھی تو انگریزوں ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ لائبریری کے ذریعہ اگر تمام لوگوں کو یہی بات سمجھا دی جائے..."

دیپنکر نے کہا "یہ باتیں اسے سمجھدار نے بتائی ہیں۔"

"سمجھدار کون ہے؟"

کالا بابو کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔

"گرو سے پوچھو نا؟ بہت لکھا پڑھا معلوم ہوتا ہے!"

دیپنکر نے کہا —— "ہاں، بہت لکھا پڑھا ہے، میرے ساتھ ابھی تک باتیں نہیں ہوئی ہیں، گرو پہچانتا ہے، گرو

کے ساتھ اس کی باتیں ہوئی ہیں۔"

کالا بابو کسی سوچ میں پڑ گئے۔

"بہت اچھا، بہت اچھی بات ہے، تمہاری لائبریری دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

آج تک بھی یاد ہے، کالا بابو کی دلچسپی دیکھ کر دیپنکر کو اس دن بڑی خوشی ہوئی تھی، اس کا حوصلہ کافی بڑھ گیا تھا۔ جس گرو کو سبھی حقیر سمجھتے تھے، جس گرو کو سبھی نظر انداز کر دیتے تھے، نفرت کرتے تھے، اسی گرو کو کالا بابو نے پہچان لیا تھا۔ دنیا میں سبھی لوگ جو کچھ چاہتے ہیں، روپیہ، عزت، ملازمت، گرو وہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا۔ گرو صرف لائبریری کو قائم کرنا چاہتا تھا، اسے مستحکم اور دیرپا بنانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی "دی کالی گھاٹ جونیئر لائبریری" کا نام کلکتے بھر میں مشہور ہو جائے اور ایک روز جانا مانا امپیریل لائبریری ... یا انہیں جیسا کوئی اس کی لائبریری کا مقام ہو۔ کالی گھاٹ کا نام چاروں طرف پھیل جائے، نیپال بھٹاچارجی اسٹریٹ کا نام چاروں طرف مشہور ہو جائے۔ اور سبھی لوگ لائبریری میں کتابیں پڑھنے کے لیے آتے رہیں، اس طرح کے بعد ایک دن سوراج آ جائے۔ سوراج صرف کلکتے ہی میں نہیں، سوراج صرف کالی گھاٹ ہی میں نہیں، ساری انسانیت کے لیے سوراج آ جائے، ... پچھڑے، ہندو مسلمان، ہر کسی سبھوں کے لیے سوراج آ سکے!

کالا بابو کو کافی دیر ہو گئی تھی، انھوں نے کہا ——

"اچھا اب میں چلتا ہوں، کیوں؟"

گرو نے کہا —— "پھر آئیے گا کالا بابو!"

[illegible]

اس کے بعد جب [illegible] ... نہیں
آیا تھا۔ وہ صبح بھی سنسان تھا کہ ٹاٹا بابا [illegible] آئے [illegible]
دیکھنے کرن کے چہرے کی طرف دیکھا' پیشانی پر [illegible] خوشی [illegible] کو
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' وہ خوشی سے ایسے جیسے [illegible] ہو گیا تھا اور اس کی دونوں آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔

جاتے جاتے ٹاٹا بابا بولے کہا۔

"تم مجھے ایک بار اپنی صورت دکھا دو۔"

"کب ٹاٹا بابا؟"

"آج رات' کچھ دیر بعد" ٹاٹا بابا نے کہا۔

ٹاٹا بابا چلے گئے اور کرن [illegible] اس کے بعد واپس [illegible] ایک چند لمحوں کے لیے
جیسے گم سا گیا' پھر [illegible] پر ناچنے لگا۔ چونکہ بابا کے [illegible] میں
جب خوشی کے [illegible] وقت [illegible] ناچنے لگتے ہیں' اسی طرح وہ بھی ناچنے لگا' دیکھ کر بھی بے حد مسرور تھا
لیکن کرن کو [illegible] اس کی [illegible] سے [illegible]
اچھل کر پورے جوش و خروش کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اس کی حالت پر دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"کرن" اس نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔

لیکن کرن کا دھیان اس طرف نہیں تھا' وہ ناچ رہا تھا' دیکھ کر [illegible] جیسے اپنے [illegible] بے دم ہو کر وہ
[illegible] پر گر نہ پڑے؟

وہ اسے سنبھال دینے کے لیے آگے بڑھا۔

"رک جاؤ' رک جاؤ کرن۔"

اس نے جلدی سے [illegible] کرن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کرن کی حالت [illegible] خوشی کے [illegible]
رہا تھا۔

"رک جاؤ کرن۔"

"چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔"

دیکھنے [illegible] —— [illegible]

کرن رک گیا —— "میں کیا کروں بتاؤ؟ —— [illegible]"

"کیوں؟"

کروہ کی حالت واقعی پاگلوں جیسی تھی۔

"مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے بھائی، میں کیا کروں بتاؤ تو؟"

دیپنکر نے کہا ——— "تم اپنا منہ بند کرو، تمہاری حالت دیکھ کر تو یہی لگے گا کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"مجھے وہ آج میں کھانے کا بھی نہیں، سونے کا بھی نہیں، میں تمام رات جاگتا رہوں گا، تمہارے کاکا بالکل اچھے آدمی ہیں بھائی، تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا تھا؟ میں نے جھوٹ موٹ انہیں برا آدمی کہہ کر گالی دی ہے۔"

کروہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر دیپنکر کو سخت حیرت ہوئی، انسان لاٹری میں ایک لاکھ روپیہ انعام پا کر بھی اس طرح دیوانہ نہیں ہوتا۔ دیپنکر نے کروہ کو زبردستی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"ارے جاؤ، ارے جاؤ، چپ رہو۔"

مجھے یاد ہے اس دن کروہ کو سر درد دیکھ کر دیپنکر بھی خود کو سنبھال نہ سکا تھا، لیکن اس دن دیپنکر کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں۔ اتنی جلدی سے رائے قائم کر کے اس آدمی کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے، جنہوں نے ہم آدمیوں کو چندہ دیا ہے، وہ مشہور وادار، جس کے ساتھ خضر پور کے راستے میں ملاقات ہوئی تھی، ایک بات پر اس نے پانچ روپیہ چندہ دے دیا تھا۔ دکان میں سے جا کر سندیش، رس گلا اور راج بھوگ کھلایا تھا۔ لیکن اس روز تو کروہ اس طرح خوشی سے بے قابو نہیں ہوا تھا اور جنہوں نے کچھ بھی نہیں دیا تھا اور پولیس سے پکڑوا دینے کی دھمکی دی تھی ——— وہ سب کیا خراب آدمی تھے؟ اس کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ کون اچھا ہے اور کون خراب؟ روپے کے پیمانے سے؟ روپے سے انسان کی انسانیت میں کمی ہو جائے گی؟ وہ مگس والا اگر پانچ روپیہ چندہ دے دیتے تو وہ بھی کیا ایک ہی طرح میں کروہ کی نگاہ میں اچھے آدمی ہو جاتے کیا؟ دیپنکر نے بعد میں بہت بار بہت طریقوں سے سوچا تھا، لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا، کوئی معقول جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، اس نے سوچا تھا، وہ کون سا پیمانہ ہے جس سے وہ انسان کو پرکھ سکتا ہے؟

کروہ نے کہا ——— "بھائی، یہ تیر والی خرید دوں گا بھائی۔"

"اگر پولیس پکڑے؟"

"مجھے پتہ چلے گا؟ میں بستر کے نیچے چھپا کر رکھوں گا اور سبھوں کو پڑھنے کے لیے دوں گا۔"

دیپنکر نے کہا ——— "اب تم جا کر کھانا کھاؤ، میں گھر جاتا ہوں۔"

اس وقت باہر دوپہر تاریکی چھائی ہوئی تھی، کروہ لائبریری میں تنہا بیٹھا رہا، شاید اسے خوشی کے مارے آج کھانا بھی نہیں کھایا گیا، شاید سونے کا بھی نہیں، واقعی تو، یہ کس نے سوچا تھا کہ کاکا اب اس طرح اس کی لائبریری کی مدد کریں گے، اس طرح لائبریری میں آ کر اس کی بہت عزت افزائی کر جائیں گے، اور جب کاکا ممبر بن گئے ہیں تو محلے میں دوستی بھی ہو جائے گی، سبھی ممبر ہوں گے تو کیا اب اسے کوئی فکر نہیں، سب سے پہلی کوئی فکر نہیں، روپے ہونے کے بعد وہ دونوں الماریاں خرید لیں گے، اور بھی کتابیں خرید لی جائیں گی، لائبریری کا بھی نئے سرے سے بنایا جائے گا، ایک ہزار روپے سے ایک نیا کمرہ بنایا جائے گا اور اس لائبریری کے سامنے نئے سرے سے فٹ بال

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible]

اس واقعے کی یاد دیجکر کی ایک یادگار تھی۔

یہ اس نے اگست کے مہینے میں بیٹھ کر ... کی روانی میں تھے پڑھتے دیکھا ایک جگہ پہنچ کر رک گیا تھا۔

ایک روز ... نے اس دوست سے پوچھا تھا ——

"مجلس، اس سمندر میں، اس وقت ... ہے ... قابل ... عمل ... مذہبی ... سچا عشق ... زبان ... نفس کشی ... ہوا ... دو ... ان اور مروجہ دستور کا ... ہو؟"

مارکس کے اس سوال پر دیجکر نے بھی غور کیا تھا۔ ... تھا ... تین ہزار سال پہلے کی بات تھی۔ ... کر چند نہیں ... ایک سادہ سا تھا۔ اس زمانے میں دنیا کے اس قدیم زمانے کے ... کرنے کے ... یہ سوال ... تھا ... کے زمانے میں ... نے ... یہ سوال کیا تھا۔ اس وقت ... تھی اس کے بعد ... نے ... ایک ... گئے ... تھے ... بیت گئے ... سوال ... مادی ... اس کے بعد ... آئے اور گزر گئے۔ سقراط سے ... تک ... مارکس ... صاحب آیا ... صاحب آیا ... انسانوں کی ... کرتا ... کی ... یہ سوال ... تھا۔ اس ... سوال کے ...

کے دیجکر نے ... تھا ... اس سوال کا جواب کہاں ... سکا۔

پہلی مرتبہ اس نے کہا —— "یہ ... کا آئیڈیل ہے۔ مارکس نے ... اس آئیڈیل ... ہے۔"

اور ... کے پروفیسر ... نے کہا تھا —— "یہ ایک یوٹوپیا (Utopia) ہے۔"

... کی دنیا ... کا پتہ ... مشکل ہے ... کر ... کے ... تھے ... اور ... تو ... کے بعد ... جب اس نے ... تو ... دیجکر ... آئیڈیل ... ہے۔

دیجکر نے ... ایک سوال کیا تھا۔

... اس نے کہا تھا —— "میں؟"

پھر چہرے سے مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔
"تم بہت کچھ جانتے ہو دینکر!"
واقعی پہلے دینکر ان کے بارے میں جانتا ہی کیا تھا، صرف ان کی شکل دیکھ کر رہا تھا، خوبصورت سبھا صحت مند جسم تھا ان کا اور ستیہ کے قریب ساتھ ساتھ باپو کو دیکھ کر اسی وقت دینکر کو بڑی خوشی ہوئی تھی، خوشی بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی ہوا تھا۔ یہی تو ہے وہ انسان! ایک آئیڈیل انسان، اس وقت ساتھ ساتھ باپو کو دیکھ کر اسے دنیا کے تمام آدمی حقیر معلوم ہوتے تھے
انھوں نے کہا تھا ——— "اس سے خود ستائی جھلکتی ہے دینکر، خود ستائی تو انسان کو کہیں نہیں بخشتی!"
لیکن اس روز غیاں بیچارہ اسٹریٹ کی اس لائبریری سے باہر آنے کے بعد دینکر کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے دنیا میں اگر کوئی آئیڈیل انسان ہو سکتا ہے تو وہ صرف کاکا باپو ہیں اور صرف دینکر ہی نہیں اکثر نے بھی یہی سوچا تھا اور اندھیری گلی سے انہیں ایک بی ہی آتے دینکر نے دیکھا ——— دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا، دینکر اندر داخل ہو گیا، گھر والوں کی حیرت بڑھ رہی تھی نانے کے ساتھ جانے بیٹھا رہا تھا۔
"کون؟"
"میں ہوں کاکی ماں، میں دینکر دیو۔"
"اس وقت اچانک؟"
"کاکا باپو نے بلایا ہے۔" دینکر نے کہا۔
"جاؤ، اوپر جاؤ، کھمی اور ستی بھی اوپر ہی ہیں۔"
کاکی ماں اتنا کہہ کر اپنے کام میں مگن ہو گئیں، مگر کاکا کاکی ماں کے نہ سننے سے کوئی فرق نہ پڑا، پھر بھی دکھ ہی، جیسے کام کرنے میں انہیں راحت ملتی ہو اور چپ چاپ رہتا جیسے انہیں یہ تیار تھا ہو۔
دینکر نے کہا ——— "سنا ہے آپ ہو کاکی ماں، کاکا باپو ہماری لائبریری دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔"
"واقعی؟ اچھا تو ہے۔"
"لائبریری کے ممبر بھی ہو گئے ہیں۔"
کاکا باپو کے ممبر بننے کی خبر وہ سبھوں تک پہنچانا چاہتا تھا، اس کا جی چاہتا، کھمی دیدی، ستی، محلے کے تمام لوگوں تک یہ خبر وہ دوڑ کر پہنچا کر آئے
دوسری منزل پر کھمی دیدی کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، شاید ستی بھی وہیں موجود تھی، اب تک تو ستی بھی سو گئی ہو گی مگر ابھی ہوگی اور سب بیٹھی باتیں ہی کر رہی ہوں گی۔ تھوڑی دیر پہلے پھر کر جاتے جاتے ہوئے کھمی دیدی نے اس سے جو کچھ کہا تھا، دینکر کو یاد آ گیا۔ واقعی کھمی دیدی بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہے، باہر سے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا، لیکن دینکر تو جانتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ سبھی کو معلوم تھا کہ کھمی دیدی کو خط کا انتظار رہتے ہیں، شاید ستی بھی الزام دیتی ہے، ممکن ہے کسی دن ستی اس سے بھی سوال

جب تک ستی کا پتہ چلے گا ——— شاید ممی دیدی سے کچھ نہ کہا جائے ؟

دینکر دبے پاؤں زینہ چڑھ گیا۔

ممی دیدی اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ستی وہاں موجود نہیں تھی۔ ... کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی۔

دینکر نے آواز دی ——— ممی دیدی !

ممی دیدی نے کتاب سے نظریں اٹھا کر حیرت سے دینکر کی طرف دیکھا۔

بولی ——— کیا ہے ؟ تو پھر کیوں آ گیا ؟

"تمہیں معلوم ہے ممی دیدی کاکا بابو ہم لوگوں کو لائبریری کے ممبر بنا گئے ہیں۔" دینکر نے کہا ——— "انھوں نے ابھی مجھے بلایا ہے۔"

ممی دیدی چونک سی گئی جیسے وہ کسی انجانے خوف سے سہم گئی ہو۔

"بلایا ہے ؟ کیوں ؟"

"معلوم نہیں۔" دینکر نے جواب دیا۔

ممی دیدی نے پوچھا ——— "ستی سے تیری ملاقات نہیں ہوئی ؟ ستی تو تیرے ہی یہاں گئی ہے !"

"میرے یہاں ؟ ابھی ؟ کیا کرنے ؟"

"کہتی تھی تیری ماں کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

دینکر حیرت سے ممی دیدی کا منہ تکنے لگا ——— ستی اس کے یہاں گئی ہے، اس کی ماں سے باتیں کرنے ! (ہے)

دینکر نے کہا ——— "میں کاکا بابو سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے تجھے یاد ہے نا ؟" ممی دیدی نے پوچھا۔

"یاد ہے ممی دیدی۔"

ممی دیدی نے پھر یاد دہانی کرا دی، بولی ——— "اگر پوچھے کہ تم میرے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں، تو کہہ دینا میں کچھ نہیں جانتا۔ سمجھ گئے نا ؟"

"دیکھو بھول مت جانا ؟"

"نہیں بھولوں گا۔"

"جھوٹ بولو گے نا بچے ؟"

آن کی آن میں دینکر زینہ طے کر کے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری منزل پر اس وقت کاکا بابو کپڑے تبدیل کر کے سامنے بیٹھے شاید کچھ کام کر رہے تھے۔ دینکر کے قدموں کی آواز سن کر انھوں نے فائل ایک طرف سرکا دی اور اسے (سے) دیکھتے ہی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ...

"بیٹھو!"

دیپنکر کرسی پر بیٹھ گیا، لیکن کاکا بابو کا چہرہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی، اُن کا چہرہ اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ قدرے سنجیدہ تھا۔

انھوں نے کہا ـــ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسی لیے تمھیں بلایا ہے۔"

دیپنکر نے کہا ـــ "آپ کے بلانے کے بعد کرن آنے والا تھا۔"

"کیوں؟"

"اُسے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی ہے کاکا بابو، ہم لوگ بڑی مشکل سے لائبریری چلا رہے ہیں، خاص طور سے کرن بڑی محنت کر رہا ہے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو، خود نہ کما کر وہ لائبریری چلا رہا ہے، لائبریری کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے، رات سوتے میں بھی وہ لائبریری ہی کے خواب دیکھتا ہے۔"

کاکا بابو نے تمام باتیں غور سے سنیں، اس کے بعد بولے

"میں نے تمھیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے، جانتے ہو؟"

وہ قدرے رُک کر بولے ـــ

"تم کرن کے ساتھ مت رہا کرو۔"

دیپنکر کے سامنے جیسے بجلی گر پڑی۔ اُسے کاکا بابو کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیوں کاکا بابو؟" اُس نے پوچھا۔

کاکا بابو نے کہا ـــ "ہاں، میں کہتا ہوں، تم اس کے ساتھ مت رہا کرو۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو!"

کاکا بابو کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا، اتنا سنجیدہ، اتنا غمگین کہ دیپنکر کو ان کا چہرہ دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ اتنا غمگین ہوتے ہوئے تو اس نے کاکا بابو کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لیکن کرن نے تو کوئی قصور نہیں کیا ہے کاکا بابو، آپ کو معلوم ہے کتنی تکلیف سے، غربت اور افلاس کے سامنے جدوجہد کر رہا ہے، اس کی زندگی میں کتنی صعوبتیں ہیں، کتنی کٹھنائی ہے، کسی دن اس کے گھر میں کھانا نہیں پکتا، اس کے باپ آٹھ سال سے بیمار ہیں۔ اس کی ماں چٹنی تیار کرتی ہے اور وہی چٹنی بیچ کر اس کا خاندان چلتا ہے، پھر بھی چندہ والا ایک پیسہ بھی گھر میں خرچ نہیں کیا۔ اس جیسا نیک لڑکا....."

"چپ رہو!"

کاکا بابو کی آواز بڑی کرخت سنائی دی۔

بولے ـــ "تمھاری عمر کتنی ہے دیپو؟ تم ابھی کل کے بچے ہو، دنیا کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ تم نے ابھی دیکھا

کیا بات ہے؟

وہ بولی کاکا بابو کی بات کا کوئی جواب دے سکا اس پر کاکا بابو کی بات سن کر [illegible]

کاکا بابو پھر کہنے لگے —— انسان کا سب کچھ دیکھا نہیں جا سکتا، اب سے [illegible] کے بعد [illegible] نہیں ہو گا تم
سے میری بڑی زیادہ محبت ہے میں نے بہت کچھ چاہا کہ یہ بات ہو جائے مگر [illegible] کا جانا چاہتی ہو اس کے ساتھ
مت جاؤ گے؟

اپنی بات ختم کر کے کاکا بابو خاموش ہو گئے۔ دیپک کے اندر تو بہت کچھ ابل رہا تھا کہ وہ کاکا بابو کی باتوں کی تردید کر سکے [illegible]
کچھ سوچ کر وہ نیچے دیکھتے ہوئے وہ خاموش بیٹھا رہا۔

کاکا بابو نے کہا —— تمہاری ماں ہے، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے، تمہاری ماں بہت بوڑھی ہو چکی ہے، دکھ اٹھا کر وہ برسوں سے
یہاں نوکرانی کا کام کر کے تمہاری پرورش کر رہی ہے۔ کیا اس لئے کہ تم گریس کے ساتھ رہا کرو؟ کیا تمہیں ایک مرد دوسروں کی طرح جیسے
بنتا ہے ویسا ہی بننا ہے، یا ہمیشہ اسی طرح دوسروں کا محتاج بن کر رہنے سے تمہاری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا؟

اب تو دیپک اور بھی تردید کر سکا۔

کاکا بابو کہتے گئے۔ "تم گریس کا ساتھ چھوڑتے ہوئے تمہیں دکھ ہو رہا ہے، ایک دن اس سے بھی زیادہ پیاری
چیز تمہیں چھوڑنا ہو گا۔ سنسار اور دنیا کی کوئی چیز نہیں، یہ دنیا کبھی ہمیشہ جیسی دنیا نہیں رہی، عمر کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے
جائیں گے، اس دن سمجھو گے کہ میں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ غلط نہیں ہے۔"

اس کے بعد دیپک کی طرف سے منہ پھیر کر بولے ——

"اب تم جا سکتے ہو۔"

مرے ہوئے قدموں سے دیپک وہاں سے اٹھا۔ آہستہ آہستہ وہ زینے سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے سوچا، یہ کیا ہو گیا؟ گریس
کو چھوڑنا ہو گا؟ گریس نے کیا قصور کیا ہے؟ گریس کے جیسا کوئی دوست ہو سکتا ہے؟ گریس تو اس کا گہرا دوست ہے۔ بچپن سے دوست
سے بھی بڑھ کر ہے۔ ایک دن بھی وہ گریس کو دیکھ نہیں پاتا ہے تو اچھا نہیں لگتا۔ وہ فرسٹ کلاس سے ایک ساتھ پڑھتا آیا ہے، ساتھ ساتھ
بڑا ہوا ہے، پڑھا ہے، کیسے ہی وہ کسی کا ساتھی ہے وہ۔ ماں بھی اس کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور نہ کر سکی، اس گریس کو دیکھے
چھوڑ دے گا؟ گریس نے کیا قصور کیا ہے؟ غریب ہونا کیا جرم ہے؟ غریب ہونا کیا گناہ ہے؟ گریس کہتا تو تھا کہ انسان کو
انسان ہی غریب بناتا ہے، انسان ہی انسان کو امیر بناتا ہے۔ پھر کاکا بابو گریس کا ساتھ چھوڑنے کو کیوں کہتے ہیں؟ اگر وہ گریس کے
ساتھ میل جول نہیں رکھے گا تو پھر کس کے ساتھ رہے گا؟ بڑے لوگ دیپک کے ساتھ میل جول کیوں رکھیں گے؟ [illegible] کیا اس
کے ساتھ تعلقات بڑھائے گا؟ وہ اس کے!! بہتر بات کیا اپنے لڑکے کو اس کے ساتھ میل جول بڑھانے دیں گے؟ چنٹو!!؟
تو [illegible] بہت ملنے نہیں دیتے، وہ اگر کبھی ملتا بھی ہے تو چھپ کر ملتا ہے، انہیں اس کا خیال نہیں ہوتا! پھر؟ پھر وہ
کیا کرے؟

دیپکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہو، تمام کشش تمام گرمجوشی یکایک سرد پڑ گئی۔ اس کے پاؤں کے نیچے کی زمین، سر کے اوپر کا آسمان اور ادھر اُدھر کی چیزیں جیسے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہوں اور وہ کسی گہری کھائی میں جا گیا ہو۔ اس کا کوئی سبب، اس کا کوئی یقین ہے؟ حالانکہ دو روز پہلے تک وہ انہیں اپنا سمجھ رہا تھا۔ یہ کاکا بابو، یہ لکشمی دیدی، یہ گھاٹ ...... یہ دھرم داس فرسٹ ماڈل سکول، یہ کالی گھاٹ کے راستے، گلیاں سب کچھ جیسے اس کے اپنے تھے۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل بھی اس کے اپنے تھے۔ سورج بھی اپنا تھا، ادھر کے پیڑ کی شاخ پر بیٹھا ہوا کوا بھی اپنا تھا اور راستے اور گلیوں میں گھومتے پھرنے کتے بھی اپنے تھے۔ کسی سے محبت یا نفرت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں جو کچھ اچھا تھا، یا جو کچھ برا تھا، اس دنیا میں جو کچھ چھپا تھا اور جو کچھ بڑا تھا، جو کچھ ادنیٰ تھا اور جو کچھ اعلیٰ تھا، دیپکر تو ان سب سے وابستہ تھا۔ دیپکر کی وابستگی تو ان سبھوں سے تھی، لیکن آج کاکا بابو کی باتوں سے جیسے اس مستقل بندھے ہوئے رشتے میں یکایک شگاف پڑ گیا تھا۔ دیپکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گم ہو گیا ہو، اور سب کچھ رہ گیا ہو۔ گھر، در اور لکشمی دیدی، کالی مندر، چھوٹا سا محلہ، جیسے صرف وہ گم ہو گیا ہو، نہیں کھو گیا ہو، جیسے اس دنیا سے وہ روپوش ہو چکا ہو اور اب اسے ڈھونڈنے سے بھی وہ نہیں ملے گا۔ کوشش کے باوجود اب کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا

"دیپو!"

دوسری منزل کے برآمدے پر آتے ہی لکشمی دیدی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی اتنی دیر سے جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ قریب آ کر اس نے دھیرے سے پوچھا ——— "اتنی دیر تک کاکا بابو کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

دیپکر کی آنکھوں میں فکر کا سایہ تھا۔ لکشمی دیدی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولی ——— "تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"لکشمی دیدی ابھی میں سیدھا گھر جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"کیوں، تمہیں کیا ہوا ہے؟ کاکا بابو اتنی دیر سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا لکشمی دیدی، ابھی میں گھر جا رہا ہوں۔"

لکشمی دیدی حیرت زدہ سی کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

دیپکر نے کہا ——— "تم کچھ خیال مت کرنا لکشمی دیدی۔ ابھی مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر لکشمی دیدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے برآمدے کو پار کر گیا اور زینے سے نیچے اترنے لگا۔ آج دیپکر کی نگاہ میں یہ مکان اجنبی سا لگ رہا تھا۔ اتنے دنوں تک اس مکان کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اس کا دل رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تمام بندھن تمام کشش ایک پل میں ٹوٹ کر تتر بتر ہو گئے ہوں اور صرف اسی گھر پر نہیں بلکہ اس دنیا پر، اس سرزمین پر اس کا کوئی حق نہ رہا ہو۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دیپکر سیدھا راستے پر باہر کھڑا ہو گیا۔ پیشور گھوش لین پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں نے بہت اتنی دیر میں دیپکر نے پہلی بار ہر چیز کو صاف طور پر دیکھا۔ اس نے خود کو اندھیرے میں آ کر دیکھ لیا۔ اتنی دیر تک کاکا بابو

یہاں [illegible] پاس کی کھائیوں سے بھی ہو گیا تھا۔

"حیرت ہے! تم یہاں ہو! اندر تمھاری ماں انتظار کر رہی ہے!"

سامنے ستی کھڑی تھی۔

ستی دروازے پر تھی اور وینکٹ دیر تک کھڑی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں [illegible] تھا۔ ستی کے سر کے گرد گھیرے اس سانپ کی طرح پھن [illegible] تھے اور وینکٹ کو ستی کے انداز میں اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک اسے ہوش آ گیا۔

"ہاں۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا کوئی وجود نہیں ہو، جیسے اس کا وجود گم ہو گیا ہو، کہیں کھو گیا ہو اور اس دنیا میں نہ ہو، جیسے اس دنیا میں اب کوئی اس کا سراغ نہیں پا سکے گا۔

"ارے سنو تو ذرا۔"

وینکٹ کسی مشین کی طرح ستی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے کچھ دیا؟"

"ہاں اتنی دیر تک تم کہاں تھے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

وینکٹ کچھ بھی نہیں سمجھ پایا، جیسے ستی اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو۔

اس نے کہا ــــ "میں؟ مجھ سے پوچھ رہی ہو؟"

"ہاں تم سے نہیں پوچھ رہی ہوں تو پھر کس سے پوچھ رہی ہوں؟ یہاں پر تمھارے سوا اور کون ہے؟"

اتنا کہہ کر ستی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی ــــ

"تمہیں سے تو پوچھ رہی ہوں، اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"کیوں؟ تمھارے یہاں جانا گناہ ہے؟"

وینکٹ عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ کالا بابو کے یہاں اس کی آمد و رفت پر آج تک کسی نے بھی تو اس طرح اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی تو یہ سوال نہیں اٹھایا تھا۔ کالا بابو کیا اس کے دشمن ہیں؟

اس نے کہا ــــ "کیوں؟ تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟"

ستی نے کہا ــــ "بتاؤ! اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کر رہے تھے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

وینکٹ خاموش رہا۔ پھر یکایک اسے کھی دیدی کی بات یاد آ گئی۔ کھی دیدی کی تکلیف اور کھی دیدی کی زندگی کی بات یاد آ گئی۔

"بتاؤ کس سے باتیں کر رہے تھے؟ میری دیدی کے ساتھ؟"

وینکٹ نے ستی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل کی بات معلوم کرنی چاہی۔ ستی کیا اس پر شبہ کر رہی ہے؟ اندھیرے

مگر ستی کی آنکھوں کی تحریر پڑھنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا، پھر بھی وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ تاریکی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دیشو رگلیوں میں کا سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ ستی دروازہ کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑی تھی اور دیپنکر راستے میں کھڑا ہوا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا [redacted] برآمدے کی روشنی ستی کی پشت پر پڑ رہی تھی اور اس کے سر کے بالوں اور ساڑی کے آنچل پر بکھر رہی تھی۔

"بتاؤ! چپ کیوں ہو؟ پیرک دیدی سے باتیں کر رہے تھے؟"

دیپنکر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔"

"پھر کس کے ساتھ؟"

"ماما جی کے ساتھ۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

اس کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے ستی مطمئن ہو گئی ہو

بولی ——— "تم لوگ تو دیر تک گھر سے باہر تھے اور وہ تمہاری ماں بیٹھی بیٹھی تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہے، جلدی گھر جاؤ۔"

اتنا کہہ کر شاید ستی اندر چلی جاتی، لیکن دیپنکر نے یکایک ایک سوال کر دیا ——— "کیوں، اگر میں نے کسی دیدی جی سے باتیں کی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟"

ستی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ برائی ہے، لیکن دیدی کے ساتھ تم جتنی چاہے باتیں کرو، لیکن اس کو بھی پڑھنا لکھنا ہے اور تمہیں بھی پڑھنا لکھنا ہے، اتنی باتیں کرنا کیا اچھا ہے؟ تمہاری ماں کہہ رہی تھی کہ تم پڑھنے لکھنے پر بالکل دھیان نہیں دیتے!"

یکایک ستی بالکل بدلی سی لگی، جیسے یہ وہ ستی نہیں ہو۔

دیپنکر نے کہا ——— "میں تو لکھتا پڑھتا ہی ہوں۔"

"لکھتے پڑھتے ہو، میں تمہاری ماں سے سب کچھ سن چکی ہوں، محلے میں کوئی ایک لڑکا ہے جو فیل ہو گیا ہے، دن رات اسی کے ساتھ گھومتے رہتے ہو، میں سب کچھ سن چکی ہوں۔"

یکایک دیپنکر نے دوسرا سوال کر دیا۔

"تم پالکی سے یہاں کیوں آئی تھیں؟"

"کیوں، نہیں آنا چاہیے؟"

دیپنکر نے کہا ——— "میں یہ نہیں کہتا، لیکن تم اچانک یہاں کیسے آ گئی تھیں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

اب کے ستی اس کی بات سن کر مسکرائی۔

"تمہاری ماں نے ٹھیک کہا تھا۔"

[illegible] نے میرے ساتھ ہی کیا ہے تم نے بتایا نہیں؟

[illegible] بہت دیکھے ہیں، دنیا تو آپ ایسا نہیں ہے، مجھے معلوم ہے، اسی لیے تم سے دوستی
تم کس مقصد سے یہاں آئی تھی۔

ڈیلچر نے کہا ـــــ "میرے ساتھ دوستی کرنے کے پیچھے تمھارا کیا مقصد ہے؟"

ستی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بولا ـــــ "تم نے اس روز کہا تھا تمھاری ماں کو تمھاری یہ بات پسند نہیں، تمھارے کہنے پر میں اس بات کو ٹال گیا تھا، یہ شرم کہ تمھاری ماں بہت خبیث ہیں ـــــ اس بڑھیا نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ تم شاید خود ہی ایسی باتیں کرتے ہو؟"
یہ بات ختم کر کے وہ ہنسنے لگی اور ڈیلچر کو وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو [illegible] سے متعلق تھیں۔

اس نے پھر پوچھا۔ "اچھا ستی، سچ سچ بتاؤ، تم میرے یہاں کیوں آئی تھیں؟"

"یہ غلطی ہے، کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟"

"نہیں، تم مجھے سچ سچ بتاؤ، تم یہاں [illegible] آئی تھیں، [illegible] کبھی کوئی نہیں آتی، پھر اچانک [illegible] دونوں [illegible] یکسے چلی گئیں؟"

ستی نے کہا ـــــ "کیوں، تم پوچھتے ہو تو میں نہ بولوں؟"

"نہیں، میں یہ نہیں کہتا، یقین ہے میں [illegible]، تمھارا کوئی مقصد تھا، یہاں کبھی کوئی [illegible] تو کبھی نہیں جاتی۔ کالی ماں بھی نہیں [illegible] کالا بابو بھی نہیں جانتے ـــــ پھر تم کیوں آئی تھیں؟"

"وہاں اگر کوئی نہیں جاتا تو کیا مجھے بھی نہیں جانا چاہیے، میں ان لوگوں جیسی نہیں ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں ان سے مختلف ہوں۔"

ڈیلچر نے سر ہلایا۔

"نہیں، مجھے یقین نہیں آتا، تم ان سے مختلف ہرگز نہیں ہو۔"

ستی اس کی باتیں سن کر حیرت میں پڑ گئی، وہ خاموش کھڑی رہی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ڈیلچر نے کہا ـــــ "اصل بات یہ نہیں ہے، اصل بات میں جانتا ہوں۔"

"کیا ہے اصل بات؟"

ڈیلچر نے کہا ـــــ "تم میرے یہاں کس لیے گئی تھیں، میں جانتا ہوں۔ تم نہیں بتاؤ گی تو میں کہے دیتا ہوں۔"

ستی کا چہرہ [illegible] پڑ گیا۔

"کیا جانتے ہو تم، میں بھی تو سنوں! میں تمھارے یہاں کس لیے گئی تھی، بتاؤ تو دیکھوں؟"

"یہ میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔" ڈیلچر نے جواب دیا۔

ستی وہ زینے سے اتر آئی۔

"سنوں تو ذرا، تم کیا جانتے ہو؟"

"نہیں، یہ میں کسی قیمت پر تمہیں نہیں بتاؤں گا۔"

دیپنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ستی اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھ رہی ہو، جیسے وہ اس کے دل کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا پتہ لگا رہی ہو، ستی اس کے بالکل قریب آگئی ہو۔ دیپنکر پیچھے ہٹ گیا۔

بولا — "تم سمجھتی ہو، میں کچھ بھی نہیں سمجھتا، کیوں؟"

ستی نے کہا — "بہت خوب، کون کہتا ہے کہ میں ایسا سمجھتی ہوں؟"

"تم سب یہی سمجھتے ہو،" دیپنکر نے کہا — "تم سمجھتی ہو، تمہارے کاکا بابو سمجھتے ہیں اور کاکی ماں بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں، لیکن یہ بچہ ہو کر مجھ سے کوئی بات معلوم نہ کر سکو گی۔ تم میرے یہاں جا کر میری ماں سے جتنے گہرے مراسم کیوں نہ پیدا کر لو، جتنی دوستی کر لو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

یکایک دیپنکر کی زبان سے اس طرح کی باتیں سن کر ستی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

بولی — "اس کا مطلب؟"

"نہیں، اس کا مطلب بھی نہیں بتاؤں گا۔" دیپنکر نے جواب دیا — "تم دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہو، سبھوں کو دکھ دیتی رہتی ہو، حالانکہ دکھ دینے سے آدمی کو کتنی تکلیف ہوتی ہے یہ تو نہیں جانتی؟"

ستی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اس نے پوچھا — "کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں جس کی بات کر رہا ہوں، یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔" دیپنکر نے جواب دیا — "میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم کون ہوتی ہو؟ تم تو صرف شک کرتی ہو۔"

"شک کرتی ہوں؟ کس پر؟ کس پر شک کرتی ہوں؟"

"جیسے جانتی ہی نہیں کہ کس پر شک کرتی ہو؟ یہ بھی تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کیا؟"

ستی نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا، پھر بولی

"تم کس کی بات کر رہے ہو، بتاؤ تو؟ تم سے یہ سب کس نے کہا ہے؟ لکشمی دیدی نے؟"

دیپنکر نے کہا — "میں تمہیں بتا دوں اور تم سبھوں کو بتا دو — میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

ستی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا —

"لیکن میں کس پر شک کرتی ہوں، تم نے یہ تو نہیں بتایا؟"

"اور کس پر؟ مجھ پر! تم مجھ پر شک کرتی ہو، تم سمجھتی ہو میں کچھ بھی نہیں جانتا؟"

"تم پر شک کرتی ہوں؟ میں تم پر شک کیوں کروں گی؟ کس لیے تم پر شک کروں گی؟ تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر دیپنکر سیدھا اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور دیپنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اگر تھوڑی دیر وہ وہاں پر ٹھہرتا تو ستی اس سے تمام باتیں اگلوا لیتی۔

دُنیائے عرب

بصیر عالم

دُنیائے عرب کی سیاست —— دوسری جنگ عظیم کے بعد

دوسری جنگ عظیم کے بعد توقع تھی کہ عرب کے مسائل اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد ہو گئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد فاتح طاقتوں نے باہمی مفادات کے مطابق سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد اکثر اہم مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

جنگ کے نتیجہ میں امریکہ اور روس کو بڑی طاقتوں کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اب یہ دونوں ملک ہی دراصل امن کی شیرازہ بندی اور دنیا کی نئی ترتیب و تدوین کے ذمہ دار تھے۔ ان دونوں ملکوں کے نظریات میں جو تضاد تھا وہ جنگ کے دوران مشترک دشمن کے خطرے کی وجہ سے دبا رہا لیکن محوری طاقتوں کی شکست کے ساتھ ہی یہ خطرہ ختم ہو گیا اور اشتراکیت و سرمایہ پرستی کے درمیان دوستی کا نباہ مشکل ہو گیا۔ روس نے جنگ کے بعد کی منقلب صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور امریکہ نے اپنی دولت کے زور سے اشتراکیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے ساری دُنیا میں جا بجا بند باندھنے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۶ء سے طاقتوں کے کمیونسٹ اور سرمایہ دار گروہوں کے درمیان "سرد جنگ" شروع ہو گئی۔ دُنیائے عرب بھی سرد جنگ سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ علاقہ جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے پہلے ہی جنگی اہمیت کا حامل تھا اور اب تیل کی دریافت نے اس کی اہمیت کو دو چند کر دیا تھا۔ مغربی طاقتیں پہلے ہی اس علاقہ میں سیاسی اور معاشی غلبہ رکھتی تھیں اب روس بھی یہاں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ لیکن عرب عوام ہر قسم کے سامراج سے اپنی سرزمین کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دُنیائے عرب کی سیاست بھی مغربی سامراج، کمیونزم اور عرب قومیت کے درمیان کشمکش کی آئینہ دار ہے۔

مارچ ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۵۰ء میں عرب لیگ کے ممبروں نے عرب اجتماعی تحفظ کے معاہدہ پر دستخط کیے جس پر ۲۲ اگست ۱۹۵۲ء سے عمل درآمد کیا گیا۔ یہ معاہدہ برطانیہ اور امریکہ کے مفاد پر براہ راست اثر انداز تھا۔ مغربی طاقتیں چاہتی تھیں کہ عرب اقوام ان کی سرپرستی میں دفاعی معاہدے کریں۔ چنانچہ برطانیہ نے ترکی اور عراق کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ کرایا اور ۱۹۵۵ء میں اسے وسعت دے کر بغداد پیکٹ کا نام دیا جس میں برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ مصر نے بغداد پیکٹ کی سخت مخالفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی دباؤ کے باوجود اردن اس معاہدے میں شامل نہ ہو سکا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اردنی عوام نے عرب جیش کے برطانوی کمانڈر گلب پاشا کی برطرفی کا مطالبہ شاہ حسین سے منوا لیا۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مصر نے شام اور سعودی عرب سے باہمی دفاع کے معاہدے کیے۔ بعد میں اردن نے بھی دفاعی معاہدے پر دستخط کیے اور مصری سرکردگی میں باہمی دفاع کی ایک تنظیم بھی وجود میں آ گئی۔

لیکن مختصر یہ کہ مصر کی فوجی شکست اس وقت بھی دیکھنے میں نہیں آئی جبکہ ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا تھا۔ مصر کو اسرائیل کی بڑھتی ہوئی عسکری طاقت سے خطرہ تھا اور مغربی طاقتوں سے خاطر خواہ اسلحہ نہیں مل رہے تھے۔ اس لیے مصر نے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں کمیونسٹ ملکوں سے ہتھیار خریدے۔ مغربی طاقتوں کو مصر کی یہ حالت ناگوار گزری۔ برطانوی وزیر اعظم سر انتھونی ایڈن نے امریکی صدر آئزن ہاور سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں دونوں نے جنوری ۱۹۵۶ء میں یہ اعلان کیا کہ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان موجودہ سرحدیں قائم رکھنے کا جو عہد کیا تھا وہ اس پر قائم رہیں گے۔ اس ملاقات میں مسٹر ایڈن نے لکھا ہے کہ صدر آئزن ہاور عرب ملکوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا اعلان کرنے پر راضی نہ ہوئے کیونکہ تیل سے متعلق اپنے معاشی مفاد کے پیش نظر امریکہ عرب ملکوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مسٹر ایڈن کی مصر دشمنی آخر کار جنگ سوئز کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے نتیجہ میں مغربی طاقتیں نہر سوئز سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ سوئز کی شکست نے جہاں ایک طرف دنیائے عرب میں قومی تحریکات کو تقویت بخشی وہاں دوسری طرف سامراجی طاقتوں کو اپنے مفاد کے اجتماعی تحفظ پر مجبور کر دیا [illegible]۔ آئزن ہاور نے امریکی کانگریس سے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ مشرق وسطی کے ملکوں کو چار سو ملین ڈالر امداد دے سکتے ہیں اور بوقت ضرورت کسی بھی ملک میں فوجی مداخلت کر سکتے ہیں۔ جب ۱۹۵۸ء میں لبنان خانہ جنگی کی آماجگاہ بن گیا تو امریکہ نے وہاں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ عراق میں شاہ فیصل کا تختہ الٹنے کے بعد برطانیہ نے بھی اردن میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان دونوں ملکوں سے غیر ملکی فوجوں کو رخصت ہونا پڑا۔

شمالی افریقہ میں تیونس اور مراکش نے ۱۹۵۶ء میں آزادی حاصل کر لی۔ الجزائر میں بھی قوم پرستوں نے ۱۹۵۴ء میں فرانسیسی سامراج کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور ایک طویل اور خونریز جنگ کے بعد ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کر لی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دنیائے عرب میں آزادی کی جو جدوجہد شروع ہوئی تھی اس کے نتیجہ میں جزیرہ نمائے عرب اور خلیج فارس کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا آج تمام عرب ممالک سیاسی اعتبار سے آزاد ہیں۔ اس آزاد دنیائے عرب کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند اہم ملکوں کی جدوجہد آزادی اور سیاست کی روشنی میں مندرجہ بالا اجمالی جائزہ کا تجزیہ کیا جائے۔

مصر

اس وقت جبکہ دوسری عالمی جنگ قریب الختم تھی مصری قوم پرستوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ کو مواصلات اور دفاع کے انتظام حاصل تھا نیز سوڈان کا مستقبل برطانیہ کی منظوری کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ نہر سوئز کا دفاع بھی برطانیہ کی ذمہ داری تھی اور اسے نہر کے علاقہ میں فوجیں رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔

اہم مصری قوم پرستوں کے مطالبات یہ تھے کہ وادی نیل کے [illegible] سوڈان [illegible] کر دیا جائے اور [illegible] علاقہ سے برطانوی فوجی دستے ختم کر دیے جائیں۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ پر نظر ثانی [illegible] مصری حکومت اور برطانیہ کے درمیان [illegible] جاری رہا لیکن کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۵۱ء میں [illegible] نحاس پاشا کی حکومت نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۳۶ء کے معاہدوں کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے شاہ فاروق کو مصر و سوڈان کا بادشاہ قرار دیا اور برطانوی فوجوں سے وہ تمام مراعات [illegible] جو انہیں نہر سوئز کے علاقہ میں حاصل تھیں۔ مصری حکومت کے [illegible]

پہلے یا بعد میں بیک وقت مشرق وسطیٰ کی تمام طاقتوں کا اتحاد قائم کیا جائے۔ برطانیہ نہ صرف امریکہ اور فرانس کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا بلکہ دیگر اسلامی حکومتوں کو بھی ساتھ ملانا چاہتا تھا لیکن مصر نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ اس دوران مصری عوام اور برطانوی فوجوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جنہوں نے جنوری ۱۹۵۲ء کو فسادات کی شکل اختیار کر لی۔ ان فسادات نے برطانیہ کو طاقت کے استعمال کا موقع فراہم کر دیا اور اس نے حملہ کر دیا۔ اس دنگے کا الزام وفد پر لگایا گیا۔ شاہ فاروق مصر و سوڈان کے متعلق مسائل پر شاہ ... چاہتے تھے لیکن وہ اس کے لیے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھے چنانچہ انہوں نے نحاس پاشا کو برطرف کر دیا اور چند ماہ تک وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ اس دوران میں برطانوی حکمران سوڈانیوں کو مصریوں کے خلاف بھڑکاتے رہے لیکن انہیں یہ خیال نہیں رہا کہ اب جب کہ شاہ فاروق کا تخت بھی خطرے میں ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو فوجی افسروں کے ایک گروہ نے جنرل نجیب کی قیادت میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو شاہ فاروق معزول کر دیے گئے اور ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو مصر کو جمہوریہ قرار دیا گیا جس کے پہلے صدر جنرل نجیب مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ آخر کار ان میں ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے ۱۸ اپریل ۱۹۵۴ء کو جنرل نجیب جمہوریہ مصر کے صدر اور کرنل ناصر وزیر اعظم نیز انقلابی کونسل کے صدر مقرر کیے گئے۔ اب حقیقی اختیارات انقلاب کے اصل معمار کرنل ناصر کے ہاتھ میں تھے۔

معاہدۂ سوڈان

جنرل نجیب کے دور میں سوڈان کا مسئلہ حل ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ مذاکرات کے ذریعے حل ہو جائے لیکن برطانوی حکمران انقلابی حکومت سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جنرل نجیب نے برطانوی حکومت کو نظر انداز کر کے سوڈان کی سیاسی پارٹیوں سے براہ راست مذاکرات شروع کر دیے۔ انقلابی حکومت کی یہ چال کارگر ثابت ہوئی۔ برطانوی حکمران جانتے تھے کہ اگر مصر و سوڈان کے عوام نے بیک وقت بغاوت کر دی تو انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے اس لیے انہوں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ مصری حکومت اور سوڈانی رہنماؤں سے مذاکرات کیے جائیں۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ایک معاہدہ پر دستخط کیے گئے جس کی رو سے مصر و برطانیہ کا ترپن سالہ مشترکہ دور حکومت ختم ہو گیا اور سوڈان کو خود مختاری مل گئی۔ معاہدہ میں طے کیا گیا کہ سوڈانی پارلیمنٹ کے لیے فوری انتخابات کیے جائیں اور تین بین الاقوامی کمیشن مقرر کیے جائیں۔ پہلا کمیشن گورنر جنرل کو امور حکومت میں مشورہ دینے کے لیے، دوسرا انتخابات کے انتظام کے لیے اور تیسرا انتظامیہ میں سوڈانیوں کی شمولیت کے لیے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے اور قومی اتحاد پارٹی جو مصر سے اتحاد کے حق میں تھی کامیاب ہوئی۔ مصر و برطانیہ کے درمیان معاہدہ کے مطابق دستور ساز اسمبلی کے لیے بھی انتخابات ہونے چاہئیں تھے لیکن ان انتخابات سے قبل ہی سوڈانی پارلیمنٹ نے سوڈان کی آزادی کا اعلان کر دیا اور مصر و برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ سوڈان کو آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کریں۔ مصر و برطانیہ نے سوڈان کی آزادی تسلیم کر لی اور اس طرح ۱۹۵۳ء کا معاہدہ جس کی رو سے سوڈان کو صرف اندرونی خود مختاری دی گئی تھی جنوری ۱۹۵۶ء میں سوڈان کی آزادی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اسماعیل الازہری سوڈان کے

پہلے وزیراعظم ازہری نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ سوڈان عرب لیگ کا رکن ہوگا اور اس کی خارجہ حکمت عملی غیر جانبدارانہ ہوگی۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں فوج نے جنرل عبود کی قیادت میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں فوجی حکومت نے دریائے نیل کے پانی کی تقسیم کے متعلق مصر سے ایک سمجھوتہ کر لیا اور اس طرح ایک ایسا مسئلہ حل ہو گیا جو مستقبل میں مصر و سوڈان کے درمیان نزاع کا باعث ہو سکتا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں عوامی پارٹیوں کی رہنمائی میں جنرل عبود کی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ حکومت کے تشدد کا نشانہ بننے والے مظاہروں نے عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ آخرکار جنرل عبود کو ملک چھوڑنا پڑا اور سوڈان میں دوبارہ جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔

مصر کی داخلی سیاست

فوجی انقلاب کے وقت مصر میں دو منظم سیاسی پارٹیاں یعنی وفد پارٹی اور اخوان المسلمون موجود تھیں۔ انقلاب کے ساتھ ہی ایک تیسری سیاسی پارٹی منظر عام پر آئی اور وہ تھی فوج کے آزاد افسروں کی تحریک۔

وفد پارٹی میں مختلف جمہوریت پسند عناصر شامل تھے ان میں سرمایہ دار، شاہ پرست جاگیردار اور آزاد خیال نوجوان غرض ہر قسم کے لوگ تھے لیکن پارٹی کی قیادت سرمایہ دار اور جاگیردار عناصر کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ لوگ صرف اپنے طبقہ کے لیے آزادی اور جمہوریت چاہتے تھے۔ شاہ فاروق ان کے طبقاتی مفاد کی علامت تھے اور شاہ کے توسط سے ان لوگوں کے ڈانڈے برطانوی سامراج سے مل جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل جدوجہد کے باوجود وفد پارٹی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اخوان المسلمین احیائے اسلام چاہتی تھی۔ یہ جماعت علما اور نچلے متوسط طبقہ تک محدود رہی۔ مصر کی نئی نسلیں مغربی خیالات و نظریات سے متاثر ہو چکی تھیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت کے نظریات سرایت کر چکے تھے۔

۱۹۳۶ء تک مصری فوج میں شاہی خاندان اور طبقہ امرا کے نوجوان ہی افسر ہوتے تھے لیکن اس کے بعد سے فوجی افسری کے دروازے عوام کے لیے بھی کھول دیے گئے اور افسروں کے طبقہ میں ترقی پسند نوجوان بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے جمال عبدالناصر کی قیادت میں آزاد افسروں کی تحریک شروع کی اور آخرکار انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں کرنل ناصر مصر کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ ان کی اقتصادی، معاشی اور سیاسی اصلاحات سے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے، ذکر شاہی کے کارندے اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈر ناخوش تھے۔ نجیب اور ناصر کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں ان عناصر کا بھی ہاتھ تھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اسکندریہ کے ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے وقت کرنل ناصر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس سے وہ بچ گئے۔ حملہ آور اخوان المسلمین کا ایک ممبر تھا۔ اس واقعہ نے کرنل ناصر کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ انہوں نے نہ صرف اخوان المسلمین اور دیگر سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا بلکہ جنرل نجیب کو بھی اس بنا پر صدارت سے معزول اور اپنے مکان میں نظربند کر دیا کہ حملہ آور کی ان سے ساز باز کی تصدیق تھی۔ اس واقعہ کے بعد کرنل ناصر نے داخلی سیاست کے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

"ہم اس وقت تک مصر میں کوئی قانون ساز مجلس نہیں بنائیں گے جب تک کہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا اثر ختم نہیں ہو جائے گا۔"

[illegible] ہے ... [illegible] ... کے تحت [illegible]

اقوام متحدہ کی ایک نئی جماعت وجود میں آئی جس کے تحت ... سامنے آئی۔

"یہ ایک آزادی کا ... جس میں ... بحیرہ روم ... کے تمام آزاد ممالک شامل ہیں۔"

معاہدہ سوئز

۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مصر اور برطانیہ کے درمیان سوئز کے بارے میں ایک نئے معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ اس معاہدہ کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ برطانوی فوجیں بیس مہینے کے اندر اندر مصر کو خالی کر دیں گی۔

۲۔ سوئز کے فوجی اڈہ پر قائم چند برطانوی اداروں میں برطانوی شہری تعینات رہیں گے۔ ضرورت پڑنے پر ان کی تعداد میں چار سو کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اگر کسی بیرونی طاقت نے عرب لیگ کے کسی بھی ممبر ملک یا ترکی پر حملہ کیا تو برطانوی فوجیں سوئز کے فوجی اڈہ پر دوبارہ قابض ہو جائیں گی اور مصر انہیں تمام سہولتیں فراہم کرے گا۔

۴۔ نہر سوئز میں تمام ملکوں کے جہازوں کو آزادی سے گزرنے کی اجازت ہوگی۔

۵۔ ۱۹۳۶ء میں مصر و برطانیہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔

۶۔ یہ معاہدہ سات سال تک نافذ رہے گا۔

جنگ سوئز

۲۸ فروری ۱۹۵۵ء کو اسرائیل نے غازہ پر حملہ کیا۔ اس حملے میں مصری فوج کے افسروں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے پاس جدید اسلحہ کی قلت ہے اور اگر مصر کو اسرائیل کا مقابلہ کرنا ہے تو اس کمی کو جلد از جلد پورا کرنا چاہیے۔ مغربی ملکوں خصوصاً امریکہ نے اسرائیل کو برابر اسلحہ دیا ہے تھے لیکن مصر زر مبادلہ خرچ کرکے بھی خاطر خواہ اسلحہ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں سے اسلحہ کی خرید کے لیے ایک معاہدہ کیا گیا۔ مصر کے اس اقدام سے ناراض ہو کر امریکہ، برطانیہ اور ورلڈ بینک نے اسوان بند کے لیے امداد کی جو پیشکش کی تھی واپس لے لی۔ اس کا جواب صدر ناصر نے یوں دیا کہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو نہر سوئز کمپنی کے قومیانے کا اعلان کر دیا۔ یہ اقدام سوئز کمپنی کے حصہ داروں یعنی برطانیہ اور فرانس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ برطانیہ نے لندن میں ۲۴ قوموں کی کانفرنس منعقد کی جس میں امریکہ کی یہ تجویز منظور کی گئی کہ نہر سوئز کو بین الاقوامی قبضہ و اختیار میں لے لیا جائے۔ مزید یہ طے کیا گیا کہ وزیر اعظم آسٹریلیا مسٹر مینزیز کی قیادت میں پانچ قوموں کا ایک وفد مصر جائے، صدر ناصر سے مندرجہ بالا تجویز کی بنیاد پر مذاکرات کرے اور اپنی رپورٹ کانفرنس کو پیش کرے۔ صدر ناصر کے لیے یہ تجویز ناقابل قبول تھی کیونکہ نہر کو بین الاقوامی اختیار میں دینے کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ اور روس جیسی بڑی طاقتیں بھی مصر کی سرزمین میں اپنے پنجے نصب کر دیتیں اور پھر مصر کی آزادی ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جاتی۔ مینزیز وفد کی ناکامی کے بعد لندن میں ۱۸ قوموں کی ایک اور کانفرنس منعقد کی گئی جس میں نہر استعمال کرنے والوں کی ایک جماعت کا قیام عمل میں آیا۔

بے خبر رہ کر امریکہ اس بات نے نہر کے معاملات میں روشن انداز کی توقع کی تو اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

برطانیہ اور فرانس کانفرنس منعقد کرکے دنیا پر یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ نہر کا مسئلہ پُر امن طور پر حل کرنا چاہتے ہیں لیکن درپردہ انھوں نے اسرائیل کو مصر پر حملہ کرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اسرائیل نے مصر کی توجہ بٹانے کے لیے پہلے اردن کی سرحدوں پر مقامات حملے کیے اور پھر ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اچانک مصر پر حملہ کر دیا۔ چشم زدن میں غازہ اور جزیرہ نما سینائی پر اسرائیل قبضہ ہوگیا۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر اور اسرائیل کو متنبہ کیا کہ وہ نہر سویز کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور اپنی فوجوں کو نہر سے دس میل دور رکھیں اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو برطانیہ اور فرانس نے بندرگاہ سعید اور بندرگاہ فواد پر بمباری کر کے وہاں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں حملے کی مذمت کے متعلق قرارداد برطانوی حق تنسیخ کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی۔ چنانچہ یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش ہوا اور جنرل اسمبلی نے جنگ بندی اور غیر ملکی افواج کے انخلا کی قراردادیں بھاری اکثریت سے منظور کر لیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر روس نے برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو مداخلت کی دھمکی دے دی اور اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ روس کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ برطانیہ اور فرانس نے جنرل اسمبلی کی قراردادیں قبول کر لیں۔ جنگ بندی پر فوراً عمل کیا گیا اور مصری سرزمین سے برطانوی اور فرانسیسی فوجیں واپس بلا لی گئیں۔ اسرائیل نے البتہ تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لیا لیکن آخر کار اُسے بھی ماننا پڑا۔ مصر اور اسرائیل کی سرحدوں پر بین الاقوامی فوج تعینات کی گئی اور اقوام متحدہ نے اپنے خرچ سے نہر سویز کو ڈوبے ہوئے جہازوں سے صاف کرایا۔

برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن کا خیال تھا کہ وہ تین چار روز میں نہر سویز کے تمام علاقہ پر قبضہ کر کے اقوام متحدہ کے سامنے ایک فاتح کی حیثیت سے جائیں گے اور نہر سویز سے متعلق اپنی شرطیں منوا لیں گے لیکن یہ جنگ تقریباً دس دن تک جاری رہی اور برطانیہ و فرانس نہر سویز کے تمام علاقہ پر قابض نہ ہو سکے۔ اس عرصہ میں دنیا کی رائے عامہ حملہ آوروں کے خلاف شدید طور پر ظاہر ہوئی اور روس نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ مسٹر ایڈن کو امید تھی کہ امریکہ ان کا ساتھ دے گا۔ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس حملے سے امریکہ دنیائے عرب میں غیر مقبول ہو رہا تھا اور اس کے اپنے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا چنانچہ امریکہ نے بھی برطانیہ اور فرانس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردادیں مان لیں۔

اس جنگ کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہر سویز سے دستبردار ہونا پڑا۔ صدر ناصر دنیائے عرب کے قائد بن گئے۔ روس افریشیائی ممالک اور خصوصاً دنیائے عرب میں مقبول ہوگیا اور برطانیہ اور فرانس کے دوست کی حیثیت سے امریکہ کی غیر مقبولیت میں اضافہ ہوگیا۔

اقوام متحدہ کے دباؤ اور روس کی دھمکی نے حملہ آور طاقتوں کی فوجی فتح کو سیاسی شکست میں تبدیل کر دیا۔ اگر مصر کو دنیا کے سامنے واضح حمایت حاصل نہ ہوتی تو روس کی دھمکی بھی بے اثر ہی ثابت ہوتی۔ سرد جنگ میں نہر سویز روس کی سب سے بڑی فتح اور مغربی طاقتوں کی سب سے بڑی شکست کی علامت ہے۔

سویز کا حملہ برطانیہ کے لیے بڑا ہی نقصان دہ ثابت ہوا۔ اُسے نہر سویز سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ۱۹۵۴ء کے معاہدہ

کی مدت میں [illegible] کی جنگ کے بعد ختم ہو گئی [illegible]
اس جنگ سے جمال ایک حد تک مصر اور عرب دنیا کی سیاست کا [illegible]
ناصر اور مصری فوج کا [illegible] ختم ہو گیا۔ [illegible] مصری سرزمین کے اقتدار کی [illegible]
زور [illegible] کی خاطر [illegible] جس کے باوجود مصری شہر پورٹ سعید پر [illegible] اور عام شہریوں نے دشمن کا مقابلہ کیا
اور حملہ آوروں کو سوئز کے [illegible] سے زیادہ علاقہ پر قبضہ نہیں کرنے دیا۔ یقیناً مصر کی باقاعدہ فوج میں کوئی خاص [illegible] شاید اس وجہ سے
کہ فوجی افسر سیاست میں پڑ گئے تھے اور سیاسی [illegible] نے [illegible] بنا دیا تھا۔ [illegible] شکست
کے باوجود صدر ناصر کی حکومت متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ کہنا [illegible] سیاسی فتح ہر حال صدر ناصر کی ہوئی تھی اور انھوں نے نہر سوئز کو قومی ملکیت
بنا کر [illegible] بجائے خود ایک ایسا اقدام تھا جس کی اہمیت گزشتہ [illegible] کم نہیں ہوئی۔

سوئز کو قومیانے میں کامیابی کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سامراجی [illegible] نے اکثر [illegible] ملکوں کو
سیاسی آزادی دے دی لیکن ان پر معاشی تسلط قائم رکھا۔ [illegible] معاشی اور صنعتی اداروں کو قومیانے کی جسارت سب سے پہلے ایران نے
کی تھی لیکن [illegible] دھمکی [illegible] اور زور سے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ تاہم اس ناکامی کے باوجود بین الاقوامی
قانون میں [illegible] کا یہ فیصلہ شامل ہو گیا کہ ہر خود مختار یا غیر خود مختار [illegible] صنعتی و تجارتی ادارہ خواہ وہ کسی غیر فرد یا ملک کی ملکیت
ہو اگر اس ملک کی حدود میں واقع ہے اور اس ملک میں رجسٹر ہوتا ہے تو اس ملک کی حکومت کو اس پر [illegible] قانونی اختیارات حاصل
ہیں اور وہ اسے اپنی ملکیت بنا سکتی ہے۔ اس فیصلے کے باوجود ایران اینگلو ایرانین آئل کمپنی کو قومیانے میں ناکام رہا لیکن مصر سوئز
کمپنی کو قومی ملکیت بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی نے ان تمام ملکوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی جہاں بیرونی [illegible]
تجارتی اور صنعتی ادارے موجود ہیں۔

سوئز کی کامیابی سے [illegible] عرب سیاست مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ صدر ناصر اور ان کے حامیوں نے اس موقع
سے فائدہ اٹھایا اور فروری ۱۹۵۸ء میں مصر و شام نے مل کر متحدہ عرب جمہوریہ بنائی۔ [illegible] ۱۹۵۸ء [illegible] متحدہ عرب
جمہوریہ میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوا۔ شام نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ یہ دونوں ملکوں کا اتحاد نہیں ہے اور
[illegible] اس کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹا ملک بڑے ملک میں ضم ہو جائے اور اس کا غلبہ قبول کرے۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں شام کی فوج نے
ایک انقلاب کیا اور متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدگی اختیار کی۔ بعد میں یمن کو مصر نے خود ہی عرب جمہوریہ سے علیحدہ کر دیا کیونکہ
یمنی سلطنت اور مصری جمہوریت کا میل مناسب نہیں تھا۔ ۱۹۶۲ء میں کرنل سلال نے امام یمن کی حکومت کا تختہ الٹ دیا [illegible]
[illegible] سعودی عرب پہنچ گئے۔ کرنل سلال نے یمن کو جمہوریہ بنا دیا اور خود اس کے صدر بن گئے۔ [illegible]
سعودی عرب [illegible] اور یمن کے سرحدی علاقوں میں جنگ شروع کر دی۔ صدر سلال نے مصر سے مدد [illegible]
صدر ناصر نے [illegible] جس کی وجہ سے مصر و سعودی عرب کے تعلقات خراب ہو گئے۔ [illegible] جنگ [illegible] سال تک
جاری رہی۔ آخر ۱۹۶۵ء میں [illegible] سعودی عرب کے شاہ فیصل، صدر ناصر اور صدر سلال نے ایک سمجھوتہ کیا، جس کی رو سے [illegible]

کے نزدیک تنظیم یمن میں امریکی مفادات کے سامنے جھکنا قرار پایا کیا یا لوگ موجودہ جمہوری نظام کو پسند کرتے ہیں یا امام سیف البدر کے خاندان کی حکومت چاہتے ہیں۔

اب تک ایسی کئی مثالیں سامنے آئی ہیں کہ صدر ناصر پہلے عرب ملکوں کی حکومتوں سے دوستی کرتے ہیں اور پھر ان ملکوں کے عوام اور فوج میں اپنے حامی پیدا کر کے ان حکومتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب دیگر عرب ریاستوں کے حکمران صدر ناصر سے تعلقات پیدا کرنے میں بہت محتاط ہو گئے ہیں اور اپنے عوام کو مصر کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ اگر صدر ناصر مصری غلبہ کی بجائے واقعی عرب اتحاد چاہتے ہیں تو وہ سازشوں اور فوجی انقلابوں سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے صحیح مقاصد کا تعین کر کے ایک بین الاقوامی عرب تحریک کی ضرورت ہے ——— جب یہ تحریک عوام میں مقبول ہو جائے گی تو ایک ایسی متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئے گی جس پر کسی ایک ملک کا غلبہ نہیں ہوگا۔

عراق

پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق پر برطانوی تولیت قائم ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے شریف مکہ کے سب سے بڑے لڑکے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں عراق آزاد ہو گیا لیکن حبانیہ اور بصرہ کے اڈوں پر برطانیہ کا قبضہ قائم رہا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران رشید علی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کے حق میں بغاوت کی جس کے نتیجہ میں سارے عراق پر برطانیہ کی فوجیں قابض ہو گئیں۔ جنگ کے اختتام پر عراق کی قسمت برطانیہ کے سب سے بڑے حامی جنرل نوری السعید کے ہاتھوں میں تھی۔ جنگ کے بعد سے ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب تک عراقی حکومت برطانیہ کے اشاروں پر چلتی رہی۔ اس عرصہ میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ رہی کہ عراق دنیائے عرب کا لیڈر بن جائے تاکہ اس کی مدد سے دنیائے عرب کی دفاعی تنظیم بنائی جائے جس کی مدد سے مغرب کو فائدہ حاصل ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر سب سے پہلے عراق اور ترکی کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ وجود میں آیا۔ جب ۱۹۵۸ء میں متحدہ عرب جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو عراق میں عرب قومیت کے حامیوں نے اس میں شمولیت کے لیے تحریک چلائی جس کا توڑ کرنے کے لیے عراقی حکومت نے اردن کے ساتھ مل کر وفاقی عرب مملکت بنائی۔ لیکن جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیر جنرل کریم قاسم نے شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شاہ فیصل، شہزادہ عبدالاله اور وزیر اعظم نوری السعید قتل کر دیئے گئے۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی وفاقی عرب مملکت ختم ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد عراق معاہدہ بغداد سے بھی علیحدہ ہو گیا۔

توقع تھی کہ معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہونے کے بعد عراق متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عراق کے نائب صدر کرنل عارف متحدہ عرب جمہوریہ میں شمولیت کے حق میں تھے لیکن صدر قاسم چاہتے تھے کہ عراق کو مغربی ایشیائی عرب ممالک کی قیادت حاصل ہو جائے۔ اس اختلاف کے باعث کرنل عارف کو حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا اور صدر ناصر عراقی صدر کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے پہلے کرنل عارف کے ذریعہ اور دوسری بار کرنل شواف کی قیادت میں صدر قاسم کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار ناکامی ہوئی۔ صدر ناصر کے حامیوں کی مخالفت نے صدر قاسم کو عراق کی کمیونسٹ پارٹی کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کا اثر خارجہ پالیسی پر یہ ہوا کہ عراق نے روس سے اقتصادی امداد ہی نہیں بلکہ اسلحہ بھی حاصل کیے۔ کمیونسٹ پارٹی سے قاسم کے اتحاد کا توڑ صدر ناصر کے حامیوں نے عرب سوشلسٹ بعث پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد کے نتیجہ میں پہلے ۱۹۶۳ء میں

شام کی حکومت اور پھر دوسری حکومتیں ختم کر دی گئیں۔ کرنل عارف کی زیر قیادت عراق میں جنرل قاسم کی حکومت ختم ہو گئی۔ انقلاب کے بعد جنرل قاسم اور ان کے ساتھی مارے گئے۔ کرنل عارف عراق کے نئے صدر بنے۔ عراق اور شام میں بعث پارٹی کی وجہ سے بہتر تعلقات قائم ہوئے اور ایک بار پھر یہ توقع ہو گئی کہ عراق اور شام متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائیں گے لیکن صدر ناصر اور بعث پارٹی میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور اب اختلافات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ صدر ناصر اور بعث پارٹی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

۱۹۶۱ء میں جنرل قاسم نے دعویٰ کیا کہ کویت عراق کا علاقہ ہے۔ دعویٰ یہ کیا تھا کہ ترکوں کی عملداری میں کویت بصرہ کا حصہ تھا۔ کویت میں برطانیہ اور امریکہ کی تیل کمپنیاں قائم ہیں۔ برطانیہ نے ایک بار پھر اپنے سابقہ معاہدے کے تحت فوجی امداد سے گریز نہیں کیا اور کویت میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ لیکن اس مرتبہ امریکہ اور عرب ریاستوں کی حمایت حاصل تھی جو صدر قاسم کی کمیونسٹ نوازی کے خلاف تھیں۔ جنرل قاسم نے تو داخلی سیاست کے خوف میں اپنی ڈگمگاتی لیڈری کو سنبھالا دینے کے لیے ایسا نعرہ لگایا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ برطانیہ بھی کوئی اُن کی آنکھوں کے سامنے کر کے کھڑا ہو جائے گا۔ کویت کا مسئلہ عراق نے سنجیدگی سے غور کیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں صدر عارف اس مطالبہ سے دست بردار ہو گئے اور برطانیہ نے کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ عراق اور برطانیہ کے درمیان اس پینترے بازی سے کویت کو ضرور یہ فائدہ پہنچ گیا کہ برطانیہ نے اسے مکمل آزادی دے دی اور وہ اقوام متحدہ کا ممبر ہو گیا۔

شمالی افریقہ

شمالی افریقہ میں لیبیا، ٹیونس، الجیریا اور مراکش کی عرب ریاستیں شامل ہیں۔ اس علاقہ کو مغرب بھی کہا جاتا ہے۔

لیبیا

دوسری عالمی جنگ سے قبل لیبیا پر اٹلی کا قبضہ تھا۔ جنگ کے بعد اقوام متحدہ کی نگرانی میں رکھا گیا اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو لیبیا آزاد ہو گیا۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں برطانیہ اور لیبیا کے درمیان باہمی دوستی اور دفاع کا ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ کو لیبیا میں فوجی اڈے قائم کرنے کا اختیار مل گیا۔ بعد میں امریکہ نے بھی ستر ملین ڈالر کے عوض ایک ہوائی اڈہ قائم کر لیا۔

ٹیونس

ٹیونس کو فرانس نے ۱۸۸۱ء میں زیر حفاظت لے لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مکمل آزادی کے لیے تحریک شروع ہوئی جو مارچ ۱۹۵۶ء میں ٹیونس کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ مسٹر بورقیبہ ٹیونس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے ٹیونس کے بے ... کو معزول کر دیا اور ملک کو جمہوریہ قرار دے کر خود اس کے صدر ہو گئے۔ گو فرانس نے ٹیونس کو آزادی دے دی تھی لیکن بزرٹا پر اس کا فوجی اڈہ قائم تھا۔ اس بحری اڈہ کو فرانس سے خالی کرانے کی جدوجہد جاری رہی۔ آخر ۱۹۶۳ء میں فرانس نے یہ اڈہ بھی ٹیونس کے حوالے کر دیا اور ٹیونس سے فرانس کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

ٹیونس کے صدر حبیب بورقیبہ اعتدال پسند لیڈر ہیں۔ وہ مغرب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ مگر وہ بھی عرب اتحاد کے قائل

ہیں کیونکہ وہ اس حق میں نہیں کہ ان کا ملک ایک بڑی عرب مملکت میں ضم ہو جائے۔ صدر ناصر سے حبیب بورقیبہ کی نہیں بنتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صدر ناصر عرب اتحاد کی آڑ میں مصر کے اقتدار اور اپنی شخصی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کے مسئلہ پر بھی انھیں دیگر عرب ہمسایوں سے اختلاف ہے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ عرب ریاستیں اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انھوں نے تجویز پیش کی کہ عرب ریاستیں اسرائیل کو اس شرط پر تسلیم کریں کہ وہ اقوام متحدہ کی ۱۹۴۷ء کی تجویز کے مطابق اپنی سرحدوں کا تعین کرنے پر راضی ہو جائے اور عرب مہاجرین کو دوبارہ اسرائیل میں بسا لے۔

حبیب بورقیبہ کے اس بیان پر دنیائے عرب میں بہت لے دے ہوئی اور متحدہ عرب جمہوریہ، شام اور عراق نے طیونس سے اپنے سفیر واپس بلا لیے۔ حبیب بورقیبہ کی تجویز سے اسرائیل نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ اسرائیلی وزیر اعظم نے گو اس بات کو سراہا کہ پہلی بار ایک عرب ملک نے مذاکرات کی تجویز پیش کی ہے تاہم انھوں نے اس امر کا اعادہ کیا کہ اسرائیل عرب مہاجرین کو واپس لینے پر تیار نہیں ہے اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر عرب ملکوں نے دریائے اردن کے معاون دریاؤں کا رخ موڑنے کی کوشش کی تو اسرائیل طاقت کا استعمال کرے گا۔

عرب ریاستوں اور اسرائیل کے مندرجہ بالا ردعمل نے صدر بورقیبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں۔ چنانچہ انھوں نے صدر ناصر کو ایک خط لکھا جس میں وضاحت کی کہ میں نے ایک حل کا پیش کیا تھا ورنہ میرا نصب العین بھی یہی ہے کہ فلسطین سے یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ ختم کیا جائے۔

مراقش

۱۹۱۲ء میں فرانس نے ایک معاہدے کے ذریعہ مراقش کا دفاع اور امور خارجہ اپنے اختیار میں لے لیے اور بعد میں سارے ملک پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد قوم پرستوں کی جدوجہد آزادی نے زور پکڑا اور جنوری ۱۹۵۱ء میں فرانسیسی فوج اور قوم پرستوں کے درمیان پہلا مسلح تصادم ہوا۔ فرانسیسی حکمرانوں نے مراقش کے سلطان سیدی محمد بن یوسف کو معزول کر دیا کیونکہ انھیں قوم پرستوں کی استقلال پارٹی سے ہمدردی تھی۔ سلطان محمد کی جگہ انھوں نے سلطان کے چچا زاد بھائی مولے محمد بن عرفہ کو مراقش کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس واقعہ سے قوم پرستوں کی جدوجہد شدت اختیار کر گئی۔ آخر کار فرانس کو معزول سلطان کو بحال کرنا پڑا۔ اس کے بعد ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراقش کو مکمل آزادی دے دی گئی۔ اپریل ۱۹۵۶ء کے پہلے ہفتہ میں سلطان محمد اسپین گئے اور وہاں سے مراقش کے اس علاقہ کی آزادی کا پروانہ بھی لے آئے جس پر اسپین کا قبضہ تھا۔ سلطان محمد کی وفات کے بعد ان کے ولی عہد سلطان حسن دوم تخت نشین ہوئے۔ ۷ جون ۱۹۶۵ء کو سلطان حسن نے کابینہ اور پارلیمنٹ برطرف کر کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

الجیریا

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر قبضہ کیا۔ شمالی افریقہ کے دیگر ملکوں کی بہ نسبت الجیریا زیادہ زرخیز اور معدنیات سے مالا مال ہے۔ شمال کے پہاڑی علاقوں میں اس ملک کی آب و ہوا بھی معتدل ہے۔ اس لیے یہ ملک یورپی باشندوں کی بود و باش کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ یہاں فرانسیسی نوآبادکاروں نے زمینیں خرید کر گندم کی جگہ انگور کے باغات لگائے اور مختلف صنعتیں بھی قائم کریں۔ ان نوآبادکاروں نے کوشش کر کے فرانسیسی دستور میں الجیریا

...ونیک کی حیثیت دوسری تھی اور فرانسیسی حکومت نے بھی الجیریا کو مستقل طور پر فرانس میں شامل کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے معاشی اور سیاسی اسباب تھے۔ معاشی سبب یہ تھا کہ الجیریا فرانس کو ۸۰ فیصد شراب مہیا کرتا تھا اور الجیریا کے پہاڑوں اور ریگزاروں میں معدنیات اور تیل کے ذخیرے ہیں۔ سیاسی سبب یہ تھا کہ فرانسیسی نوآبادکار اپنے غلبہ و تسلط سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور نہ صرف سیاسی لیڈروں بلکہ فوجی افسروں پر بھی ان کا اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ الجزائری عوام کو اپنی آزادی کے لیے ایک طویل اور خونریز جدوجہد کرنی پڑی۔ یہ جدوجہد یوں تو ۱۹۳۰ء سے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ۱۹۵۴ء سے اس نے مسلح گوریلا جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ ۱۹۵۶ء میں تیونس اور مراکش کی آزادی نے اس جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی اور اس کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ فرانس نے الجزائری عوام کو شکست دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ۴۰ ہزار گوریلوں کے مقابلہ میں پانچ لاکھ مسلح فوج الجیریا بھیجی۔ افرو ایشیائی اقوام نے اقوام متحدہ کے دسویں اجلاس کے ایجنڈے میں الجیریا کا مسئلہ شامل کر لیا تو فرانس نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں جناب فرحت عباس نے الجیریا کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا کہ فرانس کی حکومت الجیریا کی بغاوت سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے چند فرانسیسی نوآبادکاروں کے مفاد کے لیے کروڑوں روپیہ بے فائدہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن فرانسیسی نوآبادکار اور الجیریا میں مقیم فوجی افسر شمشیر کے زور سے الجیریا کی بغاوت کو دبانا چاہتے تھے اور یہ کام کمزور اور غیر مستقل جمہوری حکومتوں کے بس کا نہیں تھا۔ انہیں ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر دی اور مطالبہ کیا کہ جنرل ڈیگال کو فرانس کا وزیر اعظم بنایا جائے۔ اس بغاوت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ فرانس کے وزیر اعظم مستعفی ہو گئے اور جنرل ڈیگال ان کی جگہ وزیر اعظم بنائے گئے۔ انہوں نے فرانس کو ایک نیا دستور دیا جس کے تحت پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی نظام نے لے لی اور جنرل ڈیگال فرانس کے با اختیار صدر منتخب ہو گئے۔ شروع میں جنرل ڈیگال نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوجی طاقت سے الجیریا کی بغاوت کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ لیکن بہت جلد ان پر واضح ہو گیا کہ الجزائری عوام ہار ماننے والے نہیں ہیں۔ ادھر فرانس کی اقتصادی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ اپنے یورپی ہمسایوں کے مقابلے میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کمزوری کے باعث معاہدہ اوقیانوس میں فرانس کے رتبہ پر خراب اثر پڑ رہا تھا اور اس کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ فرانس ایک بار پھر بڑی طاقت بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہو اور جلد از جلد جوہری طاقتوں کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ لیکن یہ خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتے تھے جبکہ الجزائری عوام کے خلاف جنگ کی فضول خرچی ختم ہو جائے۔

صدر ڈیگال اس طرح سوچ رہے تھے۔ فرانسیسی نوآبادکار اور فوجی افسر صدر ڈیگال کے خیالات میں اس تبدیلی سے باخبر ہو گئے اور انہوں نے ایک بار پھر بغاوت کر دی۔ لیکن ان باغیوں کے خلاف صدر ڈیگال ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر ثابت ہوئے۔ انہوں نے باغی جنرلوں کو گرفتار کر لیا اور ان میں سے بعض کو پھانسی کے تختہ پر بھی چڑھا دیا۔ باغی فوجیوں سے نپٹنے کے بعد صدر ڈیگال نے الجزائری عوام کے نمائندوں سے مذاکرات کی پیش کش کی اور یہ مذاکرات ایویان میں شروع ہو گئے۔

مارچ ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتہ میں فرانسیسی حکومت اور الجزائر کی قومی آزادی کے نمائندوں نے ایویان میں ایک معاہدہ پر

دستخط ہوئے جن کی رو سے فرانس نے محاذ قومی آزادی کو الجزائری مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ محاذ کو شمالی صحارا، تمام الجزائر پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔ فرانس نے یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ گرفتار شدہ الجزائری گوریلوں کو جنگی قیدی سمجھا جائے گا اور ان سے ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فریقین اس امر پر متفق ہوگئے کہ الجزائر فرانس کے تعاون سے آزادی حاصل کرے گا اور آزادی کے سوال پر فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کیا جائے گا۔ تین سال کے عرصہ میں فرانسیسی فوجیں الجزائر خالی کر دیں گی۔ مرسی الکبیر اور بعض کے اڈے فرانس کو دس برس دیے جائیں گے اور ان یورپینوں کو الجزائر میں رہنے دیا جائے گا جو الجزائر کا شہری بننا پسند کریں گے۔

فرانس اور قومی محاذ کے درمیان مندرجہ بالا معاہدہ کا خیر مقدم تمام دنیا میں کیا گیا لیکن فرانسیسی نوآبادکاروں اور چند رجعت پسند فوجیوں نے اسے منسوخ کرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھوں نے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جس نے بڑے پیمانے پر دہشت انگیز کارروائیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے ایک بار پھر فرانسیسی فوجوں سے بھڑ جائیں گے اور دوبارہ جنگ شروع ہوجانے کی وجہ سے معاہدہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ لیکن اس دہشت انگیزی کے دوران مسلمانوں نے جس نظم و ضبط اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا وہ انہی کی شان ہے۔ آخر کار دہشت پسند مایوس ہوگئے اور انھوں نے الجزائری حکومت سے اس یقین دہانی پر ہتھیار ڈال دیے کہ انھیں عام معافی دے دی جائے گی۔

فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کے ذریعہ دونوں ملکوں کے عوام نے ایویان کے معاہدہ کی توثیق کر دی اور الجزائر کی آزادی کو آئینی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آزادی کے وقت بن خدا الجزائر کے وزیراعظم تھے۔ انھوں نے فرانس سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے الجزائر کے راسخ لیڈر بن بلا مکمل طور پر متفق نہیں تھے۔ وہ فرانس کو فوجی اڈے دینے کے خلاف تھے۔ وہ سوشلزم کے قائل تھے جبکہ بن خدا اور فرحت عباس مغربی طرز کی جمہوریت چاہتے تھے۔ بن بلا فرانسیسی دہشت پسندوں کو عام معافی دیے جانے کے بھی خلاف تھے۔ ان اختلافات کے باعث بن خدا اور بن بلا میں کشمکش شروع ہوگئی۔ آخر کار بن بلا کامیاب ہوگئے اور انھیں الجزائر کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔ ان کی اس کامیابی میں فوج کے سربراہ کرنل بومدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ بن بلا یقیناً ایک مخلص لیڈر تھے لیکن ان میں لچک نہ تھی اور خود رائی تھی۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام رفقاء سے ان کے اختلافات بڑھتے گئے اور وہ انھیں اپنے راستے سے ہٹاتے گئے۔ کریم بالقاسم، فرحت عباس اور بن خضر نے الجزائر چھوڑ دیا اور آیت احمد نے قبائلیہ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ ابھی یہ بغاوت پوری طرح فرو نہ ہوئی تھی کہ جنوب مغربی صحارا میں مراکش نے سرحدی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ الجزائر میں شامل صحارا کے ایک بڑے حصہ پر مراکش کا دعویٰ ہے۔ یہ حملہ اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کوشش تھی۔ الجزائر نے اپنی فوجیں مراکش کی سرحد پر روانہ کر دیں اور چند دن تک سرحد پر لڑائی جاری رہی۔ ایتھوپیا کے شاہ ہیل سلاسی نے مراکش اور الجزائر کی لڑائی ختم کرانے میں قابل تعریف کام کیا۔ انھوں نے مالی کے دارالحکومت باماکو میں تنظیم افریقی اتحاد کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس نے فریقین کے درمیان جنگ بندی کرا دی اور سرحدی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اس سرحدی لڑائی نے الجزائری رہنماؤں کی

بھی کسی شکل میں اور نہ ہی ابھی اتحاد کی عدم موجودگی [illegible] چنانچہ بادشاہ نے اپنے [illegible]
[illegible] ہو سکی

چونکہ قبائلی سیاست میں بادشاہ [illegible] کی تنقید کے سبب [illegible]

میں مغربی ایشیائی کانفرنس کا منعقد کیا جانا طے کیا۔ یہ کانفرنس ۲۹ جولائی ۱۹۶۳ء کو ہونے والی تھی لیکن اس سے پہلے [illegible] ۱۹۶۳ء کو فوج کے سربراہ کرنل [illegible] نے [illegible] بادشاہ کی حکومت ختم کر دی اور انہیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ گویا [illegible] کا خطرہ موجود تھا۔ اس لیے مغربی ایشیائی وزرائے خارجہ نے کانفرنس کو [illegible] نومبر ۱۹۶۳ء تک کے لیے ملتوی کر دیا [illegible] کی صورت حال کے باعث یہ کانفرنس [illegible] نومبر کو بھی نہ ہو سکی۔ [illegible] جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے [illegible] کی حکومت بادشاہ کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ البتہ داخلی معاملات میں ان کی پالیسی ابھی تک واضح نہیں ہوئی ہے۔

دنیائے عرب کا مستقبل

عرب لیگ کی حالیہ کانفرنس ستمبر ۱۹۶۵ء کے تیسرے ہفتے میں کاسا بلانکا میں منعقد ہوئی جس میں ۱۲ عرب ریاستوں نے حصہ لیا۔ تیونس نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اختلافات کے باعث شرکت نہیں کی۔ اس کانفرنس کے فیصلوں سے عرب ملکوں کی موجودہ حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے۔ کانفرنس میں عرب ریاستوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کیے اور ایک اعلامیہ شائع کیا۔

معاہدہ کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عرب اقوام اپنے اتحاد و یکجہتی کا اعادہ کرتی ہیں۔ وہ خصوصاً فلسطین کے مسئلہ پر متحد و متفق ہیں۔

۲۔ عرب اقوام عہد کرتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کریں گی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ایک اعلامیہ کے ذریعے بتایا گیا کہ عرب رہنماؤں نے متحدہ کمان کو مضبوط بنانے، فلسطینی فوج کے قیام اور دریائے اردن کے معاون دریاؤں کا رخ موڑنے پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس اعلامیہ میں عرب ریاستوں نے سفارش کی کہ ویت نام کا مسئلہ ۱۹۵۴ء کے جنیوا معاہدے کے مطابق حل کیا جائے۔ انہوں نے [illegible] کی تائید کی اور مطالبہ کیا کہ ان تمام فوجی اڈوں کو ختم کر دیا جائے جو دنیائے عرب کی سلامتی اور امن عالم کے لیے خطرہ ہیں۔ انہوں نے حق خود ارادیت کی حمایت کی اور مطالبہ کیا کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی تجاویز کے مطابق حل کیا جائے۔ آخر میں عرب رہنماؤں نے اعلان کیا کہ آزادی کا نصب العین واحد اور ہمہ گیر ہے اس لیے اگر کسی ایک قوم کی آزادی خطرے میں پڑتی ہے تو باقی تمام قوموں کی آزادی کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ کاسا بلانکا کانفرنس کا معاہدہ اور اعلامیہ عرب ریاستوں کی موجودہ حکمت عملی اور نظریات کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر باتیں نئی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ عرب رہنما اس سے قبل بھی بار بار کہہ چکے ہیں لیکن جب ان فیصلوں پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو باہمی اختلافات [illegible]

ہیں۔ جب تک یہ اسباب مفقود نہیں ہوں گے دُنیائے عرب کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ان اسباب کو موٹے طور پر داخلی اور خارجی اسباب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

داخلی اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عرب اقوام معاشی، تعلیمی اور سیاسی اعتبارات سے پس ماندہ ہیں۔

۲۔ اسی پس ماندگی کے باعث کسی بھی ریاست میں عوامی راج نہیں ہے۔ بعض ریاستوں میں ہنوز بادشاہوں کی حکومت ہے اور بعض میں خالص فوجی آمریت یا جمہوریت نما آمریت ہے۔ جہاں شاہی نظام ہے وہاں جاگیردارانہ معیشت ہے۔ ان ملکوں کا تیل غیر ملکی کمپنیوں کے انتظام میں ہے۔ تیل کی آمدنی کا نصف بادشاہ اور اس کے خاندان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ یہ آمدنی ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود کے لیے خرچ نہیں ہوتی۔ جہاں آمریت یا نام نہاد جمہوریت ہے وہاں ضرور غیر ملکی امداد و منصوبہ بندی کے ذریعہ ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس ترقی سے اب تک اونچے طبقے کے لوگوں کو ہی فائدہ پہونچا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ریاستوں کا نصب العین اشتراکیت ہے، جب تک عوام منصوبہ بندی کے فوائد اور اشتراکیت کے مقاصد سے آگاہ نہ ہوں گے وہ حکومت سے شعوری اور عملی تعاون نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا حکمراں طبقے واقعی عوام کا تعاون چاہتے ہیں؟ شاید نہیں۔

۳۔ عرب اتحاد، مشترکہ فوج، مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ اقدام ——— یہ سب عوام کو خوش کرنے کے لیے اعلانیوں میں کہنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اتحاد کے لیے نظریاتی ہم آہنگی اور معاشی و سیاسی نظام کی یکسانیت ضروری ہیں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ عرب رہنماؤں میں نظریاتی اختلاف ہے، عرب ریاستوں میں مختلف معاشی و سیاسی نظام رائج ہیں اور حسد و وطنیت وسیع تر عرب قومیت پر غالب ہے۔

۴۔ موجودہ حالات میں مشترکہ دشمن کے خلاف اور چند مشترکہ مقاصد کے لیے اتحاد ہو سکتا ہے جو کبھی کبھی ایک حد تک دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن صرف ایک حد تک۔ کیونکہ جب بھی اس حد کو پار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اختلافات کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔

خارجی اسباب :

۱۔ اکثر عرب ریاستوں کے وسائل (خصوصاً تیل) سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ سامراجی طاقتیں اپنے معاشی تسلط کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور ان کا سب سے بڑا سیاسی مقصد یہ ہے کہ عربوں کو صحیح معنوں میں آزاد اور متحد نہ ہونے دیا جائے۔

۲۔ جو عرب ریاستیں سامراجی طاقتوں کے معاشی تسلط سے آزاد ہیں وہ بھی ان سے معاشی اور فوجی امداد لیتی ہیں۔ جن ریاستوں نے کمیونسٹ ملک سے یہ امداد لینی شروع کی ہے انہوں نے جہاں ایک طرف کمیونسٹ اثر کا خطرہ مول لیا ہے وہاں دوسری طرف مغربی طاقتوں کی دشمنی اور سازشوں سے بھی دوچار ہیں

دنیائے عرب کا جغرافیائی طور پر ... مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس علاقے میں ... بحری اور ہوائی راستے موجود ہیں۔ تیل اور مشرق کی دنیا سے تجارت کی حفاظت کے پیش نظر ... مغربی ممالک کو بہت عزیز ہیں۔ اس کے علاوہ اسرائیل کا وجود عرب ملکوں کی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ ہے۔ ان خطروں نے ... عوام میں اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ہے وہاں دوسری طرف ان حکمران طبقوں کو اتحاد کا دشمن بنا دیا ہے جن کے مفاد ... سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو عوام کے ساتھ ہیں لیکن دراصل اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

مندرجہ بالا اسباب کی روشنی میں دنیائے عرب کی سیاست کا ایک مایوس کن نقشہ ابھرتا ہے لیکن جہاں عوام میں اپنے حقوق اور مفاد کا شعور بیدار ہو رہا ہے وہاں مستقبل سے مایوس ہونا تاریخی ارتقا کی صداقت سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیائے عرب کے عوام کو صحیح نصب العین دیا جائے اور انہیں حقیقت پسندانہ طرز عمل سے آگاہ کیا جائے۔

عرب اسلام کے اتحاد کی چند منفی اور مثبت بنیادیں ہیں۔ منفی بنیادوں میں سامراج دشمنی، اسرائیل دشمنی اور وہ تمام خطرے شامل ہیں جن سے آج کل دنیائے عرب دوچار ہے۔ منفی بنیادوں سے عارضی اتحاد حاصل ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن مستقل اتحاد کے لیے مثبت بنیادوں پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ مثبت بنیادوں میں اسلام اور عربی زبان شامل ہیں۔ بدقسمتی سے عرب رہنماؤں نے منفی بنیادوں اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا ہے اور اسلام کو فراموش کر دیا ہے۔ کیونکہ عربوں نے اپنے واحد نظریہ حیات کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لیے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اسے مغرب کے نظریات سے پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اشتراکیت، قومیت، جمہوریت وغیرہ نے ان میں نااتفاقی پیدا کر دی ہے۔ اسلام میں دور حاضر کے جدید تقاضوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت اور لچک پائی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں جدید نظریات کی اچھی باتوں کو سمو دیا جائے تو یہ جمہوریت اور کمیونزم کے سیاسی و معاشی نظریات کا کامیاب جواب ثابت ہوگا اور اس کے ساتھ نہ صرف دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام کے اتحاد کی راہیں کھل جائیں گی۔

گلیکسوز۔ڈی

آپ کی توانائی کی تعمیر کرتا ہے



[illegible]

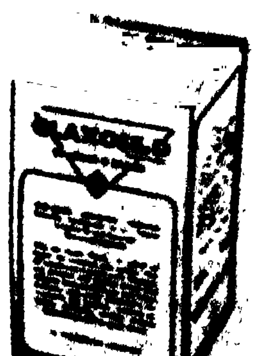
[illegible]

تین اجزار گلیکسوز۔ ڈی کو ممتاز بناتے ہیں!

۱۔ گلوکوز
غذائیت اور توانائی فوری بہم پہنچاتا ہے

۲۔ کیلشیم اور فاسفورس
غذائیت بہم پہنچاتے ہیں اور اعصاب کو تازہ رکھنے میں مدد دیتے ہیں

۳۔ وٹامن ڈی
کیلشیم کو ہضم کراتا ہے



گلیکسوز ڈی نام لے کر خریدیے

[illegible]

[illegible]

گلیکسوز۔ ڈی توانائی کی تعمیر کرتا ہے

XO - 23 - 193 - 65 - UD


ایک بہتر سلسلہ
Lily
SOAP
FLAKES
ZULFEQAR
ملبوسات کیلئے مثالی
جراثیم کش
SWAN
سوان
ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن
عمدہ۔ بہتر اور بہترین
ہم آپ کی خدمت میں دھونے اور نہانے کے معیاری صابن کا سیٹ پیش
کرتے ہیں جنہیں حفظانِ صحت کے جدید ترین اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی